مطالب الفرقان

قرآن مجید کی تفسیر ــــ خود ــــ قرآن مجید سے

جلد ششم

(سورۃ اعراف آیت ۱۵۹ تا ختم سورۃ ھود)

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

۲۵ بی، گلبرگ II لاہور ۵۴۶۶۰ پاکستان

نام کتاب ______ مطالبُ الفرقان، جلد ششم

مصنف ______ غلام احمد پرویز

پبلشر ______ طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور ۵۴۶۶۰، پاکستان

ٹیلیفون: ۵۷۶-۳۳۸۲

طابع ______ دوست ایسوسی ایٹس اُردو بازار لاہور

مطبع ______ ہوڈ پرنٹرز، ابراہیم روڈ لاہور

ایڈیشن ______ اوّل، فروری ۱۹۹۱ء

دوم، فروری ۱۹۹۷ء

صفحات ______ ۲۴+۵۱۵ = ۵۳۹

قیمت ______

طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ تمام کُتب کی

جُملہ آمدن قُرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

باسمہٖ تعالیٰ

آئینۂ مطالب

مطالب الفرقان — جلد ششم

○

سورۂ انفال

سورۂ توبہ نمبر ۹

سورۂ یونس نمبر ۱۰

سورۂ ہود نمبر ۱۱

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

پیش گفتار

مطالب الفرقان کی پہلی جلد اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری جلد اکتوبر ۱۹۷۶ء میں تیسری جلد نومبر ۱۹۷۹ء میں، چوتھی جلد نومبر ۱۹۸۱ء میں، پانچویں جلد نومبر ۱۹۸۲ء میں اور اب جلد ششم پیشِ خدمت ہے۔ اس میں سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۹ سے آخر سورۃ تک کے علاوہ..... سورۃ انفال، سورۃ توبہ، سورۃ یونس اور سورۃ ہود مکمل آگئی ہیں۔ ان کے مضامین اور موضوعات کا اندازہ فہرست سے لگ سکے گا۔ تصریفِ آیات کی رُو سے جو تفسیر مرتب کی جا رہی ہے اس کا انداز یہ ہے کہ جن آیات کی تفسیر سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے ان کا صرف حوالہ دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ نئے مضامین کی البتہ تفصیل آپ کے سامنے آتی جائے گی۔

فکرِ قرآنی کے سلسلہ میں پرویز صاحب کا مسلک حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۚ (۶/۸۰) کا ہے یعنی ہر طرف سے کٹ کر قرآن خالص کی فکر و تعلیم پیش کرنا۔ انہوں نے یہ آواز نصف صدی پہلے بلند کی تھی اور قریب بیالیس سال سے وہ اسے مسلسل پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ ابتدا میں اس کی مخالفت ہوئی، لیکن جوں جوں قرآنی حقائق زیادہ نمایاں ہوتے جارہے ہیں اس مخالفت کے بادل چھٹتے جارہے ہیں اور نگہ امید دیکھ رہی ہے کہ آخر الامر یہی اندازِ فکر غالب آئے گا جس وقت امت کے لیے یہ مسلک اپنالیا، دین کے دروازے اس پر وا ہو جائیں گے۔ پرویز صاحب کی فکری کاوش اس باب میں بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوگی۔ زیرِ نظر کتاب طباعت کے لئے تیار تھی کہ محترم پرویز صاحب اس دارِ فانی سے انتقال فرماگئے۔ كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ ۚ وَّيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ ۚ (۵۵/۲۶-۲۷)۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے سحابِ کرم سے نوازے۔ (آمین)

اس جلد کی کاپیوں کی تصحیح بڑی دیدہ ریزی سے کی گئی ہے اس کے باوجود اگر کوئی غلطی نظر پڑے تو براہِ کرم اس سے ہمیں مطلع فرمادیا جائے۔ اس فکر کی نشر و اشاعت میں ہم احباب کے ہر قسم کے تعاون کے محتاج ہیں۔

آیات کا حوالہ اس جلد میں بھی حسبِ سابق ہے یعنی متن کتاب میں $\frac{\text{اوپر سورۃ کا نمبر}}{\text{نیچے آیت کا نمبر}}$ ہے۔ البتہ انڈکس میں حوالہ یوں دیا گیا ہے۔ (۱۱ : ۹) یعنی سورۃ نمبر ۹ کی آیت نمبر ۱۱۔ والسلام

طلوعِ اسلام ٹرسٹ،
۲۵۔ بی، گلبرگ ۲، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

نواں پارہ ــــــــــــــــــــ ساتویں سُورۃ



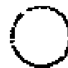
از

آیت نمبر ۱۵۹

پہلا باب
سورۃ الاعراف

قرآن اور سائنس

۱. عدل کا قرآنی مفہوم۔
۲. داعیانِ حق کی دلسوزی۔
۳. محکومیت کا رسوا کُن عذاب۔
۴. ایضاعِ صلوٰۃ کا مفہوم۔
۵. یومِ الست کا غلط عقیدہ۔
۶. خدا کے مختلف تصورات۔
۷. نسلِ انسانی کا تسلسل خدا کی ربوبیت کی زندہ شہادت
۸. تارکینِ قرآن کی مثال
۹. اہلِ جہنم کی علامات۔ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے۔
۱۰. علومِ سائنس کی اہمیت۔
۱۱. صفاتِ خداوندی کے اپنانے میں اعتدال۔
۱۲. اَلسَّاعَۃ یعنی انقلابِ عظیم
۱۳. ہمارا شرک



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

(آغاز)

سورۃ الاعراف

آیت نمبر ۱۵۹

مطالب الفرقان، جلد پنجم کا اختتام سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۵۸ (۷/۱۵۸) پر ہوا تھا. اس سورہ کا بیشتر حصہ کوائفِ حضرت موسیٰؑ اور داستانِ بنی اسرائیل پر مشتمل ہے. جلد پنجم کے آخری صفحات میں بھی انہی کے متعلق آیات درج تھیں، لیکن ان کے درمیان بعثتِ نبیِ اکرمؐ کا تذکارِ جلیلہ آگیا تھا اور ہم نے اسی آیت (۷/۱۵۸) پر اس جلد کی تکمیل کی سعادت حاصل کی تھی. اب آیت (۷/۱۵۹) سے سلسلۂ کلام آگے چلتا ہے. ارشاد ہے:-

(۷/۱۵۹) وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ○

(جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اسی قسم کا ضابطۂ ہدایت موسیٰؑ کو بھی دیا گیا تھا) اور اس کی قوم میں بھی ایک گروہ ایسا تھا جو حق کے ساتھ لوگوں کی راہنمائی کرتا تھا اور اس کے مطابق لوگوں کے فیصلے عدل و انصاف سے کیا کرتا تھا. (عدل، ہر قانون کے مطابق فیصلہ کرنے کو نہیں کہتے. اگر قانون ہی غلط ہو تو اُس کے مطابق فیصلے کو مبنی علی الحق کیسے کہا جائے گا؟ عدل وہ ہے جس میں ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ خدا کی کتاب کے مطابق ہو) (۷/۱۸۱؛ ۵/۴۴؛ ۵/۴۸؛ ۲۶/۳۸).

اس آیۂ مقدسہ میں دو نکات غور طلب ہیں. پہلا یہ کہ بنی اسرائیل (یہودیوں) کی طرف سے دعوتِ

دشمن سے بھی عدل

نبی اکرمؐ کی جس قدر مخالفت ہوئی تھی اور اس باب میں وہ جن پست سازشوں اور کمینہ حربوں تک اُتر آئے تھے' قرآنِ کریم میں ان کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے. لیکن اس کے باوجود اس کی کشادہ نگہی اور وسعتِ قلبی کا یہ عالم ہے کہ ان میں اگر کوئی گروہ حق پرستی کا مسلک اختیار کرتا تھا تو قرآن اس کی تعریف کرنے میں ذرا بھی بخل نہیں برتتا. عدل کا یہی تقاضا ہے کہ [جیسا کہ قرآنِ کریم نے خود اس کی تاکید کی ہے (۵/۸)] انسان' دشمن کو بھی' خندہ پیشانی سے اس کا حق دیدے.

دوسرا نکتہ عدل کے مفہوم سے متعلق ہے. اگرچہ اس کے متعلق ضمنی اشارہ مطالب الفرقان' جلد چہارم' ص ۳۳۶ میں کیا جا چکا ہے' لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر' ہم اس کی مزید وضاحت (اور اس کا اعادہ) ضروری سمجھتے ہیں. دنیا کے عام دستور کے مطابق' اگر کسی مروجہ قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے تو اسے عدل کہا جائے گا. اس سے بحث نہیں ہوگی کہ خود وہ قانون کس قسم کا ہے. کیا وہ بھی عدل پر مبنی ہے یا نہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ عدل اسی فیصلہ کو کہا جائے گا جو اُس قانون کے مطابق ہو جو الحق (وحیٔ خداوندی) پر مبنی ہو. اس کے نزدیک' حق اور باطل' صحیح اور غلط' جائز اور ناجائز' انصاف اور بے انصافی' عدل اور ظلم کا یہی معیار ہے. حتیٰ کہ کفر اور اسلام میں بھی حدِ امتیاز یہی ہے.

عدل کا قرآنی مفہوم

وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ ..... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ .... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (۵/۴۴ ؛ ۴۵ ؛ ۴۷) — "جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں — ظالم ہیں — فاسق ہیں." قومِ موسیٰؑ میں بھی جو لوگ اس وحی کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے جو انبیاء بنی اسرائیل پر نازل کی گئی تھی' وہی درحقیقت عادل تھے. حضور نبی اکرمؐ کے زمانے میں ان کی کتابوں میں تحریف ہو چکی تھی اور خالص وحی صرف قرآنِ کریم میں محفوظ تھی. اس لئے یہودیوں کو بھی سابقہ آیت (۷/۱۵۸) میں رسالتِ محمدیہ پر ایمان لانے اور اس کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا تھا. اب قانون' وہی صحیح قانون ہے جس کی تصدیق قرآنِ کریم کرے اور عدل وہی ہے جو اس قانون کے مطابق ہو.

اس کے بعد سلسلۂ کلام پھر داستانِ بنی اسرائیل کی طرف منتقل ہوتا ہے. فرمایا:-

(۷/۱۶۰) وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَاۤ

إِلَىٰ مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۚ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۚ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○

قومِ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل تھے اور وہ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے تھے. جب اس کی قوم نے موسیٰؑ سے پانی کی درخواست کی تو (ہم نے اُس کی راہنمائی اُس پہاڑ کی طرف کردی جہاں پانی کے چشمے مستور تھے. چنانچہ) وہ اپنی قوم کو لے کر اس طرف گیا چٹان پر سے مٹی ہٹائی تو اس میں سے (ایک چھوڑ کر) بارہ چشمے پھوٹ نکلے (۲/۶۰). اُس نے ان چشموں کو نامزد کردیا اور ہر قبیلہ کو بتا دیا کہ اُس کا چشمہ کون سا ہے.

پھر اُس بیابان میں پانی سے بھرے ہوئے بادل اُن کے سر پر سایہ فگن رہتے تھے. کھانے کے لئے پرندوں کا گوشت اور جنگل کی نباتاتی شیرینی' جو ان کے لئے وجہ سکون اور باعثِ اطمینان تھی (۲/۵۷).

سامانِ رزق کی اس قدر فراوانیاں عطا کرکے' ہم نے اُن سے کہا کہ ان پاکیزہ اور خوشگوار چیزوں کو کھاؤ پیو. (لیکن اس پر بھی' انہوں نے ہمارے قانون کا اتباع نہیں کیا. سو) اس سے ہمارا کچھ نقصان نہیں ہوا. انہوں نے اپنے ہاتھوں خود اپنا ہی نقصان کیا.

اِس آیت میں بنی اسرائیل کی زندگی کے حسبِ ذیل سوانح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے.

۱. اسباطِ بنی اسرائیل.
۲. استسقا (پانی کی طلب).
۳. بادلوں کی سایہ افگنی.
۴. منّ و سلویٰ.

مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۱۵۹ - ۱۵۸) میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ یہ قوم بارہ قبائل (اسباط) پر مشتمل تھی جو حضرت موسیٰ کی معیت اور قیادت میں سینا کی وادیوں میں گشت کر رہی تھی. اس صحرا نوردی کے دوران پانی کے چشموں کا واقعہ پیش آیا تھا جس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۲۹۷) میں گزر چکی ہے.

بادلوں کی سایہ افگنی کا بھی وہیں ذکر ہے (جلد دوم ص ۲۸۲) اور منّ و سلویٰ کا بھی (ص ۲۸۳). اُس قوم نے ان عطایائے خداوندی کی کس قدر ناسپاس گزاری کی' اس کی تفصیل ان مجلدات میں متفرق مقامات پر ملے گی (دیکھئے مختلف جلدوں کا انڈکس). اصولی طور پر اسے پھر دہرا دیا کہ "خدا کسی قوم پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا. قومیں غلط روشِ زندگی اختیار کر کے خود اپنے آپ پر ظلم کرتی ہیں اور تباہ ہو جاتی ہیں" (اس سلسلہ میں عنوان "مکافاتِ عمل" اور "قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین" دیکھئے.

اس کے بعد اُن کی تاریخ کا ایک اور المیہ سامنے لایا جاتا ہے. فرمایا:-

(۶۲-۱۶۱/۷) وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اسْكُنُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَاتِكُمْ ۚ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ○ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ○

ہم نے ان سے کہا کہ تم فلسطین کی سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے رہو سہو (۵/۲۱؛ ۲/۵۸) اور اس طرح اپنی مرضی سے' جیسے اور جب جی چاہے' سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاؤ' اس شرط کے ساتھ کہ تم ہمارے قوانین کے سامنے اپنا سر جھکائے رکھو گے. اس طرح تمہاری صحرا نوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی بھی ختم ہو جائے گی اور جو غلطیاں تم سے سرزد ہو چکی تھیں' ان کے مضر اثرات سے حفاظت کا سامان بھی مل جائے گا! اور اگر تم اس کے بعد بھی حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرو گے تو ان فتوحات کا سلسلہ آگے بڑھتا چلا

جائے گا (۲/۵۸)۔

لیکن تم نے سپاہیانہ اور مجاہدانہ زندگی کے بجائے آرام طلبی اور تساہل انگیزی کی زندگی اختیار کرلی (۲/۶۱) اور اس طرح ہمارے قوانین سے سرکشی برتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے سماوی قانونِ مکافات کے مطابق، تم میں مسلسل کمزوری آتی گئی اور جرأت اور ہمت باقی نہ رہی (۲/۵۹؛ ۲۴-۲۲/۵)۔

یہ واقعہ (انہی الفاظ کے ساتھ) آیت (۲/۵۸) میں بھی آچکا ہے جس کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۲۸۵-۲۸۹) میں کی جاچکی ہے۔

اگلی آیت میں واقعہ سبت کا ذکر ہے جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ فرمایا:

(۷/۱۶۳) وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۛ كَذٰلِكَ ۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○

سبت کی خلاف ورزی

اور ان سے اُس بستی والوں کا حال پوچھو جو دریا کے کنارے واقع تھی۔ (چونکہ یہودیوں کے ہاں سبت کے دن شکار کرنے کی ممانعت تھی اور رفتہ رفتہ مچھلیوں نے اس کا اندازہ کرلیا تھا کہ اُس دن انہیں کوئی نہیں پکڑتا، اس لئے) وہ اس دن پانی کے اوپر تیرتی پھرتی نظر آیا کرتی تھیں اور ہفتے کے دوسرے دنوں میں نیچے نیچے رہتی تھیں۔ جن لوگوں کے دل میں قانون شکنی کے جذبات پرورش پاتے، وہ اتنا بھی ضبط نہ کرسکتے کہ سبت کے دن کاروبار بند رکھنے کی بابت جو طے پایا تھا، اُس کا احترام کرتے۔ چنانچہ وہ اس قاعدے کو توڑ کر بے راہ روی اختیار کرتے (۲/۶۵؛ ۴/۴۷؛ ۴/۱۵۴؛ ۵/۶۰؛ ۱۶/۱۲۴)۔

اس کا اگلا حصہ آیت (۷/۱۶۶) میں یوں آیا ہے:

(۷/۱۶۶) فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝

جب انہوں نے اس بات سے سرکشی اختیار کرلی جس سے انہیں روکا گیا تھا، تو ہمارے قانونِ مکافات نے یہ فیصلہ کر دیا کہ وہ ذلت و خواری کے چلتے پھرتے پیکر بن جائیں (۲/۶۵) اور زندگی کی شادابیوں سے محروم رہ جائیں (۴/۴۷)۔

اس واقعہ کی تشریح مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۳۱۰ - ۳۰۷) میں کی جا چکی ہے اور مزید وضاحت جلد چہارم (صفحہ ۵۳۶) پر ہے۔

واقعہ سبت کے تمہیدی بیان (۷/۱۶۳) کے بعد کہا:۔

(۷/۱۶۴) وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

(جن لوگوں کا ذکر (۷/۱۵۹) میں کیا گیا ہے، وہ دوسروں کو اس قانون شکنی سے باز رہنے کی نصیحت کرتے لیکن اُن پر اس کا کچھ اثر نہ ہوتا) اس پر اور لوگ اُن سے کہتے کہ تم ان لوگوں کو وعظ و نصیحت کر کے اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔ ان کی خوئے سرکشی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ: یا تو یکسر ہلاک ہو جائیں گے یا کسی اور سخت عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے (ان میں راہِ راست پر آنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی)۔

اس پر وہ ان سے کہتے کہ ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ شاید تباہی سے بچ جائیں (اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو) کم از کم ہم تو خدا کے حضور سُرخرو ہو جائیں کہ ہم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا تھا۔

داعیانِ الی الحق کے احساسِ ذمہ داری اور دل سوزی کا یہی عالم ہوتا ہے (۱۸/۶، ۲۶/۳)

آیت (۷/۱۵۹) میں بتایا جا چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک گروہ ایسا تھا جو حق کے ساتھ ان کی راہنمائی کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس گروہ کے سرخیل خود حضرت موسیٰ تھے اور باقی افراد اُن کے متبعین۔ حق و صداقت کی طرف دعوت دینے والوں کی بھی کیفیت عجب ہوتی ہے۔ وہ جنہیں تباہی سے بچانا چاہتے ہیں، وہ انہیں گالیاں دیتے ہیں، پتھر مارتے ہیں، طرح طرح کی اذیتیں دیتے ہیں۔ انہیں اُن کے گھر بار سے نکال

باہر کرتے ہیں. حتیٰ کہ ان کے خلاف میدانِ جنگ تک میں اُتر آتے ہیں. لیکن اس کے باوجود ان داعیانِ حق و صداقت کے دل میں ان کے خلاف جذباتِ نفرت و انتقام نہیں اُبھرتے بلکہ ان کی تباہی اور بربادی کے احساس سے وہ اور زیادہ ملولِ خاطر ہو جاتے ہیں اور اُن کے غم میں اپنے آپ کو نڈھال کر لیتے ہیں. حضور نبی اکرمؐ سے خود خدا کو کہنا پڑا کہ

داعیانِ حق کی جانسوزی

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ○ (۱۸/۶)

(اے رسولؐ! ہم جانتے ہیں کہ تو اپنے سینہ میں ایسا دردمند دل رکھتا ہے) اگر یہ لوگ ایسی واضح حقیقت پر بھی ایمان نہ لائے تو تُو ان پر آنے والی تباہی کے غم میں اپنی جان گھُلا لے گا.

اس مقام پر قرآن نے کہا کہ جب ان مخالفین کی یہ حالت ہے کہ یہ تمہاری بات تک سننے کے لئے تیار نہیں، تو ان سے الگ ہو جاؤ. لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ان تک پیغامِ خداوندی پھر بھی پہنچاتے رہو. سورۃ الانعام میں ہے:

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ○ (۶/۷۰)

جن لوگوں کی یہ حالت ہو کہ وہ (نظامِ خداوندی تو ایک طرف) خود اُس آئین اور ضابطہ کو بھی کچھ اہمیت نہ دیں جسے انہوں نے اپنے لئے اختیار کر رکھا ہے اور انسانی زندگی کو محض کھیل تماشا سمجھیں، اور اِس دھوکے میں رہیں کہ مقصدِ حیات عیش و عشرت ہے اور بس، تم ایسے لوگوں کے پیچھے اپنی جان مت کھپاؤ. انہیں، ان کے حال پر چھوڑ دو. البتہ، قرآنی تعلیم اُن کے سامنے پیش کرتے رہو اس لئے کہ کسی شخص کو اُس کے غلط اعمال

کی وجہ سے، قرآن سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُسے، اُس کے غلط اعمال کے نتائج سے قانونِ خداوندی کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔ اس کے لئے نہ اُس کا کوئی رفیق اور مددگار ہو سکتا ہے، نہ سفارش، نہ ہی وہ کچھ بدلہ (کفارہ) دے کر اُن کے نتائج سے بچ سکتا ہے۔ اُن لوگوں کو اُن کے اعمال کے حوالے کر دیا گیا ہے کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس کی سزا بھگتیں (۶/۵۲، ۶/۳۸، ۶/۷۰)۔ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ چیزیں بھی جو عام حالت میں انسان کی پرورش کا موجب بنتی ہیں، ان کے لئے تلخابۂ حیات اور سوہانِ روح ہو جاتی ہیں اس لئے کہ انہوں نے صحیح راستے پر چلنے سے انکار کر دیا تھا اور حق و صداقت سے سرکشی برتی تھی (۶/۷۰)۔

(تشریح اس آیت کی مطالب الفرقان جلد پنجم صفحہ ۴۹-۸۰ پر گزر چکی ہے)۔ وہ یہ فریضہ کسی قسم کی ستائش کی تمنا یا صلہ کی امید سے نہیں کرتے۔ وہ اسے خدا کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داری کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ زیرِ نظر آیت (۷/۱۶۴) میں یہ دونوں نکات آگئے ہیں۔ جب ان داعیانِ حق سے لوگ کہتے کہ تم ایسے سرکشوں کو پند و نصائح سے اپنی جان کیوں کھپاتے ہو تو وہ کہتے کہ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ـــ اس لئے کہ شاید یہ تباہی سے بچ جائیں۔ اور جب پوچھا گیا کہ تمہاری اِن جانسوز کاوشوں کا جذبۂ محرکہ کیا ہے تو کہا کہ مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ ـــ اس سے ہم اپنے ربّ کے حضور سُرخرو ہو جائیں گے کہ ہم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا تھا۔ قوم کو تباہی سے بچانے کی سعی و کاوش کرنے والوں میں ان دو خصوصیات کا ہونا ضروری ہے، یعنی غم و غصہ اور نفرت و انتقام کے بغیر، بلا مزد و معاوضہ اپنی کوششوں میں لگے رہنا۔ اس کو عمل فی سبیل کہا جاتا ہے۔

جب داعیانِ حق و صداقت کی ان جانکاہ کاوشوں کے باوجود یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز نہ آئے اور پانی سر سے گزر گیا تو تباہی نے انہیں گھیر لیا ـــ

(۷/۱۶۵) فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ○

یعنی جب ان لوگوں نے قانونِ خداوندی کو یکسر پسِ پشت ڈال دیا، تو ہم نے اُن لوگوں کو، جو انہیں برائیوں سے روکا کرتے تھے، الگ کر لیا اور ان نافرمانوں کو، اُن کی سرکشی کی وجہ سے، سخت ذلّت آمیز عذاب میں مبتلا کر دیا۔

ہم اقوامِ سابقہ کی داستانوں میں دیکھ چکے ہیں کہ جب کسی قوم کی تباہی کا وقت آتا تھا تو ان افراد کو جو حق و صداقت کے پیرو ہوتے تھے، وہاں سے نکال لیا جاتا تھا اور اس کے بعد اُس قوم کو تباہی محیط ہو جاتی تھی۔ قومِ بنی اسرائیل کے ضمن میں یہ تباہی ان کی کسی خاص بستی یا خطۂ زمین کی بربادی کی شکل میں وارد نہیں ہوتی تھی۔ اس قوم پر غلامی و محکومی کی ذلّت آمیز زندگی کی صورت میں عائد ہوتی تھی۔ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جن افراد کے متعلق یہاں کہا گیا ہے کہ انہیں اس عذاب سے محفوظ کر لیا گیا تھا، وہ وہاں سے ہجرت کر کے کسی اور ملک کی طرف چلے گئے ہوں گے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اُس قوم پر غلامی اور محکومی کی مار ماری گئی تھی۔ اس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے؛

(۷/۱۶۷) وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

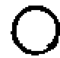
(یہ تھی بنی اسرائیل کی مجموعی حالت۔ اس کی وجہ سے) تیرے نشو و نما دینے والے نے (وحی کے ذریعے) اعلان کر دیا کہ (اگر یہ لوگ سرکشی سے باز نہ آئے تو) میں ان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسے لوگوں کو مسلّط کرتا رہوں گا جو انہیں بدترین قسم کی سزائیں دیں گے۔ (انہوں نے ہمارے قانونِ مکافات کو یونہی مذاق سمجھ رکھا تھا حالانکہ) یہ حقیقت ہے کہ وہ قانون اپنے پیمانوں کے مطابق، نتائج مرتب کرنے میں کبھی دیر نہیں لگاتا۔ اس میں مہلت کا وقفہ اس

لئے رکھا گیا ہے کہ اگر لوگ اس دوران میں اپنی روش میں تبدیلی کرلیں تو ان کے لئے سامان حفاظت و مرحمت مہیا ہو جائے۔

مطالب الفرقان جلد دوم میں داستان بنی اسرائیل شرح وبسط کے ساتھ بیان کی جاچکی ہے۔ اگر آپ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیں تو یہ مقامات جو یہاں اشارۃً یا اختصاراً آئے ہیں، اچھی طرح سمجھ میں آجائیں گے

قیامت تک کا مفہوم

اس مقام پر ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ اس قوم کی تباہی کے سلسلہ میں قانونِ خداوندی کی رُو سے فیصلہ ہوا (یعنی ان کی بے راہ روی اور سرکشی کا نتیجہ یہ تھا) کہ ان پر اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ (قیامت تک) ایسے لوگ مسلط ہوتے رہیں گے جو انہیں بدترین قسم کی سزائیں دیں گے۔" اِلٰی یَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ" کے معنی یہ نہیں کہ مصطلحہ "قیامت کے دن" تک ایسا ہوتا رہے گا۔ یہ ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں، ہمیشہ یا لمبے عرصہ تک۔ خود ہمارے ہاں بھی یہ محاورہ مروّج ہے۔ جب ہم کسی سے کہتے ہیں کہ "تم قیامت تک ایسا نہیں کرسکو گے"، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم کبھی ایسا نہیں کرسکو گے۔ یا جب ہم کہتے ہیں کہ تم میں اور ہم میں یہ لڑائی قیامت تک جاری رہے گی، تو اس کے معنی "ہمیشہ ہمیشہ کے لئے" یا لمبے عرصہ تک کے لئے ہوتے ہیں۔ ان متسلّطین کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر کیا گزری، یوں تو اُن کی ساری تاریخ اس کی شاہد ہے لیکن ان کی دو تباہیاں (جن کا ذکر خود قرآن نے کیا ہے) بڑی قیامت خیز اور عبرت آموز تھیں۔ ان کا ذکر ——— مطالب الفرقان جلد دوم ــ صفحات ۱۶۵ - ۱۶۰ پر آچکا ہے۔



ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہودی مغضوب علیہ قوم ہے۔ اُنہیں کبھی سلطنت اور حکومت میسّر نہیں آسکتی۔ ہمارے واعظ اور خطیب اسے اکثر دہراتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اب جبکہ یہودیوں کی ایک ایسی مملکت قائم ہو چکی ہے جو مسلمانوں کی قریب چالیس آزاد اور بڑی بڑی سلطنتوں کو ناکوں چنے چبوا رہی ہے، یہ حضرات برابر پکارتے چلے جاتے ہیں کہ انہیں حکومت نہیں مل سکتی۔ ہم نے اس غلط فہمی (یا خوش فہمی) کے ازالہ کے لئے مطالب الفرقان جلد دوم ص۱۶۸ میں وضاحت کردی ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا کہ اس تباہی سے ان کی حالت کیا ہوگئی۔ فرمایا؛

(۷/۱۶۸) وَ قَطَّعۡنٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اُمَمًا ۚ مِنۡہُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَ مِنۡہُمۡ

دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَ بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَ السَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○

(چنانچہ ان کے عذاب کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ) ان کی مرکزیت تباہ ہو گئی اور وہ مختلف پارٹیوں میں بٹ گئے (کسی قوم کا مختلف پارٹیوں اور فرقوں میں بٹ جانا، خدا کا سخت عذاب ہوتا ہے (۶/۶۵)۔ اِن میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہوئے، زندگی کو سنوارتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو اس روش کے خلاف چلتے تھے۔ ہم اُن کی قومی زندگی کے مختلف پہلو بدلتے رہے۔ کبھی ان پر خوشحالی کا دور آجاتا، کبھی بدحالی کا۔ (انہیں یک لخت تباہ نہیں کر دیا گیا تھا) اور یہ اس لئے کہ ممکن ہے وہ قانونِ خداوندی کی طرف لوٹ آئیں۔

تفرقہ خدا کا عذاب ہے تفرقہ (فرقہ بندی اور پارٹی بازی) کس قدر شدید عذاب ہے اور قرآن کی رُو سے شرک، اس کے متعلق متعدد مقامات پر نہایت وضاحت سے لکھا جا چکا ہے (اس سلسلہ میں انڈکس کی مدد سے متعلقہ مقامات دیکھئے)۔ داستانِ بنی اسرائیل کا آغاز اس سے ہوا کہ فرعون انہیں پارٹیوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا (وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا ۲۸/۴)۔ انہیں اِس عذاب سے نجات دلائی گئی۔ اس طرح وہ ایک امت بن گئے تو انہیں شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی کا وارث بنا دیا گیا۔ انہوں نے اپنے اوپر خود تفرقہ کی لعنت مسلّط کر لی تو ذلت و خواری کے بدترین عذاب میں ماخوذ ہو گئے۔ اقبالؒ نے اس غضبِ الٰہی کا ذکر ہمارے سلسلہ میں بھی کیا ہے کہ "امتے بودی اُمم گردیدہ"، تم ایک امت تھے۔ اس کے بعد مختلف فرقوں اور پارٹیوں، نسلوں اور قوموں، گروہوں، قبیلوں، ذاتوں اور برادریوں میں بٹ گئے۔

آیۂ زیرِ نظر میں پھر بنی اسرائیل کے دو گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک وہ جو حق کے پیرو تھے۔ دوسرے وہ جو اس کے خلاف روش پر گامزن تھے۔

اِس آیت میں خدا کے قانونِ مہلت کا بارِ دیگر ذکر آیا ہے، یعنی قوموں کی تباہی یک لخت وارد نہیں ہو جاتی۔ انہیں مہلت دی جاتی ہے کہ شاید وہ اِس دوران میں اپنی غلط روش میں تبدیلی کر لیں۔ (اِس کی

وضاحت کے لئے انڈکس دیکھئے بالخصوص جلد اوّل صفحہ ۱۹۷؛ جلد چہارم صفحہ ۲۳۶ اور جلد پنجم صفحات ۲۷؛ ۲۸)۔
اور اس کے بعد:

(۱۶۹-۱۷۰/۷) فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝

(ابتداءً ان کی یہ حالت رہی) لیکن اس کے بعد جو نسلیں ان کی جانشین ہو کر، ہمارے ضابطۂ قوانین کی وارث بنیں، ان کی حالت یہ تھی کہ وہ پیشِ پا افتادہ، دنیاوی مفاد پر جھپٹ پڑتے اور کہتے کہ اس کی ہمیں معافی مل جائے گی۔ اس کے بعد اس قسم کا کوئی اور مفاد سامنے آجاتا تو اسے بھی جھپٹ لیتے، یعنی ان کی روش ہی یہ ہو گئی کہ جونہی کوئی فائدہ سامنے آیا، اصول اور ضابطہ، قاعدہ اور قانون کو بالائے طاق رکھ کر اس کی طرف لپک پڑتے۔

(ان سے کوئی پوچھتا کہ) کیا تم سے کتاب اللہ کے مطابق، یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ تم خدا کے متعلق حق کے سوا کچھ نہ کہو گے؟ ـــ یہ اُس کتاب کو پڑھتے پڑھاتے بھی رہتے ہیں۔ ـــ (اُس کتاب میں یہ لکھا ہوا تھا کہ) اُن لوگوں کے لئے جو زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہتے ہیں (حیوانی سطحِ زندگی کے قریبی مفاد کے مقابلہ میں) مستقبل کی خوشگواریاں کہیں

بہتر ہیں، کیا یہ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ (۷/۱۶۹)

(اور اُس کتاب میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ) جو لوگ خدا کے ضابطۂ قوانین سے متمسک رہیں گے اور نظامِ صلوٰۃ کو قائم کریں گے، تو ہم اُن لوگوں کے اعمال کا اجر ضائع نہیں کریں گے جو اپنی زندگی اور معاشرہ کو سنوارنے والے ہوں (۷/۱۷۰)۔

اس قسم کے ناخلف جانشینوں یا اُمتوں کا ذکر سورۂ مریم میں بھی آیا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۙ (۱۹/۵۹)

(یہ لوگ تو اِن خصوصیات کے حامل تھے، لیکن) ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے کہ انہوں نے نظامِ صلوٰۃ کو ضائع کر دیا، یعنی (قوانینِ خداوندی کے اتباع کے بجائے) اپنے اپنے مفاد اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ (اب ان کے لئے پھر ایک موقع آیا ہے۔ اگر انہوں نے اسے بھی کھو دیا) تو یہ بہت جلد اپنی ہلاکت کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ لیں گے۔

ایضاعِ صلوٰۃ

صلوٰۃ کس طرح ضائع کی جاتی ہے، اس کے لئے (انڈکس میں) صلوٰۃ کا عنوان دیکھئے۔ صلوٰۃ کا مفہوم سمجھ میں آجانے کے بعد یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم کیا ہے اور ایضاعِ صلوٰۃ سے مراد کیا؟ اقامتِ صلوٰۃ ہے دینِ خداوندی (قرآنی نظام) کا قائم کرنا اور ایضاعِ صلوٰۃ کے معنی ہیں، قرآنی نظام کو بگاڑ کر اس کی جگہ غیر قرآنی نظام کو اسلام قرار دے لینا۔

آیۂ زیرِ نظر (۷/۱۶۹) میں وارثینِ کتاب کا ذکر آیا ہے۔ ہمیں بھی وارثینِ کتاب کہہ کر پکارا گیا ہے، لیکن ذکر ہمارا ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ؕ (۳۵/۳۲)

(اس کتاب ــ قرآن ــ میں وہ سب کچھ آ گیا ہے جو انسان کی راہنمائی کے لئے ضروری ہے، اس لئے اب وحی کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد کرنا صرف یہ ہوگا کہ انسانی

معاشرہ کو اس تعلیم کے مطابق متشکل کیا جائے)۔اس کام کے لئے ایک جماعت (امت) کی ضرورت ہو گی۔ یہ اُمت منتخب کر لی گئی ہے (۲/۱۴۳؛ ۳/۱۰۹) اور اس کے سپرد اس کتاب کو کر دیا گیا ہے۔

لیکن اس امت کی یہ حالت ہو گی کہ ان میں سے کچھ تو قرآن کے مطابق عمل کرنے میں آگے بڑھ جائیں گے، کچھ میانہ روی اختیار کریں گے اور کچھ ایسے بھی ہوں گے جو اسے چھوڑ کر اپنے آپ پر ظلم کریں گے۔ جو آگے بڑھ جائیں گے، وہ بلند مدارج کے مستحق ہوں گے۔

ناخلف جانشین ہمیں اپنی حالت کا جائزہ لے کر خود فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ہمارا شمار کس زمرہ میں ہوتا ہے۔ حالت ہماری اس قدر واضح ہے کہ اس کی روشنی میں امر کا فیصلہ کرنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آئے گی۔

اس کے بعد داستانِ بنی اسرائیل کی ایک اور کڑی سامنے لائی گئی ہے۔ یعنی

(۷/۱۷۱) وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۟ع

اور جب اس پہاڑ میں زلزلہ آیا جس کے دامن میں بنی اسرائیل ٹھہرے ہوئے تھے اور ایسا نظر آنے لگا گویا وہ ایک سائبان ہے جو اس طرح ہل رہا ہے کہ ان کے سروں پر گرا چاہتا ہے۔ (اس سے اُن کی توہم پرستی نے اُن کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ ہم نے ان سے کہا کہ ان حوادثِ فطرت سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں) جو کچھ ہم نے تمہیں وحی کے ذریعے دیا ہے اس پر نہایت مضبوطی سے کاربند رہو اور اس کی تعلیم کو ہر وقت سامنے رکھو۔ اس سے تم تمام خطرات سے محفوظ رہو گے۔

کوہِ طور کا ذکر مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۰۶ پر بھی آیا ہے۔ یہاں پہاڑ کے زلزلہ کا ذکر ہے۔ زلزلوں جیسے حوادثِ ارض کے ساتھ آج بھی دنیا کی بیشتر اقوام کے توہمات وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ آج سے

ہزاروں سال پہلے کا زمانہ تھا اور قوم وہ تھی جو اپنے سامنے بنائے ہوئے گوسالہ کی پرستش کرنے لگ گئی تھی۔ اُس کے زلزلہ سے توہم پرستی کا شکار ہو جانے پر کیا تعجب ہو سکتا ہے۔ اس توہم پرستی کے ساتھ خوف بھی شامل تھا۔ غور فرمائیے کہ وحیٔ خداوندی نے اس کا علاج کیا بتایا ہے۔ یہ کہ جو تعلیم انہیں دی جارہی ہے، اس کے محکم طور پر پابند رہیں۔ اس سے وہ اس قسم کے حوادث سے بھی محفوظ رہیں گے اور توہمات سے بھی مامون۔

حوادث فطرت سے محفوظیّت

یہ تعلیم کیا تھی؟ بات واضح ہے۔ آپ انڈکس میں "تسخیر فطرت" اور "کائنات" کے عنوانات دیکھئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ وحی نے اس راز کا انکشاف کیا کہ سلسلۂ کائنات، علّت اور معلول Cause and effect کے محکم نظام کے تابع کارفرما ہے جس کے لئے غیر متبدّل قوانین مقرر ہیں۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنے اور پھر عمل پیرا ہونے سے کائناتی قوتیں مسخر ہو جاتی ہیں اور انسان ان کے مُضر اثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں کہا گیا ہے کہ جو تعلیم وحی نے عطا کی ہے، اس پر پوری قوت سے عمل پیرا ہو گے تو تم اس قسم کے خطرات سے محفوظ رہو گے۔ اس سے واضح ہے کہ جو کتاب حضرت موسیٰ کی طرف نازل ہوئی تھی، اس میں (قرآنِ کریم کی طرح) قوانینِ فطرت بھی تھے (اس کتاب کا آج پتہ نشان تک نہیں ملتا (ملاحظہ فرمائیے عنوان "تورات")۔

لیکن ہماری تفاسیر اور ان پر مبنی قرآن کے تراجم، جب تک حقیقت کو افسانہ نہ بنا دیں انہیں تسلی نہیں ہوتی۔ چنانچہ تفسیر ابنِ کثیر میں زیرِ نظر آیت کے سلسلہ میں لکھا ہے:

ہماری کُتبِ تفاسیر

مروی ہے (یعنی یہ تفسیر مفسّر کی اپنی نہیں، ایک روایت پر مبنی ہے) کہ جب کلیم اللہ (علیہ صلوٰت اللہ) نے ان سے فرمایا کہ لو! اللہ کی کتاب کے احکام قبول کرو تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں سناؤ اس میں کیا احکام ہیں۔ اگر آسان ہوئے تو ہم قبول کرلیں گے، ورنہ نہ مانیں گے۔ حضرت موسیٰ کے بار بار کے اصرار پر بھی یہ لوگ یہی کہتے رہے۔ آخر اسی وقت خدا کے حکم سے پہاڑ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُن کے سر پر معلق کھڑا ہو گیا اور خدا کے پیغمبر نے فرمایا، لو! اب بھی مانتے ہو یا خدا تعالیٰ تم پر پہاڑ گرا کر تمہیں فنا کر دے؟ اس وقت یہ سب کے سب مارے

ڈر کے سجدے میں گر پڑے۔

(تفسیر ابنِ کثیر، اُردو ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی مرحوم، نواں پارہ صفحہ ۲۲)



اس آیت کے ساتھ داستانِ بنی اسرائیل کا سلسلہ (سردست) اختتام پذیر ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد آغازِ سخن ایک ایسی آیت سے ہوتا ہے جس کے غلط مفہوم نے کئی ایک ایسے غلط عقائد، باطل تصورات اور گمراہ کن نظریات پیدا کردیئے ہیں جن سے اسلام (یعنی قرآن) کی بنیادی تعلیم تک اپنی جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتی ہے۔ وہ آیت اور اس کی متعلقہ آیات یوں ہیں؛

(۱۷۴-۱۷۲) وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۙ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝

قبل اس کے کہ ہم ان آیات کا صحیح مفہوم (مفہوم القرآن سے) درج کریں، مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کا مروّجہ ترجمہ پیش کردیا جائے جس پر وہ تمام غلط نظریات وغیرہ مبنی ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ مروّجہ تراجم میں، شیخ الہند مولانا محمود الحسن (دیوبندی) کا ترجمہ نہایت معتبر تصور کیا جاتا ہے۔ وہ ترجمہ یوں ہے؛

اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے اُن کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر ۔ کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ بولے ہاں ہم اقرار کرتے ہیں کبھی کہنے

لگو قیامت کے دن ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی یا کہنے لگو کہ شرک تو نکالا تھا ہمارے باپ دادوں نے ہم سے پہلے اور ہم ہوئے اُن کی اولاد اُن کے پیچھے۔ تو کیا تو ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا گمراہوں نے۔ اور یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں باتیں تاکہ وہ پھر آ ئیں۔

اس پر شاہ عبدالقادرؒ کا تشریحی حاشیہ یوں درج ہے :

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے انسانی اولاد اور اُن سے اُن کی اولاد نکالی سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا۔ پھر پشت میں داخل کیا۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ خدا کے اب مطلق ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت کرتا ہے..... اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا، پھر کیا حاصل ؛ تو یوں سمجھو کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے۔ سارا جہان قائل ہے۔ جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا ہے، سو اپنی عقلِ ناقص کے دخل سے۔ پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے۔

اس پر حسبِ ذیل عقائد و نظریات بطورِ مسلمات ہمارے ہاں مروج چلے آ رہے ہیں (اور مقامِ تأسف ہے کہ ان کی تائید و تصدیق میں احادیث درج کی جاتی ہیں جن کے متعلق بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضورؐ کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں اور وہ وضعی ہیں)۔ وہ عقاید یہ ہیں :

یومِ الست کا غلط عقیدہ

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی پیدائش سے پہلے اُن سے اپنی ہستی کا اقرار لے لیا تھا۔

(۲) خدا کی ہستی کا اقرار ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ انسان کی فطرت خود خدا کی فطرت ہے جس پر اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔

(۳) خیر و شر (غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز) کی تمیز بھی انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے۔ اسے ضمیر کی آواز کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

یہ نظریات قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہیں اور واقعات و مشاہدات بھی ان کی تائید نہیں کرتے مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۲۷ - ۳۲) میں بالتفصیل لکھا جا چکا ہے کہ انسان کی فطرت کا نظریہ غلط ہے۔ فطرت مجبور اشیاء کی ہوتی ہے (جسے جبلت بھی کہا جاتا ہے) صاحبِ اختیار و ارادہ انسان کی نہیں۔ انسان کو کچھ صلاحیتیں دی گئی ہیں اور اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ انہیں جس طرح جی چاہے استعمال کرے۔

جس طریق اور جن مقاصد کے حصول کے لئے وہ انہیں استعمال کرے گا' اس کے مطابق نتائج مرتب ہوں گے
اسی طرح یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ خیر و شر کی تمیز انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان'
جلد دوم (ص ۳۸) میں ملے گی۔ اسی بنیاد پر متفرع' ایک اور عقیدہ بھی ہے جسے ضمیر کی آواز Human
Conscience کہتے ہیں۔ یہ عقیدہ اتنا عام ہے کہ ہم اٹھتے بیٹھتے اس قسم کے الفاظ سنتے رہتے ہیں کہ
"انسان کو اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرنا چاہیئے۔"

فطرت، ضمیر وغیرہ کے باطل نظریات

اگرچہ، جو کچھ اوپر لکھا جا چکا ہے' اس کے پیش نظر' اس غلط نظریہ کے ابطال کے
لئے کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں' لیکن اس کی ہمہ گیریت کے احساس اور عمومی اہمیت کے زیر نظر اس
کی مزید وضاحت غیر محل نہیں سمجھی جائے گی۔ اس موضوع پر میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں سیر حاصل
گفتگو کی ہے۔ ذیل کی چند سطور اس سے مقتبس ہیں :-

"عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک قوتِ تمیز موجود ہے جو اسے بتا دیتی ہے
کہ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا۔ اس قوتِ تمیز کا نام "ضمیر" Conscience رکھا
گیا ہے۔ اس کو انسان کے اندر کی آواز یا دل کا فتوےٰ کہا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ
کیا فی الواقع انسان کے اندر کوئی قوتِ تمیز ہے جو اُسے جائز اور ناجائز کا فرق بتا دے؟
یہ بات بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو حق اور باطل'
خیر اور شر' جائز اور ناجائز میں تمیز کر سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے اندر سے ایک
آواز ضرور اٹھتی ہے جو اسے بعض کاموں سے روکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ آواز
حق اور باطل کی تمیز بھی کرتی ہے؟ مشاہدہ اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ
حق اور صداقت' مطلق اقدار Absolute values کا نام ہے' اضافی اقدار
کا نام نہیں' یعنی حق کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک انسان
کے لئے حق ہو اور دوسرے کے لئے حق نہ ہو۔ اگر انسان کے اندر کوئی ایسی قوت ہے جو
حق و باطل میں تمیز کر سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کے اندر سے یکساں اٹھنی چاہیئے۔ لیکن
ایسا نہیں ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گوشت کھانے والے خاندان کے بچے کے سامنے جب گوشت

آتا ہے تو اس کی ضمیر اسے بالکل نہیں ٹوکتی. لیکن ایک سبزی خور گھرانے کے بچے کے سامنے گوشت کا نام آجانے سے اُس کی طبیعت اِبا کرنے لگتی ہے. جرائم پیشہ قبائل (مثلاً ٹھگوں) کے بچے بلا تکلف انسان کی جان لے لیتے ہیں اور اس میں خوشی محسوس کرتے ہیں. لیکن جینیوں کا بچہ کیڑوں مکوڑوں کو بھی ایذا نہیں پہنچاتا. اس میں شبہ نہیں کہ نفسِ لوّامہ برائی سے روکتا ہے.

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝(۷۵/۲)

اور نہیں، میں انسان کے احساسِ ندامت کو شہادت میں پیش کرتا ہوں.

لیکن وہ صرف اس برائی سے روکتا ہے جسے وہ برائی سمجھتا ہے. اس نفس میں لوّامیت کا جوہر تو ہے، لیکن وہ اس چیز کے خلاف ملامت کرتا ہے جسے اُس نے (مختلف اثرات کے ماتحت) قابلِ ملامت سمجھ رکھا ہے. لہٰذا جس چیز کو "ضمیر کی آواز" کہا جاتا ہے، وہ حق و باطل کی تمیز کا معیار نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ "آواز" خارجی اثرات سے متاثر ہوتی ہے."

Samuel اِس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

اگر یہ صحیح ہوتا کہ انسان کے اندر ایک ایسی فطری جبلّت ہے جو [illegible] اثرات سے آزاد ہے اور حق و باطل کے فیصلہ میں کبھی غلطی نہیں کرتی تو نیک عملی کے ہر معاملہ میں تمام انسان ہمیشہ متفق ہوا کرتے اور آج بھی متفق نظر آتے. لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ہم آہنگی نہ کبھی پہلے ہوئی ہے اور نہ آج ہے. اس سے ظاہر ہے کہ کسی آدمی کا یہ کہنا کہ "میں نے فلاں بات کو نہایت دیانت داری سے حق سمجھ کر اختیار کیا ہے" اس بات کو فی الحقیقت حق نہیں بنا سکتا.　　(ابلیس و آدم صفحہ ۲۲۷ تا ۲۲۸)

لہٰذا جس چیز کا نام ضمیر رکھا ہے وہ ان اثرات سے مرتب ہوتی ہے جو انسان غیر شعوری طور پر وراثت، ماحول، تربیت اور تعلیم سے اخذ کرتا ہے. اس کے سوا اس کا اپنا وجود کچھ نہیں ہوتا. اقبالؒ کے الفاظ میں ضمیر Internalized Society کا نام ہے. لہٰذا ضمیر میں یہ صلاحیت کہاں ہوسکتی ہے کہ وہ حق اور باطل، خیر اور شر، غلط اور صحیح کا امتیاز کر کے بتا دے.

اقرارِ الوہیت انسان کے اندر نہیں

یہ عقیدہ کہ خدا نے اپنی ہستی کا اقرار ہر انسان کی رُوح سے (اُس کی پیدائش سے بھی پہلے) لے لیا تھا لہٰذا اس کی ہستی کا تصور ہر انسان کے اندر خود موجود ہے، بالبداہت غلط ہے. لاکھوں کروڑوں انسان ہیں جو خدا کے وجود کے منکر ہیں. وہ خود بھی منکر ہیں اور اُن کے بچے بھی اسی انکار کو لئے ہوئے بڑے ہوتے ہیں. اگر یہ کہا جائے کہ ان کے اندر تو وجودِ باری تعالیٰ کا تصور موجود ہوتا ہے لیکن ان کی "ناقص عقل" اسے محو کر دیتی ہے، تو (اس پر یہ اعتراض وارد ہوگا) جس عقیدہ کو انسان کی ناقص عقل محو کر دے، اسے روزِ ازل سے اس کے اندر رکھنے سے حاصل کیا ہوا؟

اس عقیدہ پر دوسرا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر وجودِ باری تعالیٰ کا تصور روزِ ازل سے تمام انسانوں کے اندر رکھ دیا گیا تھا، تو یہ تصور تمام خدا پرستوں کے ہاں یکساں ہونا چاہیئے تھا، لیکن واقعات اور مشاہدات اس کی تردید کرتے ہیں. مختلف افراد ہی میں نہیں مختلف مذاہب میں بھی خدا کا تصور ایک دوسرے سے مختلف ہے. خدا کے تصور کا ہی اختلاف ہے جس کی وجہ سے قرآن اور تو اور اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ تک) سے بھی خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے، یعنی اُس خدا پر جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے.

خُدا کا تصوّر

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (مختصر الفاظ میں) "خدا کے تصور" کے متعلق مختلف نظریات پیش کر دیئے جائیں. اسے ہم اپنی کتاب "من و یزداں" سے ملخصاً درج کرتے ہیں:-

آپ تاریخِ انسانی کے کسی دَور سے گزریئے اور رُوئے زمین کے کسی خطہ پر نظر ڈالئے، ایک چیز آپ کو بلا لحاظِ زمان و مکاں بالعموم تمام نوعِ انسانی میں مشترک نظر آئے گی، یعنی کسی بلند و بالا ہستی کا تصور، کسی فوق البشر قوت کا احساس، جس کے سامنے جھکا جائے، جس کی پرستش کی جائے، جس سے مرادیں مانگی جائیں، جس سے ڈرا جائے، جس کے حضور نذرانے پیش کئے جائیں، جس کے چرنوں میں شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھائے جائیں. دنیا کے سیّاح، مغربی محققین اور مکتشفین، اگر کسی ایسے علاقے میں بھی پہنچے ہیں، جہاں اس سے قبل کسی باہر کے انسان کے نقوشِ قدم دکھائی نہیں دیئے اور وہاں کے باشندے (تہذیب و تمدن سے قطعاً نا آشنا) یکسر حیوانی سطح کی وحشت و درندگی کی زندگی بسر کر رہے تھے تو (اگرچہ وہ اپنی طرزِ بود و ماند اور معاشرت کے ہر گوشے میں باہر کی دنیا سے مختلف تھے، بایں ہمہ) ان کے ہاں بھی کسی غیر مرئی،

بلند و بالا قوت کا تصور پایا گیا جس کی وہ پرستش کرتے تھے. مشہور یونانی مؤرخ، پلوتارک Plutarih AD 102-42 اس باب میں لکھتا ہے:

زمین پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھو گے جن کی دیواریں نہیں ہیں. ایسے بھی جن میں سائنس کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی. ایسے بھی جہاں حکمران کوئی نہیں. ایسے بھی جہاں محلات ہیں، نہ ورزش گاہیں، نہ تھیئٹر. لیکن تم کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے جہاں دیوتاؤں کے مندر نہ ہوں، جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہوں، جہاں منتیں نہ مانی جاتی ہوں. ایسا شہر نہ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئے گا.

تصوّر میں اختلاف

اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس قسم کی قوت کا احساس ہر جگہ موجود ہے، اس کا تصور اور اس کی تفاصیل ہر مقام پر مختلف ہیں. ایک ہی ملک میں، ایک قبیلے کا "معبود" دوسرے قبیلے کے معبود سے نہیں ملتا. ایک ملک کا "خدا" دوسرے ملک کے "خدا" سے مختلف ہے. ایک قوم کا "دیوتا" دوسری قوم کے "دیوتا" سے جدا گانہ ہے. ایک فرقے کا "ایشور" دوسرے فرقے کے "ایشور" سے متبائن ہے. کچھ عرصہ پیشتر تک، مغربی محققین کے ایک گروہ کا خیال تھا (اور ممکن ہے اب بھی اس خیال کے مؤید وہاں موجود ہوں) کہ ابتدائی دَور کے انسان نے جب دیکھا کہ بعض حوادث ایسے آتے ہیں (مثلاً موسمی تغیرات، طوفانِ باد و باراں یا وبائی امراض وغیرہ) جن کے علل و اسباب اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور اس کے ذہن کی ان تک رسائی نہیں ہو سکتی تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو، ان حوادث کے پیچھے کوئی بہت بڑی قوتیں ہیں جو اسے نظر نہیں آتیں. اس طرح انسان کے ذہن میں "خدا" کا تصور پیدا ہوا. یہ تصور مختلف ممالک کے احوال و ظروف اور مختلف قبائل کے ماحول و کوائف کے تحت مختلف تھا. اس کے بعد جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا اور انسان ترقی کرتا گیا، اس تصور میں بھی جلا پیدا ہوتا گیا. اس طرح بتدریج "خدا" کا وہ تصور وجود میں آگیا جو دنیا کے بلند مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے. اس نظریہ کو "خدا کے تصور کا ارتقاء" کہا جاتا ہے جس کی تفصیل گرانٹ ایلن GRANT ALLEN کی کتاب The Evolution of the Idea of God یا فریزر Frazer کی Golden Bough وغیرہ کتابوں میں ملے گی. لیکن بعد کے محققین نے اس نظریہ کی تردید کر دی اور کہا کہ خدا کا صحیح تصور شروع سے ایک ہی رہا ہے. اس میں تدریج و

اِس کی تردید ارتقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ عصرِ حاضر کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر آرنلڈ ٹوئن بی Dr. Arnold Toynbee اپنی کتاب An Historien's approach to Religion میں لکھتا ہے کہ

> پروفیسر شمٹ کی تحقیق یہ ہے کہ خدا کی پرستش کا جو تصور بلند مذاہب نے پیش کیا ہے، یہ کوئی نیا تصور نہیں جسے انہوں نے ایجاد کیا ہو۔ نوعِ انسانی کا قدیم ترین مذہب یہی تھا جس کا احیاء بلند مذاہب نے کیا ہے۔ (صفحہ ۱۸)

پروفیسر شمٹ Schmidt کی جس کتاب The Origin and Growth of Religion سے ڈاکٹر آرنلڈ نے مذکورہ بالا نتیجہ پیش کیا ہے، وہ اس موضوع پر دورِ حاضر کی بہترین کتاب تصور کی جاتی ہے۔ اس میں اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ "انسان کے ابتدائی تمدن میں جس بلند ہستی کا تصور پایا جاتا ہے، وہ وہی تصور تھا جو توحید کے علمبردار مذاہب کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ نسلِ انسانی کے قدیم ترین قبائل میں سے اکثر کی نسبت یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ خدا کے متعلق اُن کا یہی تصور تھا۔ لہٰذا 'ارتقائی مذہب' کا نظریہ اب عمرانیات کے پورے میدان میں یکسر دیوالیہ ثابت ہو چکا ہے۔"

چونکہ ہماری کتاب کا موضوع خدا کے تصور یا عقیدہ کا تاریخی استقصا نہیں، اس لئے ہم اس نکتہ کی مزید وضاحت ضروری نہیں سمجھتے۔ ہمارے مقصد پیشِ نظر کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ قرآنِ کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ جب سے انسان میں تمدنی شعور بیدار ہوا، خدا کی طرف سے، بوساطتِ انبیائے کرامؑ وحی کی راہنمائی آتی شروع ہو گئی۔ اس تعلیم کا نقطۂ ماسکہ خدا کے متعلق صحیح تصور تھا۔

خدا کا صحیح تصور اور ظاہر ہے کہ جب اس علم (وحی) کا سرچشمہ ایک ہی (خدا) تھا تو یہ تصور بھی شروع سے اخیر تک ایک ہی ہوگا (اور ایک ہی تھا)۔ لیکن ہوتا یہ رہا کہ ایک رسول آتا اور خدا کے اس بلند و بالا تصور کو نہایت وضاحت سے پیش کر دیتا۔ کچھ عرصہ کے بعد، یہ حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی اور محسوسات کا خوگر انسان، الوہیت کے اس صاف اور شفاف تصور میں اپنی ذہنی رنگ آمیزی کرنے لگ جاتا۔ کبھی وہ ان چیزوں کو اپنا معبود بنا لیتا جن سے وہ ڈرتا اور خوف کھاتا، کبھی ان کو جن سے وہ اپنی کچھ توقعات وابستہ کرتا۔ کبھی ان ذہنی اور خیالی معبودوں کی عظمت و تقدیس کے پیشِ نظر ان کے مجسمے کھڑا کرتا، بُت تراشتا۔ چنانچہ یہ مختلف دیوی دیوتا ــــ اِندر ــــ اگنی ــــ سورج ــــ چاند ــــ گنگا ــــ جمنا ــــ

سانپ، گائے، بیل، سب اس جذبۂ خوف و امید (یعنی دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت) کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں۔

جب ذہنِ انسانی پر اس طرح توہم پرستی کی تاریکیاں چھا جاتیں، تو پھر ایک اور رسول آ جاتا جو خدا کے پاکیزہ تصور کو وحی کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیتا اور انہیں واضح الفاظ میں بتا دیتا کہ انسان اشیائے کائنات کا مسجود ہے، ساجد نہیں۔ اس میں ایسی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں جن کی رُو سے یہ اشیائے فطرت کو مسخر کر سکتا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔ سمندروں کی شورانگیزیاں، پہاڑوں کی گراں سامانیاں، تحت الثریٰ کی آتش نشانیاں، اوجِ ثریا کی طلعت آفرینیاں اور نور پاشیاں، دریاؤں کی (گاہ) وحشت خیز تلاطم خیزیاں اور (گاہ) سکوں افزا روانیاں، ہواؤں کی تند و تیز جولانیاں، خوفناک صحراؤں کی دہشت انگیزیاں اور حیرت افزائیاں، غرضیکہ یہ جملہ کائنات اور اس کے مختلف اور متنوع مظاہر سب انسان کے سامنے ہاتھ باندھے خدمت کے لئے کھڑے ہیں۔ لہٰذا ان چیزوں کے سامنے جھکنا اور انہیں اپنا آقا اور حاکم تصور کرنا چہ معنے؟

وحی کا یہ سلسلہ اس نہج و انداز سے جاری رہا، تا آنکہ جب ذہنِ انسانی سنِ شعور کے قریب پہنچ گیا تو خدا کا پاکیزہ اور منزہ، صاف اور شفاف، بلند و بالا تصور، ایک مکمل صورت میں، قرآن کے اندر دے دیا گیا اور اس صحیفۂ آسمانی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ چنانچہ اب خدا کا صحیح تصور (جسے خود خدا نے بیان کیا ہو) اپنی حقیقی اور اصلی شکل میں (جس میں ذہنِ انسانی کی رنگ آمیزی کا شائبہ تک نہ ہو) قرآن کی دفتین کے اندر ہے، اس سے باہر اور کہیں نہیں۔ اس لئے کہ آج دنیا کا کوئی مذہب بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ جس کتاب کو آسمانی کتاب کہتے ہیں، وہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو اُن کے پیغمبر کو خدا کی طرف سے ملی تھی (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" میں ملے گی)۔ لہٰذا جو شخص چاہتا ہے کہ اسے خدا کے متعلق وہ تصور مل جائے جسے خود خدا نے بیان کیا ہے، تو اس کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اِن تمہیدی تصریحات کے بعد آیۂ زیرِ نظر (۷/۱۷۱) کی طرف آیئے۔ اس کے صحیح قرآنی مفہوم کے سمجھنے میں چنداں دشواری نہ ہوتی، لیکن تصوف اور اس کی دمساز عجمی شاعری نے "یوم الست"، "عہدِ الست"، "درمستِ الست" کی اصطلاحات سے فضا کو اس قدر متاثر کر رکھا ہے کہ حقیقت ان رنگین اور دبیز پردوں کے پیچھے چھپ کر رہ گئی ہے۔ یہ آیت مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحات ۲۹۸-۲۹۲) پر بھی آ چکی ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ نوعِ انسان کو ہلاک کرنے والی قوتیں شروع ہی سے اس کے خلاف نبرد آزما چلی آ رہی ہیں۔ ان

میں خارجی حوادث بھی شامل ہیں اور خود انسانوں کے ہاتھوں، دوسرے انسانوں کو ہلاک کرنے کے سامان و اسباب بھی۔ اُس مقام پر کہا گیا تھا:

اسبابِ ہلاکت

"زندگی کو ہلاک کرنے والے یہ خطرات" دو قسم کے ہیں۔ ایک، کائنات کے طبیعی (ارضی اور سماوی) حوادث۔ جہاں تک ان حوادث کا تعلق ہے، ذرا اس منظر کو سامنے لائیے کہ جب انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اس نے اپنے آپ کو کس دنیا میں پایا؟ سر پر مسلسل آگ برسانے والا مہیب آتشیں گولہ — یعنی آفتاب — چاروں طرف بڑے بڑے خوفناک پہاڑ، اِدھر اُدھر ساحل ناآشنا سمندر اور ان کی تباہ کن تلاطم خیزیاں، یہاں وہاں کف بردہاں دریاؤں کی وحشت سامانیاں، تاحدِ نگاہ ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدھے، کبھی بادل کی لرزہ خیز گرج، کبھی بجلی کی جگر پاش کڑک، کبھی ہلاکت انگیز آندھی، کبھی بلاخیز جھکڑ، کہیں آتش فشاں پہاڑوں کی مرگِ سیّال، کہیں زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم۔ شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا اژدہام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یار و مددگار اور بے سروسامان ابنِ آدم! اس ماحول سے اُس نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ لیکن لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کا اعجاز دیکھئے کہ ان تمام ہلاکت سامانیوں کے باوجود نوعِ انسان کا یہ کارواں بلاانقطاع آگے بڑھتا چلا آیا۔ اس مقام پر سورۃ الاعراف کی ایک نہایت حقیقت کشا آیت بے ساختہ سامنے آجاتی ہے، وہ آیت جس کے عام مروّجہ مفہوم نے اُسے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ آپ نے خانقاہیت کے ازرکدوں میں بالخصوص "یومِ الست"، "مستِ الست" یا "قَالُوْا بَلٰی" وغیرہ طلسماتی الفاظ سنے ہوں گے اور پھر ان کی

یومِ الست

بنیادوں پر اٹھائے گئے وہ افسانے جنہیں (اقبالؒ کے الفاظ میں) اندیشۂ عجم نے زیبِ داستان کے لئے تراش رکھا ہے۔ وہ آیت ہے:

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۙ (۷/۱۷۲)

قرآنِ کریم نے بنی آدم سے کہا یہ ہے کہ تم بتاؤ کہ ان تمام ہلاکت سامانیوں کے باوجود جن کا ذکر اوپر کیا

---

[1] ہم اس تکرار کے لئے معذرت خواہ ہیں لیکن آیت کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لئے یہ ناگزیر تھا۔

نسلِ انسانی کا تسلسل

گیا ہے' اوران خارجی حوادث کے علاوہ' خود انسانوں کے اپنے ہاتھوں کی پیدا کردہ تباہیوں کے علی الرغم' نسلِ انسانی کا اس تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتے چلے آنا' خدا کی ربوبیت کی زندہ شہادت ہے یا نہیں ؟ نسلِ انسانی کا وجود' ربوبیتِ خداوندی کی کس طرح منہ بولتی تصویر اور اعلانیہ شہادت ہے' اس کے متعلق کسی سائنسدان سے پوچھئے' وہ بتائے گا کہ قرآنِ کریم اس ایک آیت میں کیسی عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔

جہاں تک حوادثِ ارضی و سماوی کا تعلق ہے' ان سے نمٹ لینا بھی آسان تھا کیونکہ خالقِ کائنات نے انسانوں سے کہہ دیا تھا کہ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۴۵/۱۳) " کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اُسے خدا نے اپنے قوانینِ فطرت کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے تاکہ تم ان پر غلبہ پا کر انہیں منفعت بخش کاموں میں صرف میں لاؤ. جو قوم بھی غور و فکر سے کام لے گی' وہ نہ صرف یہ کہ ان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہے گی' بلکہ ان سے بڑے بڑے کام لے سکے گی." یہ وہ " ملائکہ " تھے جو " آدم " کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے' اس لئے اُن کی طرف سے بنی آدم کو کوئی خطرہ نہیں تھا. خطرہ اُس " ابلیس " سے تھا جس نے اُس سے بغاوت اور سرکشی اختیار کی ـــــــ یہ ابلیس ہے' انسان کے وہ جذبات جو وحی کی قیود سے بیباک ہو جائیں. انہی جذبات کا نتیجہ انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے وہ باطل نظام ہیں جن میں بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) کا منظر سامنے آتا ہے' یعنی جن میں انسان خود نوعِ انسان کا شکار ہو جاتا ہے."

(مطالب الفرقان' جلد اوّل' صفحہ ۲۹۴ - ۲۹۳)

داستانِ بنی اسرائیل میں آپ دیکھئے. فرعون کے عہدِ غلامی میں وہ ایسے مظالم کے شکار رہے جن میں زندہ اور سلامت رہنا معجزہ سے کم نہیں تھا. سینا کی ابتدائی زندگی میں طبیعی حوادث بھی کچھ کم ہلاکت انگیز نہ تھے. بایں ہمہ' وہ قوم نہ صرف زندہ رہی' بلکہ پھولتی پھلتی آگے بڑھتی چلی گئی. اس تسلسل میں آیات (۱۷۲-۱۷۴) ہمارے سامنے آتی ہیں جنہیں پہلے درج کیا جا چکا ہے. اب ان کا مفہوم پیشِ خدمت ہے. فرمایا:

(اے قومِ مخاطب! تم نے بنی اسرائیل کی داستان سے دیکھا کہ قومیں کن خطرناک مراحل سے گزر کر' اور کیسے کیسے مہیب موانع کو راستے سے ہٹا کر آگے بڑھتی ہیں! یہ بات کسی خاص قوم تک محدود نہیں. خود نوعِ انسان کا مسلسل آگے بڑھتے چلے آنا' خدا کے نظامِ ربوبیت

کی زندہ شہادت ہے)، تم ذرا اس پر غور کرو کہ اس قدر ناساعد حالات کے باوجود بنی آدم کی نسل کا سلسلہ پُشت ہا پُشت سے جاری ہے اور اس میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کا وجود اس حقیقت کی شہادت ہے کہ کائنات میں خدا کا قانونِ نشوونما کارفرما ہے۔ ہر نیا پیدا ہونے والا بچہ اس حقیقتِ حال کی ناطق شہادت ہوتا ہے۔ ہم یہ دلائل و شواہد اس لئے تمہارے سامنے لا رہے ہیں کہ جب تمہارے تخریبی اعمال کے نتائج متشکل ہو کر تمہارے سامنے کھڑے ہوں، تو تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ مشیت کا پروگرام تعمیری کام چاہتا ہے یا تخریبی۔ (۱۷۲)

یا یہ کہہ دو کہ ہمارے اسلاف یہ مانتے چلے آ رہے تھے کہ کائنات میں اکیلے خدا کا قانونِ ربوبیت کارفرما نہیں، اور قوانین بھی ہیں۔ ہمارے اسلاف کا یہ عقیدہ تھا اور ہم بعد میں آنے والے اُنہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ تو کیا ہمیں اُن لوگوں کے جرم کی پاداش میں ہلاک کیا جا رہا ہے جو اس قسم کے باطل عقائد رکھتے تھے؟ (۱۷۳)

ہم اس طرح اپنے احکام و قوانین نکھار کر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ، غلط راستوں کو چھوڑ کر، صحیح راہ کی طرف رجوع کریں۔ (۱۷۴)

کاروانِ نوعِ انسانی کے راستوں میں اس قسم کے تزاحمات و تصادمات کا ذکر کرنے کے بعد، بتایا کہ قوموں کے عروج و زوال کی یہ کیفیت نہیں کہ جو قوم ایک دفعہ قعرِ مذلت میں گر گئی، وہ وہاں سے اٹھ ہی نہیں سکتی۔ اگر اس میں زندہ رہنے کی رمق بھی باقی ہے تو قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ان لوگوں میں اتنی توانائی آ سکتی ہے کہ وہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لیں۔ اسی طرح جو قوم ایک دفعہ بامِ عروج پر پہنچ جائے ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے بعد وہ جو جی میں آئے کرتی رہے، وہ زوال پذیر نہیں ہو سکتی۔ عروج حاصل ہو جانے کے بعد اسے مستحکم رکھنے کے لئے قوانینِ خداوندی کا مسلسل اور متواتر اتباع ضروری ہے۔ اگر وہاں پہنچ کر اس راستے کو چھوڑ دیا، تو وہ قوم ایسی پستیوں میں گر جاتی ہے جہاں سے اُبھرنا بڑا ہمت طلب ہوتا ہے۔ اس بنیادی حقیقت کو ایک مثال کی رُو سے سمجھایا گیا۔ فرمایا۔

(۷/۱۷۵) وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا

فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○

تارکِ حق وصداقت قوم

(لیکن حق کی راہ اختیار کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ایک دفعہ کسی قوم نے یہ روش اختیار کرلی تو اس کے بعد آنے والی نسلیں جو جی میں آئے کریں، وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہرحال بہرہ یاب ہوتی رہیں گی ـــ قطعاً نہیں ـــ ہم اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعہ بیان کرتے ہیں)

اے رسولؐ! تم اسے اپنی جماعت (مؤمنین) کے سامنے پیش کرو اور ان سے کہو کہ اسے دل کے کانوں سے سُن لیں

ایک شخص کو خدا نے اپنے احکام و قوانین دیئے (وہ ان پر کاربند ہوا تو اسے خوشحالی اور عروج حاصل ہوگیا)۔ اس کے بعد وہ انہیں چھوڑ کر ان میں سے اس طرح صاف نکل گیا جس طرح سانپ اپنی کینچلی میں سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ جب اس نے ان قوانین کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو حیوانی سطحِ زندگی کے جذبات اس پر بُری طرح غالب آگئے اور وہ (حق کا راستہ چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلا)۔

(۷/۱۷۶) وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○

اگر وہ ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق چلتا رہتا (جو اسے دیا گیا تھا) تو ہم اسے (آسمان کی) بلندیوں تک لے جاتے۔ لیکن اس نے ہمارے قوانین کی بجائے اپنے جذبات ہی کی پیروی شروع کردی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ (آسمان کی بلندیوں کے بجائے) زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک گیا (اس کی زندگی کا سارا مقصد دنیاوی مفاد کا حصول رہ گیا۔ اب اُس

کی مثال کتے کی سی ہوگئی کہ اسے دوڑاؤ اور گھساؤ، تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور اگر ویسے چھوڑ دو، تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے (یعنی پھر بھی انسان کی ہوس کی تسکین ہی نہیں ہوتی خواہ وہ کسی حالت میں بھی کیوں نہ ہو۔ اسے اطمینان کا سانس لینا نصیب نہیں ہوتا)۔
یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قانونِ ربوبیت کو جھٹلاتی ہے۔ سو اے رسولؐ! تم انہیں یہ باتیں سناؤ تاکہ یہ ان پر غور و فکر کریں۔

یہ آیات اپنے مفہوم میں اس قدر واضح ہیں کہ ان سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لئے گہرے غور و تدبر کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی کہ یہ خود ہماری (ملتِ اسلامیہ کی) عبرت انگیز داستان ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے ‌ ‌ ‌ مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار بادا ‌ ‌ ‌ کہ افتاد است از بامِ بلندے

(ارمغانِ حجاز، طبع دوم اگست ۱۹۴۴ء)

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے: فَاقۡصُصِ الۡقَصَصَ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ ۝ "ان کے سامنے یہ مثال پیش کرو تاکہ یہ سوچیں کہ ہمارے ساتھ کیا بیتی اور اس کا علاج کیا ہے"۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے تو "مذہب" کے معاملہ میں سوچنا حرام قرار دے رکھا ہے۔ اس لئے جب تک ہم اس (خود وضع کردہ) مذہب کے ساتھ چمٹے رہیں گے، ذلتوں کی ان پستیوں سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ اسی لئے خدا نے ہمارے متعلق کہہ دیا:

(۱۷۷-۱۷۸) سَآءَ مَثَلَا ۨالۡقَوۡمُ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَاَنۡفُسَهُمۡ كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ ۝ مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِىۡ‌ۚ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ۝

کس قدر بری حالت ہوتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کو جھٹلاتی ہے اور یوں اپنے آپ پر زیادتی کرتی ہے (۱۷۷)۔ اور اتنا نہیں سمجھتی کہ زندگی کے خوشگوار راستوں کی طرف راہنمائی صرف قوانینِ خداوندی کی رو سے مل سکتی ہے۔ جو قوم ان قوانین کو چھوڑنے اسے

صحیح راستہ کبھی نہیں مل سکتا اور وہ سخت نقصان اٹھاتی ہے۔
اور اس کے بعد واضح الفاظ میں بتا دیا کہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والی قوموں کی حالت کیا ہوتی ہے:

(۷/۱۷۹) وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○

اہلِ جہنّم کی علامات

(لیکن یہ باتیں تو عقل و فہم اور غور و تدبر سے سمجھ میں آ سکتی ہیں) اور انسانوں کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ ـــــ متمدن اقوام ہوں یا جاہل بادیہ نشیں، ان کی روشِ زندگی پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ وہ اہلِ جہنّم میں سے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام کبھی نہیں لیتے۔ اُن کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں، لیکن اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وہ کان بھی رکھتے ہیں لیکن اُن سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ انسان نہیں، بالکل حیوان ہوتے ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ، (اس لئے کہ حیوان کم از کم اپنے جبلّی تقاضوں کے مطابق تو چلتے ہیں اور اس قسم کے انسان، ان حدود سے بھی) بے خبر رہتے ہیں۔

ہم میں سے کون ہے جو یہ جاننا نہیں چاہے گا کہ آخرت میں اُس کا انجام کیا ہوگا؟ وہ اہلِ جنّت میں سے ہوگا یا عذابِ جہنّم میں مبتلا۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں مختلف مقامات پر بڑی تفصیل سے بتایا ہے لیکن یہاں اُن لوگوں کی، جن کا مآل جہنّم ہوگا، ایک ایسی متعیّن علامت بتائی ہے جس سے اس امر کا فیصلہ کرنے میں کچھ بھی دشواری پیش نہیں آ سکتی کہ ہمارا (افراد یا اقوام کا) انجام کیا ہوگا؟ وہ اٹل قانون یہ ہے کہ جو لوگ

عقل و فکر کی اہمیّت

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان کی زندگی جہنّم کی ہے ـــــ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ سورۃ الملک میں ہے کہ جب ان لوگوں کو، جو عذابِ جہنّم کے مستحق قرار پائیں گے، جہنّم میں داخل

کرنے کے لئے لایا جائے گا تو جہنم کا داروغہ ان سے پوچھے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی شخص نہیں آیا تھا جس نے تمہیں بتایا ہو کہ اگر تم فلاں قسم کی زندگی بسر کرو گے تو اس کا مآل جہنم ہوگا؟ (۶۷/۸). وہ جواب میں کہیں گے کہ ہاں! اس طرح آگاہ کرنے والا آیا تو تھا، لیکن ہم نے اُس کی بات کو اس قابل ہی نہیں سمجھا تھا کہ اسے بگوشِ ہوش سنتے: وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (۶۷/۱۰)

اگر ہم اُس کی بات کو دل کے کانوں سے سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو آج اہلِ جہنم میں سے کیوں ہوتے؟ ـــــ بات واضح ہے کہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کا مآل جہنم ہے۔

علم کسے کہتے ہیں

قرآن کریم نے علم کی تعریف Definition ان الفاظ میں کی ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــُٔـوْلًا ۝ (۱۷/۳۶)

اور یاد رکھو! جس بات کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو (اور جس کی خود تحقیق نہ کرلو) اسکے پیچھے مت لگو۔ (ذاتی تحقیق کے معنی یہ ہیں کہ) تم اپنی سماعت و بصارت (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل کرو اور پھر، اِن معلومات کی بنا پر، اپنے ذہن سے فیصلہ کرو اور اس طرح صحیح نتیجہ پر پہنچو۔ ان میں سے اگر ایک کڑی بھی گم ہوگئی تو تمہاری تحقیق ناقص رہ جائے گی۔ سوچو کہ اس باب میں تم پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے (اس لئے کہ خدا نے تمہیں صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے، مجبور مشین نہیں بنایا اور اس اختیار کے استعمال کے لئے ذرائع علم و تحقیق عطا کر دیئے ہیں۔ ان سے کام نہ لینے والا اپنی ذمہ داری سے جی چراتا ہے)۔

یعنی انسان کے حواس (Senses جنہیں قرآن نے مخففاً "سمع و بصر" سے تعبیر کیا ہے) معلومات فراہم کرکے دل (یا دماغ) تک پہنچاتے ہیں جو ان کی روشنی میں کسی فیصلہ پر پہنچتا ہے۔ اسے علم کہا جاتا ہے۔ (ہم نے اس فیصلہ کرنے والی قوت کو دل یا دماغ کہہ کر پکارا ہے کیونکہ اربابِ علم و تحقیق ہنوز کسی یقینی نتیجہ تک نہیں پہنچے کہ انسان کے اندر فیصلہ کرنے والی قوت کونسی ہے۔ ہمارے ہاں عرفِ عامہ میں اسے دل یا دماغ کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے بالعموم قلب اور بعض مقامات پر فُؤَاد کا لفظ استعمال کیا ہے ـــ بہرحال یہ قوت جو بھی ہو[1] قرآن کی رُو سے، خارجی کائنات کے متعلق معلومات سے انسان جس نتیجہ پر پہنچے اسے

[1] یہ بڑا اہم سوال ہے کہ انسان کے اندر فیصلہ کرنے والی قوت کونسی ہے۔ اہم اس لئے کہ انسانی اعمال کی ذمہ داری اسی پر

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

علم کہا جائے گا[1] محض نظریات، یا قیاسات کے ماحصل کو علم نہیں کہا جائے گا۔ بنا بریں، قرآن کریم نے کہا ہے کہ جو لوگ اس قسم کا علم حاصل کر کے عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان کا شمار اہل جہنم میں ہوگا۔

زیرِ نظر آیت (۷/۱۷۹) کے الفاظ پر ایک بار پھر نظر ڈالئے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ آنکھیں رکھتے ہیں، لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اور جب وہ سماعت و بصارت (حواس) کی رُو سے معلومات ہی حاصل نہیں کرتے تو ان کا قلب سمجھنے سوچنے کا کام کیا کرے گا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوگا کہ دنیا میں ہر شخص جو آنکھیں رکھتا ہے، ان سے دیکھتا ہے۔ جو کان رکھتا ہے، ان سے سنتا ہے۔ پھر قرآن کریم نے یہ کیسے کہا ہے کہ وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ قرآن کریم نے دیکھنے اور دیکھنے، سننے اور سننے میں فرق کیا ہے۔ (اور یہ عربی زبان کی وسعت اور گہرائی ہے کہ اس میں اس امتیاز کے لئے الفاظ بھی الگ الگ ہیں)۔ اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر کہا:

نظر اور بصر کا فرق

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَ تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

(۷/۱۹۸)

لیکن ان کی اندھی عقیدت کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس قدر واضح دلائل کے باوجود) اگر تم انہیں راہِ راست کی طرف دعوت دو، تو یہ تمہاری کبھی نہیں سنیں گے۔ تُو دیکھے گا کہ وہ تیری طرف تک رہے ہیں، لیکن وہ درحقیقت دیکھ نہیں رہے ہوتے (ان کی آنکھیں بظاہر تمہاری طرف ہوتی ہیں لیکن دل کہیں اور ہوتا ہے ۴۳-۱۰/۴۲؛ ۴۷/۱۶)۔

یہاں کہا کہ تم انہیں مخاطب کر کے سیدھے راستے کی طرف بلاتے ہو، لیکن یہ تمہاری بات ہی نہیں سنتے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ اس دعوت پر توجہ نہیں دیتے۔ اسے دل کے کانوں سے نہیں سنتے۔ اس کے بعد کہا کہ یہ تمہاری مجلس میں بیٹھے تمہاری طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں، لیکن ان کا خیال کہیں اور ہوتا

گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ، جائز ہوگی۔ ہمارے نزدیک، یہ فیصلہ کرنے والی قوت انسانی ذات (نفس) میں ہو سکتی ہے۔

[1] یہاں بات خارجی کائنات کے متعلق علم کی ہو رہی ہے۔ وحی اس سے یکسر الگ ہے۔

ہے۔ اس لئے یہ تمہیں صرف تک رہے ہوتے ہیں، "دیکھ نہیں رہے ہوتے"۔ یہاں نظر اور بصر کے الفاظ نے دونوں مفاہیم میں فرق کر دیا۔

سورۃ یونس میں اس حقیقت کو اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جہاں کہا؛

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ (۱۰/۴۲-۴۳)

ان میں سے ایسے لوگ ہیں کہ تمہارے پاس آکر بیٹھتے ہیں تو اس طرح، گویا تمہاری باتیں بہت غور و خوض سے سن رہے ہیں، حالانکہ وہ محض سُن ہی رہے ہوتے ہیں (ان کا خیال کہیں اور ہوتا ہے (۴۷/۱۶)۔ تم سوچو کہ تم ایسے بہروں کو کس طرح سنا سکتے ہو جو عقل و فکر سے کام ہی نہ لیں؟ (۴۲)۔

اور وہ بھی ہیں جو تمہاری مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں اور تمہاری طرف تکتے رہتے ہیں گویا وہ ہمہ تن توجہ ہیں۔ لیکن وہ صرف تک رہے ہوتے ہیں، دھیان اُن کا بھی کہیں اور ہوتا ہے (۷/۱۹۸)۔ سوچو کہ تم ایسے اندھوں کو کس طرح راستہ دکھا سکتے ہو جو عقل و بصیرت سے کام نہ لیں؟ (۴۳)

اس سے واضح ہے کہ سُننا وہی سُننا ہے جس کے ساتھ عقل شامل ہو۔ دیکھنا وہی دیکھنا ہے جس میں توجہ مرکوز ہو۔ جس سمع و بصر کے ساتھ عقل اور توجہ شامل نہ ہو اس کے متعلق فرمایا؛

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰۤى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۫ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ اتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ ۝ (۴۷/۱۶)

ان مخالفین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو (تمہاری مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں اور ایسا نظر آتا ہے کہ یہ بڑے غور و خوض سے تمہاری باتیں سُن رہے ہیں (۷/۱۹۸؛ ۱۰/۴۲)۔ لیکن جب وہ مجلس سے باہر جاتے ہیں تو ان لوگوں سے جنہیں کتاب اللہ کی سمجھ بوجھ ہوتی ہے پوچھتے ہیں کہ اس (رسولؐ) نے ابھی ابھی کیا کہا تھا؟ (یہ اس لئے نہیں کہ قرآن کی زبان ان کی

سمجھ میں نہیں آتی. بلکہ اس لئے کہ یہ قرآن کا پیغام سُننا اور اس پر عمل کرنا چاہتے ہی نہیں). یہ محض اپنے مفاد اور خواہشات کا اتباع کرتے ہیں۔(اور جن لوگوں کی یہ حالت ہو ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ، ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہتی.

(۴/۱۵۵ ؛ ۱۰/۷۴ ؛ ۱۶/۱۰۶ـ۱۰۷ ؛ ۱۷/۴۵ ؛ ۴۷/۲۴ ؛ ۸۳/۱۴)

آیت کے آخری الفاظ نے واضح کر دیا کہ دلوں پر مُہر کس طرح لگتی ہے اور کن لوگوں کے دلوں پر لگتی ہے. (انڈکس میں خَتَمَ اللّٰهُ اور صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ کے عنوانات دیکھئے) اس سے (ضمناً) یہ بھی دیکھ لیجئے کہ یہ جو ہم قرآن کے الفاظ' مطلب سمجھے بغیر' دیکھ کر (ناظرہ) پڑھتے ہیں اور تراویح میں ان الفاظ کو (بلا مطلب سمجھے) سنتے رہتے ہیں، قرآن کی رُو سے اس طرح پڑھنے اور سننے کو کس زُمرہ میں شمار کیا جائے گا؟

اس سے بھی آگے بڑھئے اور اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے علم کی تعریف Definition ہی یہ کی ہے کہ حواس کے ذریعہ مظاہرِ فطرت سے معلومات حاصل کر کے کسی نتیجہ پر پہنچا جائے. علم کی اس قرآنی تعریف کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ہمارے ہاں جنہیں عالِم کہا جاتا ہے کیا اُن کا علم قرآن کے معیار کے مطابق' علم کہلا سکتا ہے؟ ان کا علم بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے اور فلاں مصنف نے یہ کہا ہے. اس موضوع پر ہم تفصیل سے پہلے لکھ چکے ہیں (دیکھئے مطالب الفرقان' جلد اوّل' صہ' ۶' جلد دوم' صہ ۸۶-۸۷ اور صہ ۳۶۹). اس کے علاوہ' انڈکس میں تقلیدِ کائنات' تسخیرِ فطرت' علومِ سائنس' علم وعقل کے عنوانات بھی دیکھئے. ان مقامات پر قرآنی شواہد منتشر طور پر ملیں گے. لیکن یہ موضوع اس قدر اہم اور بنیادی ہے کہ اس کے متعلق قرآنی تعلیم جامع طور پر یکجا سامنے آجائے تو مفید رہے گا.

مادّی اور روحانی دُنیا دنیا کے کسی مذہب کو لیجئے' اس نے انسانی زندگی' بلکہ جملہ تخلیقِ خداوندی کو دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یعنی مادّی Material اور روحانی Spiritual یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد اور معاند ہیں، ایسے معاند کہ' نہ صرف یہ کہ یہ یکجا اکٹھے نہیں ہو سکتے' اہلِ مذہب' مادیّت کو انتہائی قابلِ نفرت قرار دیتے ہیں اور مذہب

---

[1] واضح رہے کہ عقل وخرد سے بیگانگی جہنّم کے اسباب میں سے ایک سبب ہے. دیگر اسباب قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں درج ہیں. انڈکس میں جہنّم کا عنوان دیکھئے.

کا سخت دشمن۔ دوسری طرف اہلِ مادیت (جنہیں آجکل کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہہ لیجئے) مذہب کو جہالت اور توہم پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان دونوں میں جنگ، قدیم سے چلی آرہی ہے۔ عصرِ حاضر کی سیکولرازم مذہب کے خلاف اسی نفرت کا نتیجہ ہے۔ وہ مذہب کا نام تک لینا پسند نہیں کرتے۔

لیکن قرآنِ کریم کی منفرد خصوصیت کو دیکھئے کہ وہ (یوں کہئے کہ) مذہب کے اسٹیج پر کھڑا ہو کر مادی کائنات کے نظام کو اپنی صداقت کی تائید میں بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ قرآنی تعلیم کا بنیادی نکتہ قانون کی عملداری Rule of law ہے۔ اس کا منتہیٰ اور مقصود تو انسانی دنیا میں قانونِ خداوندی کی حاکمیت ہے لیکن چونکہ قانون کی حاکمیت، خارجی کائنات کے محسوس پیکروں میں نہایت آسانی سے سامنے آجاتی ہے، اس لئے وہ انہیں قرآنی دعاوی کی تائید میں بطور شواہد پیش کرتا ہے۔ (مثلاً سورۂ واقعہ میں ہے)۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ.....ۙ (۵۶/۷۵) "نہیں! بات یہ نہیں کہ میں اپنے دعاوی کے ثبوت میں نظری دلائل یا بسیط حقائق Abstract Realities پیش کر کے آگے بڑھ جاؤں گا۔ میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ نظری یا تجریدی دلائل عام فہم نہیں ہوتے۔ میں کائنات کے مرئی اور محسوس نظام

کائناتی شواہد

کی مثالوں سے واضح کروں گا کہ یہ تمام نظام کس طرح قوانین کے تابع مصروفِ گردش ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے ستاروں کی گزرگاہوں کو بطور شہادت پیش کرتا ہوں" وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۙ (۵۶/۷۶) "اور اگر تم علم و بصیرت کی بارگاہ سے دریافت کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ شہادت کس قدر محکم اور پائدار ہے"۔

ہم شہروں کے رہنے والے ستاروں کی گزرگاہوں کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے متعلق پوچھئے صحرانورد بدوؤں سے جن کی ساری زندگی سفر میں گزرتی تھی اور سفر بھی بیشتر رات کی تاریکی میں، اُس صحرا میں جہاں نہ کوئی نشانِ راہ ہوتا تھا نہ دلیلِ منزل۔ ان حالات میں ان کے سفر کی راہنمائی صرف ستاروں کی گزرگاہوں سے ہوتی تھی۔ وہ ان سے راستہ کا تعین کرتے تھے اور انہیں اس کا عملی یقین ہوتا تھا کہ وہ نہ راستہ بتانے میں کبھی غلطی کریں گے، نہ منزل کی طرف لے جانے میں فریب دیں گے۔ آج بھی ان گزرگاہوں کی اہمیت جہازرانوں اور علم الافلاک کے محققین سے دریافت کی جاسکتی ہے۔ ان گزرگاہوں کو بطورِ شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ (۵۶/۷۷)

جس طرح یہ ستارے تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچانے میں چراغِ راہ بنتے ہیں اور اس میں کبھی دھوکا نہیں دیتے اسی طرح یہ قرآن بھی انسانی زندگی کے سفر میں تمہاری راہنمائی کرے گا اور اس میں غلطی نہ کرے گا، نہ دھوکا دے گا۔

سورۂ تکویر میں اس اجمال کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جہاں کہا کہ فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ۙ﴿۱۵﴾ الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ ۙ﴿۱۶﴾ (۱۵-۱۶/۸۱) "یہی نہیں، بلکہ میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان سیاروں کو جو پچھلے پاؤں لوٹ جاتے ہیں اور انہیں بھی جو برق رفتار غزالہ کی طرح تیزی سے آگے بڑھ کر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں"۔ وَ الَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ﴿ۙ۱۷﴾ وَ الصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿ۙ۱۸﴾ (۱۷-۱۸/۸۱) "اور شہادت میں پیش کرتا ہوں لیلائے شب کو جب وہ دبے پاؤں آتی ہے اور اسی طرح خاموشی سے لوٹ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی عذرائے سحر کو جب وہ اپنی مسیحا نفسی سے ساری دنیا کو حیاتِ نَو کا پیغام دینے، مشرق کے جھروکے سے نمودار ہوتی ہے۔

میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان تمام کائناتی شواہد کو اس حقیقت کی تصدیق کے لئے کہ

اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ﴿ۙ۱۹﴾ (۸۱/۱۹)

"جس شخص کی زبان سے تم اس قرآن کو سن رہے ہو، وہ یہ کچھ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ وہ تو ہمارا قاصد ہے اور ہمارا پیغام تم تک پہنچا رہا ہے۔ وہ قاصد نہایت واجب التکریم ہے اور یہ پیغام بھی واجب التکریم (۵۶/۷۷) اور جس خدا نے اسے بھیجا ہے وہ بھی واجب التکریم (۸۲/۶)"۔

سورۃ الطارق میں ہے؛ وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ﴿ۙ۱۱﴾ (۸۶/۱۱) "یہ فضائے کرّے جو اس قدر عظیم الجثہ ہونے کے باوجود اس حُسن و خوبی سے اپنے اپنے مدار میں مصروفِ گردش ہیں" (۳۶/۴۰) اور اپنی گردش سے زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں، وہ بھی اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ اور یہ زمین بھی جو بیج کو پھاڑ کر اس میں سے ایک کونپل کی شکل میں ایک نئی زندگی کی نمود کرتی ہے (وَ الۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ (۸۶/۱۲)) یہ سب اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ـــ اِنَّہٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴿ۙ۱۳﴾ (۸۶/۱۳) "یہ قرآن ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل کو نکھار کر الگ الگ کر دیتا ہے"۔ وَّ مَا ہُوَ بِالۡہَزۡلِ ﴿ؕ۱۴﴾ (۸۶/۱۴) "یہ یونہی مذاق نہیں۔ تم کہتے ہو کہ یہ شاعری ہے جسے زمانے کی گردشیں خود بخود مٹا دیں گی"۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ

بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰) "یہ بھی تمہارا واہمہ ہے": فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۙ وَ مَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۙ (۳۹ - ۶۹/۳۸) "جو کچھ تمہیں دکھائی دیتا ہے، یعنی یہ عالم محسوس اور جو کچھ تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے"، وہ سب، اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ وَّ مَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ (۴۱ - ۶۹/۴۰) "یہ قرآن ایک واجب التکریم قاصد کی وساطت سے پہنچنے والا ابدی حقائق کا مجموعہ ہے۔ یہ شاعرانہ تخیلات کا نگاہ فریب مرقع نہیں جو مرور زمانہ سے حرف غلط کی طرح مٹ جایا کرتے ہیں۔"

قرآن کریم میں بکثرت مقامات ہیں جہاں نظام کائنات، اور اس کے عناصر کو قرآنی حقائق اور دعاوی کی تائید میں بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔ نظام کائنات کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے تمام رموز و اسرار بیک وقت سامنے نہیں آجاتے۔ جوں جوں علم انسانی ترقی کرے گا اور محققین کی کاوشیں ان پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھاتی جائیں گی، یعنی انہیں Discover بے نقاب کرتی جائیں گی، یہ ابھر کر سامنے آتے جائیں گے۔ اسی بنا پر قرآن نے کہا ہے کہ

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○ (۴۱/۵۳)

ہم عالم انفس و آفاق، یعنی انسان کی خود اپنی زندگی اور خارجی کائنات میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے اور ہر حقیقت جو اس طرح بے نقاب ہو گی اس امر کی شہادت پیش کرے گی کہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ قرآن اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ تمام مستور حقائق اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ وہ تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں، اس سے نہیں۔

اس آیۂ جلیلہ میں قرآن کریم نے عظیم حقائق کو پیش کیا ہے۔ اس نے ارباب علم و دانش کو تاکید کی ہے کہ وہ رموز فطرت دریافت کرنے میں مسلسل کوشش کرتے رہیں۔ اور دوسرے اس نے یہ کہا ہے کہ قرآن کریم کے احکام و اوامر تو ہر دور میں واضح طور پر سامنے رہیں گے، لیکن اس کے حقائق و معارف تمام کے تمام کسی ایک دور میں منکشف نہیں ہو جائیں گے۔ علم انسانی کی سطح جوں جوں بلند ہو گی یہ رفتہ رفتہ بے نقاب

ہوتے جائیں گے۔ اس لئے یہ ہر زمانے کے اربابِ علم کے لئے موضوعِ تحقیق و ہدفِ کاوش رہے گا۔ اس کا حرفِ آخر آخری دَور کے انسان کے لئے چھوڑا گیا ہے۔ لہٰذا کسی دَور کے انسانوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہوگا کہ قرآنی حقائق کے متعلق جو کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا ہے۔ اب اس میں فکر و تدبّر کے لئے کچھ باقی نہیں رہا۔

مومنین کا شیوہ

نظامِ کائنات کی یہی اہمیت ہے جس کے پیشِ نظر اس نے علمی تحقیقات پر اس قدر زور دیا ہے۔ (مثلاً) سورۃ آلِ عمران میں ہے:۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۚۙ الَّذِیۡنَ..... عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۰-۱۸۹/۳﴾

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے تخلیقِ کائنات اور گردشِ لیل و نہار میں قوانینِ خداوندی کی حقیقت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے بیٹھے، لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیقی ترکیب پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات اور انکشافات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس کارگہ کائنات کو نہ تو عبث و بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو اتنے عظیم نظام کو بلا مقصد پیدا کر دے۔ یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد عناصرِ کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اس طرح تباہ کُن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں۔

علماء کون ہیں؟

ہمارے ہاں جن حضرات کو "علماء کرام" کہا جاتا ہے، قوانینِ فطرت کے متعلق ان کے مبلغ علم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن دیکھئے کہ قرآنِ مجید علماء کن لوگوں کو قرار دیتا ہے۔ سورۃ فاطر میں ہے: اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ

فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ...... (۳۵/۲۷) تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ بادلوں سے ایک جیسا پانی برستا ہے لیکن اس سے مختلف انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں. یہ نہیں ہوتا کہ سب پھل اور فصلیں ایک جیسی ہوں"...... وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ (۳۵/۲۷) "اور پہاڑوں کو دیکھو کہ ان کا مادۂ تخلیق ایک ہی تھا لیکن ان میں مختلف رنگوں کے خطے ہیں ـــ کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھجنگ" (اور ہر خطہ اپنے اندر ارتقائی منازل کی داستانیں مرقوم و محفوظ رکھے ہوئے ہے). وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ...... (۳۵/۲۸) "اسی طرح انسان اور دیگر حیوان اور مویشی بھی مختلف التنوع ہیں"

آپ غور کیجئے کہ علومِ سائنس کے مختلف شعبے ان آیات کے اندر آ گئے ہیں. اس کے بعد کہا کہ صحیفۂ فطرت کے یہ اوراق جو قوانینِ خداوندی کی زندہ شہادت ہیں، سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں، لیکن ان قوانین کی عظمت کے سامنے وہی جھکتے ہیں جو ان پر علم و بصیرت کی رُو سے غور کرتے ہیں. اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝ (۳۵/۲۸) "یہی لوگ ہیں جو علماء کہلانے کے مستحق ہیں اور یہی جان سکتے ہیں کہ خدا کا قانون کس قدر غلبہ کا مالک ہے اور جو لوگ ان کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، وہ انہیں کس قدر سامانِ حفاظت عطا کر دیتا ہے" (نیز ۲۴-۳۰/۲۲). آپ غور کیجئے کہ جن لوگوں کو قرآنِ کریم نے علماء کہا ہے کیا وہ وہی نہیں جنہیں دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں سائنٹسٹ کہا جاتا ہے؟

تسخیرِ کائنات قرآنِ کریم نے نظامِ کائنات پر غور و فکر کی محض نظری طور پر تاکید ہی نہیں کی، اس نے کہا ہے کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۴۵/۱۳)

اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کی رُو سے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (یعنی جملہ کائنات) کو تمہارے تابعِ تسخیر کر دیا ہے، لیکن اس حقیقت کو وہی لوگ سمجھ سکیں گے جو غور و فکر سے کام لیں گے.

اس نے کہا یہ ہے کہ قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرنا اس لئے ضروری ہے کہ تم اس سے فطرت کی قوتوں کو

مسخر کر سکو گے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن نے جو شروع ہی میں کہا تھا کہ اس میں خود تمہارے لئے شرف و مجد کا راز پوشیدہ ہے، تو وہ دعویٰ کس قدر صداقت پر مبنی ہے۔ جو قومیں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہیں، انہیں کس قدر قوت اور ثروت حاصل ہو جاتی ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن امتِ مسلمہ کے لئے یہ چیزیں، شرف و مجد کا صرف ایک پہلو ہیں۔ اس کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں قرآن کی ابدی اقدار کے مطابق صرف میں لایا جائے۔

علامہ اقبالؒ نے قصۂ آدم کو اپنے تمثیلی انداز میں بڑے خوبصورت اسلوب سے پیش کیا ہے۔ آدم فرشتوں کے جلو میں زمین کی طرف آتا ہے تو روحِ ارضی یہ کہہ کر اس کا استقبال کرتی ہے کہ

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں		یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں!
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں		تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں		آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں		جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

(بالِ جبریل صفحہ ۱۳۳-۱۳۲)
(ایڈیشن ہشتم ۱۹۸۹ء)



خارجی کائنات سے آگے بڑھ کر، اب خود انسان کی طرف آئیے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ انسان، حیوانات سے اشرف اور ممتاز اس لئے ہے کہ اسے غور و تدبر، عقل و فکر، علم و بصیرت کی صلاحیت دی گئی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ انسان کے حیطۂ علم و بصیرت سے صرف ایک چیز باہر ہے اور وہ ہے وحی کی کُنہ و حقیقت، یعنی یہ کہ حضرات انبیاء کرامؑ کو وحی کس طرح ملتی تھی اور اس کا سرچشمہ کیا تھا۔ صرف یہ چیز عقلِ انسانی سے ماوراء ہے۔ عقلِ انسانی نہ وحی کی تخلیق کر سکتی ہے اور نہ یہ جان سکتی ہے کہ نبی کو وحی ملتی کس طرح تھی۔ اس کے بعد، جب حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے، وحی انسانوں تک پہنچ جاتی تھی، تو اسے غور و فکر اور علم و بصیرت کی رُو سے سمجھا جا سکتا تھا۔ قرآنِ کریم نے علم و عقل اور فکر و بصیرت کی اہمیت پر اس قدر زور دیا ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہوگی۔

عقل و فکر سے کام نہ لینے والے

وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ......(۷/۱۷۹) صحرائی اور شہری آبادیوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کا انداز زیست زبانِ حال سے بتاتا ہے کہ یہ جہنمی مخلوق ہیں...... لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ........(۷/۱۷۹) "یہ وہ لوگ ہیں جو سینوں میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وہ ماتھے پر آنکھیں بھی رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ لوگ دیکھنے میں تو انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوان ہوتے ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔"

سورۃ انفال میں ہے: إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ○ (۸/۲۲) "خدا کے نزدیک بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں، یعنی وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے۔" سورۃ ملک میں ہے کہ جہنم کا داروغہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے پوچھے گا کہ تم نے کیا کیا تھا جس کی وجہ سے تم جہنم میں داخل کئے جا رہے ہو؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ○ (۶۷/۱۰) "اگر ہم سچی بات دل کے کانوں سے سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو اہلِ جہنم میں سے نہ ہوتے۔" عقل و فکر سے کام نہ لینا ہے جس کی وجہ سے ہم جہنم میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ سورۃ حٰم میں ہے کہ قرآن تو ہے ہی ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہوں۔ كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۴۱/۳) "قرآن واضح عربی زبان کی کتاب ہے جس کے احکام و حقائق نکھار کر بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ اس قوم کے لئے ہے جو علم و عقل سے کام لے۔"

قرآنِ کریم تدبّر و تفکّر پر بڑا زور دیتا ہے۔ وہ قرآن سے اعراض برتنے والوں کے متعلق کہتا ہے: أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ○ (۴۷/۲۴) "یہ لوگ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے۔ کیا انہوں نے اپنے دلوں پر (خود ساختہ) تالے ڈال رکھے ہیں؟" (نیز ۲۳/۶۸)۔ سورۃ النساء میں ہے: أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ

اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (۴/۸۲) "کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ فکر و تدبر سے کام لیتے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اور یہ بھی اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔" سورۂ صٓ میں ہے: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (۳۸/۲۹) "یہ مبارک کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس میں غور و تدبر کریں اور صاحبانِ عقل و بصیرت اس سے حقائق پر آگاہ ہوں۔"

ظاہر ہے کہ یہ غور و تدبر کسی خاص دَور تک محدود نہیں تھا کہ قرآن پر جس قدر تدبر کیا جانا تھا وہ اس دَور میں کیا جا چکا ہے اور اب اس پر مزید غور نہیں کیا جا سکتا۔ تدبر کا لفظ تمام مسلمانوں کے لئے اور ہر زمانے کے لئے ہے۔ جب قرآن قیامت تک کے لئے ضابطۂ راہنمائی ہے تو اس پر غور و فکر کے دروازے بھی ہمیشہ کے لئے کھلے ہیں۔ یہ کہنا کہ غور و تدبر اسلاف تک محدود تھا، انہوں نے 'جتنا تدبر کیا جانا ضروری تھا' کر لیا۔ اب ہمیں ان کی تقلید کئے جانا چاہیئے، خود قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآنِ کریم اس تصور اور مسلک کی بڑی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے عقل و فکر اور علم و بصیرت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور انسان، انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر پہنچ جاتا ہے، جہاں ہانکنے والا جدھر چاہے اسے ہانک کر لے جائے۔ نہ کسی دَور میں علم کی راہیں مسدود ہوتی ہیں، نہ قرآن میں غور و تدبر کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان بلاسوچے سمجھے ان باتوں کو مان لے جو ہمارے ہاں روایتاً چلی آ رہی ہیں۔ لیکن سنئے کہ قرآن مومن کن لوگوں کو قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے: وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ (۲۵/۷۳) "مومن وہ ہیں کہ (اور تو اور) جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے، غور و فکر کے بعد انہیں قبول کرتے ہیں۔" اسے کہتے ہیں قرآن کی رو سے ایمان! یہ وجہ ہے جو وہ ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی ایمان لانے کے لئے کہتا ہے (۴/۱۳۶)۔

یہ ہے عزیزانِ من! قرآن کی رُو سے، عقل و فکر اور علم و بصیرت کی اہمیت۔ صدرِ اوّل کے مسلمان اسی طرح ایمان لائے تھے اور تمام معاملات پر اسی انداز سے غور و فکر کرتے تھے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟

لیکن اس کے بعد جب حالات نے پلٹا کھایا تو مخالفینِ اسلام نے سب سے پہلے قندیلِ قرآنی کو انسانی

تخیلات کے دبیز پردوں سے ڈھانپ دیا جب وہ روشنی بجھ گئی تو اس کے ساتھ ہی عقل وفکر کی شمعیں بھی گل ہونا شروع ہو گئیں. اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا مقصد یہ بتایا تھا:-

لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَٰتِ إِلَى النُّورِ ....(۵۷/۹) نیز (۱۴/۱)

یہ تمہیں جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر (علم وبصیرت کی) روشنی میں لے آئے گا.

اس کے برعکس طاغوتی قوتوں کا حربہ یہ بتایا تھا: يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَٰتِ .... (۲/۲۵۷) "وہ انہیں روشنی سے تاریکی کی طرف لے جائیں گی." ان قوتوں نے یہی حربہ استعمال کیا اور اس کے لئے انہیں کوئی دشواری پیش نہ آئی. انہوں نے کچھ روایات وضع کیں اور انہیں احادیثِ رسول اللہ کے نام سے مشہور کر دیا اور ان کے متعلق عقیدہ یہ وضع کر دیا کہ ان کے انکار سے مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے. یہ روایات کس قسم کی ہیں، انہیں آپ احادیث کے کسی بھی مجموعہ میں دیکھ سکتے ہیں. میں یہاں دو چار ایسی روایات پیش کروں گا. جامع ترمذی میں حضرت عباسؓ کی ایک روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

چند وضعی روایات

> رسول اللہ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ۷۱ یا ۷۲- ۷۳ سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے. ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے. اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے. ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے.

بخاری شریف کی ایک روایت ہے کہ نبیٔ اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ موسم کس طرح بدلتے ہیں. کبھی سردی آجاتی ہے، کبھی گرمی. تو آپؐ نے فرمایا کہ

> دوزخ نے اپنے پروردگار سے شکایت کی کہ اے میرے پروردگار! میرے ایک حصے نے میرے دوسرے حصے کو کھا لیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو مرتبہ سانس لینے کی اجازت دے دی. ایک سانس جاڑوں میں اور ایک گرمی میں. پس تم جو سخت سردی دیکھتے ہو تو یہ بھی جہنم کی سانس ہے.

اسی بخاری میں ہے:-

حضرت ابوہریرہؓ، نبی (صلعم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا، ایک گروہ بنی اسرائیل کا کھو گیا۔ نہیں معلوم کیا ہوا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ چوہے وہی ہیں کہ جب ان کے سامنے اونٹ کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ نہیں پیتے اور جب۔ ان کے سامنے بکریوں کا دودھ رکھا جاتا ہے تو وہ پی لیتے ہیں۔

اسی کی ایک اور روایت :-

حضرت ابوہریرہؓ، نبی (صلعم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا، بنی اسرائیل برہنہ غسل کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے۔ اور حضرت موسیٰؑ تنہا غسل کیا کرتے تھے۔ تو بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ! موسیٰؑ کو ہم لوگوں کے ساتھ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ فتق میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰؑ غسل کرنے لگے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے کر بھاگا اور حضرت موسیٰؑ اس کے پیچھے پیچھے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ "ثوبی یا حجر! ثوبی یا حجر!!" اے پتھر! میرے کپڑے دیدے۔ یہاں تک بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی طرف دیکھ لیا اور کہا کہ واللہ! موسیٰؑ کو کچھ بیماری نہیں اور پتھر ٹھہر گیا۔ موسیٰؑ نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! حضرت موسیٰؑ کی مار سے اس پتھر پر چھ یا سات نشان اب تک باقی ہیں[1]۔



اس مقام پر ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ قوانینِ فطرت کے علوم کا حصول اور تسخیرِ فطرت کے دروازے تمام انسانوں کے لئے کھلے ہیں۔ جس کا جی چاہے انہیں حاصل کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے۔ اس میں کفار اور مومنین کی کوئی تمیز نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان دونوں میں کوئی فرق ہے۔ اور اگر فرق ہے تو وہ کیا ہے؟ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ مومنین، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسان کی منفعت کے لئے صرف کرتے ہیں اور ان اقدار پر ایمان نہ لانے والے (کفار) انہیں اپنے قومی اقتدار، غلبہ و تسلط اور سلب و نہب کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کا نتیجہ انسانیت

---

[1] ان روایات کے حوالوں کے لئے طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" دیکھئے۔

کی تباہی ہوتا ہے۔ ایسی قومیں دوسروں کو تو تباہ کرتی ہی ہیں، ان کے ساتھ خود بھی تباہ ہوجاتی ہیں۔ انہی اقوام کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے:

مومن سائنسدانوں اور کفار میں فرق

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۧ (۴۶/۲۶)

(اور وہ کوئی ایسی ویسی قوم نہیں تھی) جس قدر جاہ و جلال اور غلبہ و اقتدار انہیں حاصل تھا، ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں۔ نیز، وہ غیر مہذب اور وحشی قوم بھی نہیں تھی۔ انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع ـــــ سماعت، بصارت اور قلب ـــــ حاصل تھے۔ لیکن چونکہ ان پر جذبات پرستی کے جذبات غالب تھے جس کی وجہ سے وہ قوانینِ خداوندی کی مخالفت کرتے تھے، اس لئے ان کی عقل و دانش اور فہم و فراست، ان کے کسی کام نہ آئے (۴۵/۲۳) اور جن نتائج کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے، انہوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ (جب عقلِ انسانی وحی کی روشنی میں کام کرے تو اس کے نتائج بڑے خوشگوار ہوتے ہیں۔ لیکن جب انسان اپنے جذبات سے مغلوب ہوجائے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے اور اس کی عقل و دانش ماؤف ہوجاتی ہے (جس طرح نشے کی حالت میں وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے)۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو اقوامِ عالم تین شقوں میں تقسیم ہوجاتی ہیں:-

۱۔ جو قومیں فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف میں لائیں، انہیں جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔

۲۔ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں اپنے ذاتی مفاد اور تخریبِ نوعِ انسانی کے لئے استعمال کریں، انہیں کفار کہا جائے گا (جیسے مغرب کی موجودہ قومیں)۔ اور

۳۔ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کی بجائے ان کی مغلوب، اور شق نمبر (۲) کی اقوام کی دست نگر اور محکوم

رہیں، جیسے ہم مسلمانانِ عالم، خسر الدنیا والاٰخرۃ۔



قرآن نے اہلِ جہنّم کے زمرے میں شمار ہونے سے محفوظ رہنے کا طریق خدا پر ایمان بتایا جس کا ذکر اگلی آیت میں آیا ہے۔ اس میں دو ایک ایسے بنیادی اور منفرد نکات ہیں جو انتہائی غور طلب ہیں۔ پہلے آپ اس آیت اور اس کے مفہوم کو دیکھئے۔

(۷/۱۸۰) وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

(اس جہنّم کی زندگی کو جنّت سے بدلنے کا طریق یہ ہے کہ) تم صفاتِ خداوندی کو ـــــ جو کامل حُسن و توازن کی مظہر ہیں ـــــ اپنے اندر اجاگر کرتے جاؤ اور اس میں اعتدال اور توازن کا خیال رکھو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اُن میں سے کسی ایک صفت کو لے کر افراط کی طرف نکل جاتے ہیں[1]۔ (اور یوں زندگی کا توازن کھو دیتے ہیں ـــــ ۴/۱۷۱؛ ۴۱/۴۰)۔ ان کی غلط روش بہت جلد اپنا نتیجہ ان کے سامنے لے آئے گی۔

جیسا کہ سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے ذاتِ خداوندی کی کُنہ و حقیقت کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ انسان کا محدود ذہن، لامحدود کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ خدا کے متعلق اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا علم اُس نے اپنے متعلق خود عطا فرمایا ہے۔ اور یہ علم اس نے اپنی صفات بیان کر کے عطا کیا ہے، یعنی ہم خدا کے متعلق اتنا ہی جان سکتے ہیں جتنا ہم اس

صفاتِ خداوندی

[1] جیسے عیسائیوں نے خدا کی صفت "رحم" میں اس قدر غلُو کیا کہ اس کے قوانینِ مکافاتِ عمل کو یکسر نظر انداز کر دیا اور نجات و سعادت کو اعمال پر نہیں بلکہ اُس کے رحم پر موقوف کر دیا۔ اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا اس پر عیسائیت کی تاریخ شاہد ہے۔ قرآنِ کریم صفاتِ خداوندی کو اپنانے میں اعتدال اور صحیح تناسب کی تعلیم دیتا ہے۔

کی صفات کی رُو سے جان سکتے ہیں۔ اللہ رازق ہے۔ رزّاقیت کا مفہوم تو ہم سمجھ سکتے ہیں لیکن جو (اللہ) رازق ہے اُس کی ذات کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ قرآنِ کریم نے صفاتِ خداوندی کو الاسماء کہہ کر پکارا ہے۔ قرآنِ کریم کی پہلی انفرادیت تو یہ ہے کہ اس نے جو صفاتِ خداوندی بیان کی ہیں، مذاہبِ عالم کی کسی (مُبیّنہ) آسمانی کتاب میں وہ صفات اس جامعیّت کے ساتھ نہیں ملتیں۔ لہٰذا خدا کا جو تصوّر ان صفات کی رُو سے قائم ہوتا ہے، اس قسم کا اعلیٰ اور منزّہ تصوّر اور کسی طریق سے قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ (اوّلین) وجہ ہے جو قرآن، ان لوگوں سے بھی جو اپنے طور پر خدا کو مانتے ہیں، خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ "قرآنی خدا" کی یہ خصوصیّت ہے جس کی بنا پر اُس نے "خدا پرستوں" کے متعلق بھی کہا ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ؕ (۲/۱۳۷) اگر یہ لوگ ایمان لائیں جس طرح (اے قرآن پر ایمان لانے والو!) تم ایمان لائے ہو، تب سمجھا جائے گا کہ یہ راہِ راست پر آ گئے ہیں۔"

یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ خدا پر ایمان کا عملی مفہوم یہ ہے کہ انسان (علیٰ حدِّ البشریّت) صفاتِ خداوندی کو اپنی ذات میں منعکس کرے، یعنی اس کی سیرت و کردار سے ان صفات کی نمود ہو۔ یہ بات قرآن پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس طرح جو نظام خدا کے نام پر قائم کیا جائے، اسے بھی ان صفاتِ خداوندی کا مظہر ہونا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہیں تو اسے نظامِ خداوندی یا اسلامی نظام نہیں کہا جائے گا۔

صفاتِ خداوندی کے سلسلہ میں قرآن کی دوسری انفرادیت یہ ہے کہ اس نے اِن صفات کو اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کہہ کر پکارا ہے۔ (زیرِ نظر آیت، نیز ۱۷/۱۱۰؛ ۲۰/۸؛ ۵۹/۲۴)۔ الحسنٰی کے معنی ہیں حسن کی مظہر۔ اور جیسا کہ متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس) حُسن صحیح صحیح توازن Proportion کا نام ہے۔ جس شے کا ذرا سا توازن بگڑ جائے اس کا حُسن باقی نہیں رہتا۔ کسی حسین ترین چہرے کی آنکھ کی سیاہی ذرا اپنے مقام سے ہٹی ہوئی ہو تو اس کا حُسن ختم ہو جاتا ہے۔ جسمِ انسانی کی مختلف اخلاط میں توازن اور اعتدال ہو تو اسے صحت کہتے ہیں۔ کسی خلط میں کمی بیشی ہو جائے (یعنی اخلاط کا توازن بگڑ جائے) تو انسان بیمار ہو جاتا ہے (اب تو نہ وہ طب رہی ہے نہ طبیب، ورنہ اس سے پہلے، ہم نے حاذق ترین اطبا کو دیکھا۔ وہ نسخہ تو بلا تامّل تجویز کر دیتے تھے، لیکن اس نسخہ کے اجزاء کے اوزان متعیّن کرنے کے لئے گہری سوچ میں ڈوب جاتے تھے۔

اور جسمِ انسانی تک ہی کیا موقوف ہے، سارا سلسلۂ کائنات صحیح توازن اور اعتدال کی بنا پر اسی حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل ہے۔

آپ قرآنِ کریم میں بیان کردہ صفاتِ خداوندی کو دیکھئے، اس میں ایسی صفات نظر آئیں گی جو باہم دیگر متضاد ہیں۔ (مثلاً) وہ غفور الرّحیم بھی ہے اور شدید العقاب بھی۔ اس میں جلال بھی ہے اور جمال بھی، بطشِ شدید بھی ہے اور عفوِ کریمانہ بھی۔ سطح بین نگاہوں کو ان میں تضاد نظر آئے گا۔ لیکن ان میں تضاد نہیں۔ نظامِ عالم قائم رکھنے کے لئے ان میں سے ہر صفت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان میں سے ہر صفت کا ظہور صرف وہاں ہو جہاں اس کی ضرورت ہو اور اسی حد تک جس حد تک ان کا ظہور مقصد پیشِ نظر کے لئے لاینفک ہو۔ اس سے ان میں وہ توازن (حسن) قائم رہے گا جو (مثال کے طور پر) ایک حاذق طبیب کے نسخہ کے اوزان میں ہوتا ہے، اس میں سنکھیا بھی ہوتا ہے اور کافور بھی، لیکن خاص توازن لئے ہوئے۔ ایک فرد کی انفرادی زندگی میں ہو یا اسلام کے اجتماعی نظام میں، ان صفاتِ حُسنہ کی نمود بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہوگی، یعنی ہر مقام پر یہ دیکھا جائے گا کہ وہاں کس صفت کے ظہور (استعمال) کی ضرورت ہے اور کس حد تک ضرورت۔ ان صفات میں اس قسم کا اعتدال بھی قرآن کی انفرادیت ہے۔ وہ اس قسم کے مومن پیدا کرتا ہے جو ان صفات کی نمود میں کامل اعتدال قائم رکھیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

صفات میں اعتدال

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن ۔۔۔ گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہّاری و غفّاری و قدّوسی و جبروت ۔۔۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم ۔۔۔ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

(ضربِ کلیم صفحہ ۶۰ ایڈیشن ہشتم ۱۹۸۹ء)

بانگِ درا میں ہے ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر ۔۔۔ شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تُند رُو کوہ و بیاباں سے ۔۔۔ گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اس قسم کی سیرت قرآنی تعلیم ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس، اہلِ مذاہب نے جہاں صفاتِ خداوندی کو مسخ کر دیا، وہاں ان صفات کے توازن کو بھی بگاڑ دیا۔

آیۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے: وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآىٕهٖؕ "تم ان لوگوں سے الگ ہو جاؤ جو صفاتِ خداوندی میں الحاد برتتے ہیں۔" دوسری جگہ ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَاؕ (۴۱/۴۰) "جو لوگ ہمارے قوانین میں الحاد کرتے ہیں، وہ ہم سے مخفی نہیں۔"

آجکل عام طور پر قبر کے لئے ایک مستطیل گڑھا کھودا جاتا ہے جس میں مردہ کو دفن کر دیتے ہیں۔ لیکن پہلے (اور بعض مقامات پر اب بھی) اس مستطیل گڑھے کی بغل میں (ایک طرف) ایک اور گڑھا کھودا جاتا تھا جس میں مردہ کو دفن کیا جاتا تھا۔ اسے لحد کہتے تھے (قبر اور لحد کے الفاظ مرادف سمجھے جاتے تھے)۔ لحد کے معنی ہوتے ہیں اعتدال کی راہ سے ہٹ کر ایک طرف کو مڑ جانا، جادۂ مستقیم کو چھوڑ کر افراط و تفریط اختیار کر لینا۔

غُلُوْ فِی الدِّیْن

آیاتِ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ صفاتِ خداوندی میں اعتدال، توازن اور صحیح تناسب کا قائم رکھنا دین ہے۔ اگر اس اعتدال کو چھوڑ کر صفاتِ خداوندی میں سے کسی ایک صفت میں افراط یا تفریط اختیار کی جائے تو یہ الحاد[1] ہو گا جس کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ یہودی شریعت میں عدل (جرم کی سزا) کے سلسلہ میں ایسی شدت اختیار کی گئی کہ مجرم (یا گنہگار) کے لئے توبہ (اصلاح یا بازآفرینی) کی گنجائش ہی نہ رہی۔ یہ شدت، عدل میں الحاد ہے۔ دوسری طرف عیسائیت میں عدل کا تصور ہی نہیں۔ اس میں نجات کا دارومدار خدا کے رحم (یعنی کفارۂ حضرت مسیحؑ کے ایمان) پر ہے۔ یہ عقیدہ قانونِ مکافاتِ عمل (عدل) میں تفریط ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان، جلد اوّل صـ۲۵)۔ اسے اسے غُلُو فی الدّین سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

ہم سے کہا گیا تھا کہ جو لوگ صفاتِ (و قوانینِ) خداوندی میں اِلحاد کی راہ اختیار کریں تو تم ان سے الگ ہو جاؤ۔ لیکن ہم، اس باب میں، دیگر اہلِ مذاہب سے بھی آگے بڑھ گئے۔ عیسائیوں کا الحاد یہ تھا کہ تم جس قدر بھی چاہے گناہ کرو، اگر حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ پر ایمان لے آؤ گے تو نجات ہو جائے گی۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:-

و الذی نفسی بیدہٖ لو لم تذنبوا لذھب اللہ بکم و لجاء

---

[1] ہمارے ہاں الحاد کا لفظ بے دینی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم افراط و تفریط اختیار کر لینا ہے۔

بقوم یذنبون فیستغفرون۔
اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے گا اور تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے گا جس کا شیوہ یہ ہوگا کہ گناہ کرے گی اور خدا سے بخشش طلب کرے گی۔

اس کے علاوہ ہم نے دین میں کس قدر غلو کیا ہے اس کے متعلق انڈکس میں عنوان غلو دیکھئے (بالخصوص مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۹۳، جلد چہارم صفحہ ۴۴۵-۴۴۷ : صفحہ ۵۵)۔ قانون کے بارے میں ہمارے الحاد کے متعلق تو پوچھئے ہی نہیں۔ ہمارے فقہی قوانین میں بہت کم ایسے ہوں گے جو قرآن کے مطابق جادۂ اعتدال کی راہ پر ہوں۔ عدل ویسے بھی قوانین خداوندی کے مطابق فیصلہ کرنے کو کہا جائے گا۔ فرمایا:۔

(۷/۱۸۱) وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝

ان کے برعکس، ہمارے پیدا کردہ وہ لوگ بھی ہیں جو حق کے ساتھ دوسروں کی راہنمائی کرتے ہیں اور اسی کے ذریعے اعتدال اور توازن کو ہمیشہ برقرار رکھتے ہیں۔

اسی کو حق و عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا کہتے ہیں۔ الحق، قرآنِ مجید کا دوسرا نام ہے۔
یہی آیت (۷/۱۵۹) میں بھی کہا گیا ہے تشریح وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

ان کے برعکس،

(۷/۱۸۲-۱۸۳) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝

جو لوگ ہمارے قوانین کو جھٹلاتے ہیں (ان کی گرفت فوری نہیں ہو جاتی) ہم انہیں آہستہ

---

[1] اس حدیث کو (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن جلد اول (شائع کردہ زمزم کمپنی لاہور) کے صفحہ ۱۰۱ پر مسلم کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

آہستہ آہستہ بتدریج (۴۴/۶۸) تباہی و بربادی کے اس مقام تک لے آتے ہیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا (۴۵-۴۶/۴۷؛ ۱۶/۲۵؛ ۳۹/۲۵)۔ (یہ اس لئے کہ ہمارا قانون

قانونِ مہلت

یہی ہے کہ بیج ڈالنے اور فصل کے پکنے میں ایک مدتِ معینہ کا وقفہ رہے) یہی ان کے لئے مہلت کا وقفہ ہوتا ہے (یہ بات نہیں کہ ان کی غلط کاریوں پر گرفت کرنے والا ہی نہیں ہوتا)۔ ہمارے قانونِ مکافات کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے (اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا)۔

قانونِ مہلت کے لئے دیکھئے عنوان "مکافاتِ عمل" اور "مہلت"؛ نیز توبہ، عملِ سُوء (غلط کام) اور اس کے آخری نتیجہ کے نمودار ہونے میں تدریج اور مہلت کا قانون خدا کی رحمت ہے جس کی بنا پر خطا کار کے لئے باز آفرینی کا امکان ہوتا ہے ۔۔۔ منشاءِ ایزدی انسان کی اصلاح ہے، انتقام جوئی یا ایذا رسانی نہیں۔ اس ضمن میں "جرم و سزا" کا عنوان دیکھئے۔

یہ لوگ غلط روش کیوں اختیار کرتے ہیں، اس کی وجہ وہی بتائی گئی جس کی تفصیل آیت (۷/۱۷۹) میں گزر چکی ہے، یعنی غور و فکر سے کام نہ لینا۔ فرمایا:

(۱۸۴، ۱۸۵) اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ○

ان لوگوں کے انکار اور تکذیب کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔ اگر یہ عقل و فکر سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ ان کا یہ رفیق ۔۔۔۔ یعنی ہمارا رسولؐ ۔۔۔۔ پاگل نہیں۔ وہ انہیں جن تباہیوں سے خبردار کر رہا ہے، وہ واقعی

ان پر آنے والی ہیں (۴۶/۳۴)۔

اگر یہ لوگ کائنات کے عظیم سلسلہ اور تخلیقِ خداوندی پر ہی غور کر لیتے تو یہ بات ان کی سمجھ میں آ جاتی کہ یہ رسولؐ جو کچھ کہتا ہے، وہ سچ کہتا ہے (۴۵/۲۲)۔ تخریبی روش کا نتیجہ کبھی منفعت بخش نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ اپنی آنکھوں پر اس طرح پردے نہ ڈالتے تو انہیں نظر آ جاتا کہ ان کی تباہی کا وقت کس قدر قریب آ رہا ہے (اس کی محسوس علامات سامنے کھڑی ہیں)۔ اگر یہ اس پر بھی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے تو اس کے بعد وہ کونسی بات باقی رہ جاتی ہے جسے دیکھ کر یہ ایمان لائیں گے؟ ــــــ خارجی دنیا میں کائنات کا یہ محیّر العقول نظام اور ان کی داخلی دنیا میں اس قسم کی معاشرتی خرابیاں، ان شواہد کے بعد اور کونسی ایسی دلیل آ جائے گی جس کی بنا پر یہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں گے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے کا نتیجہ حسن و خوبی ہے اور اس کی خلاف ورزی کا انجام تباہی و بربادی۔

اس کے بعد اس قانونِ محکم کا پھر اعادہ کیا گیا کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور ضد اور تعصب کی بنا پر حقائق کا اندھا دھند انکار کئے جاتے ہیں، وہ صحیح راستہ اختیار نہیں کر سکتے۔

(۷/۱۸۶) مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ (خدا کے قوانین کو چھوڑ کر) غلط راستہ اختیار کر لیں، تو پھر کوئی قوت ایسی نہیں ہوتی جو انہیں صحیح راستہ کی طرف لے آئے۔ وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے خدا کے قانون کو چھوڑ دیتے ہیں، تو خدا کا قانون انہیں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ زندگی کی تاریکیوں میں حیران و سرگرداں مارے مارے پھریں (۲/۱۵)۔

آیت کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "جسے خدا گمراہ کر دے، اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا"۔ لیکن اس سے جو غلط فہمی (بلکہ گمراہی) پیدا ہوتی ہے، اس کی وضاحت متعدد مقامات پر کی جا چکی ہے (مثلاً مطالب الفرقان، جلد اوّل صفحہ ۱۸۸-۱۷۹ نیز انڈکس میں متعلقہ عنوانات)۔ مطلب اس قسم کی آیات کا

یہی ہے کہ جو شخص صحیح راستہ اختیار ہی نہیں کرنا چاہتا' اسے کوئی بھی اس راستے پر نہیں لا سکتا۔ اس کی پہلی منزل وہی ہے جو آیت (۷/۱۷۹) میں گزر چکی ہے، یعنی عقل و فکر سے کام نہ لینا۔



مطالب الفرقان کی متعدد جلدوں میں قرآنی حقائق کے متعلق جو تفصیلات آپ کے سامنے آ چکی ہیں' ان سے آپ نے اس بنیادی حقیقت کو سمجھ لیا ہوگا کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصدِ عظیم یہ ہوتا تھا کہ اربابِ اقتدار نے ظلم و غارت گری اور سلب و نہب پر مبنی جو نظام قائم کر رکھا تھا' اسے مٹا کر اس کی جگہ حق و انصاف پر مبنی انسانیت ساز نظامِ خداوندی قائم کر دیا جائے۔ اس انقلابِ عظیم کو جو ان حضرات کے ہاتھوں رونما ہوتا تھا، مختلف اصطلاحات سے تعبیر کیا گیا ہے جن میں سب سے نمایاں اصطلاح السَّاعَۃ ہے۔

السَّاعَۃ

اِس لفظ کا مادہ (س۔ و۔ ع) اور (س۔ ی۔ ع) دونوں سے آتا ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں' کسی کیفیت یا حالت میں مسلسل تغیّر واقع ہوتے چلے جانا' تا آنکہ وہ رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو کر تباہ ہو جائے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ حق و باطل کی کشمکش میں باطل کی قوتیں بتدریج کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں' تا آنکہ ایک ایسا وقت آ جاتا ہے جب ان میں قائم اور باقی رہنے کی سکت نہیں رہتی اور وہ تباہ ہو جاتی ہیں۔ قوموں کے اس انقلاب کو قرآنِ کریم السَّاعَۃ سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے ظہورِ نتائج کا وقت بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ اعمالِ انسانی کے نتائج کا خاتمہ اس دنیا میں ہی نہیں ہو جاتا، مرنے کے بعد اُخروی زندگی میں بھی ان کا ظہور ہوتا ہے' اس لئے اسے بھی قرآنِ کریم نے السَّاعَۃ کہہ کر پکارا ہے۔ اسے قیامت بھی کہا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ السَّاعَۃ سے مراد دونوں قسم کے انقلاب ہوں گے ــــــ ایک وہ انقلاب جو اس دنیا میں واقع ہو' دوسرا وہ جو مرنے کے بعد آخرت میں ظہور پذیر ہوگا۔ قرآنِ مجید کی مختلف آیات میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے دیکھ لینا چاہیئے کہ اس سے کونسا انقلاب مراد ہے۔

حضرات انبیاء کرامؑ مخالف قوتوں سے مسلسل کہتے رہتے تھے کہ جس روش پر تم چلے جا رہے ہو' اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ یہ اس انقلاب کی رُو سے مرتب ہوگا جو رفتہ رفتہ ہیئت پذیر ہو رہا ہے۔ وہ (مخالفین) بجائے اس کے کہ اس وارننگ (تنذیر) سے عبرت حاصل کر کے اپنی غلط روش میں اصلاح کر لیتے' بار بار پوچھتے کہ جس انقلاب کی تم دھمکی دیتے چلے آ رہے ہو' وہ کب نمودار ہوگا؟ چونکہ اس انقلاب کو خدا کے قانونِ

مکافات کی رُو سے مہلت کا وقفہ ختم ہو جانے کے بعد واقع ہونا ہوتا تھا۔ اس لئے انبیاء کرام اس کا وقت متعین نہیں کر سکتے تھے۔ وہ حقائق خداوندی کی روشنی میں، یہ تو حتمی طور پر جانتے تھے کہ اسے واقع ہو کر رہنا ہے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کب واقع ہو گا۔ یہ سوال و جواب قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں آئے ہیں۔ اس مقام پر فرمایا:

(7/187) يَسْئَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسٰهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي ۖ لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ۚ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ۗ يَسْئَلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○

یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ انقلاب کی وہ گھڑی (جس کی بابت تم اس قدر دھمکیاں دے رہے ہو) کب واقع ہو گی (سعیٔ عمل کی کشتیٔ رواں اپنی نتیجہ خیزی کے لئے کب لنگر انداز ہو گی)۔

ان سے کہو کہ اس کا علم میرے پروردگار ہی کو ہے (33/63؛ 42/17؛ 79/42)۔

اس کے سوا کوئی نہیں جو اسے نمودار کر دے (اس کا فیصلہ اس کے قانون کی رُو ہی سے ہو سکتا ہے (13/38-40)۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ انقلاب ایسا عظیم ہو گا کہ) وہ زمین و آسمان پر بھاری ہو گا اور تم پر اچانک آ جائے گا (6/31؛ 12/107؛ 22/55؛ 47/18؛ 43/66؛ نیز 16/77؛ 54/50؛ 50-48/36)۔ یہ تجھ سے اس کے متعلق اس طرح پوچھ رہے ہیں گویا تو اسی کاوش میں لگا رہتا ہے (اس کے سوا تیرے لئے کوئی اور کام ہی نہیں)۔ ان سے کہہ دو کہ (میں اس کے متعلق قطعاً کوئی کاوش نہیں کرتا) اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے (اور اس کے متعلق یونہی قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں)۔

اس کے لئے وقت کا تعین علمِ غیب سے متعلق ہے اور مجھے غیب کا علم حاصل نہیں بجز اس علم کے جو مجھے خدا بذریعہ وحی عطا کر دے. غیب کا علم تو ایک طرف میری تو یہ کیفیت ہے کہ

(۷/۱۸۸) قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۠

نفع و نقصان کی مقدرت

ان سے کہو کہ (یہ تو بہت بڑی چیز ہے کہ میں بتا سکوں کہ یہ انقلاب کب آئے گا. میری تو یہ کیفیت ہے کہ) میں اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع نقصان کی قدرت نہیں رکھتا. یہ کچھ بھی خدا کے کائناتی قانون کے مطابق ہوتا ہے. اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں اپنے لئے بہت سی نفع بخش چیزیں اکٹھی کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف چھو تک نہ سکتی. (میری پوزیشن تو صرف یہ ہے کہ) میں اس قوم کو جو خدا کے قوانین پر یقین رکھتی ہے صحیح روش کے خوشگوار نتائج اور غلط روش کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتا ہوں (کیونکہ مجھے اس کا علم وحی کے ذریعے دیا گیا ہے. غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا (۲۷/۶۵). حتیٰ کہ رسولوں کو بھی از خود غیب کا علم نہیں ہوتا (۶/۵۰؛ ۱۰/۲۰). انہیں جس قدر علمِ غیب خدا دینا چاہے، بذریعہ وحی عطا کر دیتا ہے (۳/۱۷۸؛ ۷۲-۲۶/۷۲؛ ۳/۴۳؛ ۱۱/۴۹) — لہٰذا جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے علم پا کر پیش گوئیاں کرتے ہیں، وہ وحی پانے کے مدعی ہوتے ہیں اور یہ عقیدہ ختمِ نبوت کے خلاف ہے).

علمِ غیب کے متعلق تصریحات مختلف مقامات پر آ چکی ہیں. انڈکس میں عنوان "غیب" دیکھئے. بالخصوص مطالب الفرقان جلد اوّل، صـ ۹۷-۹۰، جلد پنجم، صـ ۳۲ اور صـ ۴۰-۳۸.

قرآنِ کریم کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ جملہ اقتدارات اور اختیارات کا مالک خدا ہے۔ اس میں اُس کا کوئی شریک نہیں۔ خدا کے بعد سب سے بلند و بالا مقام حضرات انبیاء کرامؑ کا ہے۔ لیکن ان کے متعلق بھی یہ وضاحت کر دی کہ وہ دوسرے انسانوں جیسے انسان ہیں (بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ)۔ انہیں اپنی ذات کے لئے بھی (بجز قوانین خداوندی) نفع یا نقصان کا اختیار نہیں چہ جائیکہ وہ کسی اور کو نفع یا نقصان پہنچا سکیں۔ انہیں غیب کا علم بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اُن کی خصوصیت ایک ہی ہے کہ ان کی طرف وحی نازل ہوتی ہے، جس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو آگاہ کر دیں کہ نجات و سعادت کی راہ کون سی ہے اور تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والا راستہ کون سا۔ ظاہر ہے کہ جب نوعِ انسان کی برگزیدہ ہستیوں کی یہ کیفیت ہے تو کسی اور انسان کو کسی قسم کی فوق البشر قوت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک حقیقت کی وضاحت سے قرآن نے کس طرح شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی! اسی کا نام توحید ہے۔

دنیا کے دیگر مذاہب[1] میں خدا کا نام تو بس برائے وزنِ بیت ہوتا ہے۔ ان کی جملہ عقیدت مندیوں اور اطاعت گزاریوں کا مرکز غیر خدائی قوتیں ہوتی ہیں (جو درحقیقت ان کے اپنے ذہن کی تراشیدہ ہوتی ہیں)۔ ان میں وہ آفاقی قوتیں بھی شامل ہوتی ہیں جن کا درحقیقت کوئی وجود نہیں ہوتا۔ (مثلاً) دیوی دیوتاؤں کے موہوم تصورات، ان موہوم تصورات کو محسوس پیکروں میں سامنے لانے کے لئے ان کے بُت (مجسمے) تراش لئے جاتے ہیں۔ ان سے آگے بڑھئے تو انسان پرستی جس کی ان گنت شکلیں ہیں۔ ان انسانوں میں جن کی پرستش کی جاتی ہے' ایک خصوصیت مشترک ہوتی ہے' اور وہ یہ کہ انہیں دوسرے انسانوں سے ارفع و اعلیٰ اور مقدس و متبرک سمجھا جاتا ہے ـــــــ کوئی غیر برہمن کسی برہمن کا ہمتا نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم نے انسانی تخلیق کی حقیقت واضح کر کے نسلی تفوّق کے باطل نظریہ کو بھی خاک میں ملا دیا۔

قرآن نے آیت (۷/۱۸۸) میں' بعد از خدا بزرگ ترین شخصیت کا ذکر کرنے کے بعد' آئندہ آیات (۷/۱۸۹-۱۹۵) میں شرک کی ان مختلف شکلوں کی تردید کی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان آیات اور ان کے مفہوم کا درج کرنا کافی ہو گا۔ اس کے بعد بعض خصوصی نکات کی وضاحت کی جائے گی۔

---

[1] میں جب مذاہب کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں اسلام کو بھی مذاہب کی صف میں شامل کرتا ہوں۔ اسلام مذہب نہیں' دین ہے۔ مذاہب کے ضمن میں اس کا ذکر محض بغرض تقابل ہوتا ہے۔

ع ۱۸۹

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ ۖ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ○

ان لوگوں سے کہو کہ (میں جس خدا کے قانون کی طرف دعوت دیتا ہوں وہ) وہ خدا ہے جس نے تمہاری پیدائش کا سلسلہ آغاز' ایک جرثومۂ حیات سے کیا۔ پھر وہ جوشِ نمو سے پھٹ کر نر اور مادہ میں تقسیم ہو گیا (۱/۴) اور اس طرح رفتہ رفتہ' عورت اور مرد کا وجود عمل میں آگیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور باہمی رفاقت سے انہیں سکون حاصل ہوتا ہے (۳۰/۲۱)۔ اس سے نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے چنانچہ جب ایسا ہوتا ہے کہ مرد' عورت کی طرف ملتفت ہوتا ہے تو اسے حمل قرار پا جاتا ہے۔ شروع میں وہ اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ اسے اس کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی شدت محسوس ہونے لگتی ہے[1]۔ پھر جب وضعِ حمل کا وقت قریب آجاتا ہے تو میاں بیوی دونوں اپنے ربّ سے دعا کرتے ہیں کہ اگر تُو نے ہمیں ایک تندرست و توانا بچہ عطا کر دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔

ع ۱۹۰

فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا ۚ فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○

لیکن جب وہ انہیں' تندرست بچہ عطا کر دیتا ہے' تو وہ اِس بچے کی پیدائش کے سلسلے

---

[1] حمل اور رضاعت کی مدت کے متعلق اپنے مقام پر تشریح کی جائے گی (زیرِ نظر آیت کے علاوہ متعلقہ آیات (۲/۲۳۳) ؛ (۳۱/۱۴) ؛ (۴۶/۱۵) اور (۶۵/۶) ہیں۔ رضاعت کے متعلق مطالب الفرقان' جلد سوم (صـ۲۱۰) پر لکھا جا چکا ہے)۔

میں خدا کے ساتھ اوروں (زندہ اور مردہ پیروں فقیروں) کو بھی شریک کرنے لگ جاتے ہیں (اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جنہیں وہ خدا کا ہمسر قرار دیتے ہیں) اللہ کا مقام اُن سے کس قدر بلند ہے۔

(۷/۱۹۱) اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْئًا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ۝ۖ

ان کی حماقت دیکھئے کہ وہ خدا کا ہمسر انہیں بناتے ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ اُن کا کسی چیز کو پیدا کرنا تو ایک طرف، وہ خود کسی کی تخلیق ہیں۔

(۷/۱۹۲) وَ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّ لَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ۝

وہ اس قابل ہی نہیں کہ ان کی کوئی مدد کر سکیں۔ ان کی مدد کرنا تو درکنار، وہ خود اپنی مدد کرنے کے بھی قابل نہیں۔

(۷/۱۹۳) وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَی الْهُدٰی لَا یَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ۝

(ان لوگوں پر اپنے معبودانِ باطل کی عقیدت کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ وہ، اس بارے میں کسی کی بات تک سننے کے روادار نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ) اگر تم انہیں راہِ راست کی طرف دعوت دو، تو وہ تمہارا اتباع کبھی نہیں کریں گے۔ لہٰذا تمہارے لئے یکساں ہے کہ تم انہیں صحیح راستے کی طرف دعوت دو، یا خاموش رہو (۲/۶)۔

(۷/۱۹۴) اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝

(ان سے کہو کہ) جن ہستیوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو، وہ تمہارے ہی جیسے (خدا کے) بندے ہیں۔ ان میں کوئی خدائی قوت نہیں۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ ان میں خدائی

تو تیں ہیں، تو تم انہیں اپنی احتیاجوں میں مدد کے لئے پکارو۔ پھر دیکھو کہ کیا وہ تمہاری احتیاج کو پورا کر دیتے ہیں؟

(۷/۱۹۵) اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ○

(اور یہ مٹی اور پتھر کے بُت، جن کی تم پرستش کرتے ہو؛ وہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ تم نے ان کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان سب بنا دیئے ہیں۔ لیکن سوچو کہ) کیا ان کے پاؤں ایسے ہیں جن سے یہ چل سکیں۔ کیا ان کے ہاتھ ایسے ہیں جن سے یہ کچھ پکڑ سکیں۔ کیا ان کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے یہ دیکھ سکیں یا ان کے کان ایسے ہیں جن سے یہ سُن سکیں۔

اے رسولؐ! ان سے کہو کہ (یہی ہیں نا تمہارے وہ معبود جن کے بل بوتے پر تم سمجھتے ہو کہ مجھے شکست دے دو گے۔ سو) تم انہیں بلاؤ اور سب کو دعوت دو کہ وہ میرے خلاف جو تدبیریں چاہیں کر لیں، اور مجھے اس باب میں، ذرا سی بھی مہلت نہ دیں۔

شرک

ان آیات میں شرک کی مختلف شکلوں کی تردید کر کے، ایمان و ایقان کو خالصتاً ذاتِ خداوندی پر مرکوز کر دیا گیا ہے۔ شرک سے انسان کس طرح شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے اور خوف سے اس کے اعصاب مفلوج ہو جاتے ہیں، اس کے لئے انڈکس میں شرک و خوف اور شخصیت پرستی کے عنوانات دیکھئے۔ اب آیئے ان آیات کے بعض خصوصی نکات کی طرف۔

آیت (۷/۱۸۹) میں کہا گیا ہے کہ خدا نے تم سب (تمام انسانوں) کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا۔ انسانی تخلیق کی تشریح اور نفسِ واحدہ کی وضاحت مطالب الفرقان، جلد دوم کے باب اوّل میں کی جا چکی ہے

نسلی امتیاز کا خاتمہ

نیز جلد پنجم صفحہ ۸۶ پر۔ انڈکس میں عنوان ارتقا اس موضوع پر مزید روشنی ڈالے گا۔ ان مقالات پر تخلیقِ انسانی کے حیاتیاتی Biological

مراحل کو سامنے لایا گیا ہے. لیکن اس سے جو اخلاقی نکتہ ہویدا ہوتا ہے وہ اس سے بھی اہم اور درحقیقت اصل مقصود ہے. جب تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں تو ان میں پیدائشی (اور نسلی) تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. درخت کے تمام پتّے ایک اصل (جڑ) سے نمود پذیر ہوتے ہیں. اس لئے کوئی پتّا دوسرے پتّے سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تم سے افضل و اعلیٰ ہوں. یہی وحدتِ اصل، مساواتِ انسانیہ کی بنیاد ہے. اس ایک نکتہ سے قرآن نے تفریقِ انسانی کے تمام باطل تصوّرات اور طبقاتی امتیازات کو ختم کر کے رکھ دیا.

اس کے بعد کہا کہ اس نفسِ واحدہ سے مذکر و مؤنث (مرد اور عورت) کی تخلیق ہوئی. اس سے مرد اور عورت کی مساوات کا تصوّر ذہن نشین کرا دیا. اس سلسلہ میں انڈکس میں عنوان "عورت" دیکھئے، بالخصوص مطالب الفرقان، جلد دوم صـ ۱۲۳، جلد سوم صـ ۳۵۹. نیز عنوان "عائلی قوانین".

ازدواجی تعلقات

مرد اور عورت کے جنسی تعلقات میں خاوند اور بیوی کو ایک دوسرے کا زوج قرار دیا. اس کی تشریح مطالب الفرقان، جلد اوّل صـ ۲۲۸ پر گزر چکی ہے. زوج کے معنی ہوتے ہیں، ہم آہنگ اور یک رنگ رفقاء. اس سے مردوں کی بالادستی اور تفوّق کا غلط تصوّر باطل قرار دے دیا.

ان کے ازدواجی رشتہ کا مقصد بتایا: لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا، تاکہ وہ زندگی میں سکون حاصل کر سکیں. عربوں کے ہاں اَلسُّكَّانُ کشتی کے پتوار کو کہتے ہیں جس سے وہ آگے بھی بڑھتی جاتی ہے اور اس کا توازن بھی برقرار رہتا ہے. لہٰذا ازدواجی رشتہ سے مقصود یہ ہے کہ زندگی کی کشتی اس طرح آگے بڑھتی چلی جائے کہ اس کا توازن بھی برقرار رہے. دوسرے مقام پر اس میں اضافہ فرماتے ہوئے کہا:

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ (۳۰/۲۱)

جامد مادہ سے جب زندگی کی ابتدا ہوئی تو وہ ایک جرثومہ[1] کی شکل میں تھی. وہ جوشِ نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تو اس کا ایک حصّہ نر بن گیا اور دوسرا مادہ ______

[1] Life Cell

اس طرح تم ــــــ مرد اور عورت ــــــ ایک دوسرے کے زوج (جوڑے) بن گئے۔
مقصد اس سے یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کی رفاقت سے سکونِ قلب حاصل کرو۔ اس نے
تم میں ایک ایسا گہرا رشتہ پیدا کر دیا جو تمہاری (مرد اور عورت دونوں کی) صلاحیتوں کی نشوونما
کا موجب بن گیا۔
زندگی کے اس نقشے میں بھی، ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں، قانونِ
خداوندی کی محکمیت اور حیات بخشی کی نشانیاں ہیں۔

اور اس پُرسکون مودّت اور رحمت کی رفاقت کے ساتھ افزائشِ نسل کے فریضہ کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اس میں بھی محض حیاتیاتی عمل کو سامنے نہیں لایا گیا بلکہ نہایت لطیف پیرایہ میں شرک کے ایک گوشہ کی طرف بھی توجہ دلائی گئی۔ کہا کہ جنین کی حالت میں تو ان کی توجہ کا مرکز خدا ہی ہوتا ہے، لیکن جب تندرستُ توانا بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اسے "اللہ دِتا" کی بجائے "پیراں دِتا" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی مائیں اپنے نوزائیدہ بچوں کو کون کون سے دواروں، کون کونسی خانقاہوں، کون کونسی درگاہوں پر لئے لئے پھرتی اور ان آستانوں پر منّتیں پوری کرتی اور نذرانے چڑھاتی ہیں، یہ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ میں نے اپنی کتاب "تصوّف کی حقیقت" میں ان درگاہوں اور آستانوں کی طرف منسوب کردہ بکثرت کراماتوں کا ذکر کیا ہے، لیکن حصولِ اولاد کے سلسلہ میں مجھے ایک ایسا قصہ یاد آ رہا ہے جو بڑا دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ عرصہ کی بات ہے، لاہور سے ایک رسالہ شائع ہوا کرتا تھا ــــــ انوار الصوفیہ ــــــ شاید اب بھی نکلتا ہو۔ اس میں حضرات اولیاء کرام کی محیّر العقول اور حیرت فروش کرامات کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اس رسالہ کی مارچ ۱۹۴۱ء کی اشاعت میں ایک سرمست بزرگ شاہ سید قلندر (جنہیں شاہ سیدہ ولی بھی کہا جاتا تھا) کی ایک کرامت کا تفصیلی تذکرہ شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے تحریر یہ تھا:

> ایک دن ایک عورت شاہ سیدہ ولی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگی کہ جناب میرے ہاں کوئی بال بچہ نہیں ہے۔ دعا فرمایئے کہ خدا تعالیٰ مجھ کو لڑکا عطا فرمائے۔ آپ نے نظرِ باطن سے دیکھ کر فرمایا کہ تیری قسمت میں کوئی بچہ لکھا ہوا نہیں ہے۔ وہ بہت دلگیر ہوئی اور پھر عرض کی مگر پھر بھی وہی جواب ملا۔ آخر وہ عورت مایوس ہو کر واپس چلی گئی اور جب وہ چوک کنک منڈی میں پہنچی تو ایک ولی اللہ نور شاہ گدیلہ نامی جن کا مزار اب بھی اُسی جگہ بازار

کی دکانوں میں موجود ہے اس عورت کو ملے۔ اس نے ان کی خدمت میں حصولِ اولاد کے لیئے التجائے دعا کی۔ نور شاہ نے کہا جمع خاطر رکھ خدا تجھ کو لڑکا دے گا۔ پس وہ اپنے گھر چلی گئی اور خدا نے اُسے پورے دنوں پر لڑکا عطا فرمایا۔ وہ عورت حیران تھی کہ شاہ سیّدہ کی بات کبھی خطا نہیں گئی۔ اُن کا کہا پورا ہوجاتا ہے اور میری بابت آپ نے کہا تھا کہ تمہاری قسمت میں کوئی اولاد نہیں ہے، تو پھر یہ لڑکا میرے ہاں کیسے پیدا ہوا۔ پس وہ عورت لڑکے کو لے کر شاہ سیدہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اُن سے کہا کہ آپ تو کہتے تھے کہ تمہاری قسمت میں کوئی اولاد نہیں، دیکھو خدا نے مجھ کو یہ لڑکا عطا فرمایا۔ آپ نے پھر نگاہ لوحِ محفوظ کی طرف کی اور دیکھا تو وہاں کچھ بھی لکھا ہوا نہیں پایا اور اس عورت سے کہا کہ تیری قسمت میں تو لوحِ محفوظ پر لکھا ہوا کہیں نظر نہیں آتا، یہ لڑکا تمہارے ہاں کیسے ہوگیا۔ عورت نے جواب دیا کہ جس روز میں آپ کے پاس اسی مطلب کے لئے آئی تھی اور مایوس ہوکر چلی گئی تھی اور سیدھی نور شاہ کے ہاں پہنچی تو ان سے اولاد کے لئے عرض کی تو انہوں نے کہا کہ جاؤ خدا تم کو لڑکا دے گا۔ پس ویسے ہی ہوا اور خدا نے مجھ کو پورے دنوں پر یہ لڑکا عطا فرمایا ہے۔ شاہ سیدہ نے جب نور شاہ کی طرف نگاہ کی تو اُن کی زبان پر لکھا ہوا پایا۔ تب شاہ سیدہ نے کہا کہ بیشک درست ہے۔ اگر نور شاہ نہ کہتا تو کبھی لڑکا پیدا نہ ہوتا، کیونکہ خدا نے نور شاہ کی زبان پر لکھا ہوا تھا۔ تو ثابت ہوا کہ فقیروں کی زبان بھی لوحِ محفوظ ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ فقیروں کی زبان پر لکھ دیتا ہے۔ وہ جیسا فرمائیں ویسا ہوجاتا ہے۔ پس بطورِ مذاق شاہ سیدہ صاحب نے عورت سے کہا کہ یہ تو لڑکی ہے، تو کہتی تھی کہ یہ لڑکا ہے۔ جب عورت نے دیکھا تو وہ لڑکی نظر آئی۔ حیران ہوئی کہ میں تو گھر سے لڑکا لے کر آئی تھی، یہ لڑکی کیسے ہوگئی! پس وہ عورت لڑکی کو لے کر نور شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچی اور اُن سے سب حال سنایا کہ آپ کی دعا سے خدا نے مجھ کو لڑکا عطا فرمایا اور شاہ سیدہ کہتے تھے کہ تمہاری قسمت میں اولاد ہی نہیں ہے اور میں اُن کو دکھلانے گئی تھی کہ آپ تو کہتے تھے کہ تمہاری قسمت میں اولاد ہی نہیں ہے اور نور شاہ کے کہنے پر مجھ کو خدا نے لڑکا عطا فرمایا ہے تو آپ نے یہ سنکر کہا کہ یہ لڑکا نہیں، لڑکی ہے تو اُن کے

کہنے سے یہ لڑکی ہو گئی ہے۔ اس پر نور شاہ صاحب مسکرائے اور کہا کہ نہیں مائی، لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہے۔ غور سے دیکھ۔ جب عورت نے دیکھا تو لڑکا ہی نظر آیا۔ وہ پھر شاہ سیدہ کے پاس گئی اور کہا کہ دیکھو شاہ صاحب! یہ لڑکا ہے لڑکی نہیں۔ اس پر شاہ صاحب نے کہا کہ اے عورت! تم غلطی کرتی ہو۔ یہ تو لڑکی ہے، لڑکا کہاں ہے۔ جب پھر عورت نے دیکھا تو وہ لڑکی ہو گئی۔ پس وہ اُسی وقت پھر نور شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچی اور کہا کہ جناب یہ تو پھر لڑکی ہو گئی ——— جس پر نور شاہ صاحب نے کہا کہ تو پاگل ہے، دیکھ یہ تو لڑکا ہے۔ اُن کے کہنے پر پھر جب عورت نے دیکھا تو لڑکا ہی پایا۔ تب عورت نے کہا کہ میں کیا کروں ——— جب آپ کے پاس آتی ہوں تو لڑکا ہو جاتا ہے اور جب شاہ سیدہ کے ہاں جاتی ہوں، لڑکی ہو جاتی ہے۔ اس پر نور شاہ صاحب نے کہا کہ اب شاہ سیدہ کے پاس نہ جانا اور سیدھی اپنے گھر کو چلی جانا تو پھر لڑکا ہی رہے گا۔ اے عزیز! دیکھا کہ خدا کے بندے ایک نظر میں کچھ کا کچھ کر کے دکھا دیتے ہیں[1]۔

اس سے قرآنِ کریم کے اس ارشادِ گرامی کا مفہوم نکھر کر سامنے آ گیا ہوگا، فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا ۚ (۷/۱۹۰) اور یہ کسی ایک مائی اور کسی ایک قلندر کا قصہ نہیں، ہماری ساری قوم اِسی قسم کے خرافات میں کھوئی ہوئی ہے۔

اِس کے بعد اِس قسم کی جہالت اور توہم پرستی کی تردید کی گئی ہے ——— اور تردید بھی قرآنِ کریم کے اپنے مخصوص انداز میں۔ فرمایا کہ یہ لوگ جن سے جا کر اولادیں مانگتے ہیں اور جو اولادیں دینے کے مدعی ہیں، ان کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ "ان کا کسی چیز کو پیدا کرنا تو ایک طرف، وہ خود بھی مخلوق (کسی کے پیدا کردہ) ہیں"۔ یہ حقیقت بالبداہت واضح ہے کہ کوئی انسان کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتا۔ "پیدا کرنے" سے مراد ہے کسی شئے کو عدم Nothingness سے وجود میں لانا۔ جن چیزوں کو انسانی ایجادات کہا جاتا ہے، ان کی کیفیت اتنی ہی ہوتی ہے کہ خدا کی پیدا کردہ مختلف اشیاء میں خاص تناسب سے امتزاج پیدا کر کے انہیں ایک نئی چیز میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ یہ Discovery ہیں، نہ کہ تخلیق (یعنی عدم سے وجود میں لانا)۔

[1] بحوالہ ماہنامہ طلوعِ اسلام، بابت جولائی ۱۹۴۱ء (صفحہ ۵۱ - ۴۹)۔

کو تخلیق کہا جاسکتا ہے۔ وہ تو کسی موجود شے پر پڑے ہوئے پردہ کو اٹھا دینا ہوتا ہے۔
باقی رہا یہ کہ یہ لوگ خود اپنی پیدائش پر بھی قادر نہیں۔ یہ خود پیدا شدہ ہیں۔ بات بالکل واضح ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا "بزرگ" کیوں نہ ہو، اگر اس کے ماں باپ کے جنسی اختلاط سے استقرارِ حمل نہ ہوتا، تو اُن بزرگوں کا وجود ہی نہ ہوتا۔ باقی رہا اُن کا عالی نسب ہونا، سو اس پر بھی اُن کا کوئی اختیار نہ تھا کہ یہ کس کے گھر پیدا ہوں گے۔ جو خود مخلوق ہو وہ تخلیق پر قادر کس طرح ہوسکتا ہے؟ (۷/۱۹۱)۔ اب رہا اُن سے جا کر مرادیں مانگنا، تو یہ خود اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی خدا کے پیدا کردہ اسباب و ذرائع کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہ بھی انہی عناصر اور قویٰ کے سہارے زندہ رہتے ہیں جنہیں خدا نے زندگی کے قیام و بقا کے لئے ناگزیر قرار دیا ہے (۷/۱۹۲)۔ لہٰذا، یہ تمہارے ہی جیسے انسان ہیں۔ ان میں کوئی خدائی قوت نہیں (۷/۱۹۴)۔

ان کی جہالت کی انتہا ہے کہ (انسان تو ایک طرف) یہ مٹی اور پتھر کی ان مورتیوں (بتوں) کو بھی خدا بنا لیتے ہیں جنہیں یہ خود اپنے ہاتھ سے تراشتے اور گھڑتے ہیں۔ کیا یہ صورتِ حالات مضحکہ انگیز نہیں کہ ایک پتھر کے ٹکڑے کو تراش خراش سے انسانی شکل میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ اس کے کان اور آنکھیں بنا دیتے ہیں اور اس کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا جہان کی باتیں سنتے ہیں اور آسمانوں تک کے احوال و ظروف کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ان کی داستان بھی اتنی ہے کہ ــــ تراشیدم، پرستیدم، شکستم۔

یہ ہیں اُن کے وہ حمایتی اور مددگار جن کے بل بوتے پر یہ (اے رسولؐ!) تمہارے خلاف نبرد آزما ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تمہیں شکست دے دیں گے۔ تم ان سے کہہ دو کہ نہ میں تم سے ڈرتا ہوں، نہ تمہارے ان معبودانِ باطل سے خوف کھاتا ہوں۔

(۷/۱۹۶) اِنَّ وَلِیِّ َۧ اللّٰہُ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡکِتٰبَ ۚۖ وَ ہُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیۡنَ ۝

(میں اس چیلنج کو اس حتم و یقین اور جرأت و بیباکی سے اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ) میرا رفیق و دمساز وہ خدا ہے جس نے مجھے اس قسم کا محکم ضابطۂ حیات دیا ہے اور وہ ان تمام لوگوں کی رفاقت اور کارسازی کرتا ہے جو اُس کے بنائے ہوئے صلاحیت بخش

پروگرام پر عمل پیرا ہوتے اور معاشرہ کے بگڑے ہوئے کام سنوارتے ہیں۔

اس کے بعد پھر دہرایا کہ

(۷/۱۹۷) وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ○

اس کے برعکس جن معبودوں کو تم "خدا کے سوا" پکارتے ہو، وہ نہ تمہاری کچھ مدد کر سکتے ہیں، نہ اپنے آپ کی۔

جن لوگوں کی جہالت اس حد تک پہنچ چکی ہو اور اپنے خود ساختہ خداؤں کی عقیدت کا یہ عالم ہو کہ یہ ان کے خلاف ایک لفظ تک سننے کے لئے تیار نہ ہوں، ان پر حق کی دعوت کیا اثر کر سکتی ہے۔

(۷/۱۹۸) وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ○

(لیکن ان کی اندھی عقیدت کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس قدر واضح دلائل کے باوجود) اگر تم انہیں راہِ راست کی طرف دعوت دو، تو یہ تمہاری کبھی نہیں سنیں گے۔ تو دیکھے گا کہ وہ تیری طرف تک رہے ہیں، لیکن وہ درحقیقت دیکھ نہیں رہے ہوتے۔ (ان کی آنکھیں بظاہر تمہاری طرف ہوتی ہیں، لیکن دل کہیں اور ہوتا ہے (۱۰/۴۲-۴۳)؛ ۱۶/۴۷؛ ۱۱/۲۰)۔

نظر اور بصر کا فرق، سابقہ صفحات میں (آیت ۷/۱۷۹ کے زیرِ تشریح) سامنے لایا جا چکا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قرآنی تعلیم اور حقائق پر وہی لوگ ایمان لا سکتے ہیں جو تعصبات اور باطل کی عقیدت مندیوں سے الگ ہٹ کر، قرآنی دعوت پر عقل و فکر کی رُو سے غور کریں۔

ہمارا شرک

سابقہ آیات میں شرک کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اُس سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ کچھ زمانۂ نزولِ قرآن کے عربوں سے متعلق ہے، ہمارا اس سے کچھ واسطہ نہیں (کیونکہ ہم "توخدا کے فضل سے" مومن اور توحید پرست ہیں)۔ لیکن بنظرِ تعمق دیکھنے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ان کے شرک کی کونسی نہج اور جہت ہے جس میں ہم خود مبتلا نہیں؟ ہم

ہیں اور ان (عربوں) میں فرق یہ ہے کہ وہ ان معبودانِ باطل کی پرستش کرتے تھے تو دھڑلے سے اس کا اقرار کرتے تھے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم شرک میں ان سے بھی زیادہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، لیکن اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھے ہوئے ہیں کہ ہم خدا پرست ہیں۔ گویا ہم عملاً مشرک بھی ہیں اور اس کے ساتھ منافق بھی۔ وہ مشرک منافق نہیں تھے۔

خود شرک میں بھی ہم ان سے ایک قدم آگے ہیں۔ قرآنِ کریم کی رُو سے حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے کسی انسان کو نہیں۔ ہم ہزار برس سے انسانوں کی حکومت کے تابع زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں، اور قیامت بالائے قیامت کہ اسے اسلامی حکومت کہہ کر پکارتے ہیں، حالانکہ خدا کے حقِ حکومت میں کسی انسان کو شریک کرنے کو خود خدا نے شرک قرار دیا ہے (۱۸/۲۶)۔

ایک اور نکتہ کا اعادہ بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو اس سختی سے شرک سے منع کیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اگر خدا کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر لیا جائے تو اس سے خدا کی کبریائی میں کوئی فرق آ جاتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ خدا تو اس وقت بھی خدا ئے مقتدر تھا جب اس کا نام تک لینے والا کوئی پیدا ہی نہیں ہوا تھا، یعنی وہ تخلیقِ کائنات سے بھی پہلے خدا تھا۔ اس لئے اگر اسے کوئی بھی نہ مانے یا اس کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کر لے تو اس سے اُس کا کیا بگڑتا ہے؟ اس نے شرک سے اس لئے منع کیا ہے کہ اس سے انسان خود اپنے مقام سے گر جاتا ہے، شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کا سینہ خوف و حزن کا مہبط بن جاتا ہے۔ شرک سے خدا کا تو کچھ نہیں بگڑتا، لیکن انسان کا کچھ رہتا ہی نہیں۔

ان حقائق کی وضاحت کے لئے انڈکس میں شرک اور خوف کے عنوانات دیکھئے، نیز عنوانات حکومت، خدا کی حکومت، اسلامی یا قرآنی نظام وغیرہ۔



آیت (۷/۱۵۷) میں بعثتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ بیان کی گئی تھی کہ وہ غلامی کی اُن تمام زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں نوعِ انسان جکڑی چلی آ رہی تھی۔ ان اطواق و سلاسل کی شکلیں کتنی ہی مختلف ہوں، ان سب کے لئے قرآن کی جامع اصطلاح شرک ہے۔ شرک کی مختلف نوعیتوں کی وضاحت کے بعد حضور نبیٔ اکرمؐ کی توجہ ان کے پیشِ نظر مرکزی پروگرام کی طرف مبذول کرائی۔ فرمایا:-

۷/۱۹۹ خُذِ الۡعَفۡوَ وَاۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡجٰهِلِيۡنَ○

(اس کا مفہوم بعد میں دیا جائے گا)۔

اس آیۂ جلیلہ میں تین اہم امور کا حکم دیا گیا ہے۔ خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے والوں سے اعراض' امر بالمعروف اور خذ العفو۔ کفار کے ساتھ تعلقات اور اُن سے اعراض برتنے کے سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں متعدد مقامات پر لکھا جا چکا ہے (انڈکس میں عنوان کفار دیکھئے)۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر امتِ مسلمہ کا بنیادی فریضہ ہے۔ آیت (۷/۱۵۷) میں خود نبیٔ اکرمؐ کا بھی یہی فریضہ بتایا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلامی نظام کا بنیادی فریضہ یہی ہے یعنی ان امور کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکنا جنہیں وہ ناجائز قرار دیتا ہے۔ اس آیت میں معروف کی جگہ عُرف آیا ہے جس سے مراد معروف ہی ہے' بالخصوص جب آیت (۷/۱۵۷) میں رسول اللہ کے متعلق "معروف کا حکم دینے والا" آیا ہے اور یہاں حضورؐ کا فریضہ' عرف کے مطابق حکم دینا بتایا گیا ہے۔ عرف کے

عرف

عام معنی کسی قوم کے رسم و رواج کے بھی ہیں۔ فقہ میں کسی قوم کے رسم و رواج کو بھی شریعت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ چیز غور طلب ہے۔ جیسا کہ متعدد مقامات پر واضح کیا جا چکا ہے قرآن کریم بالعموم' دین کے اصول و اقدار بیان کرتا ہے اور اسے اسلامی مملکت پر چھوڑتا ہے کہ وہ ان اصول کی جزئیات خود وضع کرے۔ قرآنی اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے' لیکن ان کی جزئیات بہ تقاضائے حالات' بدلی جا سکیں گی۔ اگر کوئی اسلامی مملکت یہ دیکھے کہ کسی قوم کا کوئی رواج ایسا ہے جسے قرآن کے کسی اصول کے جزئی قانون کی حیثیت سے اختیار کیا جا سکتا ہے' تو وہ اس (عرف) کو مملکتی قانون قرار دے سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ عُرف اُس قوم کے رواج ہونے کی وجہ سے اسلامی قانون تسلیم نہیں کیا جائیگا' بلکہ اس لیے اسلامی قانون تسلیم کیا جائے گا کہ اسلامی مملکت نے اسے صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ اگر کسی قوم کا کوئی عُرف (رواج) قرآنی اصولوں سے ٹکرائے گا' تو اس کا شمار معروف کے بجائے منکر میں ہوگا۔

اب آیئے خُذِ الۡعَفۡوَ کی طرف۔ جیسا کہ لغات القرآن میں بتایا گیا ہے' عَفو کے متعدد معانی ہیں جن میں دو نمایاں ہیں' یعنی (۱) درگزر کرنا۔ اور (۲) زائد از ضرورت مال و دولت۔

خُذِ الْعَفْو

جب کسی لفظ کے ایک سے زیادہ معانی ہوں اور قرآنِ کریم میں وہ لفظ مختلف آیات میں آیا ہو تو قرآنی طالب علم کے لئے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس آیت میں اس لفظ کے متعدد معانی میں سے کون سا معنٰی زیادہ موزوں ہے۔ اس کے لئے قرآن کے دیگر مقامات کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ اس طریق سے جن معانی کو ترجیح دی جاتے گی وہ قرآنی مفکر کا فکری اجتہاد ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی (بڑے سے بڑے مفکر) کا فکری اجتہاد بھی نہ وحیٔ خداوندی کی طرح حرفِ آخر ہو سکتا ہے نہ غیر متبدل۔ دوسرے تو ایک طرف، وہ خود بھی مزید غور و تدبر سے اپنے سابقہ فکری استنباط میں تبدیلی کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی تائید لغت اور قرآن کی کلی تعلیم سے ہوتی ہو۔

العفو کا لفظ آیت (۲/۲۱۹) میں آیا ہے جہاں بالبداہت "زائد از ضرورت" معنی ہی موزوں ہیں۔ چنانچہ میں نے (مفہوم القرآن میں) بھی یہی معانی لکھے اور 'مطالب الفرقان' جلد سوم (ص ۳۲۶) پر بھی اس کے مطابق وضاحت کی۔

اس کے بعد یہ لفظ (زیرِ نظر آیت ۷/۱۹۹) میں آیا تو مجھے "اپنی بصیرت کی رُو سے" اس کا دوسرا مفہوم یعنی "درگزر کرنا" موزوں دکھائی دیا۔ چنانچہ میں نے یہی ترجمہ مفہوم القرآن میں دے دیا (اس کا عام طور پر یہی ترجمہ کیا جاتا ہے)۔ اس کے بعد ایک بحث کے دوران میں نے محسوس کیا کہ یہ مفہوم مزید تحقیق کا متقاضی ہے، بالخصوص لفظ خُذْ کے پیشِ نظر جس کے معنی "وصول کرنے یا لینے" کے ہیں۔ اس سلسلہ میں سورۂ توبہ کی آیت (۹/۱۰۳) ـــــ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ـــــ اس کی مؤید تھی۔ اس غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آیت (۷/۱۹۹) میں بھی اَلْعَفْو کا وہی مفہوم زیادہ موزوں ہے جو آیت (۲/۲۱۹) میں دیا گیا ہے، یعنی زائد از ضرورت مال۔ اس آیت میں اسلامی نظام (یا اس کے سربراہ حضور نبیٔ اکرمؐ) سے کہا گیا ہے کہ جماعتِ مومنین کا زائد از ضرورت مال، اپنی تحویل میں لے لیا کرو تاکہ اس طرح اجتماعی طور پر، قرآن کا معاشی نظام قائم رہے۔ مفہوم القرآن (آیت ۷/۱۹۹) کے مفہوم میں ترمیم، اس کے نئے ایڈیشن میں کر دی جائے گی۔ البتہ اس دوران میں 'تبویب القرآن' میں عفو کے عنوان کے تابع، یہ مفہوم دے دیا گیا ہے۔ (ص ۱۰۲۴)

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ مفہوم القرآن میں اس تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ اَلْعَفْو کے دو معانی میں سے پہلی ترجیح کی جگہ دوسری ترجیح کو زیادہ مناسب سمجھا گیا ہے۔ یہ معنی لغت کی رُو سے بھی اور قرآن

کے دیگر شواہد کی روشنی میں بھی صحیح ہیں۔ اس طرح آیت (۷/۱۹۹) کا مفہوم حسب ذیل ہوگا؛

(بہرحال تم اسے رسولؐ! نظامِ ربوبیت کے قیام کے سلسلہ میں عملی پروگرام اختیار کئے رکھو۔ اس پروگرام کی رُو سے، جماعت مومنین کا زائد از ضرورت مال، ان کے پاس رہنے کے بجائے، نظامِ اسلامی کی تحویل میں رہے گا۔ اس لئے تم) اس مال کے وصول کرنے کا انتظام کرو۔ قرآنی قوانین کو عام کرتے جاؤ اور جہلا سے کنارہ کش رہو کہ وہ ناحق تمہارا وقت ضائع نہ کریں۔

واضح رہے کہ اَلْعَفْو کے وصول کرنے کا حق اسی نظام کو حاصل ہوگا جو امر بالمعروف (قرآنی قوانین نافذ کرنے) کا فریضہ ادا کرے۔ غیر قرآنی نظام، اسلام کے نام پر کسی سے ایک پائی لینے کا بھی حقدار نہیں ہوگا۔ وہ جو کچھ لے گا، غصب اور استحصال ہوگا۔

اس کے بعد ان خطرات کی طرف توجہ دلائی جو اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں پیش آئیں گے اور ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر۔ فرمایا:

(۷/۲۰۰) وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○

اگر کسی قسم کا کوئی وسوسہ (یا ان مخالفین کا کوئی سرغنہ) تم میں باہمی فساد ڈالنے کی کوشش کرے (۱۷/۵۳) یا کسی اور خرابی کا سبب بنتا نظر آئے، تو تم ضابطۂ خداوندی کے ساتھ اور شدت سے متمسک ہوکر، اس کی پناہ میں آجاؤ۔ یاد رکھو! (تمہارا) خدا سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے (۱۶/۹۸)؛ (۴۰/۲۷)۔

شَیْطٰن کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان، جلد دوم صفحہ ۵ دیکھئے جہاں بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ انسان کے وہ جذبات اور خواہشات ہیں جو اسے قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی یا سرکشی کے لئے ابھارتے ہیں اور شَیٰطِیْن اس پارٹی کے سرغنوں کو کہا گیا ہے جو دین کی مخالفت کے لئے آمادۂ نبرد آزما رہتی ہیں۔ یہ اپنے سرکش جذبات ہوں یا مخالفین

(۷/۲۰۱) کے سرغنے، ان سے محفوظ رہنے کے لئے استعاذ باللہ کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ بڑی اہم تدبیر ہے۔

اس کے مفہوم کی وضاحت مطالب الفرقان جلد دوم (ص ۳۱۲) پر کی گئی ہے۔ آیت (۷/۲۰۱) کا ذکر بھی وہیں آگیا ہے۔ اسے بغور دیکھ لیا جائے۔ ان کے برعکس؛

(۷/۲۰۲) وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ۝

(ان کے برعکس، جو لوگ قوانینِ خداوندی کی طرف رجوع نہیں کرتے، ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اوّل تو انہیں خود ہی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ اور اگر کبھی ایسا ہونے کا امکان ہوتا ہے تو) ان کے بھائی بند (جوڑی دار) انہیں ان کی غلط روی اور سرکشی میں کھینچ کر اور آگے لے جاتے ہیں اور وہ کسی مقام پر رُکتے ہی نہیں (آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ انسان کے قرین ـــــ غلط رو ساتھی اور مصاحب اسے بُری طرح تباہ کر دیتے ہیں۔ (۴۱/۲۵؛ ۴۳/۳۶ـ ۳۹؛ ۵۰/۲۳ـ ۲۸؛ ۵۱/۲۷ـ ۵۷).

غلط رو انسان کے مصاحب اِسے کس طرح تباہ کرتے ہیں، اس کے متعلق سورۂ زخرف میں ہے؛

قرین وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ۝ (۴۳/۳۶ـ ۳۸)

(لیکن اکثر لوگ اس بنیادی اصولِ حیات سے روگردانی کرتے ہیں۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ) جونہی کسی نے نظامِ ربوبیت کے تصور سے مُنہ موڑا، اُسی جیسے اور سرکش لوگ جھٹ سے اس کے ساتھ آملے اور اس پر بُری طرح سے مسلط ہو گئے (۴۱/۲۵)۔

یہ ساتھی ایسے لوگوں کو صحیح راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں (اور فریب انگیزیوں کا ایسا جال بچھاتے ہیں کہ انہیں محسوس ہی نہیں ہوتا کہ وہ صحیح راستے سے ہٹ چکے ہیں)۔

وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم بالکل سیدھی راہ پر چل رہے ہیں ـــــ

تا آنکہ ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ اُس وقت اُن

کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ کفِ حسرت مل کر کہتے ہیں کہ اے کاش! ہم میں اور ہمارے ان ساتھیوں میں بُعد المشرقین ہوتا ــــــــــ یہ ساتھی کس قدر بُرے تھے جو اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبے۔

سورۂ نساء میں ہے؛ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا (۴/۳۸) جس کا ساتھی شیطان بن جائے تو اس سے بُرا ساتھی اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ مصاحب اس کے غلط کاموں کو بھی مزین بنا کر دکھاتے ہیں (۴۱/۲۵)۔

پرانے زمانے میں یہ لوگ درباری مصاحب ہوتے تھے جن کا منصب قصیدہ خوانی ہوتا تھا۔ آج کل، عوام کی زبان میں انہیں "چمچے" کہا جاتا ہے۔ خوشامدی، بھٹئی کرنے والے، غلط کاموں پر بھی مرحبا اور سبحان اللہ کے نعرے بلند کرنے والے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ اہلِ جنت ایک دوسرے سے کہیں گے کہ ہمارا ایک قرین ہوتا تھا جو ہمیں ہمیشہ اُلٹی پٹی پڑھایا کرتا تھا۔ وہ یہاں نظر نہیں آتا۔ وہ بنظرِ غائر دیکھیں گے تو وہ جہنم میں دکھائی دے گا (۳۷/۵۱-۵۷)۔ یہ (اہلِ جنت) وہ ہوں گے جو ان مصاحبوں کی باتوں میں نہیں آئے تھے۔ جو ان کی باتوں میں آ گئے تھے، وہ بھی ان کے ساتھ جہنم میں ہوں گے اور ایک دوسرے کو الزام دیں گے کہ تم نے ہمیں تباہ کیا۔ لیکن ان کا کوئی عذر مسموع نہیں ہو گا (۲۵/۲۳-۲۸)۔

اس قسم کے مصاحبوں نے جس طرح بڑی بڑی سلطنتوں تک کو تباہ کرا دیا، تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ قرآنِ کریم نے اسی لئے ان سے محتاط رہنے کی تاکید کی ہے۔

مخالفین کا ایک ہتھکنڈہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جب دیکھتے ہیں کہ انہیں کامیابی کی کوئی امید نہیں تو وہ مفاہمت اور مصالحت Compromise کی کوشش کرتے ہیں اور حق کی دعوت دینے والوں سے کہتے ہیں کہ کچھ تم جھکو کچھ ہم جھکتے ہیں اور اس طرح باہمی صلح کر لیتے ہیں۔ جو لوگ باطل پر ہوں، اُن کے اپنے مقام سے پیچھے ہٹ جانے میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ لیکن جو حق پر ہو وہ اگر اس سے ایک قدم بھی ہٹ جائے تو اس کا کچھ باقی نہیں رہتا۔

مفاہمت کی کوشش

(مثال کے طور پر) ایک شخص کہتا ہے کہ دو اور دو چھ ہوتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ اوّل الذکر، دوسرے سے

کہتا ہے کہ آؤ! ہم باہمی صلح کر لیں. میں، اپنے مقام سے ہٹ کر، تسلیم کئے لیتا ہوں کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں. تم بھی اسے تسلیم کر لو، جھگڑا ختم ہو جائے گا. جو شخص دو اور دو چھ کہتا تھا، وہ باطل پر تھا. اس نے اگر دو اور دو پانچ مان لیا، تو بھی وہ باطل پر ہی رہے گا. لیکن جو شخص دو اور دو چار کہتا تھا، اس نے اگر دو اور دو پانچ مان لیا، تو وہ حق کو چھوڑ کر باطل پر آ گیا. وہ اسے کس طرح تسلیم کر سکتا ہے؟ لوگ اسے اُس کی ضد کہیں گے. لیکن یہ ضد نہیں. حق کہتے ہی اسے ہیں جو اپنے مقام پر اٹل ہو، بے لچک ہو. اس لئے وہ باطل سے مصالحت کر ہی نہیں سکتا. اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے　　شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

نبی اکرمؐ کی دعوت کے مخالفین حضورؐ سے اس قسم کی مصالحت چاہتے تھے. فرمایا:

(۷/۲۰۳) وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

(اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے مفاہمت کرنا چاہتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ تم ان کی مرضی کے مطابق قرآن کے احکام لاؤ. ۱۰/۱۵؛ ۱۱/۱۱۳؛ ۱۷/۷۴؛ ۶۸/۹). جب تو انہیں اس قسم کے احکام نہیں دیتا، تو یہ کہتے ہیں کہ (اگر تمہارا خدا اس بات پر راضی نہیں ہوتا تو تم اپنی طرف سے اس قسم کے احکام وضع کیوں نہیں کر لیتے؟

ان سے کہو کہ (میں کوئی بات اپنی طرف سے وضع نہیں کر سکتا). میں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے میرے نشو و نما دینے والے کی طرف سے ملتی ہے. یہ ضابطۂ قوانین تمام دنیا کے لئے بصائر و دلائل کا مجموعہ ہے اور جو لوگ اس کی صداقت پر ایمان لائیں، ان کے لئے ہدایت و رحمت کا سرچشمہ ہے.

(جیسا کہ مندرجہ بالا مفہوم میں مذکور حوالوں سے واضح ہے) قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اس "مصالحت" کا ذکر آیا ہے. سورۂ یونس میں اسے نسبتاً زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جب

کہا کہ

وَ إِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۱۰/۱۵)

جب ان لوگوں کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کئے جاتے ہیں، تو جو لوگ ہمارے قانونِ مکافات کا سامنا نہیں کرنا چاہتے، کہتے ہیں کہ یا تو تم، اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ. اور یا پھر اس (کے مطالب) میں ہی کچھ ردّ و بدل کر دو (یعنی وہ خدا کے اٹل اور غیر متبدّل قوانین کو اپنی منشاء اور مفاد کے مطابق تبدیل کرانا چاہتے ہیں)۔ ان سے کہہ دو کہ یہ چیز میرے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ میں اپنی طرف سے کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکوں. میرا مقصد صرف اس وحی کی پیروی کرنا ہے جو میری طرف نازل ہوتی ہے. اگر میں اپنے نشو و نما دینے والے کے احکام سے سرتابی کر دوں، تو اس کا قانونِ مکافات مجھے بھی نہیں چھوڑے گا. اس لئے میں اس کی گرفت سے بہت ڈرتا ہوں. اس کی سزا بڑی سخت ہوا کرتی ہے. (۱۵/۶ ; ۱۳/۳۹).

یہ رہا مخالفین کی طرف سے مصالحت کی دعوت کا جواب. لیکن ہماری حالت ان سے بھی ابتر ہے. ہم خود دین میں مصالحت سے کام لیتے ہیں. اللہ تعالیٰ نے خالصتاً اپنی کتاب کی اطاعت کا حکم دیا تھا اور اس کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کو شرک قرار دیا تھا. لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے شریعت کے متعدد مآخذ تجویز کر رکھے ہیں؛ قرآن، روایات، فقہ، تفاسیر، اجماع، قیاس وغیرہ. ان میں سے جو زیادہ Suit کرتا ہے، اسے اختیار کر لیتے ہیں. اس مسلک کا نام ہم نے "اسلام" رکھ چھوڑا ہے! سوچئے کہ کیا یہ وہی مسلک نہیں جسے اختیار کرنے کا مطالبہ مخالفینِ عرب کرتے تھے؟ اس مسلک کی وضاحت مطالب الفرقان، جلد دوم صفحہ ۳۵۹ پر کی گئی ہے. رہی سہی کسر "ناسخ و منسوخ" کے عقیدہ نے پوری کر دی. مخالفین کا مطالبہ یہی تھا کہ قرآن میں کچھ تبدیلی کر دی جائے یا اس کے احکام کو منسوخ کر کے، ان کی جگہ دوسرے احکام لائے جائیں. حضورؐ نے اسے معصیتِ خداوندی کہہ کر اُن کے مطالبہ کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا. لیکن ہم نے

قرآنِ مجید کی کثیر التعداد آیتوں کے متعلق کہہ دیا کہ وہ منسوخ ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ روایات یا فقہ کے احکام نافذ العمل ہیں (ناسخ و منسوخ کے ضمن میں دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل ص۱۲۵، جلد دوم ص۴۲۴؛ جلد سوم ص۱۷۹ اور جلد چہارم ص۲۲۶)۔ یاد رکھئے! خدا کی طرف سے جو وحی رسول اللہ پر نازل ہوئی تھی، وہ پوری کی پوری (بلاکم و کاست) قرآنِ مجید کے اندر مندرج و محفوظ ہے اور یہی امت کے لئے ضابطۂ قوانین اور تمام نوعِ انسان کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ نہ اس کا کوئی ایک لفظ منسوخ ہے اور نہ ہی کسی قسم کے اضافہ کا محتاج۔ اس لئے حضورؐ سے فرمایا کہ

وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (۷/۲۰۴)

(تم) ان لوگوں سے صرفِ نظر کر کے اپنی توجہات کو اپنی جماعت پر مرکوز رکھو اور ان سے کہو کہ) جب تمہارے سامنے قرآن پڑھا جائے (یعنی اس کے احکامات کا اعلان کیا جائے، اس کی تعلیم کی نشر و اشاعت کی جائے) تو اسے پوری پوری توجہ کے ساتھ، خاموشی سے سنا کرو۔ اس سے تمہیں، نوازشِ خداوندی سے، سامانِ نشو و نما مل جائے گا۔

قرآن کو خاموشی سے سننے کے معنی یہ ہیں کہ اس پر غور و فکر کیا جائے ـــــ مخالفین کی ایک ٹیکنیک یہ بھی تھی کہ جہاں کہیں قرآن کی آواز بلند ہو، شور مچا دیا جائے تاکہ لوگ اسے خاموشی سے سُن نہ سکیں (دیکھئے مطالبُ الفرقان، جلد اوّل ص۱۷۳)۔ یہی آج ہماری حالت ہے۔ آپ قوم کو دنیا بھر کے قصے کہانیاں سنائیے، کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ جونہی آپ نے قرآنِ خالص کی دعوت دی، تو چاروں طرف سے "مقدس شور" بلند ہونا شروع ہو گا کہ اس کی بات مت سنو۔ یہ کفر ہے، الحاد ہے، بے دینی ہے اور خدا جانے کیا کیا ہے!

(انڈکس میں عنوان "قرآن" دیکھئے)۔

اگلی آیت اسی کے تسلسل میں ہے۔ فرمایا:

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ وَ لَا تَكُنْ (۷/۲۰۵)

مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ○

(ان سے کہو جب اس قانونِ خداوندی کو اچھی طرح سُن لو تو یہ نہ سمجھ لو کہ بس مقصد پورا ہو گیا۔ اسے صبح، شام، ہر وقت، اپنے پیشِ نظر رکھو۔ اس پر غور و فکر کرو اور دل کے ایسے جھکاؤ کے ساتھ جو تمہارے تحت الشعور کی گہرائیوں سے اُبھرے (۷/۵۵) اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔ اس سے مطمئن نہ ہو جاؤ کہ قرآن کو اونچے اونچے پڑھ لیا تو تلاوتِ قرآن کا فریضہ ادا ہو گیا۔ مقصد یہ ہے کہ تم اس سے کسی حالت میں بھی غافل نہ رہو۔

تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً کے مفہوم کے لئے مطالب الفرقان جلد پنجم صفحہ ۲۱۲ دیکھئے۔

بعض حضرات اس آیت کو بھی اوقاتِ صلوٰۃ کے لئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ اوقاتِ صلوٰۃ کے سلسلہ میں تفصیلی بحث مطالب الفرقان، جلد اوّل، صفحات ۱۳۸-۱۲۴ میں گزر چکی ہے، نیز جلد چہارم صفحہ ۲۰۴ میں۔

سورۂ اعراف کی آخری آیت میں جماعتِ مومنین کی بنیادی خصوصیات بیان کر دی گئی ہیں، جہاں فرمایا:۔

(۷/۲۰۶) اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ○

خدا کے مقربین (مومنین) کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کی اطاعت سے کبھی سرتابی اختیار نہیں کرتے۔ وہ اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں انتہائی جدوجہد کرتے ہیں اور صرف اُسی کے قوانین کے سامنے جھکتے ہیں، کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے۔

یہی مضمون بعض دیگر مقامات پر بھی آیا ہے (مثلاً ۱۶/۴۹؛ ۲۱/۱۹؛ ۳۲/۱۵؛ ۴۱/۳۸)۔ عبادت، تسبیح، سجدہ کے مفہوم کے لئے انڈکس ملاحظہ فرمایئے۔ ان سے مراد قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور قرآن میں متعین فرمودہ مقاصد کے حصول کے لئے، انتہائی جدوجہد ہے۔ رکوع و سجود اس اطاعت کے علاماتی مظاہر ہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نواں پارہ ــــــــــــــــــ آٹھویں سورۃ



باب دوم
سُورۃُ الاَنفَالِ

ہنگامۂ رُستاخیز

۱۔ قریش اس نظام کے مخالف کیوں تھے؟
۲۔ ایفائے عہد کا ایمان افروز مظاہرہ۔
۳۔ دو قومی نظریہ کا عملی ثبوت۔
۴۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!
۵۔ تیر قضا اور کمانِ محمدیؐ۔
۶۔ خدا کی معیّت کا عملی ثبوت، ہر میزان کی زبانی
۷۔ مؤمن بالاتے ہر بالا ترے۔
۸۔ بد ترین خلائق ــــ عقل و فکر سے کام نہ لینے والے۔
۹۔ زندگی اور عمر میں لطیف فرق۔
۱۰۔ سیلاب نہ پُرسد کہ در خانہ کجا است۔
۱۱۔ انفرادی نیکیاں اجتماعی تباہیوں کو روک نہیں سکتیں۔
۱۲۔ دین کے تمکّن کے لئے مستحکم مملکت لاینفک ہے۔
۱۳۔ نظامِ ربوبیت کی راہ میں سنگِ گراں ــــ بیوی بچے۔
۱۴۔ تقسیمِ دولت کا اصول ــــ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق۔
۱۵۔ مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡہُ کا مطلب۔
۱۶۔ نفسیاتی تغیّر کے بغیر خارجی انقلاب آ نہیں سکتا۔
۱۷۔ قانون کا احترام کس طرح ہو سکتا ہے۔
۱۸۔ صحابہؓ کی عظمت۔
۱۹۔ بیٹی کا ہار۔

باب دوم

سُورَۃُ الْاَنْفَال

آٹھویں سورۃ

اس سورت میں جنگ کے متعلق عمومی ہدایات دی گئی ہیں اور جنگِ بدر کے احوال وکوائف کا خصوصی تذکرہ ہے۔ بدر کا ضمنی ذکر اس سے پہلے سورۂ آلِ عمران (آیت ۱۲۲/۳) میں آیا ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۲۰۴)۔ اس کی تفصیلات زیرِ نظر سورہ میں دی گئی ہیں۔

قرآنِ کریم کی رو سے جنگ کن حالات میں ناگزیر ہوجاتی ہے اور اس سے مقصد کیا ہوتا ہے، اختصاراً اس موضوع پر مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۱۹۹-۸۰)، جلد چہارم صفحہ ۳۷۸ پر لکھا گیا ہے لیکن تفصیلی بحث جلد سوم (صفحہ ۲۶۴) میں کی گئی ہے (متعین طور پر انڈکس میں جنگ، جہاد اور قتال کے عنوانات دیکھئے)۔ چند الفاظ میں یوں سمجھئے کہ قرآنِ کریم کا مقصد ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں شرف وتکریم انسانیت کا فروغ ہو اور کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو نہ محتاج۔ پابندی ہو تو اُن اقدارِ خداوندی کی جن کے تحفظ سے یہ نظام قائم رہتا ہے۔ اس میں نہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل ہوتا ہے نہ نظامِ سرمایہ داری بار پاسکتا ہے، نہ مذہبی پیشوائیت کا وجود باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مفاد پرست قوتوں کی طرف سے اس نظام کے قیام واستحکام کی شدید مخالفت ہوگی۔ کوشش کی جائے گی کہ انہیں بدلائل و براہین سمجھایا جائے کہ یہ نظام خود ان کے لئے بھی بڑا مفید ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود اگر وہ اپنی مخالفت سے باز نہ آئیں اور بزورِ شمشیر اسے ختم کر دینا چاہیں تو اپنی مدافعت کے لئے اس نظام کے حامیوں کو بھی میدانِ جنگ میں اترنا پڑیگا۔ اسی قسم کی پہلی جنگ تھی جو نبی اکرمؐ کو ۲ھ میں بدر کے میدان میں لڑنی پڑی۔ اس کا پس منظر سامنے

آجانے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ جماعتِ مومنین میدانِ جنگ میں اُترنے کے لئے کس طرح مجبور ہوگئی تھی۔ اس کے نتائج کس قدر دُور رس تھے

جنگِ بدر کا پس منظر

نبیٔ اکرمؐ نے اپنی دعوت کا آغاز مکی زندگی میں کیا اور وہیں سے قریش نے اس آواز کی مخالفت شروع کردی۔ اس کے باوجود اس دعوتِ تبلیغ کا اثر سُبک خرامی سے آہستہ آہستہ پھیلتا چلا گیا۔ جو سعادتمند افراد اس پر لبیک کہتے وہ قریش کی ایذا رسانیوں اور صعوبات انگیزیوں کا نشانہ بنتے۔ اس کا سلسلہ اس قدر دراز اور ناقابلِ برداشت ہوگیا کہ ایک مختصر سی جماعت حبش کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئی۔ ان میں حضرت عثمانؓ اور اُن کی حرم محترم (رسول اللہؐ کی صاحبزادی) حضرت رقیہؓ بھی شامل تھیں۔ لیکن قریش کی مخالفت کا جوش ٹھنڈا نہ ہوا۔ آخرِ کار خود نبیٔ اکرمؐ (صحابہؓ کی مختصر جماعت کے ساتھ) ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے۔ عام حالات میں اب قریش کو اُن کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیئے تھا کیونکہ اب نہ تو مکہ میں اُن کے کانوں میں وہ آوازیں پڑتی تھیں جن کے متعلق وہ کہتے تھے کہ وہ انہیں ناگوار گزرتی ہیں اور نہ ہی ان کی طرف سے انہیں کوئی خطرہ ہی لاحق تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے باوجود قریش اُن کا پیچھا کیوں کررہے تھے۔ اس کی وجہ کا سمجھ لینا چنداں دشوار نہیں۔ حضورؐ مکہ میں جس نظام کے قیام کی دعوت دیتے تھے اس سے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ

قریش کی مخالفت کی وجہ

اگر یہ نظام (مکہ چھوڑ) ملک کے کسی حصے میں بھی قائم ہوگیا تو اس کے انسانیت ساز نتائج میں اس قدر کشش اور جاذبیت ہوگی کہ لوگ جُوق در جُوق اس کی طرف کھنچے چلے جائیں گے اور اس طرح قریش کی زندگی کا سارا نظام تہ و بالا ہوجائے گا۔ ان کی زندگی کا کاروبار غلاموں کے سر پر چلتا تھا۔ اسلامی نظام میں آقا اور غلام کی تمیز ہی نہیں رہتی تھی۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس نظام کے قائم ہوجانے کے بعد ان کے غلام اور لونڈیاں ان کے پاس رہ نہیں سکتے تھے۔ قریش کعبہ کے متولی تھے اور اس مذہبی پیشوائیت کی بنا پر وہ تمام قبائل کے نزدیک واجب التکریم تھے۔ اسلامی نظام میں مذہبی پیشوائیت اور ذاتی تولیتِ کعبہ کا سلسلہ ہی ختم ہوجاتا تھا۔ اسی احترام کی وجہ سے قریش کی تجارت بھی محفوظ تھی جس کی وجہ سے ان کے سرمایہ دارانہ کاروبار کو بڑا فروغ حاصل تھا۔ اسلامی نظام میں سرمایہ داری کا وجود باقی نہیں رہتا۔ نسلی اعتبار سے قریش سب سے بڑی امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ اسلامی نظام میں نسلی تفوق اور نسبی امتیاز باقی

نہیں رہتا۔ یہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر قریش اسے برداشت ہی نہیں کرسکتے تھے کہ ملک کے کسی حصہ میں بھی یہ اسلام قائم ہوجائے۔ علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں نوحۂ بوجہل کے عنوان سے اس کا نقشہ بڑے دلآویز انداز میں کھینچا ہے۔ اسے ہم مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۱۹۹ پر بڑی تفصیل سے پیش کرچکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے تہیّہ کرلیا کہ مسلمانوں کا تعاقب کیا جائے اور جب تک ان کی تحریک کا استیصال نہ کرلیا جائے چین سے نہ بیٹھا جائے۔ ہجرتِ نبی اکرمؐ سے پہلے عبداللہ بن اُبی مدینہ کا رئیس تھا۔ قریش نے اسے خط لکھا کہ:

> تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ انہیں قتل کرڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کردیں گے اور تمہیں فنا کرکے تمہاری عورتوں پر تصرّف کریں گے۔[1] (بحوالہ سنن ابوداؤد)

نبی اکرمؐ کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے عبداللہ بن اُبی کو سمجھایا کہ اس مخالفت میں تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے۔ اس لئے کہ (اُس کے بھائی بند) انصار مسلمان ہوچکے تھے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے قریش کی بات ماننے سے انکار کردیا۔ اس پر قریش نے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔ ۲ ھ کے اوائل میں مکہ کے ایک رئیس، کرز بن جابر فہری، نے مدینہ کی ایک چراگاہ پر حملہ کیا اور مسلمانوں کے مویشی لوٹ کرلے گیا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب قریش کا قافلہ شام کی طرف تجارت کے لئے گیا ہوا تھا۔ اس قافلہ کو واپسی پر اسی راستے سے گزرنا تھا۔ امیر کارواں ابوسفیان کو کسی نے یہ غلط خبر پہنچادی کہ مسلمان تمہارے قافلے کو لوٹنے کی فکر میں ہیں۔ اُس نے اس کی اطلاع قریشِ مکہ کو بھیج دی۔ وہ

قریش کی لشکر کشی

پہلے ہی مدینے پر حملہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ اُونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ! ایک لشکرِ جرّار لے کر مدینہ کی طرف اُمنڈ آئے۔ ہزار سپاہیوں کی جمعیّت، سو سواروں کا رسالہ، رسد کا یہ انتظام کہ دس دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ تمام رؤسائے قریش (باستثنا ابولہب) شریکِ فوج۔ ان کے مقابل، حضورؐ کے جانثاروں کی کُل جماعت ۳۱۳ نفوس پر مشتمل تھی اور بےسروسامانی کا یہ عالم کہ ان کے ساتھ کُل دو گھوڑے تھے۔ قریش کو بدر کے مقام کے قریب

---

[1] یہ تمام تفاصیل سیرتِ نبویؐ پر میری کتاب "معراجِ انسانیت" میں مذکور ہیں۔

معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے باہر نکل گیا ہے اور اب اندیشہ کی کوئی بات نہیں لیکن یہ موہوم خطرہ تو محض ایک بہانہ تھا۔ اُن کا مقصد اسلامی نظام کے خطرہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا تھا۔ وہ ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ وادی کے دوسری طرف حضورؐ فروکش تھے۔ حضرت حباب بن منذرؓ ایک صحابی تھے۔ انہوں نے خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ میدان کا یہ انتخاب وحی کی رُو سے ہوا ہے یا حضورؐ نے اپنی رائے سے ایسا کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ وحی کا حکم نہیں۔ میں نے خود ہی اندازہ کیا ہے کہ یہ مقام ہمارے لئے مفید رہے گا۔ اس پر حضرت حبابؓ نے کہا کہ پھر اس مقام سے فلاں مقام زیادہ مناسب ہے۔ ہمیں وہاں جاکر اترنا چاہیے۔ حضورؐ نے معاملہ کے ان تمام پہلوؤں پر غور کیا جنہیں حضرت حبابؓ نے پیش کیا تھا، اور فرمایا کہ حبابؓ کی رائے زیادہ صائب ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اس پر عمل فرمایا۔ رات کو بارش ہوئی تو موقع کے حسنِ انتخاب نے میدان کا نقشہ الٹ دیا۔ اب جو دیکھا تو بساطِ جنگ کا ہر گوشہ مجاہدین کے حق میں تھا۔



حضورؐ کا ہر ارشاد وحی پر مبنی نہیں ہوتا تھا

یہاں ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ وحی، تمام کی تمام قرآن میں محفوظ نہیں۔ حضورؐ نے تمام عمر جو کچھ فرمایا اور جو کچھ کہا وہ بھی وحی کی رُو سے تھا۔ اس وحی کو وحیٔ خفی یا وحیٔ غیر مکتوب کہا جاتا ہے اور یہ احادیث میں درج ہے۔ اس عقیدہ کے خلافِ حقیقت ہونے کے سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں تفصیل سے گفتگو کی جاچکی ہے (دیکھئے انڈکس میں عنوانات وحی اور حدیث)۔ اس مقام پر یہ دیکھئے کہ حضورؐ نے جنگ کے میدان کے متعلق ایک فیصلہ فرمایا؛ دریافت کرنے پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ وہ فیصلہ وحی کی رُو سے نہیں کیا گیا، آپؐ کا قیاس ہے۔ اس پر حضرت حبابؓ نے متبادل موقع کی تجویز پیش کی جسے حضورؐ نے قبول فرمالیا۔ اس واقعہ سے بھی یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ حضورؐ کے اپنے ارشادات یا عمل وحی کی رُو سے نہیں ہوتے تھے۔ وحی وہی تھی جو قرآن میں درج ہوجاتی تھی۔

سب سے پہلے روزے

روزے پہلے پہل ۲ھ میں فرض ہوئے تھے اور یہ اسی رمضان کی سترہ تاریخ تھی جب حق و باطل کا یہ معرکہ پیش آگیا۔ قرآن کریم نے روزوں کا مقصد یہ بتایا ہے کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (۲/۱۸۵) تاکہ تم اس قابل ہوجاؤ کہ دنیا میں خدا کی کبریائی (اقتدارِ اعلیٰ) قائم کرسکو۔ ان سترہ دنوں کے روزوں نے اس کا عملی مظاہرہ کرکے

دکھا دیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے روزوں میں اور مومنین کے روزوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ وہی فرق جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اس معرکہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب دونوں فوجیں میدانِ جنگ میں صف آرا ہوگئیں تو آپؐ جھولی پھیلائے بارگاہِ ایزدی کے حضور کھڑے ہو گئے اور والہانہ جذب و انہماک سے عرض کیا کہ:

حضورؐ کی دُعا

بار الہٰا! اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج مٹ گئی تو پھر قیامت تک تیری عبودیت اختیار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

حضورؐ اس جذب و کیف سے یہ دُعا فرما رہے تھے اور محویت کا یہ عالم تھا کہ ردائے مبارک کندھوں سے گر پڑتی تھی اور حضورؐ کو خبر تک نہ تھی۔ حضورؐ کی یہ دعا مبنی بر حقیقت تھی۔ حضورؐ آخری نبی تھے اور آپؐ کی عمر بھر کی دعوت و تبلیغ کا ماحصل یہی تین سو تیرہ نفوس تھے۔ اگر وہ اُس وقت ختم ہو جاتے تو پھر قیامت تک ایسی جماعت پیدا نہ ہو سکتی۔ اس معرکہ کی اہمیت کا یہ عالم تھا۔

عین اُس وقت دو صحابی (حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور ابو حسیلؓ) دوڑتے دوڑتے آئے اور صفوں میں شامل ہوگئے۔ ایسے موقع پر لشکر میں ایک سپاہی کا اضافہ بھی ہزار مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ صحابہؓ کو بڑی خوشی ہوئی۔ آنحضرتؐ کے دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ ہم کسی اور طرف سے آرہے تھے۔ راستہ میں کفار نے روکا کہ تم محمدؐ کی مدد کو جا رہے ہو۔ ہم نے انکار کیا اور وعدہ کیا ہم اس جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔

ایفائے عہد کی عدیم النظیر مثال

اس طرح ہم مجاہدین سے آملے ہیں۔ آپؐ نے سُنا تو فرمایا کہ تم نے اُن سے عدم شرکت کا وعدہ کیا ہے تو اس کا ایفا کرنا ضروری ہے۔ تم جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے۔ فکر نہ کرو، ہماری مدد اللہ کرے گا۔

غور کیجئے! بلندیٔ کردار اور حسنِ سیرت کی اس قدر تابندہ مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟ اس کے برعکس یہ دیکھئے کہ ہمارے زمانے کے اقامتِ دین کے مدّعی ہمیں کیا تعلیم دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان، جلد چہارم، صفحہ ۵۸ میں گزر چکی ہے۔

دوقومی نظریہ کا عملی مظاہرہ

دونوں صفیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہیں۔ ان میں ہمیں ایک عظیم حقیقت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

مطالب الفرقان جلد پنجم (صفحہ ۲۲۵ - ۲۳۲) میں بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ مجید نے نوعِ انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ میں ایک عظیم انقلاب یہ بھی برپا کیا کہ اُس نے قومیت کا مدار وطن، نسل، رنگ، زبان وغیرہ کے اشتراک کے بجائے، دین کا اشتراک قرار دیا۔ اسی معیار کی رُو سے، دنیا بھر کے مسلم ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں اور تمام غیر مسلم، ان کے بالمقابل، دوسری قوم کے افراد (تفصیل کے لئے دیکھئے انڈکس میں عنوانات قوم، قومیت، دوقومی نظریہ، اُسوۂ ابراہیمی وغیرہ)۔ بدر کے اس میدان میں یہ "دوقومی نظریہ" ایسی محسوس اور مرئی شکل میں سامنے آجاتا ہے کہ اس کی صداقت میں کسی قسم کا ابہام یا التباس نہیں رہتا۔ اِس میدان میں دونوں طرف جو افراد ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں، ان کا وطن ایک ہے، نسل ایک ہے، زبان ایک ہے۔ حتّٰی کہ حسب ونسب کے لحاظ سے بھی وہ ایک ہیں۔ لیکن اس اشتراک کے باوجود، وہ دو ایسے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں کسی قسم کا اشتراک نہیں۔ اس تفریق وتقسیم کی بنیاد کیا ہے؟ کفر اور اسلام ـــــ یہی وہ معیارِ تفریق تھا جس کی بنا پر ایک طرف حضرت ابوبکرؓ تھے تو دوسری طرف مقابلہ میں اُن کا بیٹا۔ اِدھر حضرت حذیفہؓ تھے تو صفِ مخالف میں ان کا باپ عتبہ۔ اِدھر حضرت عمرؓ تھے، اُدھر آپ کا ماموں۔ اِدھر حضرت علیؓ تھے تو دوسری طرف اُن کے بھائی عقیل۔ نہیں، ذرا آگے بڑھئے۔ اِدھر خود (ذاتِ رسالتمآبؐ) محمدؐ تھے تو سامنے کی صف میں آپ کے چچا عبّاس اور داماد ابوالعاص۔ یہی تھی وہ تقسیم وتفریق جس کی بنا پر حبش کا رہنے والا اپنوں میں سے تھا، لیکن حقیقی چچا غیروں میں سے۔ روم کا صہیب یگانہ تھا لیکن حقیقی بیٹا بیگانہ۔ اسی سے دوقومی نظریہ (جس کا آغاز سلسلۂ نزولِ وحی کی ابتدا ـــــ عہدِ حضرت نوحؑ سے ہو چکا تھا) ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آرہا تھا۔



اب سورۃ انفال ہمارے سامنے آتی ہے۔

(۸/۱) يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ

وَ رَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ○

اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ حکومت کی جو آمدنی مقررہ واجبات کے علاوہ ہو وہ کس کے پاس جائے گی[1]؟ ان سے کہہ دو کہ وہ آمدنی "خدا اور رسول" (نظامِ مملکت) کی ہوگی۔ (تم اس بارے میں جھگڑو نہیں بلکہ) قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور آپس میں معاملات درست رکھو اور ہمواریاں پیدا کرتے رہو اور "خدا و رسول" — نظامِ خداوندی کی اطاعت کرتے رہو۔ یہی مومنین کا شعار ہے۔

مالِ غنیمت

عربوں کے ہاں عام ذریعہ معاش "مالِ غنیمت" تھا یعنی جو کچھ دشمن سے لوٹ لیا جائے۔ عام قاعدہ یہ تھا کہ جو سپاہی دشمن کے جس فرد کو قتل کر دے اُس کا مال اُس سپاہی کی ملکیت میں آجاتا تھا۔ یہی (لوٹ کا مال) ان کے لئے جنگ کا جذبۂ محرکہ تھا۔ اس (لُوٹ کے مال) کے لئے ان کی اصطلاح "غنیمت" تھی۔ اَلْغَنَمُ کے معنی بھیڑ بکریاں ہیں۔ چونکہ عربوں کے معاشرہ میں مویشی ہی سب سے بڑی دولت تھی، اس لئے جنگ میں بھی زیادہ تر یہی ہاتھ آتے تھے۔ اس اعتبار سے جنگ میں لوٹے گئے مال کو غنیمت کہا جاتا تھا۔ (قرآنِ کریم میں یہ اصطلاح ان مقامات میں آتی ہے (۶۹، ۸/۴۱؛ ۴/۹۴؛ ۱۹، ۱۵، ۴۸/۲۰)۔

(ضمناً) مرورِ زمانہ سے جس طرح الفاظ کے معانی میں تبدیلی آجاتی ہے، اس کی ایک مثال لفظِ غنیمت بھی ہے۔ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) غَنَمٌ بھیڑ بکریوں کو کہا جاتا تھا۔ یہیں سے لفظ "غنیمت" بنا۔ اس سے آگے چل کر "غنیم" جس کے معنی دشمن ہیں۔ ہمارے ہاں لفظ غنیمت جس مفہوم کے لئے بولا جاتا ہے، وہ ان سب سے مختلف ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "اس گئے گزرے زمانے میں ان کا دم غنیمت ہے"۔



---

[1] اَنْفَالٌ جمع ہے نَفْلٌ اور نَفَلٌ کی۔ اس کے معنی "زیادتی" کے ہیں، یعنی جو چیز زیادہ ہو۔ اس آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو مال لوگوں کی ضروریات سے زیادہ ہو (فاضلہ دولت) وہ ربوبیتِ عامہ کے لئے مملکت کی تحویل میں رہے گا۔ اس کی تائید (۲/۲۱۹) سے بھی ہوتی ہے، نیز (۷/۱۹۹) سے۔

جنگ میں ہاتھ آنے والے مال کے لئے دوسرا لفظ ـــــ فَيْءٌ ـــــ ہے۔ جس انداز سے یہ لفظ (۵۹/۶) میں استعمال ہوا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ وہ مال ہے جو دشمن سے مقابلہ کے بغیر حاصل ہو جائے، یعنی وہ مال جسے دشمن لڑے بغیر میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگ جائے۔ آیت (۵۹/۶) کے علاوہ یہ لفظ آیت (۵۰/۳۳) میں بھی آیا ہے۔ اس کا مفہوم اس مقام پر بیان کیا جائے گا۔

انفال اس سلسلہ کی تیسری اصطلاح "انفال" ہے۔ اَلنَّفْلُ کے معنی ہیں ہر وہ عمل جو واجب سے زیادہ ہو۔ (مثلاً آیت (۱۷/۷۹) میں رسول اللہ کے متعلق ہے: وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ...... یعنی رات کا یہ جاگنا فرائض میں داخل نہیں۔ یہ فرائض پر اضافہ ہے اور حضورؐ کے لئے مختص (تشریح اپنے مقام پر آئے گی)۔ آیت (۲۱/۷۲) میں یہ لفظ پوتے کے لئے آیا ہے، یعنی بیٹے سے زائد۔ چونکہ بعض لوگ "انفال" سے مراد بھی مالِ غنیمت لیتے ہیں، اس لئے ہم نے اس مقام پر اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھا ہے۔ ورنہ ہمارے نزدیک اس سے مُراد وہ تمام آمدنی ہے جو حکومت کی طرف سے عائد کردہ واجبات کے علاوہ ہو (انہیں عطیات کہہ لیجئے۔ تفصیل ان امور کی 'معاشی نظام' کے عنوانات میں ملے گی جس کے لئے انڈکس دیکھئے)۔

قرآنِ کریم نے جنگ کے سلسلہ میں جو اصلاحات کی ہیں، ان میں ایک اہم اصلاح مالِ غنیمت کے متعلق ہے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، عربوں کے ہاں مالِ غنیمت سے مراد لوٹ کا مال تھا، یعنی جو جس کے ہاتھ آجائے، وہ اسی کا ہو جائے۔ یہی لوٹ کا مال اُن کا بیشتر ذریعۂ معاش تھا اور جنگ کا جذبۂ محرکہ۔ اسی بنا پر وہ جنگوں کا سلسلہ جاری رکھتے تھے ـــــ چاہتے ہی نہیں تھے کہ یہ سلسلہ ختم ہو۔

انقلاب آفریں اصلاح قرآنِ کریم نے بیک جنبشِ قلم اس سارے سلسلہ کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ مالِ غنیمت افراد کی ملکیت نہیں ہوگا (کہ جو جس کے ہاتھ میں آجائے وہ اُسی کا ہو جائے)۔ یہ سب مال اسلامی مملکت کے ہاں جمع ہوگا اور وہ اسے افرادِ مملکت کی ضروریات کے مطابق تقسیم کرے گی۔ اس سے نہ تو اس مال کی ناہموار تقسیم باقی رہی اور نہ ہی جنگ کا جذبۂ محرکہ مالِ غنیمت۔ اس کا جذبۂ محرکہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ قرار پاگیا۔ جذبات کا اس طرح بدل دینا آسان کام نہیں تھا۔ ایسا نبیؐ اکرمؐ کی تعلیم و تربیت کی رُو سے ہی ممکن تھا۔ ان "لٹیرے" عربوں میں یہ تبدیلی کس حیرت انگیز طریق سے رونما ہوئی تھی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ جب

ایران کا مالِ غنیمت

ایران فتح ہوا تو سپہ سالار حضرت سعد بن وقاصؓ نے تمام مالِ غنیمت (عرب جس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے تھے) مرکز میں بھیج دیا اور حضرت عمرؓ کو خط میں لکھا کہ اس مال سے جو مسرت آپ کو ہو گی اس سے کہیں زیادہ وجہ مسرت ایک اور بات ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ تمام نوادرات ہماری افواج کو ایسے ایسے مقامات سے ملے ہیں جہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ ہمارے سپاہیوں میں سے کسی نے ایک سوئی تک بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب مال لاکر مرکز میں جمع کر دیا۔ یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے اور فرمایا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکتی ہے؟ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ عمرؓ! تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری سپاہ اس قدر نیک نیت کیوں ہے؟

چونکہ آپ کا دامن پاک ہے، اس لئے آپ کی رعایا بھی پاک دامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو رعایا کی نیت میں بھی فرق آ جاتا۔ (شاہکارِ رسالت صفحہ ۱۸۲)

رعایا تھی یا ان کا سربراہ، اُن عربوں میں یہ محیّر العقول تبدیلی قرآنی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھی۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن مجید نے سب سے پہلی اصلاح یہ کی کہ مالِ غنیمت لوٹا نہیں جائے گا۔ یہ سب مملکت کے بیت المال میں جمع ہوگا اور حکومت کی طرف سے حسبِ ضرورت اس کی تقسیم ہو گی۔ (ان امور کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں مالِ غنیمت کی تقسیم کی آیات آئیں گی)۔

(ضمناً) آیت زیرِ نظر میں ہے کہ یہ مال "اللہ اور رسول" کے لئے ہے۔ یہ بحث سابقہ جلدوں میں بالتفصیل سامنے آ چکی ہے کہ "اللہ اور رسول" سے مراد اسلامی مملکت یا قرآنی نظامِ حکومت ہوتا ہے۔ اس کے لئے انڈکس دیکھئے، بالخصوص جلد چہارم، صفحات ۲۷۲، ۴۰۰، ۳۴۰۔

مومنین کی خصوصیات

آیت کے اخیر میں کہا تھا، اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ۔ اگلی آیت میں مومنین کی بنیادی خصوصیات کا ذکر ان الفاظ میں کر دیا:

(۸/۲) اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَاِذَا تُلِيَتۡ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُهٗ زَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ۚ

مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ جب تعلیم خداوندی کا مجموعی تصور ان کے سامنے لایا جاتا ہے
تو (اس کی خلاف ورزی سے جو تباہی آتی ہے اُس کے احساس سے) ان کے دل کانپ
اٹھتے ہیں اور جب قوانین خداوندی ان کے سامنے آتے ہیں تو (اُن پر عمل پیرا ہونے
کے خوشگوار نتائج کے تصور سے) ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے نشو و نما دینے
والے (کی رہنمائی) پر پورا پورا بھروسا رکھتے ہیں کہ وہ انہیں کبھی دھوکا نہیں دے گی۔

توکّل کا مفہوم مطالب الفرقان جلد چہارم صـ۲۰۲ پر بیان ہو چکا ہے. یہ تھا مومنین کی قلبی کیفیت کا عالم. ان کی عملی زندگی کے متعلق فرمایا؛

(۸/۳) الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

یہ لوگ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور جو سامانِ نشوونما انہیں ملتا ہے' اسے نوعِ انسان
کی پرورش کے لئے کھلا رکھتے ہیں.

اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور انفاق' نظامِ خداوندی کے بنیادی ستون ہیں جن کے متعلق تفصیلی گفتگو سابقہ جلدوں میں ہو چکی ہے (ملاحظہ ہو انڈکس). ایمان وعمل کی ان خصوصیات کی حامل جماعت کے متعلق کہا:

(۸/۴) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

یہ ہیں پکے اور سچے مومن. ان کے نشوونما دینے والے کے ہاں' ان کے مدارج بہت بلند
ہیں اور ان کے لئے سامانِ حفاظت اور باعزت رزق فراواں ہے. (۸/۷۴؛ ۶۴-۸/۶۲
۹/۱۰۰؛ ۵۷/۱۰؛ ۴۸/۲۹).

یہ تھی سرفروشوں کی وہ جماعت جسے اب دین کی حفاظت کے لئے' شمشیر بکف اور کفن بردوش' میدانِ کارزار میں اترنا تھا.

اس کے بعد جنگِ بدر کی تفاصیل سامنے آتی ہیں جن کا آغاز جنگ کی Strategy سے

متعلق بحث سے ہوتا ہے۔

(۸/۵-۶) كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۪ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ يُجَادِلُوْنَكَ فِى الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝

دلیکن یہ نظام یونہی قائم نہیں ہوجاتا اور اس انداز کا رزقِ کریم بلا محنت و مشقت نہیں مل جاتا۔ اس کے لئے بڑی قربانیوں اور جانفشانیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً بدر کی جنگ کا واقعہ ہی لو جس میں تو اپنے نشو ونما دینے والے کے پروگرام کے مطابق دشمن کے مقابلہ کے لئے مدینہ سے باہر نکلا تھا، حالانکہ تمہاری جماعت (مومنین) میں سے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو مشورہ کے وقت اس سے متفق نہیں تھا۔ وہ باہر نکلنے کے بجائے شہر کے اندر رہتے ہوئے مدافعانہ جنگ کے حق میں تھا[1]۔

وہ تجھ سے اس باب میں بحث کرتے تھے کہ تمہارا یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں، حالانکہ معاملہ ان پر بالکل واضح ہوچکا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ بحالاتِ موجودہ شہر سے باہر نکلنا، دیدہ و دانستہ اپنے آپ کو موت کی طرف ہانک کر لے جانے کے مرادف ہوگا۔

یہاں ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ مطالب الفرقان جلد چہارم (صفحہ ۲۱۵) میں بتایا جاچکا ہے،

---

[1] ہم نے جس انداز میں مفہوم بیان کیا ہے اس سے مترشح ہوگا کہ یہ ایک گزرے ہوئے واقعہ کی داستان ہے لیکن يُجَادِلُوْنَكَ اور يُسَاقُوْنَ (مضارع) کے پیشِ نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات عین اس وقت نازل ہوئیں جب واقعہ سرزد ہو رہا تھا۔ اس اعتبار سے اس واقعہ کا بیان زمانۂ حال کے الفاظ میں کرنا زیادہ موزوں ہوگا اور آیت ۷ کا مفہوم بھی زیادہ واضح ہوجائے گا، یعنی وہ وعدہ کسی گزرے ہوئے زمانہ میں نہیں ہوا تھا بلکہ حال ہی کا بیان ہے۔ خدا جماعتِ مومنین سے یہ وعدہ کر رہا ہے۔

رسول اللہ کو حکم دیا گیا تھا کہ وحی کے احکام و اصول کو عملاً نافذ کرنے کے طور طریقوں کے متعلق اپنے رفقاء (صحابہ کبارؓ) سے مشورہ کیا کریں۔ اس مشورہ کے وقت ہر ایک کو اظہارِ رائے کی کس قدر آزادی حاصل تھی؛ اس کی ایک جھلک آیۂ زیرِ نظر میں سامنے آتی ہے۔ یہ اسلامی زندگی کی پہلی جنگ تھی جس میں کیفیت یہ تھی کہ ایک طرف یہ بے سروسامان مہاجرین تھے اور ان کے ساتھ انصار کی جماعت جنہیں بالعموم لڑائیوں سے واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ مقابلہ میں قریش کا لشکرِ جرار تھا جو فنونِ حرب کے بھی ماہر تھے اور سامان و اسلحہ بھی ان کے پاس وافر تھا۔ ان حالات میں

مشاورت کا منظر

جماعتِ مومنین کے بعض افراد کی ہچکچاہٹ قابلِ فہم تھی۔ وہ باہر نکل کر جنگ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ واضح رہے کہ یہ حضرات جنگ میں شرکت سے اس لئے نہیں گھبراتے تھے کہ اس میں جان کا خطرہ تھا۔ یہ تو وہ مومن تھے جو اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے (۹/۱۱۱)۔ انہیں باہر نکل کر جنگ کرنے میں زیادہ خطرات اور نقصانات کا احتمال تھا۔ اور مجلسِ مشاورت میں بحث اسی نکتہ پر تھی۔ اس بحث میں آزادیٔ رائے کس حد تک تھی، اس کے لئے قرآن کریم میں یُجَادِلُوْنَكَ آیا ہے۔ جدال اس قسم کی بحث کو کہتے ہیں جس میں دوسرے کی بات کو یونہی کاٹ نہ دیا جائے، بلکہ اسے اجازت ہو کہ وہ جو کچھ اور جس قدر کہنا چاہتا ہے، کہے۔ یہ بحث اُمتیوں کی اپنے رسولؐ کے ساتھ ہوتی تھی۔ غور فرمائیے کہ اس سے حضورؐ نے اپنے متبعین کی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کی کس قسم کی تربیت فرمائی تھی۔ اس کے مقابلہ میں آپ آج کے حکمرانوں کو تو ایک طرف، دین کے علمبرداروں کو دیکھئے۔ ان سے ذرا سا اختلاف کیجئے تو جھٹ سے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے اور اس کے باوجود دعویٰ یہ ہے کہ ہم سنتِ رسول اللہ کے سب سے بڑے پیرو ہیں۔

اس کے بعد ایک اور سوال بھی فیصلہ طلب ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قریش کا ایک قافلہ سامانِ تجارت کے ساتھ مدینہ کے پاس سے گزر رہا تھا۔ بعض کا خیال یہ تھا کہ اس پر چھاپا مارا جائے لیکن منشائے خداوندی اس کے برعکس تھا۔

(۸/۷) وَ اِذْ یَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَیْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ یُرِیْدُ

اللّٰہُ اَنۡ یُّحِقَّ الۡحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَ یَقۡطَعَ دَابِرَ الۡکٰفِرِیۡنَ ۙ﴿۷﴾
لِیُحِقَّ الۡحَقَّ وَ یُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۚ﴿۸﴾

پھر جب تم آگے بڑھے تو حالات بتا رہے تھے کہ اللہ کے اُس وعدے کے مطابق جو اس نے ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجے میں استخلاف فی الارض کے لئے کر رکھا ہے (۲۴/۵۵)، فریقِ مقابل کے دو گروہوں میں سے ایک پر تم ضرور غالب آجاؤ گے۔ تم یہ چاہتے تھے کہ تمہارا ٹکراؤ اُس گروہ کے ساتھ ہو جو غیر مسلح تھا اور لڑائی کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اللہ یہ چاہتا تھا کہ تمہارا مقابلہ ان کے لشکر سے ہو تاکہ اس طرح یہ ثابت ہو جائے کہ حق، باطل پر غالب آیا کرتا ہے اور اس سے انکار کرنے والوں کی جڑ کٹ جایا کرتی ہے۔

اور اس طرح حق، حق اور باطل، باطل بن کر دنیا کے سامنے آجائے، خواہ مجرمین پر یہ بات کیسی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

یہاں سے پھر اسلام میں جنگ کا مقصد نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ جماعتِ مومنین کے سامنے دونوں ممکنات Possibilities تھیں۔ وہ جنگ کئے بغیر قافلہ کو بھی لوٹ سکتے تھے اور دوسری طرف اس کا بھی امکان تھا کہ جنگ کی صورت میں وہ قریش پر غالب آجائیں۔ جن ناساعد حالات کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، اس کے پیشِ نظر وہ فطری طور پر قافلہ پر چھاپہ مارنے کو ترجیح دیتے تھے لیکن اس سے منشائے خداوندی پورا نہیں ہوتا تھا۔ منشائے خداوندی یہ تھا کہ باہمی ٹکراؤ سے یہ حقیقت نکھر کر اور اُبھر کر سامنے آجائے کہ حق کی علمبردار جماعت، ساز و براق کی کمی (بلکہ فقدان) کے باوجود، کس طرح باطل پرست جماعت کو شکست دے سکتی ہے۔ اعلائے کلمۃ الحق یعنی حق پر مبنی نظریہ اور مسلک کا غلبہ، مومنین کا فریضۂ حیات ہے اور ان کے دین کا مقصد۔ اس کے مقابلہ میں مال و دولت کی بڑی سے بڑی کشش بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ اس منشائے خداوندی کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے آسانی سے ہاتھ آجانے والی دولت کے مقابلہ میں سر دے دینے کو ترجیح دی اور فیصلہ کیا کہ وہ قریش کے لشکر کا مقابلہ کریں گے۔ کس قدر ہمت طلب تھا یہ فیصلہ! لیکن جو لوگ اپنا سب کچھ خدا کے ہاتھ فروخت کر چکے ہوں، ان کے لئے اس قسم

کے فیصلے زندگی کے معمولات بن جاتے ہیں.

فیصلہ کیا اور پھر بحضور رب العزت فتح و نصرت کی دعائیں مانگیں. مانگنے والوں نے انتہائی عجز و نیاز سے مانگا اور دینے والے نے اس طرح بذل کریمانہ اور ترحم خسروانہ سے نوازا کہ قرآن کے الفاظ میں:

(۸/۹) اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ○

(تمہیں دشمن کی قوت کا اس قدر شدید احساس تھا کہ) تم خدا سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگ رہے تھے. سو اللہ تعالیٰ نے تمہاری دعائیں سن لیں اور کہا کہ (اگر دشمن کا لشکر ایک ہزار ہے تو گھبراؤ نہیں) میں تمہاری مدد ایک ہزار ملائکہ سے کروں گا جو لگاتار آئیں گے (لیکن وہ تمہیں دکھائی نہیں دیں گے ۹/۲۶ ؛ ۹/۴۰ ؛ ۳۳/۹ ؛ ۴۱/۳۰) کائناتی قوتیں تمہارے حق میں جائیں گی (۸/۱۱).

ملائکہ کی مدد

ملائکہ کس طرح مدد کرتے ہیں، اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۶۹) اور جلد چہارم (صفحہ ۲۰۴) میں گفتگو کی جا چکی ہے. یہاں اس نصرت کا نتیجہ ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ

(۸/۱۰) وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ ع

(کامیابی تو تمہیں ہونی ہی تھی) اللہ نے اس نصرت کے وعدے کو تمہارے لئے خوشخبری بنا دیا تاکہ اس سے اطمینانِ قلب نصیب ہو جائے (۳/۱۲۵ ؛ ۴۱/۳۰). حقیقت یہ ہے کہ فتح و نصرت خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے (اور تمہیں بھی اسی وجہ سے فتح حاصل ہونی تھی کہ تم اُس کے قانون پر عمل پیرا تھے). وہ قانون جس میں قوت اور تدبیر

دونوں موجود ہوتی ہیں۔

ہم نے جلد دوم (عنوان ملائکہ) میں بتایا ہے کہ خارجی کائنات میں، فطرت کی قوتیں جو امورِ الٰہیہ کو بروئے کار لاتی ہیں انہیں بھی ملائکہ سے تعبیر کیا گیا ہے بدر کے میدان میں یہ قوتیں کس طرح مومنین کے لئے باعثِ تقویت بنی تھیں، اس کا تذکرہ اگلی آیت میں آیا ہے۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور عرب میں پانی کی قلت۔ اس کے ساتھ ہی اس وادی میں زمین ریتلی تھی جس سے پیادہ فوج کے پاؤں زمین میں دھنسے جاتے تھے (اور مجاہدین تمام تر پیادہ ہی تھے)۔ لڑائی کی رات بارش ہوگئی جس سے اُن کے پاس پانی کی فراوانی ہوگئی اور زمین کی حالت بھی بدل گئی۔ اُن کے خدشات دور ہوگئے تو وہ رات بھر نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ سوئے۔ صبح دم اُٹھے تو وہ تازہ دم تھے۔ حالات اِس طرح سازگار ہو جائیں تو وہ جنگ کا نقشہ بدل دیتے ہیں۔ یوں فطرت کی قوتیں باعثِ قوت اور موجبِ تسکین بن جاتی ہیں۔

(۸/۱۱) إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ۝

اس (خوشخبری) سے تم پر امن و سکون کی فضا طاری ہوگئی اور خوف و ہراس جاتا رہا (۳/۱۵۳)۔ پھر تم پر بادلوں سے پانی برسا تاکہ تم نہا دھو کر پاک و صاف اور تر و تازہ ہو جاؤ اور فریقِ مخالف کی طرف سے پانی بند کر دینے کا جو خطرہ تمہیں لاحق ہو رہا تھا اُس سے تمہارا اطمینان ہو جائے اور وہاں کی ریتلی زمین ایسی ہو جائے کہ تم وہاں اپنے پاؤں جما سکو ___ ایک بارش سے یہ تمام خطرات و وساوس دُور ہو گئے اور تمہیں جمعیتِ خاطر نصیب ہوگئی ___ کائناتی قوتیں یوں بھی مدد کر دیتی ہیں۔

یہ ایک واقعہ جہاں مجاہدین کے لئے ثباتِ قلب اور استقامتِ اقدام کا موجب بن گیا، دشمنوں کے دل پر اس سے خوف و ہراس طاری ہوگیا۔

(۸/۱۲) إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝

(۱) یہ وہ وقت تھا جب تیرے پروردگار نے ملائکہ سے کہا تھا کہ میری تائید و نصرت جماعتِ مومنین کے ساتھ ہے۔ تم ان کے دل میں اطمینان و سکون پیدا کر کے انہیں ثابت قدمی عطا کر دو۔ میں مخالفین کے دل میں اُن کا رُعب طاری کر دوں گا۔ (سو اے جماعتِ مومنین!) تم مخالفین کی گردنیں اڑا دو اور ان کی قوت و گرفت کے تمام اسباب و ذرائع کو تہس نہس کر دو۔

یہ اس لئے کہ یہ لوگ اِس نظام کو ملیامیٹ کرنے کے مذموم عزائم لے کر اُٹھے تھے جو نوعِ انسان کے لئے انتہائی منفعت بخش تھا۔ یہ شرف و تکریم انسانیت کی راہ میں روڑے اٹکانا چاہتے تھے۔ اُن کی ان دست درازیوں اور چیرہ دستیوں کی روک تھام ضروری تھی۔

(۸/۱۳-۱۴) ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَن يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ۝

یہ اس لئے کہ یہ لوگ قانونِ خداوندی اور اُس کے نافذ کرنے والے رسولؐ (یعنی نظامِ خداوندی) کی مخالفت کرتے ہیں۔ سو جو لوگ بھی اس نظام کی مخالفت کریں گے خدا کا قانونِ مکافات انہیں سخت سزا دے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارے اعمال کی سزا ہے۔ سو اس کا مزہ چکھ لو۔ (اور یہ چیز صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں قانونِ خداوندی کی مخالفت کرنے والے جہاں بھی ہوں گے ان کے لئے اسی قسم کا تباہ کرنے والا عذاب

ہوگا۔

عین اُس وقت جب دونوں فوجیں آمنے سامنے صف آرا ہوگئیں، یہ تنبیہہ خداوندی نازل ہوئی کہ

(۸ / ۱۶-۱۵) يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

سیدھے جہنم میں

اے جماعتِ مومنین! (فتح و ظفر کی ان خوشخبریوں اور تائید و نصرت کے ان تمام وعدوں کے بعد تم اچھی طرح سُن لو کہ) جب تمہارا مقابلہ دشمن کی فوج سے ہو تو انہیں پیٹھ مت دکھانا۔ یاد رکھو! جو ایسے وقت میں پیٹھ دکھائے گا وہ خدا کے عذاب کا مورد بن جائے گا اور سیدھا تباہی و بربادی کے جہنم میں جا گرے گا۔ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ ہاں مگر جو جنگ کی مصلحت کی بنا پر اپنا پینترا بدلے یا اپنی پارٹی کی طرف پلٹنا چاہے اور اس طرح اپنے مقام سے ہٹ کر اِدھر اُدھر ہو جائے تو اس کا مضائقہ نہیں۔

غور فرمایئے کہ یہ کون ہیں جنہیں اس قسم کی تنبیہ کی جا رہی ہے؟ یہ وہ ہیں جو اپنا جان و مال خدا کے ہاتھ بیچنے کا معاہدہ کر کے اس نظام میں داخل ہوتے ہیں، جن کے لئے موت، حیاتِ جاوید کی پیامبر اور جنت الفردوس کی نشید جانفزا ہے جو اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ اس شہادت گہہ الفت میں رقص کناں آتے ہیں۔ یہ تنبیہ اس لئے نہیں تھی کہ اس کا امکان تھا کہ یہ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے۔ یہ صرف اُس جنگ کی اہمیت واضح کرنے کا انداز تھا ______ نہیں! یہ درحقیقت ہمارے لئے وعید تھی کہ یاد رکھو! تمہارا جو قدم نظامِ خداوندی کی شکست یا ضعف کا موجب ہوگا اس کا نتیجہ سیدھا جہنم ہوگا۔ تمہارے ہزار روزے اور لاکھوں نمازیں تمہیں اس عذاب سے بچا نہیں سکیں گی۔ اس وعید کا زندہ ثبوت ہم مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ ہم نے نظامِ خداوندی کی جگہ ملوکیت کا نظام قائم کیا اور اسے مسلسل قائم کئے چلے آ رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا

ذلّت اور خواری کا وہ جہنّم ہے جس میں ساری کی ساری اُمّت (تمام مسلم اقوام) مبتلا چلی آرہی ہے اور اس کی کروڑوں نمازیں، لاکھوں روزے اور ہزاروں حج، اس عذاب میں ذرا سی تخفیف نہیں کر سکتے. ہم اس میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگے ہوئے مجرم ہیں.

تیر قضا اور اس کے بعد میدانِ جنگ میں تلواروں کی جھنکار اور تیروسناں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی. مجاہدین کی شجاعت وبسالت کے اس عدیم النظیر کارنامے پر بارگاہ خداوندی سے جس تبریک وتحسین کے پھول برسائے گئے، اس رشکِ صد فردوس نظارہ کے تصوّر سے روح وجد میں آجاتی ہے. فرمایا:

(۸/۱۷) فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

ان مخالفین کو تم نے میدانِ جنگ میں (از خود) قتل نہیں کیا، بلکہ انہیں درحقیقت اللہ نے قتل کیا. اور جو تیر اندازی تم نے کی، وہ بھی تم نے (از خود) نہیں کی بلکہ خود اللہ ہی نے کی. (اس لئے کہ تم نے یہ جنگ وقتال خدا کی اجازت سے کیا ہے (۲۲/۳۹) از خود نہیں کیا. اور خدا نے اس کا حکم اس لئے دیا تھا کہ اتنے عرصہ کی مسلسل جانکاہ مشقتوں کے بعد، جماعت مومنین کے سامنے (ان کی محنتوں کا ماحصل اور) زندگی کا خوشگوار پہلو آجائے. اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے (لہٰذا کسی کی محنت رائگاں نہیں جاتی بشرطیکہ وہ صحیح طریق سے کی گئی ہو).

انسان جو کام قوانینِ خداوندی کے مطابق سرانجام دیتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کس طرح اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور انسانی دنیا میں جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لیتا ہے، اسے کس طرح انسانوں کے ہاتھوں پورا کراتا ہے، ان اہم امور کے متعلق مطالب الفرقان، جلد اوّل صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۹ اور جلد چہارم صفحہ ۳۷۷، ۳۷۳، ۲۶۰) میں دیکھئے. وہیں سے "وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ" کی تفسیر وجۂ فروغِ دیدہ ہوگی. اُن تشریحات کو ایک

نظر (بار دیگر) ضرور دیکھ لیجئے کیونکہ اس سے خدا اور بندے کے باہمی تعلق اور شرف و مجدِ انسانیت کے مقام بلند کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے' اور یہی اسلام کا صحیح مقصود و مطلوب ہے۔

اس کے بعد کہا کہ جنگِ بدر میں مخالفین کی ذلت آمیز شکست' اس کشمکشِ حق و باطل کی آخری منزل نہیں۔ یہ تو اس کا مرحلۂ آغاز ہے ـــــــ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

(۸/۱۸) ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ○

اور یہ تو ابھی تمہاری پہلی فتح ہے۔ اس کے بعد سمجھ لو کہ اللہ ان مخالفین کی ساری تدبیریں ناکام کر دینے والا ہے۔ (انہیں شکست پر شکست ہوتی جائے گی۔ انسانی دنیا میں خدا کے پروگرام انسانوں ہی کے ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں۔ اس لئے یہ سب کچھ تمہارے ہاتھوں ہی سے ہوگا ۹/۱۴؛ ۲۲/۴۰)۔

فرمایا کہ ان مخالفین سے کہہ دو کہ:

(۸/۱۹) اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَ لَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ع

تم مخالفین سے کہہ دو کہ تم چاہتے تھے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان دوٹوک فیصلہ ہو جائے۔ سو وہ بھی تم نے دیکھ لیا۔ لہٰذا اگر تم اب بھی رک جاؤ اور نظامِ خداوندی کی مخالفت سے باز آجاؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ لیکن اگر تم پھر پلٹ کر جنگ کے لئے آ گئے تو ہم بھی مقابلہ کے لئے آ جائیں گے اور تمہارا لاؤ لشکر تمہارے کسی کام نہیں آئے گا' خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ یہ اس لئے کہ خدا کا قانون جماعتِ مومنین کے ساتھ ہے۔

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے، وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۸/۱۹ ہم' جو نہ خدا کے صحیح تصور سے آشنا ہیں' نہ

مومنین کی صفات سے بہرہ ور کیا سمجھیں کہ "خدا کی معیّت" کس طرح ہوتی ہے۔ اسے سمجھا تھا ان لوگوں نے جنہوں نے اس "معیّت" کے نتائج کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا۔

فتح ایران کے بعد تستر کا گورنر ہرمزان گرفتار ہو کر آیا تو حضرت عمرؓ نے اس سے سب سے پہلا سوال یہ کیا تھا کہ ہرمزان! یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے تم ایرانی، ہم عربوں کو خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے اور نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اب کیا ہوا جو، ہم لوگوں کے ہاتھوں، تم اس قدر ذلت آمیز شکست پر شکست کھاتے چلے جاتے ہو؟ اس نے کہا کہ عمرؓ! بات یہ ہے کہ ایامِ جاہلیّت میں ہم اور تم اکیلے ایک دوسرے سے نپٹتے تھے، اس لئے ہم ہمیشہ تم پر غالب آجایا کرتے تھے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت ہم اکیلے ہوتے ہیں اور تمہارے ساتھ تمہارا خدا ہوتا ہے۔ ہمارے لئے ممکن ہی نہیں کہ تم دونوں کا مقابلہ کر سکیں۔ (شاہکار رسالت ص۱۲۳)

ہرمزان کی شہادت

ایک ایران ہی کیا، ان "دونوں" (خدا اور مومنین) کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوم بھی نہیں کر سکتی۔ جب تک خدا ان کے ساتھ رہا، دنیا کا کوئی ملک بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ خدا کے ساتھ ہونے کے معنی یہ تھے کہ یہ لوگ (رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ) خدا کے متعین کردہ نصب العین کی خاطر، باطل کی قوتوں کے ساتھ ٹکراتے تھے اور اس ٹکراؤ میں خدا کے مقرر کردہ قوانین و اقدار کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ اس طرح خدا کا یہ وعدہ قدم قدم پر پورا ہوتا تھا کہ وَلَنۡ یَّجۡعَلَ اللّٰہُ لِلۡکٰفِرِیۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سَبِیۡلًا (۴/۱۴۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار مومنین پر غالب آجائیں۔ اس کے لئے ایک بار پھر تاکید کر دی؛

(۸/۲۰) یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَ لَا تَوَلَّوۡا عَنۡہُ وَ اَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ ۞

(یہ تو تم ان سے کہو اور خود اس بات کو دل کے کانوں سے سن لو کہ اس فتح سے تمہارے دل میں کہیں یہ خیال پیدا نہ ہو جائے کہ ہمیں اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو! یہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس کے بعد ابھی تم نے بہت کچھ کرنا ہے۔ اس لئے) تم "خدا اور رسول" (نظامِ مملکتِ خداوندی) کی پوری پوری اطاعت کرو اور اس کے احکام کو سننے کے بعد ان سے کبھی گریز کی راہیں نہ نکالو۔

"اللہ اور رسول" سے عملاً مراد اسلامی نظام یا اسلامی مملکت (اور اس کا سربراہ) ہے۔ اس کی تشریح اس سورت کی پہلی آیت کے ذیل میں گزر چکی ہے۔ یہاں "اللہ اور رسول" (تثنیہ) کے لئے عَنْهُ کی ضمیر واحد بھی اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے مراد سربراہِ مملکتِ اسلامیہ ہے۔

علاوہ ازیں، یہ بھی بصراحت کہا گیا ہے: "وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ" (درآنحالیکہ تم اس کے احکام سُن رہے ہو) یہ ظاہر ہے کہ کسی زندہ اتھارٹی کے احکامات ہی کو سُنا جا سکتا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اطاعت، اس کی کتاب اور رسولؐ کی اطاعت حضورؐ کی احادیث کی رُو سے کی جاتی ہے، تو اس مفہوم کی رُو سے

زندہ اتھارٹی کی اطاعت

"اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ" کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ یہ مفہوم اُس زمانے میں وضع کیا گیا تھا جب (ہمارے عہدِ ملوکیّت میں) نہ اسلامی مملکت باقی رہی تھی، نہ اس کا سربراہ۔ اس وقت دین، مذہب سے بدل گیا تھا۔ مذہب میں اطاعت اپنے اپنے طور پر کی جاتی ہے۔ اس میں کسی زندہ اتھارٹی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اگلی آیت میں اس "سماعت" (سننے) کا مفہوم اور بھی واضح کر دیا۔ پہلے کہا:

(۸/۲۱) وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ○

دیکھنا! تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم نے احکام کو سُن لیا ہے لیکن درحقیقت وہ اُنہیں دل کے کانوں سے نہیں سنتے۔

بصر اور نظر (دیکھنے اور دیکھنے کے باوجود نہ دیکھنے) اور سماعت و عدم سماعت (سننے کے باوجود نہ سننے) میں فرق، متعدد مقامات پر سامنے لایا جا چکا ہے۔ بالخصوص دیکھئے مطالب الفرقان (جلد اوّل ص ۱۶۸)؛ (جلد چہارم ص ۴۷۳)، نیز اس جلد میں آیت ۷/۱۹۸ کے تحت۔ اگلی آیات ہیں:

(۸/۲۲-۲۳) اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

قانونِ خداوندی کی رُو سے، بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں

شَرَّ الدَّوَآبِّ اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے (۲/۱۸ ؛ ۱۶/۷۶ ؛ ۸/۵۵)۔ (اس قسم کے لوگ جو عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں، اس قابل ہی نہیں رہتے کہ صحیح بات قبول کر سکیں) اگر ان میں صحیح بات قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی تو اللہ (اپنے قانون کے مطابق) ایسا کر دیتا کہ وہ اسے قبول کر لیں. لیکن اگر وہ (اسے ان سے بغیر اس صلاحیت کے زبردستی) قبول کراتا تو وہ اس سے منہ پھیر لیتے، جیسا کہ وہ اب منہ پھیرے ہوئے ہیں (سو ان کا اعراض اس امر کی دلیل ہے کہ ان میں قبولِ حق کی استعداد ہی نہیں رہی، حالانکہ اتنے لمبے عرصہ تک انہیں حق کی تبلیغ کی جاتی رہی ہے)۔

" لَا يَعْقِلُوْنَ " سے بات واضح ہو گئی کہ " سننے کے باوجود نہ سننے " کا مفہوم کیا ہے. اس کی وضاحت اسی جلد میں زیرِ آیت (۷/۱۷۹) کی جا چکی ہے. انسانوں کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں کس طرح سلب ہو جاتی ہیں اور خدا اسے اپنی طرف کیوں منسوب کرتا ہے، اس کی وضاحت مطالب الفرقان جلد اول (ص ۱۸۸-۱۸۰) میں کی جا چکی ہے. علاوہ ازیں انڈکس میں تقدیر کا عنوان بھی دیکھئے کہ وہ بڑا جامع ہے. بالخصوص ان تمام تشریحات کا یہ ہے کہ یہ سب کچھ انسان کی اپنی ہی غلط روش کا نتیجہ ہوتا ہے. صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ:

(۸/۲۴) يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَجِيبُوا۟ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ وَأَنَّهُۥٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ○

اے جماعتِ مومنین! (دیکھنا! تم کہیں ایسا نہ ہو جانا) تم "اللہ اور رسول" (نظامِ خداوندی) کی آواز پر لبیک کہو، جب وہ تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کرنے والی ہے. (اس کے لئے عزمِ راسخ اور ہمتِ بلند کی ضرورت ہوتی ہے بسا اوقات انسان کے اندر ایسے جذبات بھی تو ہیں جو اس کے حوصلوں کو پست کر دیتے ہیں). لہٰذا تم اس حقیقتِ حال سے بے خبر نہ رہو کہ) ایسا بھی ہو جایا کرتا ہے کہ بجائے اس کے کہ خدا کا حکم، انسان کے ارادوں کی پختگی کے ساتھ پیوست رہے، وہ اس کے جراتمندانہ

ارادوں اور حوصلوں کے پست کر دینے والے جذبات کے درمیان گھِر جاتا ہے اور اس طرح اس انسان میں تذبذب کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ (اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم ہر وقت اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھو کہ) تمہیں نظامِ خداوندی کے مرکز کے گرد ہی جمع ہونا ہے۔ اسے چھوڑ کر کسی اور طرف نہیں نکل جانا۔ اور تمہارے ہر اقدام کی تم سے جواب طلبی ہونی ہے۔ (یہ خیال تمہارے دل میں جاگزیں رہا تو پھر تمہارے ذاتی جذبات، تمہارے حوصلوں کو پست نہیں کر سکیں گے)۔

اِس آیت میں پھر دیکھئے ـــــــ "اللہ اور رسول" (تثنیہ یعنی دو)، لیکن "دَعَاكُمْ" میں ضمیر واحد کی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "اللہ اور رسول" الفاظ تو بے شک دو ہیں، لیکن اس سے مراد نظامِ اسلامی ہے (یعنی وہ نظام جسے سب سے پہلے رسول اللہ نے قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم کیا تھا)۔ انڈکس میں "اللہ اور رسول" اور "اسلامی نظام" کے عنوانات دیکھئے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، یعنی اُن لوگوں سے خطاب کیا گیا ہے جو عام معانی میں (طبعی طور پر) زندہ ہیں اور کہا یہ گیا ہے کہ تم اس نظامِ خداوندی کی دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں اُس پروگرام (جہاد) کی دعوت دیتا ہے "جو تمہیں زندگی عطا کر دے گا"۔ زندہ انسانوں سے کہنا کہ تم اس آواز پر لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطا کر دے گی، زندگی اور زندگی کے نہایت نازک، لطیف اور عمیق فرق کو نمایاں طور پر سامنے لے آتا ہے۔ ایک زندگی محض نفس شماری کی زندگی ہے، یعنی سانس کی آمد و رفت۔

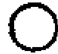
زندگی اور زندگی میں فرق

اس زندگی میں حیوان اور انسان سب برابر کے شامل ہوتے ہیں۔ دوسری زندگی شرفِ انسانیت کی ہے جو اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس زندگی میں تو موت سے بھی حیاتِ جاوید حاصل ہو جاتی ہے۔ ان نکات کی تشریح اس سے قبل (مختلف جلدوں میں) سامنے آچکی ہے ـــ انڈکس میں "حیات اور موت" کے عنوانات دیکھئے (مطالب الفرقان، جلد دوم، ص۲۸۱ پر تو زیرِ نظر آیت بھی درج کی جا چکی ہے)۔ اس مقام پر ایک شعر بے ساختہ نوکِ قلم پر آ گیا۔ شعر تو عمومی غزل کا ہے لیکن اس میں زندگی اور عمر میں جو فرق کہا گیا ہے، وہ بڑا لطیف ہے۔ کہا ہے: ؎

جی لیا چار دن جوانی میں　　　زندگی عمر بھر نہیں ہوتی

عمر اور زندگی میں جو فرق ہے، وہی فرق قرآنی مفہوم میں موت اور حیات میں ہے. عمر، سانس لینے کی طبیعی حیات ہے جسے مہ و سال سے ماپا جاتا ہے. اس عمر میں، زندگی اُس حصّہ کا نام ہے جو شرفِ انسانی کی سطح پر کسی بلند مقصد کے لئے بسر کی جاتے. پس دیکھنا یہ چاہیئے کہ ہماری "عمر" میں "زندگی" کا کتنا حصّہ ہے. موت کے بعد، عمر تو ختم ہو جاتی ہے، لیکن زندگی آگے (ساتھ) جاتی ہے. قرآنی سطح پر زندگی کا تعین حضور نبئ اکرمؐ کے ایک مختصر سے ارشادِ گرامی میں ہیرے کی طرح چمکتا دکھائی دیتا ہے. پوچھا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ فرمایا،

> جب جہاد ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو. جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو.
> یوں مومن کی ساری عمر، زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے. جس شخص کی عمر کا جتنا حصّہ زندگی ہوگا، وہ اتنا ہی 'فی الحقیقت' زندہ انسان ہوگا.



آیت کا آخری حصّہ بڑا غور طلب ہے. ظاہر کہ قرآن کے مطابق مجاہدانہ (سعی و عمل کی) زندگی بسر کرنے کے لئے عزمِ راسخ کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی اپنے مقصد کی صداقت پر یقینِ محکم اور پھر اس کے حصول کے لئے عزمِ راسخ. اگر ان میں ذرا بھی تذبذب پیدا ہو گیا تو وہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا. اس قسم کے عزمِ راسخ کے راستے میں، انسانی مفاد پرستی کے جذبات حائل ہو جاتے ہیں جو اسے کبھی اِدھر لے جاتے ہیں اور کبھی اُدھر. اس سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے.

اس آیت میں اَلْمَرْءِ اور قَلْبِہٖ کے الفاظ انہی بنیادی معانی میں استعمال ہوئے ہیں. اَلْمَرْءُ (مادہ م. ر. أ) کے معنی کمالِ مردانگی ہے اور انسانی جذبات اسے ایک مقام پر نہیں ٹکنے دیتے. ان دونوں میں کشمکش جاری رہتی ہے. مومن کے ایمانِ محکم کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے نہ ہلے، اپنے عزم و ارادہ میں تزلزل نہ پیدا ہونے دے. وہ تذبذب کا شکار نہ ہو جائے. اس کو تمثال استقامت کے لئے ضروری ہے کہ یہ افراد اپنے مرکز کے گرد جمع رہیں. وہاں سے اِدھر اُدھر نہ ہوں. یہ بات خدا کے قانونِ مکافات پر یقینِ محکم سے پیدا ہو سکتی ہے. اگر قوم کا یہ انداز نہ رہے تو پھر ایسی تباہی آتی ہے جس کے متعلق فرمایا،

(۸/۲۵) وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ

خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

(اور اسے بھی یاد رکھو کہ اگر جماعت میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو اس قسم کے تذبذب میں گرفتار ہوں) تو اس سے جو مصیبت آتی ہے وہ ظالمین تک محدود نہیں رہتی. وہ سارے کے سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتی ہے. اس لئے کہ خدا کا قانون اپنی نتیجہ خیزی میں بڑا سخت واقع ہوا ہے (اجتماعی اعمال کے نتائج بھی اجتماعی ہوتے ہیں. اس لئے اس سے بہت محتاط رہو اور ایسا انتظام کرو کہ تمہارے ہاں ایسی صورت پیدا نہ ہونے پائے) (۸/۲۵).

اجتماعی تباہی

یہ آیۂ جلیلہ ایک عظیم حقیقت کی طرف راہنمائی کرتی ہے. قرآن مجید کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہ "مذہب" کے اسٹیج سے گفتگو کرتا ہے، لیکن انسان کو جذبات میں الجھانے کے بجائے حقائق Facts کا سامنا کرنا سکھاتا ہے. مذہب کی دنیا یہ کہے گی کہ کیسی ہی تباہی آئے خدا اپنے نیک بندوں کو اس سے محفوظ رکھے گا. قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جن حوادث کا تعلق طبیعی اسباب Physical Causes سے ہے، وہ تمام انسانوں کو یکساں طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں. وہ مومن اور کافر، نیکوکار اور فاسق وفاجر میں کوئی تمیز نہیں کرتے. ان سے حفاظت بھی طبیعی اسباب کی رُو سے مل سکے گی اور ان کی رُو سے واقع ہونے والے نقصان کا ازالہ بھی طبیعی اسباب ووسائل کے ذریعے ہی ممکن ہوگا. (مثلاً) دریا کے کنارے بسنے والے گاؤں کے باشندے اگر دریا کا بند باندھنے میں کوتاہی برتیں گے تو سیلاب ان لوگوں کے گھروں کو بھی بہا کرلے جائے گا جو اس کوتاہی کے ذمہ دار تھے اور ان کے گھروں کو بھی جو اس سے بری الذمہ تھے. وہ خدا کے نیک بندوں کے گھروں کو بھی اسی طرح تباہ کردے گا جس طرح فاسق وفاجر لوگوں کے گھروں کو. حتّٰی کہ سیلاب، مسجد اور مندر میں بھی تمیز نہیں کرے گا.

کسی شہر میں ہیضہ کی وبا پھوٹے گی تو اس سے وہی محفوظ رہیں گے جنہوں نے حفاظتی تدابیر اختیار کرلی ہوں گی یا اس سے متاثر ہو جانے کے فوری بعد ضروری علاج کرالیا ہوگا. چھتوں پر چڑھ کر اذانیں دینے سے نہ سیلاب کا رُخ بدل سکتا ہے، نہ وبائی امراض کے اثرات زائل ہو سکتے ہیں. یہ حوادث خدا کے مقرر کردہ طبیعی قوانین کے مطابق رونما ہوتے ہیں اور انہی قوانین کی رُو سے ان کا ازالہ ہو سکتا ہے. جنگ

اُحد میں، تیر اندازوں کے محافظ دستہ کے ایک غیر دانشمندانہ اقدام سے نہ صرف فتح مبدّل بہ شکست ہو گئی، بلکہ رسولؐ اللہ تک بھی حریف کے وار سے محفوظ نہ رہ سکے اور زخمی ہو گئے (تفصیل مطالب الفرقان جلد چہارم میں گزر چکی ہے)۔ قرآنِ کریم میں انبیائے سابقہ کی جو داستانیں بیان ہوئی ہیں، ان میں آپ دیکھیں گے کہ جب کسی بستی پر تباہی آنے والی ہوتی تھی تو جماعتِ مومنین کو اس سے محفوظ رکھنے کا طریق یہ اختیار کیا جاتا تھا کہ وہ وہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام کی طرف ہجرت کر جائیں۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس بستی میں رہیں، تباہی آئے اور کفار کے گھر تو تباہ ہو جائیں اور ان مومنین کے گھر محفوظ رہ جائیں۔ حضرت نوحؑ اور اور ان کے ساتھی اس لئے سیلاب سے محفوظ رہے تھے کہ انہوں نے کشتی بنا لی تھی۔

مومن اور کافر کا فرق آگے چل کر سامنے آتا ہے۔ جنگ میں شکست دونوں کو ہوتی ہے۔ جماعتِ مومنین کو چونکہ اپنے مقصد کی صداقت پر یقین ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لئے مسلسل جدّ وجہد کو وہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں اور اس راہ میں موت کو حیاتِ جاوید، اس لئے وہ اس شکست سے مایوس نہیں ہو جاتے۔ وہ اس کے اسباب پر غور کرتے ہیں۔ اُن نقائص کو دُور کرتے ہیں جو اس کا سبب بنے تھے اور اس کے بعد، تازہ ولولوں اور پُر عزم حوصلوں کے ساتھ پھر میدانِ کارزار میں نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ ان کے اس ایمان کی قوّت ہوتی ہے جو ان کے تین سو مجاہدوں کو دشمن کے ایک ہزار سپاہیوں پر کامیابی عطا کر دیتی ہے (۸/۶۵)۔

آیت (۸/۶۵) کی تشریح تو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں برسبیلِ تذکرہ ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ اگر تم میں بیسؔ مجاہد بھی ایسے ہوتے جو میدانِ جنگ میں جم کر کھڑے ہو گئے تو وہ دو سو مخالفین پر بھاری رہیں گے اور اگر سوؔ مجاہدین ایسے نکلے تو وہ دشمن کے ایک ہزار سپاہیوں پر غالب آجائیں گے (۸/۶۵)۔ خدا نے یہ نہیں کہا کہ تم میں سے کوئی میدان میں نکلے یا نہ نکلے، تمہیں بہرحال کامیابی نصیب ہو جائے گی۔ ایک ہزار پر کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک سو مجاہدین کا باہر نکلنا ضروری ہے۔ ان کے ایمان کی قوّت ان کی عددی کمی کا ازالہ کر دے گی۔ لیکن ان مجاہدین کا مقابلہ کے لئے نکلنا ضروری ہے۔ اس سے واضح ہے کہ طبیعی حوادث کا مقابلہ بہرحال طبیعی اسباب و ذرائع کی رُو سے ہی کیا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان مجاہدین کی فکر و نظر کی بلندی اور عزم و ارادہ کی پختگی، ان کی طبیعی کمی کا ازالہ کر دے۔ اس کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی۔

اسباب کی کمی کا ازالہ

آیت (۸/۶۵) میں کہا گیا ہے کہ تمہارے سو سپاہی، ہزار پر غالب آجائیں گے۔ آیت (۸/۶۶) میں کہا کہ یہ ایک اور دس کی نسبت اس صورت میں ہے جب طبیعی اسباب و ذرائع (سامانِ حرب ضرب وغیرہ) کے لحاظ سے تمہاری اور دشمن کی پوزیشن یکساں ہو۔ سرِدست چونکہ صورت ایسی نہیں۔ ان اسباب و ذرائع کے اعتبار سے تم دشمن کے مقابلہ میں کمزور ہو۔ اس لئے یہ نسبت ایک اور دو کی ہوگی، یعنی تمہارے ایک سو سپاہی دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آسکیں گے اور ایسا تمہاری استقامت کی وجہ سے ہوگا۔

ذہنیت کا اثر

معاشرہ میں ایک مقام البتہ ایسا آجاتا ہے جہاں انفرادی راستبازی اور اس کے مقابل مفاد پرستانہ ذہنیت طبیعی اسباب کے نتائج وثمرات پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ مرض بھی وہی ہوتا ہے تشخیص بھی وہی، دوائیاں بھی وہی، لیکن ایک ڈاکٹر نوعِ انسانی کے جذبۂ ہمدردی اور بہی خواہی کے ساتھ مریضوں کا علاج کرتا ہے اور دوسرا ذاتی مفاد پرستی کے تابع۔ دونوں کے علاج کے نتائج میں جو نمایاں فرق ہوتا ہے، وہ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے۔ قرآن، ڈاکٹر تیار کرنے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ انہیں "انسان" بنانے کی بھی سخت تاکید کرتا ہے۔ غلط (غیر قرآنی) معاشرہ میں (مثلاً) ڈاکٹر تو بہت ہوتے ہیں، لیکن ان میں انسان بہت کم۔ صحیح (قرآنی) معاشرہ میں پوزیشن اس کے برعکس ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو اس معاشرہ میں دوائی خاطر خواہ نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، صحیح علاج کے لئے (۱) ڈاکٹر (۲) اس کا حسنِ کردار اور (۳) صحیح دوائی تینوں لازم وملزوم ہیں اور یہ عناصر صحیح نظام میں ہی ممکن ہوتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ قرآن اس بات پر کیوں زور دیتا ہے کہ اس امر کی خاص احتیاط برتو کہ معاشرہ میں غلط ذہنیت اور مفسدانہ کردار کے لوگ بار نہ پانے پائیں۔ وہ دریا کا بند تعمیر کرنے میں سیمنٹ کی جگہ ریت بھر دیں گے اور پھر ساری بستی سیلاب کی نذر ہوجائے گی۔ اجتماعی تباہی سے محفوظ رہنے کے لئے انفرادی "نیکیاں" کچھ کام نہیں دیتیں۔ اس کے لئے صحیح (قرآنی) نظام کی ضرورت لاینفک ہے۔ انفرادی نیکیاں تو قرآن غیر مسلموں میں بھی تسلیم کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ اہلِ کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی امانات کو نہایت دیانتداری سے واپس کردیتے ہیں (۳/۷۵) لیکن اس کے باوجود انہیں بھی امتِ مسلمہ (اسلامی نظام) میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ صحیح نظامِ معاشرہ کی تشکیل ہے۔ اس کے بعد بتایا کہ صحیح نظام کی تشکیل

کانتیجہ کیا ہوتا ہے۔ فرمایا:

(۸/۲۶) وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝

(تم اس نظام کی اطاعت کے حسین نتائج کا اندازہ خود اپنی حالت سے لگاؤ۔ تمہاری حالت یہ تھی کہ (تم تعداد میں بھی کم تھے اور قوت کے اعتبار سے بھی بے حد کمزور تصور کئے جاتے تھے۔ تمہیں ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہتا تھا کہ مخالفین تمہیں اُچک کر نہ لے جائیں۔ ان حالات میں قانونِ خداوندی نے تمہاری اطاعت اور استقامت کے بدلے میں) تمہیں ایسا ٹھکانا دیا جہاں تم اکٹھے رہ سکتے ہو۔ اور اپنی نصرت سے تمہیں تقویت پہنچائی اور خوشگوار چیزیں دے کر تمہارے رزق کا سامان مہیا کر دیا۔ یہ سب اس لئے کہ (نظامِ خداوندی کے قیام و بقا میں) تمہاری جدوجہد بھرپور نتائج پیدا کر سکے۔

قرآنِ کریم نے یہاں تین انعاماتِ خداوندی کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ ۱۔ خوف کی جگہ امن۔ ۲۔ محفوظ ٹھکانا اور ۳۔ رزقِ طیب۔ اُس نے اس کا ذکر دیگر متعدد مقامات پر بھی کیا ہے۔ اُس نے بھوک اور

بھوک خدا کا خوف ہے

خوف (لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ) کو خدا کا عذاب کہہ کر پکارا ہے (۱۶/۱۱۲) اور قریش کو جن انعامات کی خصوصیت سے یاد دلائی ہے وہ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶/۴) ہیں، یعنی بھوک اور خوف سے نجات۔ داستانِ بنی اسرائیل میں بتایا کہ اس قسم کا حقیقی امن، ٹھکانا اور سامانِ زیست، تمکن فی الارض سے میسر آتا ہے۔ (تفصیل مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۷، پر گزر چکی ہے)۔ امتِ مسلمہ کے ضمن میں بھی فرمایا کہ یہ انعامات استخلاف فی الارض سے حاصل ہوتے ہیں، یعنی استخلاف فی الارض سے دین (نظامِ خداوندی) متمکن ہوتا ہے اور اس کے تمکن کا نتیجہ حقیقی امن ہوتا ہے۔ حقیقی امن کا معیار یہ یہ ہے کہ اس میں قوم اس قابل ہوتی ہے کہ محکومیت صرف احکام و قوانین کی ہو، کسی انسان کی نہ ہو سورۃ

النّور میں اس حقیقتِ ابدی کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ص وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ط یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ط وَ مَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (۲۴/۵۵)

استخلاف | ہم نے ان لوگوں سے جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے (۲۷/۳۳)۔ (اور ان کی حکومت اس خطۂ ارض کو جنت میں تبدیل کر دے گی ۴۷/۳۹) ـــــــ یہ ہمارا ابدی قانون ہے جس کے مطابق ہم نے اقوامِ سابقہ کو بھی اسی قسم کی حکومت (تمکّن فی الارض) عطا کی تھی (۶/۲۸) ـــــــ اسی قانون کے مطابق ہم ان مومنین کے ایمان اور اعمال کے نتیجہ میں انہیں حکومت عطا کر دیں گے اور اُن کے اس نظامِ زندگی کو مستحکم کر دیں گے جسے ہم نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن کا خوف، امن سے بدل جائے گا، تاکہ وہ نہایت اطمینان سے، ہمارے اور صرف ہمارے قوانین کی اطاعت کریں اور ان پر کسی قسم کا جبر یا دباؤ نہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ کسی اور کی بھی اطاعت کریں اور اس طرح شرک کے مرتکب ہوں۔ (دنیا کی کوئی طاقت انہیں مجبور نہ کر سکے کہ وہ قوانین خداوندی کے ساتھ، انسانوں کے خودساختہ قوانین کی اطاعت کریں)۔

(لیکن اسے اچھی طرح سن رکھو کہ یہ سلسلہ اُس وقت تک قائم رہے گا جب تک یہ قوم ہمارے قوانین پر عمل پیرا رہے گی) جو لوگ ایسا نظام قائم ہو جانے کے بعد اس سے عملاً انکار کر دیں گے (اور احکامِ خداوندی کے بجائے اپنے احکام نافذ کرنے لگ جائیں گے)، تو یہ لوگ اُس شاہراہِ حیات کو چھوڑ کر جو انہیں صحیح منزل کی طرف لے جا رہی تھی، اور راہوں کی طرف نکل جائیں گے (اور اس لئے اس جنّتی معاشرہ کی برکتوں سے محروم

ہو جائیں گے۔ یہ برکات ایمان و عمل کا نتیجہ تھیں۔ جب ایمان و عمل نہ رہا تو وہ برکات کیسے باقی رہیں گی؟)۔

یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔ بنی اسرائیل کو تمکن عطا کرنے کے سلسلہ میں کہا:۔

وَ نُرِیۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَ نَجۡعَلَہُمۡ اَئِمَّۃً وَّ نَجۡعَلَہُمُ الۡوٰرِثِیۡنَ ۙ﴿۵﴾ وَ نُمَکِّنَ لَہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ نُرِیَ فِرۡعَوۡنَ وَ ہَامٰنَ وَ جُنُوۡدَہُمَا مِنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یَحۡذَرُوۡنَ ﴿۶﴾

(۲۸/۵-۶)

چنانچہ فرعون کی سرکشی اور فساد انگیزی کے پیشِ نظر ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کئے جا رہا تھا اسے ہماری نعمتوں سے نوازا جائے یعنی انہیں ملک کی سرداری عطا کر دی جائے اور ایک خطۂ زمین کا مالک بنا دیا جائے۔

جہاں ان کی اپنی حکومت ہو اور فرعون اور اس کے مذہبی پیشواؤں کے سردار ہامان اور ان کے سب لاؤ لشکر کو وہ کچھ دکھا دیا جائے جسے دیکھنے سے وہ اس قدر خائف تھے اور جس سے بچنے کے لئے وہ اس قدر محکم تدابیر اختیار کیا کرتے تھے، یعنی ان کی تباہی اور بربادی۔

بنی اسرائیل اور اُمّتِ محمدیہؐ میں فرق

جیسا کہ معلوم ہے کہ قومِ بنی اسرائیل فرعون کی غلامی کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہاں رہتے ہوئے ان کے لئے اس امر کا امکان نہیں تھا کہ وہ ایسی آزادی حاصل کر سکیں جس میں حکومت صرف احکامِ خداوندی کی ہو۔ اس کے لئے ان کا وہاں سے نکل آنا ضروری تھا۔ یہ اُن کی آزادی کے سلسلہ کی پہلی کڑی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے زیرِ قیادت عمل میں آئی۔ اسے قرآن نے "خدا کا احسان" کہہ کر پکارا ہے کیونکہ اس میں اُن کی سعی و عمل کا دخل نہیں تھا۔ یہ اس کے فرستادہ (پیغمبر حضرت موسیٰؑ) کی حسنِ قیادت کا نتیجہ تھا۔ اس کے برعکس اُمّتِ مسلمہ کے استخلاف فی الارض کو ان کے ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ کہہ کر پکارا ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی رسول اللہ کی بعثت تھی۔ اسے قرآن نے خدا کا احسان قرار دیا ہے (۳/۱۶۳)۔ لیکن اُمّتِ مسلمہ اور بنی اسرائیل میں بنیادی فرق تھا۔ حضرت موسیٰؑ ایک بنی بنائی قوم کی طرف مبعوث ہوئے

تھے. ان کا قدمِ اوّل اس قوم کو مصر سے باہر لے جانا تھا تاکہ وہ اس خلا میں اپنی مملکت قائم کرسکیں۔ حضورؐ کا فریضہ ایک اُمت کی تشکیل تھا۔ اس فریضہ کا آغاز حضورؐ کی مکّی زندگی سے ہوا۔ اس امت کی تشکیل "ایمان و اعمالِ صالح" کی رُو سے کی گئی، اور جب وہ اس طرح تیار ہوگئی تو مدنی زندگی میں ان کے تمکن کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس طرح ان کا تمکن فی الارض اس امت کے ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ تھا۔ لیکن بنی اسرائیل ہو یا امتِ مسلمہ، دونوں کے استخلاف کی شرط یہ تھی کہ یہ اُس وقت تک قائم رہے گا جب تک قوم نظامِ خداوندی کی پابند رہے گی۔ اگر انہوں نے اس سے اعراض برتا تو یہ نعمت ان سے چھن جائے گی۔ چنانچہ دونوں کی صورت میں ایسا ہی ہوا۔ بنی اسرائیل نے قوانینِ خداوندی سے مُنہ موڑا تو ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا ہوگئی۔ امتِ مسلمہ نے ان سے اعراض برتا تو ملوکیت کے پنجۂ استبداد کا شکار ہوگئی اور اس کے بعد ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا۔

ملّتِ پاکستانیہ

ہم ملّتِ پاکستانیہ کی داستان بنی اسرائیل سے ملتی جلتی ہے۔ ہماری آزادی کا قدمِ اوّل، انگریز اور ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کرنا تھا۔ اس کے لئے ہمیں الگ خطۂ زمین عطا ہوگیا تاکہ ہم اس میں نظامِ خداوندی قائم کرسکیں۔ یہ محض احسانِ خداوندی تھا جس کا ذریعہ علامہ اقبالؒ کی قرآنی بصیرت اور قائد اعظمؒ (محمد علی جناح) کا حسنِ تدبر تھا۔ خطۂ زمین تو ہمیں مل گیا، لیکن جس مقصد کے لئے یہ عطا ہوا تھا، اس کے لئے ہم نے ابھی تک ایک قدم بھی نہیں اٹھایا— اس منزل کی طرف قدم اٹھانا تو ایک طرف، ہم پھر اپنے عہدِ ملوکیت کی طرف لوٹ رہے ہیں[1]۔ اس سے خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ بھی وہی کچھ نہ ہو جو بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا تھا۔ خدا کے قوانین اٹل ہوتے ہیں ؎ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔

ہم تو اس جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں جس سے اگلی آیات میں، متنبہ کردیا گیا ہے کہ؛

(۸/۲۸-۲۷) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ وَاعْلَمُوا

[1] نوشتہ ۱۹۸۳ء

إِنَّمَآ أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّأَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

اے جماعتِ مومنین! تم نہ تو اس نظامِ خداوندی (خدا و رسولؐ) سے کسی قسم کی خیانت کرو اور نہ ہی ان ذمہ داریوں کی ادائیگی میں جو تمہارے سپرد کی جائیں۔ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا (۸/۵۸)۔ تم اسے بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ (انفرادی مفاد کے مقابلہ میں) انسانیت کے مفادِ کُلّی کو اپنا نصب العین قرار دینے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، مال اور اولاد کی کشش ہوتی ہے۔ اگر ان کی کشش تم پر غالب آگئی ہو تو یہ چیز تمہاری تباہی کا موجب بن جائے گی۔ لیکن اگر تم نے، ان کی کشش وجاذبیت کے باوجود انسانیت کے مفادِ کُلّی کو ترجیح دی، تو تم اس کٹھالی میں سے کندن بن کر نکلو گے اور دیکھو گے کہ نظامِ خداوندی کی طرف سے اس کا کس قدر عظیم بدلہ ملتا ہے۔

بیوی بچے اور بلند اقدار بیوی بچے بے شک اپنے اندر کشش وجاذبیت رکھتے ہیں اور یہ کوئی بُری بات بھی نہیں۔ لیکن جب کبھی اس کشش ومحبت اور بلند اقدارِ خداوندی میں تصادم ہو تو اُس وقت اِس کشش کو ان اقدار کے راستے میں روک نہیں بن جانا چاہیئے (۴/۲۵؛ ۱۵-۶۴/۱۴؛ ۲۴-۹/۲۳)۔

ہم نے اس خطۂ زمین کے لئے یہ کہہ کر خدا سے استدعا کی تھی کہ ہم اس میں اُس کا نظام قائم کریں گے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں یہ خطۂ ارض بطور امانت ملا تھا۔ ہم نے اس امانت میں بھی خیانت برتی اور جو ذمہ داریاں ہمارے سپرد ہوئیں، ان میں بھی خیانت برتی کیونکہ انہیں ان کے سپرد نہ کیا جو ان کے اہل تھے (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد چہارم، صفحہ ۳۳۵)۔

اس کے بعد قرآنِ کریم نے بتایا کہ ان مقدس امانات میں خیانت کے محرکات کیا ہوا کرتے ہیں۔ نظامِ خداوندی کا مطلب ربوبیتِ عالمینی ہے، یعنی "اپنوں اور بیگانوں" کی تفریق وتمیز سے بلند وبالا ہو کر، عالمگیر انسانیت کی نشوونما کا انتظام کرنا۔ اس کی ابتداء بہرحال اپنی مملکت کے افرادِ معاشرہ سے ہوگی، یعنی تمام افرادِ

معاشرہ کی طبیعی اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے اسباب و وسائل مہیا کرنا۔ اس کے برعکس، غلط معاشرہ میں، ہر شخص اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی پرورش اور نشوونما کی فکر آپ کرتا ہے۔ ان سے آگے کسی اور کی پرورش کی اسے فکر یا پرواہ نہیں ہوتی۔ اپنے بچوں کی پرورش تو حیوانات بھی کرتے ہیں۔ اگر انسان کی حدِ نگاہ بھی یہیں تک ہو تو اس میں اور حیوان میں فرق کیا رہ جاتا ہے۔ وحیٔ خداوندی اس کی نگاہ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتی ہوئی اسے عالمگیر انسانیت تک لے جاتی ہے۔ ؎

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر		سُودِ خود بیند نہ بیند سُودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سُودِ ہمہ		در نگاہش سُود و بہبودِ ہمہ

تفصیل ان امور کی سابقہ جلدوں میں، ربوبیت اور معاشی نظام کے عنوانات کے تحت ملے گی۔ قرآن رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک گھر بار، مال و دولت، بیوی بچے اپنے اندر کشش رکھتے ہیں اور یہ کشش نہ معیوب ہے نہ ممنوع۔ اس کے برعکس، وہ اہل و عیال کی زندگی میں (بشرطیکہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق بسر کی جائے) مودّت، سکون اور رحمت کا سامان بنتا ہے (۳۱/۲۱)۔

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر کسی وقت، بیوی بچوں کی کشش اور دین کے کسی بلند مقصد میں تصادم ہو (۱۱:۱) آپڑے) تو اس وقت اگر بیوی بچوں کی کشش اس بلند مقصد پر غالب آجائے، تو یہی بیوی بچے فتنہ بلکہ تمہارے دشمن بن جاتے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۳۶۔

اس ضروری تنبیہ کے بعد کہا کہ:

(۸/۲۹) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

اگر تم ان کی بیجا کشش و جاذبیت سے بچنے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے رہے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کر دے گا اور تمہاری ناہمواریوں کو تم سے دور کر دے گا اور تمام خطرات سے تمہاری حفاظت کا سامان بہم پہنچائے گا۔ یاد رکھو! اللہ کا نظام بڑی

عظیم خوشحالیوں کا ضامن ہے۔

قرآنی نظام میں زندگی بسر کرنے کے نتیجہ کو "فرقان" کہہ کر قرآن سب کچھ کہہ گیا۔ کفر و اسلام میں فرق کرنے والی زندگی، حق و باطل میں تفریق کرنے والی زندگی، اقوامِ عالم میں امتیازی مقام عطا کرنے والی زندگی۔ ے

مومنے بالاتے ہر بالا ترے　　　غیرتِ اُو بر نتابد ہمسرے

یہ امتیازی زندگی قرآن کے اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اُس نے خود قرآن کو بھی فرقان کہہ کر پکارا ہے (۲/۱۸۵؛ ۳/۳؛ ۲۵/۱)۔ لیکن یہ امتیازی زندگی بیٹھے بٹھائے نہیں مل جاتی۔ یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنے سے ملتی ہے۔ اسی لئے اُس نے بدر کی جنگ کو یوم الفرقان کہا ہے (۸/۴۱)۔ اس "یوم الفرقان" تک پہنچنے کے لئے انہیں جن جانگسل اور زہرہ گداز مراحل سے گزرنا پڑا تھا اُن کی یاد یہ کہہ کر دلائی کہ:

(۸/۳۰) وَ اِذۡ یَمۡکُرُ بِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِیُثۡبِتُوۡکَ اَوۡ یَقۡتُلُوۡکَ اَوۡ یُخۡرِجُوۡکَ ؕ وَ یَمۡکُرُوۡنَ وَ یَمۡکُرُ اللّٰہُ ؕ وَ اللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ ۝

(اے رسولؐ! تم اُس وقت کو یاد کرو) جب فریقِ مخالف (کفارِ مکہ) اس قسم کی تدبیریں کرتے تھے کہ تجھے قید کر لیں یا قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ اُدھر اس قسم کی تدبیریں کرتے تھے اور اِدھر ہمارا قانون بھی اپنی تدبیروں میں لگا ہوا تھا (اس کے بعد سب نے دیکھ لیا کہ) کارگر تدبیر ہمارے ہی قانون کی ہوئی۔

اس کے بعد بتایا کہ ان مخالفین کی کیا حالت تھی:

(۸/۳۱) وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا قَالُوۡا قَدۡ سَمِعۡنَا لَوۡ نَشَآءُ لَقُلۡنَا مِثۡلَ ہٰذَاۤ ۙ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ۝

ان کی حالت یہ تھی کہ جب اُن کے سامنے قرآن کی آیات پیش کی جائیں تو وہ (عجیب حقارت آمیز انداز سے) کہتے کہ ہم نے انہیں سُن لیا ہے (ان میں کون سی خاص بات

ہے؟ اگر ہم چاہیں تو انہی جیسی آیات ہم خود بھی بنا سکتے ہیں۔ ان میں اس کے سوا رکھا ہی گیا ہے کہ یہ پہلے لوگوں کے قصّے کہانیاں ہیں!

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ تباہی ہوگا:

(۸/۳۲) وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ○

(اور جب ان سے کہا جاتا کہ اس قانون کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم پر خدا کی طرف سے تباہی آجائے گی، تو) وہ کہتے کہ اے اللہ اگر یہ وعید فی الواقع تیری طرف سے ہے اور سچی ہے، تو پھر تجھے انتظار کس بات کا ہے؟ تو ہم پر پتھروں کی بارش برسا دے یا ہمیں کسی اور عذاب میں مبتلا کر دے۔

یہ کوتاہ اندیش اپنی تباہی کے لئے اس قدر جلدی مچاتے ہیں، لیکن ہمارے قانونِ مہلت کا تقاضا کچھ اور ہے۔ وہ اس انتظار میں ہے کہ آپ (نبی کریمؐ) کی تبلیغ و تنذیر سے جتنے خوش نصیب، نظامِ خداوندی کی پناہ میں آسکتے ہیں (یعنی امتِ مسلمہ کے زمرے میں داخل ہو سکتے ہیں) وہ اِدھر آجائیں، تو پھر (ان باقیماندہ افراد پر) عذاب وارد ہو ــــــ

(۸/۳۳) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ○

لیکن ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ اُن پر تباہی آجاتی، درآنحالیکہ تم ہنوز اُن میں مصروفِ تبلیغ تھے اور اس کا امکان تھا کہ ان میں سے کئی لوگ، حق کو قبول کر کے پناہِ خداوندی میں آجائیں گے

اب وہ مہلت کا وقفہ گزر گیا ہے اور باقی وہی لوگ رہ گئے ہیں جو اپنی ضد اور تعصب کی بنا پر حق کی بات

سننے تک کے لئے تیار نہیں۔

(۸ / ۳۴-۳۵) وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○

اب کونسی بات باقی رہ گئی ہے کہ ان پر (ان کے اعمال کے نتیجے میں) تباہی نہ آجائے اور انہیں مزید ڈھیل دی جائے؟ ان کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے اُن مقاصد اور مصالح کی راہیں بند کر رکھی ہیں جن کے لئے ہم نے کعبہ کو واجب الاحترام قرار دیا تھا۔ اس لئے یہ قطعاً اس قابل نہیں رہے کہ انہیں کعبہ کا محافظ و متولی رہنے دیا جائے۔ اس کے متولی صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو قانونِ خداوندی کی نگہداشت کریں۔ لیکن ان میں تو اکثر کا یہ عالم ہے کہ وہ جانتے تک بھی نہیں (کہ تولیتِ کعبہ کا مقصد کیا ہے؟)۔

بے مقصد صلوٰۃ

(کعبہ اور اُس کی تولیت کا عظیم مقصد تو ایک طرف) ان کی تو خانہ کعبہ میں صلوٰۃ تک بھی اس کے سوا کچھ نہیں رہ گئی کہ سیٹیاں بجائیں اور تالیاں پیٹیں ــــــ یعنی چند بے معنی آوازیں اور کچھ بے مقصد حرکتیں ــــــ یہ صلوٰۃ کی اصل حقیقت سے یکسر انکار کے مرادف ہے۔ اس لئے اُن سے کہو کہ تم اب اپنی ان حرکات کا نتیجہ بھگتو اور تباہی و بربادی کا مزہ چکھو۔ (جو قوم بھی احکامِ خداوندی کی اصل و غایت کو نظر انداز کر کے محض رسوم و ظواہر کو منتہیٰ قرار دے لیتی ہے وہ عذابِ خداوندی میں ماخوذ ہو جاتی ہے)۔

جس طرح اُن کے ہاں کعبہ نام رہ گیا ہے اینٹ اور پتھروں کی عمارت کا اور اس کا مقصود و منتہیٰ یکسر نگاہوں سے گم ہو چکا ہے، اسی طرح ان کے ہاں اُس صلوٰۃ کا لفظ تو باقی رہ گیا ہے جس کا نظام ان کے

مُورتِ اعلیٰ، حضرت ابراہیمؑ نے قائم کیا تھا، لیکن اس کی حقیقت کی جگہ چند بے معنی حرکات و سکنات نے لے لی ہے۔ ان اینٹوں اور پتھروں کی پوجا اور صلوٰۃ کے نام سے چند بے مقصد حرکات و سکنات تو انہیں اس تباہی سے بچا نہیں سکتیں جو ان کی غلط روشِ زندگی کا فطری نتیجہ ہے۔

کیا ہماری حالت بھی بعینہٖ یہی نہیں ہو چکی؟ (اس کے لئے صلوٰۃ اور کعبہ کے عنوانات دیکھئے)۔

یہ تو رہی ان کی (نام نہاد) عبادات کی حقیقت۔ جہاں تک مال و دولت خرچ کرنے کا تعلق ہے، ان کی حالت یہ ہے کہ

(۸/۳۶) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ۝

یہ لوگ جو نظامِ خداوندی سے انکار کرتے اور سرکشی برتتے ہیں اور مال اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو "خدا کے راستے" کی طرف آنے سے روکیں، سو انہیں اپنی دولت اس طرح خرچ کرنے دو۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ ان کی ان تمام حرکات کے علی الرغم نظامِ خداوندی قائم ہو کر رہے گا اور اس وقت یہ مغلوب ہو جائیں گے اور بصد حسرت دیاس کہیں گے (کہ ہم نے اپنی دولت اس ناکام مقصد کے لئے ناحق صرف کی!)۔

اس مقام پر پھر ایک ثانیہ کے لئے رُک جائیے اور سوچئے کہ جو کچھ (اور جتنا کچھ) ہم (بزعمِ خویش) خدا کی راہ میں (فی سبیل اللہ) خرچ کرتے ہیں، اُس میں سے کتنا اس منزل کی طرف لے جانے والے راستے میں صرف ہوتا ہے جسے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے اور کتنا اس راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لئے؟ اس تفصیل میں گئے بغیر کہ قرآنِ کریم کی رُو سے وہ کون کون سے عناصر ہیں جو خدا کی طرف جانے والے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتے یا روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں، ایک عنصر تو ایسا نمایاں ہے جو بالبداہت نظر آجاتا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (۹/۳۴)

خدا کا راستہ روکنے والے

اے ایمان والو! ان کے علمار و مشائخ میں سے جنہیں یہ خدائی درجہ دیتے ہیں، اکثر کی یہ حالت ہے کہ وہ، جھوٹ اور فریب سے، لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں (کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت اور اقتدار ختم ہو جاتا ہے)۔

قرآن کی رُو سے یہ علمار و مشائخ ہیں جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف لے جانے والے راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں، لیکن، درحقیقت، وہ اس راستے میں رکاوٹیں بن کر کھڑے رہتے ہیں کہ اُمت منزلِ مقصود تک جانے نہ پائے۔ یہ مذہب کو ذریعۂ معاش بنا لیتے ہیں (ان کا کوئی ذریعۂ معاش ہوتا ہی نہیں)۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۹/۹)

یہ لوگ ذرا سے فائدے کی خاطر جھٹ سے قوانینِ خداوندی کو بیچ ڈالتے ہیں اور لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ جو کچھ یہ کرتے ہیں، وہ کس قدر بُرا ہے!

سوچئے کہ ہمارا کس قدر روپیہ (جسے ہم سمجھتے ہیں کہ اسے ہم خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں)، ان رکاوٹوں کے پیدا کرنے اور کھڑی کرنے میں خرچ ہوتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ ہمارا سارا روپیہ، بالواسطہ یا بلا واسطہ، اسی مد میں چلا جاتا ہے! مذہب، بذاتِ خود دین کے راستے میں رکاوٹ ہوتا ہے۔ اسی لئے جو کچھ مذہب کے فروغ کے لئے کیا جائے گا وہ دین کا راستہ روکنے کا موجب ہوگا۔ تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ جس قدر (اور جہاں بھی)، مذہب آگے بڑھا ہے، دین پیچھے ہٹ گیا ہے۔

آیت (۸/۳۶) میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ، دین کا راستہ روکنے میں، جتنا زور جی چاہے لگا کر دیکھ لیں، یہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ دین کا نظام بالآخر کامیاب ہو کر رہے گا۔ چنانچہ ہمارے صدرِ اوّل کی تاریخ نے اسے ثابت کر کے دکھا دیا۔ لیکن قرآن کا یہ دعویٰ اُسی زمانے تک محدود نہیں تھا۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے جسے قرآن میں متعدد مقامات میں بیان کیا گیا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں حق کو آخر الامر

غالب آنا ہوتا ہے اور وہ غالب آکر رہتا ہے ــــــ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹/۳۳)
کا تعلق کسی خاص دَور سے نہیں۔ یہ ایک ابدی حقیقت کا بیان ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ باطل غالب ہے اور حق سرنگوں، تو یہ اس لئے کہ حق کی سربلندی کے لئے کوئی جماعت کھڑی نہیں ہوتی اور حق محض اپنی فطری رفتار (اندرونی قوت) سے آگے بڑھ رہا ہے اور اس کی یہ رفتار بڑی سبک خرام اور غیر محسوس ہوتی ہے۔ تشریح اس نکتہ کی سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے (انڈکس میں عنوانات 'حق و باطل یا خیر و شر کی کشمکش، ابلیس و آدم میں نبرد آزمائی یا دین کا غلبہ وغیرہ دیکھئے)۔

حق کی مخالفت کرنے والوں میں ایک گروہ وہ ہوتا ہے جو کھلے بندوں مخالفت کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں اسے سیکولرازم کے حامی کہیئے۔ ان کا مقابلہ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

دوسرا گروہ مذہب پرستوں کا ہوتا ہے۔ ان کی ایک ٹیکنیک 'کتمانِ حق ہوتی ہے، یعنی حق کو یکسر چھپائے رکھنا اور اپنے باطل مسلک کو رائج کرنا۔ جن اہلِ مذاہب کی آسمانی کتاب محفوظ نہیں ہوتی، یہ ٹیکنیک وہاں کامیاب رہتی ہے۔ دنیا میں قرآن کے سوا کوئی (مبتینہ) آسمانی کتاب بھی اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ اسی لئے جملہ اہلِ مذاہب کی یہی کیفیت ہے۔ (ہم) مسلمانوں کی آسمانی کتاب محفوظ ہے' اسی لئے ہماری مذہبی پیشوائیت کتمانِ حق تو کر نہیں سکتی۔ ان کی ٹیکنیک تلبیسِ حق و باطل ہوتی ہے۔ یہ اپنے باطل نظریات و مسالک کو کتاب اللہ کی غلط تاویلات کے سہارے پیش کرتے اور آگے بڑھاتے ہیں۔ ان کی مخالفت بڑی مشکلات پیدا کرتی ہے کیونکہ عوام ان کے دامِ فریب کے شکار ہوتے ہیں۔

حق کے غالب آجانے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ حق اور باطل' طیّب اور خبیث چھٹ کر الگ الگ ہو جائیں تاکہ کوئی شخص مذہب پرستوں کے دھوکے میں نہ آسکے۔ اس حقیقت کو اگلی آیت میں یہ کہہ کر واضح کیا گیا ہے کہ (حق کے غلبہ سے مقصود یہ ہے کہ):

(۸/۳۷) لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

یہ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات' خوشگوار نظریۂ حیات رکھنے والی جماعت کو تخریب

پیدا کرنے والی جماعت سے الگ کرلے اور تمام تخریبی جماعتیں، حق کی مخالفت میں ایک دوسرے سے مل کر انبار در انبار بن جائیں۔ اور پھر قانونِ خداوندی اس پورے ڈھیر کو بربادی اور تباہی کے جہنم میں جھونک دے اور اس طرح انہیں بتادے کہ وہ کس طرح خاسر و نامراد رہتے ہیں (۴۱/۵۵؛ ۵۹/۳۶؛ ۳/۱۷۸)۔

حق (یعنی نظامِ خداوندی) کے قیام کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں مجرم اور شریف انسان الگ الگ نظر آجاتے ہیں، اس لئے کوئی کسی سے دھوکا نہیں کھاتا۔ اس میں يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ (۵۵/۴۱)—— " ہر مجرم اپنی پیشانی سے پہچانا جاتا ہے"۔ یوں سمجھئے گویا اُس کا جرم اس کے ماتھے پر لکھا ہوتا ہے۔ اس میں (یوں سمجھئے کہ) اعلان کیا جائے گا: وَ امْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (۳۶/۵۹)—— "اے مجرمو! تم شرفاء سے الگ ہو جاؤ"۔

(ضمناً) رسول اللہ کے زمانے میں معاشرہ میں منافقین کی کثرت تھی اور قرآن شاہد ہے کہ ان کی وجہ سے کس قدر مشکلات پیش آتی تھیں۔ حق و باطل کی کشمکش اور بالآخر حق کے غلبہ کا ایک مقصد (یا ایک نتیجہ) یہ بھی تھا کہ معاشرہ، منافقین کے وجود سے پاک ہو گیا تھا۔ (تفصیل اس کی مطالب الفرقان، جلد چہارم صفحہ ۲۳۷ پر دیکھئے)۔

ان تنبیہات کے بعد کہا کہ:

(۸/۳۸) قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ اِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ○

ان مخالفین سے کہہ دو کہ یہ اب بھی حق کی مخالفت سے باز آجائیں، تو جو کچھ یہ اِس وقت تک کر چکے ہیں، اُس کا ان سے کچھ مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر یہ وہی کچھ پھر کرنے لگ گئے تو جو کچھ اقوامِ گذشتہ کے ساتھ ہوا ہے، وہی ان کے ساتھ ہوگا (۸/۳۸)۔

اسلامی نظام کی کس قدر کشادہ نگہی ہے کہ وہ مخالفین کے خلاف آخری قدم اٹھانے سے پہلے بھی

انہیں متنبہ (وارن) کرتا ہے کہ اگر وہ اپنی مخالفت اور سرکشی سے باز آجائیں، تو ان کے سابقہ جرائم کو بھی معاف کر دیا جائے گا۔ "اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ" قرآن

قانون کا اطلاق تاریخ اجرا سے ہوگا

کے نظامِ عدل کا بنیادی اصول ہے، یعنی قانون کا اطلاق اس کے نفاذ کے بعد ہوگا۔ اس سے پہلے اگر کوئی کام ایسا ہو گیا ہو جو اس قانون کے خلاف تھا تو اسے جُرم قرار نہیں دیا جائے گا۔ (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد سوم صفحہ ۱۷۴، نیز آیات ۲/۲۷۵؛ ۴/۲۳-۲۲؛ ۵/۹۵)۔

اور ان تنبیہات اور مراعات کے باوجود اگر یہ اپنی مخالفتوں سے باز نہ آئیں اور میدانِ جنگ تک میں اُتر آئیں، تو پھر تمہارے لئے مدافعت ناگزیر ہو جائے گی۔ اس لئے

(۸ / ۴۰-۳۹) وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۚ فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○ وَإِن تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ ۚ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ○

بہرحال، جب تک یہ اپنی حرکات سے باز نہیں آتے، تم ان کے خلاف جنگ جاری رکھو، تا آنکہ (ظلم و استبداد کا) وہ فتنہ فرو ہو جائے جو انہوں نے برپا کر رکھا ہے اور ایسی فضا پیدا ہو جائے جس میں، جس کا جی چاہے، پوری آزادی سے دین کو خالصۃً بِوَجْهِ اللّٰهِ (بلا جور و اکراہ) اختیار کر سکے (۲/۱۹۳؛ ۲/۲۵۶)۔

اگر یہ لوگ اس فتنہ سے باز آجائیں، تو پھر ان سے مؤاخذہ کی ضرورت نہیں (کیونکہ جنگ سے مقصد ہی اس فتنہ کو فرو کرنا اور دین کے معاملہ میں لوگوں کو پوری پوری آزادی دینا تھا تاکہ جو شخص جسے بزعمِ خویش سچا دین سمجھتا ہے، اسے بطیبِ خاطر اختیار کرے اور جسے ایسا نہیں سمجھتا اس سے انکار کر دے)۔ یہ دینِ خداوندی آہستہ آہستہ ایسا کرے گا کہ اپنے خوشگوار تعمیری نتائج سے تمام غلط نظاموں (باطل ادیان) پر غالب آجائے۔

(۹/۳۳) اور اس صورت میں قانون خداوندی اس پر نگاہ رکھے گا کہ یہ اس کے بعد کیا کرتے ہیں (۸/۳۹).

اور اگر یہ بعد میں اپنے معاہدہ سے پھر جائیں (تو تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں) تمہارا رفیق و دمساز تو بہرحال خدا کا قانون ہے. وہ کیسا اچھا رفیق اور کارساز اور کیسا اچھا معین و مددگار ہے (۸/۴۰).

اسلام میں جنگ کی اجازت کن حالات میں ہے' اس کے اشارات اسی سورۃ کے ابتدا میں پیش کئے جا چکے ہیں. آیت (۲/۱۹۳) میں بھی یہی الفاظ آتے ہیں. اس کی تشریح مطالب الفرقان' جلد سوم صفحات ۲۶۵ تا آخر ملاحظہ فرمایئے.

شروع سورہ میں بتایا جا چکا ہے کہ جنگ کے ضمن میں قرآن کریم نے ایک اہم اصلاح یہ بھی کی کہ دشمن سے جو مال و اسباب ہاتھ آئے اسے "لوٹ کا مال" تصور نہ کر لیا جائے کہ جو جس سپاہی کے ہاتھ آ جاتے' وہ اس کا ہو جائے. عام قاعدہ یہ تھا کہ جو سپاہی جس دشمن کو قتل کرے' اس کا مال و اسباب اس سپاہی کی ملکیت قرار پاتے. اس نے کہا کہ وہ سب مال' مملکت کی تحویل میں دیا جائے گا جسے وہ حسب ضرورت تقسیم کرے گی. فرمایا:

دسواں پارہ شروع

(۸/۴۱) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

جنگ کے سلسلہ میں اس اہم حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ اس سے پہلے تمہارا دستور یہ تھا کہ جنگ میں جو کچھ کسی کے ہاتھ آجائے وہ اُسی کا ہو۔ یہی لوٹ کا مال، وہ بنیادی جذبہ تھا جس کے لئے تم میدانِ جنگ میں جایا کرتے تھے۔ لیکن اب جنگ ظلم کو روکنے اور نظامِ عدل واحسان قائم کرنے کے لئے ہوگی۔ اس لئے اس میں جذبۂ محرکہ لوٹ کا مال حاصل کرنا نہیں ہوگا۔ یاد رکھو! میدانِ جنگ میں جو مالِ غنیمت بھی ملے گا، اس میں سے پانچواں حصہ "خدا اور رسول" ——— یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات ——— کے لئے رکھ کر، باقی ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے میں صرف کیا جائے گا ——— مثلاً (میدانِ جنگ میں جانے والوں اور کام آجانے والوں کے) اقربا کے لئے، یتیموں اور معاشرہ میں بے یار و مددگار تنہا رہ جانے والوں کے لئے، جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک گیا ہو، یا جو کسی حادثہ کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں، نیز اُن مسافروں کے لئے جو مدد کے محتاج ہوں[1]۔

تقسیم کا اُصول

ہم جانتے ہیں کہ اس طرح ہاتھ آئے ہوئے مال سے یوں دست کش ہوجانا کچھ آسان کام نہیں، لیکن اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اُن احکام پر جو ہم نے اپنے بندے پر اُس دن نازل کئے تھے جب دو لشکر ایک دوسرے کے مقابل آئے تھے اور جب حق و باطل نکھر کر سامنے آگیا تھا (تو تمہارے لئے ایسا کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ مستقل اقدار پر ایمان، اس قسم کی تمام جاذبیتوں کو ٹھکرا سکتا ہے)، اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ اللہ نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں اور اُن پر اس کا پورا پورا کنٹرول ہے (اس لئے اس کے قانون پر عمل پیرا ہونے سے تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں ہوگا)۔

سابقہ جلدوں میں، قرآن کے معاشی نظام کے سلسلے میں بتایا جاچکا ہے کہ جملہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا مملکت کی ذمہ داری ہوتا ہے۔ اس نظام کی رُو سے کسی کے پاس زائد از ضرورت کچھ رہنے کا سوال

---

[1] تقسیم کا اصول یہ تھا کہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب شاہکارِ رسالت صفحہ ۳۷۹، ایڈیشن چہارم (بلا ترمیم) ۱۹۸۷ء)۔

پیدا نہیں ہوتا۔ آیت زیر نظر میں کہا گیا ہے کہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصّہ "اللہ اور رسول" (نظامِ مملکت) کی تحویل میں رہے گا اور بقایا (۴/۵) حاجت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تقسیم کیا جائے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم قرآنی مملکت کے ابتدائی ایام سے متعلق ہے۔ اس کی تکمیل کے بعد[1] اس قسم کی الگ الگ تقسیم کی ضرورت نہیں رہے گی۔ (مالِ فَے کے متعلق (۱/۵) اور (۴/۵) کی تفریق نہیں تھی۔ وہ سب کا سب حکومت کی تحویل میں رہتا تھا تاکہ وہ اسے ضرورتمندوں میں مناسب طریق سے تقسیم کرے (۵۹/۷)۔
مالِ غنیمت کی ملکیت اور تقسیم کی اصلاح سے مقصد یہ تھا کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃً ۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ؕ (۵۹/۷) "دولت اُوپر کے طبقہ ہی میں گردش نہ کرتی رہے"۔ وہ دورانِ خون کی طرح ملّت کے پورے کے پورے "جسم" میں گردش کرے۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم ہر مقام پر کس طرح اپنے معاشی نظام کے اصولوں کو نمایاں کرتا چلا جاتا ہے۔ جس نظام میں دولت اوپر کے طبقہ (اغنیاء) ہی میں گردش کرتی رہے اور نچلا طبقہ اُن کا محتاج ہو، وہ نظام غیر قرآنی ہے۔
جس مال کے متعلق کہا کہ وہ "اللہ اور رسول" (نظامِ مملکت) کی تحویل میں رہے گا، وہ بھی سربراہِ مملکت کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا تھا۔ وہ رفاہِ عامہ کے لئے خرچ کرنے کے لئے ہوتا تھا۔ چنانچہ حضورؐ نے یہ کہہ کر اس کی تشریح کر دی تھی،

> تمہارے مالِ غنیمت میں سے میرے لئے پانچواں حصّہ ہے اور یہ حصّہ بھی تم ہی لوگوں کو واپس دے دیا جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

کمیونزم کے مدّعی بڑے فخر سے کہا کرتے ہیں کہ دنیا کی معاش کا حل کارل مارکس نے یہ بتایا تھا کہ:

> ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے، اور ہر ایک کو اُس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔

یہ اصول بڑا درخشندہ اور تابناک ہے اور نوعِ انسان کی معاشی مشکلات کا اطمینان بخش حل۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ اصول مارکس نے نہیں، حضور نبی اکرمؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور مارکس کی طرح محض نظری طور پر ہی پیش نہیں کیا تھا، بلکہ اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا تھا۔ (مثلاً، مالِ غنیمت کو دیکھئے۔

---

[1] اس کی تفصیل میری کتاب "نظامِ ربوبیت" میں ملے گی۔

ظاہر ہے کہ جنگ میں تمام سپاہی (مجاہدین) یکساں حصہ لیتے تھے اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق نبرد آزمائی کرتے تھے۔ مالِ غنیمت میں ان سب کا حصہ یا تو یکساں ہونا چاہیئے تھا یا ان کی کارکردگی کے مطابق۔ لیکن حضورؐ نے اصول یہ طے فرمایا کہ ہر ایک کو اُس کی ضروریات کے مطابق حصہ دیا جائے۔ (بخاری، کتاب الجہاد)۔ اور عملاً اس کا مظاہرہ یوں ہوتا تھا کہ مجرّد (غیر شادی شدہ) کو ایک حصہ ملتا تھا اور اہل وعیال والے کو دو حصے۔ (ابو داؤد۔ کتاب الخراج الامارہ)۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے لئے وظائف مقرر کئے گئے، تو ان کے لئے بھی یہی اصول اختیار کیا گیا، یعنی ہر ایک کا وظیفہ اس کی ضروریات کے مطابق نہ کہ خدمات کے تناسب سے۔

بات تو مالِ غنیمت کی تقسیم کی ہو رہی ہے، لیکن جس آیت (۵۹/۷) کا ذکر مالِ فے کے سلسلہ میں آیا ہے، اس کے ضمن میں ایک ایسا نکتہ سامنے آیا ہے جسے پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حدیث کے مقام اور اطاعتِ رسول کے سلسلہ میں سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے، جس سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے اطاعت، احکامِ خداوندی کی ہے۔ نبیٔ اکرمؐ خود بھی انہی احکام کی اطاعت کرتے تھے اور اُمّت سے بھی انہی کی اطاعت کراتے تھے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کا مسلک یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت الگ ہے اور رسولؐ اللہ کی اطاعت الگ۔ اطاعتِ رسولؐ سے عہدہ برآ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جس بات کا حضورؐ نے حکم دیا، اسے بجالایا جائے گا۔ جس سے آپؐ نے منع فرمایا، اس سے رُکا جائے گا۔ رسولؐ اللہ کے یہ اوامر و نواہی کتبِ احادیث میں ملیں گے۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں وہ کہہ دیتے ہیں کہ دیکھئے! خود خدا نے فرمایا ہے، وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (۵۹/۷)
" جو کچھ تمہیں رسولؐ دے، اسے لو، جس سے منع کرے، اس سے رُک جاؤ "۔

ہم اس وقت " اطاعتِ رسولؐ " کی بحث نہیں چھیڑنا چاہتے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ حضرات اپنے دعویٰ کی تائید میں قرآن تک میں دستبرد سے بھی نہیں چوکتے۔ قرآن کے جو الفاظ یہ حضرات پیش کرتے ہیں، وہ اس آیت کا حصہ ہیں جو (سورۃ) الحشر میں اس طرح آئی ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ

فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (۵۹/۷)

دشمن کا جو مال و اسباب اس طرح جنگ کئے بغیر ہاتھ آجائے، اس کی نوعیت عام مالِ غنیمت سے مختلف ہوتی ہے (۸/۴۱)۔ یہ مال سب کا سب، نظامِ خداوندی کی تحویل میں رہنا چاہیئے تاکہ اس کو ضرورتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے صرف کیا جائے۔ مثلاً (جنگ میں شریک ہونے اور کام آجانے والوں کے) اقربا کے لئے، یتیموں اور معاشرہ میں بے یار و مددگار تنہارہ جانے والوں کے لئے، ان کے لئے جن کا چلتا ہوا کاروبار رُک گیا ہو یا جو کسی وجہ سے کام کاج کرنے کے قابل نہ رہ گئے ہوں، نیز ان مسافروں کے لئے جو مدد کے محتاج ہوں۔ اسے اس طرح نہیں بانٹنا چاہیئے کہ یہ دولت مندوں کے طبقہ میں ہی گردش کرتا رہے (اور محتاج اور غریب، اپنی ضروریاتِ زندگی تک سے بھی محروم رہ جائیں)۔ لہٰذا، اس کی تقسیم میں، جو کچھ تمہیں رسولؐ (مرکزِ نظامِ خداوندی) دے، اسے بطیبِ خاطر قبول کرو اور جس مال سے تمہیں روکے، اس سے برضا و رغبت رُک جاؤ (۹/۵۹)۔ تم ہر حال میں، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ ان قوانین کی خلاف ورزی پر سخت مواخذہ ہوتا ہے۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ مالِ غنیمت (فَے) کی تقسیم کے سلسلہ میں جو کچھ رسول اللہؐ کسی کو دیں، اسے بطیبِ خاطر قبول کرلینا چاہیئے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ مجھے کم دیا گیا ہے اور فلاں کو زیادہ۔ یہی بات قرآن نے صدقات کی تقسیم کے متعلق بھی کہی ہے (۹/۵۹)۔ آپ غور کیجئے کہ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ کس چیز کے لئے آیا ہے اور یہ حضرات اسے اپنے کس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں؟

اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ

سوچئے کہ ان کی کتنی بڑی جرأت ہے! ان سے کون کہے کہ اپنے مسلک کی تائید میں اور جتنی دلیلیں جی چاہے لے آیئے لیکن قرآن کو تو مسخ نہ کیجئے۔ اطاعتِ رسولؐ کے ضمن میں قرآن مجید میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔

قرآن نے جو غنائم کے متعلق خاص طور پر کہا ہے کہ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ

عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا ۚ (۵۹/۷)، تو اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، عربوں کے ہاں یہ دستور چلا آتا تھا کہ مقتول دشمن کا مال و اسباب سپاہی کی ذاتی ملکیت ہو جاتا تھا۔ قرآن نے اس رواج اور دستور کی جگہ یہ قاعدہ مقرر کیا کہ مالِ غنیمت سب کا سب، حکومت کی تحویل میں رہے گا اور وہیں سے تقسیم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی اکثر سپاہیوں کے مفاد کے خلاف جاتی تھی)۔ اس لئے جو کچھ انہیں ملتا تھا وہ اس سے خوش نہیں ہو سکتے تھے۔ ان پر اس تبدیلی کے بلند مقاصد واضح کرنے کے لئے ان سے کہا گیا کہ اس تقسیم کی رُو سے جو کچھ سربراہِ مملکت تمہیں دیدے، اُسے بطیبِ خاطر قبول کرو۔ جب اس نظام کے نتائج تمہارے سامنے آئیں گے تو تم خود پکار اٹھو گے کہ یہ تقسیم فی الواقع بہترین ہے۔

آیت (۸/۴۱) میں جنگِ بدر کو یوم الفرقان کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس کے بعد اس جنگ کی مزید تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ اس کا نقشہ یوں تھا کہ قریش کا قافلہ، مدینہ سے قریب نسبتاً پست راستے سے گزر رہا تھا۔ ان کا لشکر (مکہ سے) دور دراز راہیں طے کرتا ہوا آ رہا تھا۔ مجاہدین مدینہ سے باہر نکل کر بدر کے میدان میں پہنچ رہے تھے۔

(۸/۴۲) اِذۡ اَنۡتُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الدُّنۡيَا وَهُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الۡقُصۡوٰى وَالرَّكۡبُ اَسۡفَلَ مِنۡكُمۡ ؕ وَلَوۡ تَوَاعَدۡتُّمۡ لَاخۡتَلَفۡتُمۡ فِى الۡمِيۡعٰدِ ۙ وَلٰـكِنۡ لِّيَقۡضِىَ اللّٰهُ اَمۡرًا كَانَ مَفۡعُوۡلًا ۙ لِّيَهۡلِكَ مَنۡ هَلَكَ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحۡيٰى مَنۡ حَىَّ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۙ

اُس دن (جنگِ بدر کے موقع پر) تم اِدھر قریب کے ناکے پر تھے اور دشمن اُدھر دُور کے ناکے پر اور قافلہ نچلی طرف سے گزر رہا تھا۔ اگر تم نے آپس میں ہی فیصلہ کرنا ہوتا کہ جنگ کی جائے یا نہ اور کی جائے تو کب اور کہاں کی جائے تو تمہارا اس باب میں ضرور اختلاف ہو جاتا۔

(اس لئے کہ تم میں کچھ لوگ دشمن کی کثرت سے خائف تھے اور کچھ قافلہ لوٹنا چاہتے تھے)۔
لیکن قانونِ خداوندی کا تقاضا یہ تھا کہ فریقِ مخالف سے تمہارا ٹکراؤ ہو جائے۔ تاکہ جسے
ہلاک ہونا ہے، وہ بھی کھلی دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے، وہ بھی کھلی
دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے (یعنی جسے زندہ
رہنا ہے، وہ اس امر کا ثبوت بہم پہنچائے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے اور
جسے مرنا ہے، وہ دنیا کو دکھا دے کہ اُس میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ یہ دونوں
شکلیں ٹکراؤ سے سامنے آ سکتی ہیں اور یہی قانونِ ارتقاء ہے)۔

سابقہ صفحات (زیرِ آیات ۷ - ۸/۵) میں بتایا جا چکا ہے کہ جنگ کے اس تناظر میں مجاہدین کے
دلوں میں کس طرح متضاد خیالات رونما ہو رہے تھے۔ اگر فیصلہ انہی پر چھوڑا جاتا تو ان حالات میں ممکن تھا
ان میں باہمی اختلاف ہو جاتا۔ کوئی جنگ کرنے کے حق میں ہوتا، کوئی قریش سے صلح کرنے کے حق میں
اور کوئی قافلہ لوٹنے کو ترجیح دیتا۔ لیکن خدا کے متعین فرمودہ پروگرام کے مطابق بہتر یہی تھا کہ حق و باطل کا

جنگ کا مقصد

فیصلہ میدانِ جنگ میں ہو جائے۔ جنگ کے مقاصد کے متعلق پہلے بات
کی جا چکی ہے۔ آیت (۸/۸) میں اس کا مقصد بتایا تھا: لِيُحِقَّ الْحَقَّ
وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ یعنی اس سے حق کا اثبات اور باطل کا ابطال ہو جائے۔ سورۃ توبہ (۹/۴۰) میں کہا
ہے: وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ ——— تاکہ اس
طرح باطل کے نظریات اور مسالک پست ہو جائیں اور نظامِ خداوندی غالب آ جائے۔ یہاں کہا: لِيَهْلِكَ
مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ——— تاکہ جسے زندہ رہنا ہے،
وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے۔ جسے ختم ہونا ہے، وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے ختم ہو۔ اس آیت
میں قوموں کے عروج و زوال اور فنا و بقا کا عظیم اصول بیان کیا گیا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہاں نہ کوئی قوم
خدا کی چہیتی اولاد ہے کہ وہ، جو جی میں آئے کرتی رہے، زندگی کی کامرانیاں اور کامیابیاں اس کے ہمرکاب
رہیں گی۔ نہ ہی کوئی قوم سوتیلی اولاد ہے کہ وہ کتنی ہی صلاحیتوں کی مالک ہو، وہ راندۂ درگاہ رہے گی نہیں۔
یہاں اصول یہ کارفرما ہے کہ جو قوم بدلائل و براہین ثابت کر دے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت اور
استعداد ہے، وہ زندہ رہے گی۔ جو ایسا ثابت نہ کر سکے، وہ ختم ہو جائے گی۔ کشمکش حق و باطل کا مقصد

یہی ہے اور اسی کشمکش کا آخری مرحلہ میدانِ جنگ ہوتا ہے جہاں یہ صلاحیتیں نکھر اور اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں (انڈکس میں دیکھئے "قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین")۔

انسان کی نفسیاتی تبدیلی کس طرح خارجی احوال و کوائف میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔ جماعتِ مومنین سے کہا گیا تھا کہ اگر تم نے استقامت سے کام لیا، تو اول تو اپنے سے دس گنا فریقِ مقابل پر غالب آجاؤ گے (۸/۶۵) اور اگر تم ساز و یراق میں کم ہوئے تو اپنے سے دگنوں پر ضرور کامیابی حاصل کر لو گے (۸/۶۶)۔ خدا کی طرف سے اس یقین دہانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کی تعداد سچ مچ ان کی نگاہوں میں کم دکھائی دینے لگی۔

(۸ / ۴۴-۴۳) إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ○ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ○

جب اللہ نے تیری نگاہ میں دشمنوں کی تعداد کو تھوڑا کر دکھایا تھا ـــــ یعنی تم جان گئے تھے کہ ان کی کثرت ان کے کسی کام نہ آسکے گی اور یہی آخر الامر ہوا بھی ـــــ اگر وہ تمہاری نظروں میں بہت زیادہ دکھائی دیتے تو تم ہمت ہار دیتے اور جنگ کے معاملہ میں باہم جھگڑنے لگ جاتے۔ لیکن اللہ نے تمہیں اس صورتِ حال سے بچا لیا، اس لئے کہ اللہ کو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں کیا کیا خیالات گزر رہے ہیں (۴۳)۔

جب تم ایک دوسرے کے سامنے آئے تو دشمن کو تمہاری نظروں میں کم کر کے دکھایا گیا (یعنی تم سے صرف دو چند حالانکہ وہ درحقیقت تم سے سہ چند سے بھی زیادہ تھے[۲])۔

اس لئے کہ تم خلوص اور استقامت کے ساتھ میدان میں آئے تھے اس کی وجہ سے دشمن کی کثرت تمہیں مرعوب نہیں کر رہی تھی (۳/۱۷۲)۔ ان کی نگاہوں میں تمہیں اور بھی تھوڑا کر کے دکھایا (کیونکہ وہ قوت کے نشے میں بدمست تھے اور تمہیں کسی خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے)۔ یہ اس لئے کہ خدا اس معاملہ کا فیصلہ کر دے جو واقع ہو کر رہنے والا تھا۔ اور (یاد رکھو) تمام امور، قوانینِ خداوندی کے گرد گردش کرتے اور انہی کی رُو سے تمام معاملات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ (تم نے اس سے اندازہ کر لیا ہوگا کہ زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے خارجی حوادث میں کس طرح تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو نفسیاتی تبدیلی کہا جاتا ہے ۸/۵۳)۔

سابقہ آیات میں بتایا گیا تھا کہ جماعتِ مومنین نے استقامت سے کام لیا تو انہیں ملائکہ کی تائید و نصرت حاصل ہوگی (۱۰-۸/۹؛ ۴۱/۳۰؛ ۴۶/۱۳) اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انہیں اطمینانِ قلب میسر آجائے گا۔ اسے (عصرِ حاضر کی اصطلاح میں) نفسیاتی تبدیلی کہا جاتا ہے جس کا ذکر ذرا آگے چل کر آیت (۸/۵۳) میں آئے گا۔ اس نفسیاتی تبدیلی کا اثر یہ تھا کہ مجاہدین کی نگاہوں میں دشمن کچھ تھے ہی نہیں تھے۔ وہ انہیں ان کی تعداد سے بہت کم نظر آتے تھے۔ دوسری طرف مخالفین نشۂ قوت میں بدمست تھے جس سے ان میں ایسا احساسِ برتری Superiority Complex پیدا ہو گیا تھا کہ وہ لوگ مجاہدین کو خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔ غور کیجئے، دونوں کی نگاہوں میں فریقِ مقابل اصل سے کم نظر آتا تھا لیکن مجاہدین کے زاویۂ نگاہ کی یہ تبدیلی اطمینانِ قلب کا نتیجہ تھی اور مخالفین کی نگاہ کی تبدیلی قوت کے نشہ کی پیدا کردہ۔ اس فرق کا نتیجہ جلد ہی سامنے آگیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ نفسیاتی تبدیلی کے اثرات اور نتائج کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کا جذبۂ محرکہ کیا ہے۔ علم النفس کے ماہرین کے لئے اس نکتہ میں بھی غور و فکر کا بڑا سامان ہے۔ اس فرق کی طرف آئندہ آیات میں بھی توجہ دلائی گئی ہے۔

(۸/۴۵-۴۶) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ

رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝

(اب سنو کہ کثیر لشکر، کم کس طرح ہوا کرتا ہے اور چھوٹی جماعت بڑی پر غالب کیسے آیا کرتی ہے) اس سلسلہ میں یاد رکھو کہ جب بھی تمہارا مقابلہ کسی جماعت سے ہو، تم ثابت قدم رہو اور قوانینِ خداوندی کو شدت کے ساتھ اپنے سامنے رکھو (اور اپنا ہر قدم ان کی روشنی میں اٹھاؤ)۔ یہ کرو گے تو تمہیں یقیناً کامیابی ہوگی (۴۵)۔

اور "اللہ اور رسول" ـــــ یعنی اپنے نظام ـــــ کی پوری پوری اطاعت کرو۔ یہ نہ ہو کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگ جاؤ اور انفرادی مفاد کی خاطر باہمی تکرار شروع کر دو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اس لئے تم ہمیشہ ثابت قدم رہو۔ یاد رکھو! قوانینِ خداوندی کی تائید و نصرت انہی کے ساتھ ہوتی ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں (۴۶)۔

زندگی کے ہر معرکہ میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنا۔ مصائب اور مشکلات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرنا۔ سربراہان کی اطاعت کرنا۔ آپس میں جھگڑنا نہیں۔ ایک تبدیلی اس طرح واقع ہوگی۔ اس سے نصرتِ خداوندی تمہارے شاملِ حال رہے گی، یعنی کامرانی و فتحمندی۔ ـــــ اس کے برعکس:

(۸/۴۷) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝

اور دیکھنا! تم کہیں اُن لوگوں (اپنے مخالفین) کی طرح نہ ہو جانا جو اپنے گھروں سے (جنگ کے لئے) نکلے تو عجیب انداز سے اتراتے ہوئے، اور لوگوں کے دکھاوے کی خاطر نکلے۔ یہ تو ان کے اوچھے پن کی کیفیت تھی اور مقصد یہ کہ لوگوں کو اللہ کے راستے کی طرف آنے سے روکیں جو نوعِ انسان کی سلامتی اور بہبود کی راہ ہے۔ لیکن خدا کا قانون

انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ وہ ان کے تمام اعمال کو محیط تھا۔

آپ نے دیکھا کہ دونوں فریقوں کے اندازِ نگاہ اور مقاصد میں کیا فرق تھا۔ ایک فریق (مجاہدین) ایک بلند مقصد کے حصول کی خاطر باہر نکلا۔ اس میں اُن کے پیشِ نظر نہ ستائش کی تمنا تھی، نہ صلہ کی امید۔ بلند اقدارِ خداوندی کا حصول اُن کی تمنا تھی اور اس میں کامیابی اُن کا صلہ۔ دوسرے فریق کے سامنے کوئی بلند مقصد نہیں تھا۔ لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بننے کے لئے اپنی قوت کی نمود ان کا جذبۂ محرکہ تھا۔ اُس قسم کے بلند مقصد اور اُس سے پیدا شدہ جرأت و بسالت کے مقابلہ میں اس قسم کے پست مقاصد اور ان کے حصول کے لئے سعی و کاوش کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ ایمان کی قوت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

ع کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

قرنِ اول کے مسلمانوں (جماعتِ مومنین) نے جو محیرّ العقول کارنامے سرانجام دیئے تھے ان کی بنیادی وجہ اُن کے ایمان کی محکم قوت تھی۔ ع

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

(۸/۴۸) وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ ۖ فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيٓءٌ مِّنكُمْ إِنِّيٓ أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّيٓ أَخَافُ اللَّهَ ۚ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ان کے ایک شریر سرغنے نے (جو انہیں جنگ کے لئے اکساتا تھا)، ان کے پروگرام کو اُن کی نگاہوں میں بڑا خوشنما بنا کر دکھایا اور ان کے کان میں یہ افسوں

پھونک دیا کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور انہیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ لیکن
جب اس نے دیکھا کہ دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل آگئے ہیں، تو پچھلے پاؤں
بھاگ کھڑا ہوا اور صاف کہہ دیا کہ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں۔ میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں
جو تم نہیں دیکھتے (مجھے نظر آتا ہے کہ تمہیں کس بُری طرح شکست ہونے والی ہے)۔
مجھے خدا (کی اس جماعت) سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کے ہاتھوں
تمہیں کس قدر سخت سزا ملنے والی ہے۔

جس قوم کی منافقت کی یہ حالت ہو تو اس کے سرغنے بھی ایسے ہوتے ہیں۔ پہلے انہیں ٹکراؤ کے لئے اکسائیں اور پھر وقت پر دغا دے جائیں۔ ہماری (صدرِ اوّل کے بعد کی) تاریخ اس قسم کے منافقوں اور فریب کاروں سے اٹی پڑی ہے۔ منافقین کو حقیقت اپنے اصلی رنگ میں نظر ہی نہیں آیا کرتی ـــــ

(۸/۴۹) اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

اور جب منافقین ـــــ یعنی وہ لوگ جن کی نیّت میں خرابی تھی ـــــ کہتے تھے
کہ مسلمانوں کو ان کے دین نے دھوکا دے رکھا ہے (جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم قلیل التعداد
ہونے کے باوجود غالب آئیں گے کیونکہ ہم حق پر ہیں۔ انہیں اس کا علم نہیں کہ یہ دھوکا
نہیں بلکہ حقیقت ہے جو ان لوگوں کو صاف نظر آجاتی ہے) جو قانونِ خداوندی کے محکم
اور استوار ہونے پر کامل اعتماد رکھتے ہیں ـــــ وہ قانون جو یہ بھی جانتا ہے کہ
غالب کیسے آیا جاتا ہے اور یہ بھی کہ محکم تدبیریں کس طرح کی جاتی ہیں۔

قرآنِ کریم نے منافقت کو "دل کا روگ" کہہ کر پکارا ہے۔ اسی کو عصرِ حاضر میں نفسیاتی مرض کہا جاتا ہے۔ غور فرمائیے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ایسی عمیق اور نازک حقیقت کا انکشاف قرآن ہی کا حصہ ہو سکتا تھا! ایسے مریضوں کا مقابلہ کرنے کے لئے قوانینِ خداوندی کی صداقت پر کامل یقین اور اعتماد کی ضرورت

نفسیاتی امراض کے علاج کی شرط

ہوتی ہے۔ اس میں پھر نفسیاتی امراض کے علاج کے سلسلہ میں ایک بنیادی نکتہ سامنے لایا گیا ہے نفسیاتی امراض کے علاج کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ مریض کو معالج پر پورا پورا اعتماد ہو۔ ایسا نہ ہو تو بڑے سے بڑا انفسیاتی معالج مریض کے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ قرآن کریم نے جماعت مومنین سے کہا کہ تم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہو، یا جو تبدیلی پیدا ہو چکی ہے اسے محکم اور پائدار رکھنا چاہتے ہو، تو اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ تمہیں قوانینِ خداوندی کی صداقت اور حقیقت پر پورا پورا اعتماد ہو۔

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ —— اللہ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی اس کے معنی یہ ہیں کہ صحیح نہج زندگی اور اس میں کامرانیوں اور کامیابیوں کے لئے قوت کی بے شک ضرورت ہوگی، لیکن قوت کے ساتھ حکمت Wisdom بھی ناگزیر ہے (حکمت اور قوت کے امتزاج کے لئے انڈکس میں عنوانات —— "قوانین اور قوت" یا "قوت اور علم" دیکھئے)۔ یہ قرآنی نظامِ زندگی کی منفرد خصوصیت ہے جس میں قوت اور حکمت کا امتزاج ہے۔ خالی حکمت فلسفہ ہے جس سے زندگی کے عملی مسائل حل نہیں ہو سکتے اور خالی قوت چنگیزیت ہے۔

اس سیل سُبک سیر و زمیں گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

(ضربِ کلیم)

اسلامی نظام کو عزیز (صاحبِ قوت) بھی ہونا چاہیئے اور حکیم (صاحبِ عقل و دانش) بھی۔

منافقین اپنی ابلہ فریبیوں اور مکارانہ سازشوں کی عارضی کامیابی پر کتنے ہی شاداں و فرحاں ہوں اُن کا انجام بڑا دردناک اور عبرت آموز ہوتا ہے۔

(۸/۵۰) وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ○

(یہ لوگ اِس وقت تو یوں بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں لیکن اے مخاطب!) اگر تو

کہیں ان) کی اس حالت کو دیکھ سکے جب (میدانِ جنگ میں) ملائکہ ان کی روح قبض کر رہے ہوں گے اور انہیں آگے اور پیچھے سے 'توبڑ تو' مار پڑ رہی ہوگی اور وہ ان سے کہتے ہوں گے کہ اب تم اُس سوزناک عذاب کا مزہ چکھو (جس کی تم ہنسی اڑایا کرتے تھے (۶/۹۴).

اور یہ عذاب خود ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

(۸/۵۱) ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

یہ سب تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے جو تم کر چکے ہو۔ خدا اپنے بندوں پر زیادتی نہیں کیا کرتا۔

جیسا کہ ہم شروع سے دیکھتے چلے آرہے ہیں، قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ قوموں کے عروج و زوال کے اصول اور قوانین پیش کرتا ہے اور ان کی تائید اور شہادت میں اقوامِ سابقہ کے احوال و کوائف اور ان کا انجام و مآل بیان کرتا ہے۔ اس مقام پر بھی اُس نے، قریش کو یہ بتانے کے بعد کہ ان کی غلط روشِ زندگی کا انجام تباہی ہوگا، ان کی توجہ قومِ فرعون کے انجام کی طرف مبذول کرائی ہے۔ فرمایا:

(۸/۵۲) كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

(یہ معاملہ جو اب سامنے آرہا ہے، ایسا ہی ہے) جیسا اس سے پہلے، قومِ فرعون کے ساتھ ہو گزرا ہے۔ نیز اُن اقوام کے ساتھ جو اس سے پہلے گزر چکی تھیں۔ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی، تو اُس کے قانونِ مکافات نے اُنہیں اُن کے جرائم کی پاداش میں پکڑ لیا۔ بے شک خدا کا قانونِ مکافات بڑی قوت والا اور

مؤاخذہ کرنے میں بڑا ہی سخت ہے (۸/۵۲)۔

اور اس کے بعد نفسیاتی تغیّر کا وہ عظیم اصول بیان فرمایا ہے جس کی بنیادوں پر افراد اور اقوام کی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

(۸/۵۳) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ

یاد رکھو! یہ سب اس لئے ہوا کہ خدا کا یہ محکم قانون ہے کہ وہ، زندگی کی جو خوشگواریاں کسی قوم کو عطا کرتا ہے، اُن میں اُس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم، خود اپنے اندر، ایسی نفسیاتی تبدیلی نہیں پیدا کر لیتی جس سے وہ ان خوشگواریوں کی اہل نہ رہے۔ جو قوم اپنی ذہنیت کو تخریب کی طرف نہ لے جائے اور اپنے معاشرہ کو، قوانینِ خداوندی کی روشنی میں، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ منطبق کرتی جائے، اور جہاں کوئی ذرا سی خرابی نظر آئے اس کی ساتھ ساتھ اصلاح کرلے، تو اس قوم کا عروج، مبدّل بہ زوال نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ قوموں کا عروج و زوال یونہی اندھا دھند واقع نہیں ہو جاتا۔ یہ اُس خدا کے محکم اصولوں کے مطابق واقع ہوتا ہے جو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے (۱۳/۱۱)۔

نفسیاتی تغیّر کے بغیر خارجی انقلاب ممکن نہیں

سورۃ الرّعد میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۗ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ (۱۳/۱۱)

یہ حقیقت ہے کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی نفسیات کو

نہ بدلے۔ (چنانچہ) جس طرح یہ ایک محکم اصول ہے کہ زندگی کی جو خوشگواریاں کسی قوم کو حاصل ہوں، وہ اس سے نہیں چھنتیں جب تک وہ ان کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے (۸/۵۳)۔ یہ بھی ایک غیر متبدل قانون ہے کہ جب کسی قوم پر اس کے اعمال کے نتیجے میں تباہی آتی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ ہی اس قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے (۱۳/۱۱)۔

قرآن کریم نے ان آیات میں ایک ایسا بنیادی اصول بیان فرمایا ہے جس پر انفرادی اور اجتماعی زندگی کا دار و مدار ہے۔ جس قسم کا زاویۂ نگاہ، اسی قسم کی زندگی۔ ہمارے ہاں کے شعراء کے ہاں (اور ہمارے ہاں کے شعراء ہی کیوں؟ دنیا بھر کے شعراء کے ہاں) یہ موضوع بڑا مقبول اور محبوب چلا آرہا ہے۔ وہ اسے نفس کے بجائے دل کہہ کر پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں، دنیا مرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلا

ایک اور شاعر نے کہا ہے

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی ۔۔۔ فقط ایک دل کی شگفتگی سببِ نشاطِ بہار ہے

بیدلؔ اس حقیقت کو اپنے انداز میں بیان کرتا ہے:

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو سمن درا ۔۔۔ تو غنچہ کم ندمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درا

اختر شیرانیؔ کا انداز اپنا؛ اور بڑا پُرکیف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو ۔۔۔ کہ جو شے ہے نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

ان تعبیرات کا تعلق جذبات سے ہے۔ اس کے برعکس قرآن کے پیش نظر اقدار Values کا تغیر ہے۔ اقبالؒ اسے تعمیر خودی سے تعبیر کرتا ہے جس کے احاطہ میں جذبات اور اقدار دونوں آجاتے ہیں۔ اس کا سارا فلسفہ اس نکتہ کے گرد گردش کرتا ہے۔ وہ اشیائے کائنات کی قدر و قیمت کا پیمانہ خود انسان کو قرار دیتا ہے۔ وہ (اسے) کہتا ہے:

قدرِ خویش

تو قدرِ خویش نہ دانی بہا ز تو گیرد
دگرنہ لعلِ درخشندہ پارۂ سنگ است

اس لئے وہ سارا زور تعمیرِ خویش پر دیتا ہے:

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی | وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی | یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

اس سے بھی زیادہ واشگاف الفاظ میں:

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے | خودی تیری مُسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں | تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

(ارمغانِ حجاز)

قرآن، "خودی کے مُسلمان ہونے" کو ایمان کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ ایمان چار لفظوں کے دُہرا دینے کا نام نہیں۔ یہ دل کی تبدیلی کا نام ہے۔ دیکھئے! سورۃ حجرات میں قرآن نے اسے کس قدر بلیغ اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ فرمایا: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ط ـــ یہ بدّو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا ـــ ان سے کہہ دو کہ تم ابھی صاحبِ ایمان نہیں ہوئے۔ اس لئے تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ـــ انہیں سروست یہی کہنا چاہیئے کہ ہم نے اس نظام کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴) "ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا"۔ جب یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے، تو اقدار بدل جاتی ہیں۔ اسی کا نام تغیّرِ نفس ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ صدرِ اوّل کی جماعتِ مؤمنین نے جو عالمگیر انقلاب برپا کر دیا تھا، وہ ان کے ایمان کی بدولت تھا، تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ اُن کی نگاہ کا زاویہ بدل جانے سے اشیائے کائنات کی قدر و قیمت بدل گئی تھی۔ اس کی ایک مثال وہی ہے جسے ہم نے اس سورۃ کے شروع میں تقسیم مالِ غنیمت کے اُس وقت کے مروّجہ قاعدہ میں اصلاح کے سلسلہ میں بیان کیا ہے۔ اسے (اس نکتہ کی اہمیّت کے پیشِ نظر) پھر دہرا دیا جائے کہ عربوں کی معیشت اور معاشرت کا بڑی حد تک دارو مدار مالِ غنیمت اور جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لینے پر تھا۔ مالِ غنیمت پر ان کی اقتصادیات کا انحصار تھا اور معاشرہ میں تمام کام کاج غلام کرتے اور لونڈیاں ان کی بے محابا جنسی خواہش کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتیں۔ یہی مفاد اور جاذبیتیں ان کے لئے جنگ کے محرکات بنتے۔ قرآن نے بیک جنبشِ قلم جنگ کی ان دونوں جاذبیتوں (یا محرکات) کو ختم

کردیا۔ مالِ غنیمت کے متعلق کہہ دیا کہ یہ مملکت کی تحویل میں رہے گا۔ اور جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہہ دیا کہ انہیں غلام نہیں بنایا جائے گا۔ رہا کیا جائے گا (۴۷/۴)۔ جنگ کے ان محرّکات کے ختم ہو جانے سے جنگ کے لئے ان کے جوش اور ولولے کو ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد انہوں نے میدانِ کارزار میں ایسی جرأت و بسالت اور بے جگری اور استقامت کا مظاہرہ کیا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ کس طرح ہوا تھا؟ ان کی نگاہ کا زاویہ بدل جانے سے۔ انہیں جنگ کا محرّکہ جذبہ اعلائے کلمۃ الحق بتایا گیا اور ان کی نگاہوں میں اس کی قدر و قیمت اتنی بلند ہو گئی کہ مالِ غنیمت اور غلام اور لونڈیوں کی کشش اس کے مقابلہ میں ہیچ نظر آنے لگی۔ ایمان کی رُو سے اسی قسم کی (قدر و قیمت کی) تبدیلی، دنیا کی ہر شے میں پیدا ہو گئی اور اسی تبدیلی (تغیّرِ نفس) سے خارج میں وہ تبدیلی نمودار ہو گئی جس کے تصور سے ہم ہی نہیں، ساری دنیا محوِ حیرت ہو جاتی ہے۔ ان میں یہ تغیّرِ نفس کس طرح پیدا ہو گیا تھا؟

قرآنِ کریم میں حضور نبیٔ اکرمؐ کا فریضۂ رسالت یہ بھی بتایا گیا ہے: وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲/۲)۔ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس ___ تزکیۂ نفس کے معنی آپ تطہیرِ ذات کر لیجئے یا انسانی ذات کی نشوونما، مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی حضورؐ کا فریضۂ رسالت یہ تھا کہ افرادِ امّت کو قرآن کے احکام و ضوابط اور اُن کی غرض و غایت کی اس طرح تعلیم دیں کہ ان کی اہمیت ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور اس طرح اشیائے کائنات کی اقدار کے پیمانے بدل جائیں۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں حضورؐ نے، نو مسلموں کی زندگی میں اسی قسم کا تغیّرِ اقدار پیدا کر دیا۔ یہ حضرات جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا، نہ تو باہر سے آئے تھے، نہ ہی (موجود) افراد کے بعد آنے والی نسل تھی۔ یہ وہی عرب تھے جن کی قبل از اسلام (زمانۂ جاہلیہ) کی زندگی کے متعلق دنیا بھر کے مؤرخین متفق ہیں کہ وہ ہر قسم کے جرائم اور معائب سے معمور تھی۔ ان عربوں میں ایسی تبدیلی پیدا کر دینا کہ ان کی پاکیزہ سیرت اور تابندہ کارناموں پر خدا اور اس کے ملائکہ تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کریں (۳۳/۴۳)، اسی تغیّرِ نفس کا نتیجہ تھا۔ بدر و اُحد کے میدانوں میں مجاہدین بھی اسی طرح سر بکف نکلے تھے جس طرح کفار (قریش)، لیکن قرآن نے فریقِ اوّل کی جنگ کو فی سبیل اللہ کہا ہے اور فریقِ مقابل کی جنگ کو فی سبیل الطاغوت (۴/۷۶)۔ یہ فرق مقاصد و اقدار ہی کا تھا جسے تغیّرِ نفس (نگاہ کی تبدیلی) نے پیدا کر دیا تھا۔[1]

---

[1] اس کی تشریح میری کتاب "شاہکارِ رسالت" میں ملے گی۔

نگاہ کی تبدیلی کی اہمیت کا احساس اُن قوموں میں بھی ہے جن کا انداز زیست سیکولر ہے۔ وہ اپنے نوجوانوں کو وطن پرستی Patriotism کی تعلیم دیتی ہیں اور اس جذبہ کو ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دیتی ہیں کہ "My Country right or wrong". اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کی قوم کے افراد، قومی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں اور وطن کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ قرآن بھی امتِ مسلمہ کو "مفاد طلبی" کی تعلیم دیتا ہے، لیکن وہ انفرادی مفاد کے مقابلہ میں اپنے وطن اور اپنی قوم کے مفاد کو ترجیح دینے کے بجائے عالمگیر انسانیت کے مفاد کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ (۱۳/۱۷) ـــــ دنیا میں بقا اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کی منفعت کے لئے کیا جائے ـــــ وطنیت کا نتیجہ اپنی قوم کے سوا، دنیا کی تمام اقوام سے نفرت اور عداوت ہوتا ہے۔ موجودہ عالمگیر جہنم اسی جذبہ کا پیدا کردہ ہے۔ عالمگیر انسانیت کے مفاد کا جذبہ اس زمین کو فردوسِ بریں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں سیکولرازم میں قومی جدّوجہد کے نتیجہ میں، مادی سامان و وسائل حاصل ہوتے ہیں۔ قرآنی مقصد کے لئے جدّوجہد کرنے سے مادی اسباب[1] کے حصول کے ساتھ ساتھ، انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جاتی ہے۔ قرآن اسے فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (۲/۲۰۱) کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس نکتہ کو مسولینی کے حوالے سے بڑے لطیف انداز میں سمجھایا تھا۔ مسولینی کا نظریہ یہ تھا کہ "جس کے پاس فولاد ہے اُس کے پاس روٹی ہے۔" "He who has steel, has bread". علامہ اقبالؒ نے اس میں یہ تبدیلی کی تھی کہ "جو خود فولاد ہے، اس کے پاس سب کچھ ہے[1]۔" "He who is steel, has every thing"

اسلام کی خصوصیت

(خطبۂ صدارت، مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء)

---

[1] میں نے اپنے ایک مقالہ میں ذرا سی ترمیم کی جرأت کی تھی اور کہا تھا کہ He who is steel, is everything اس کے بعد میرے سامنے مشہور ماہر نفسیات ERIC EROMM کی کتاب آئی جس کا ٹائیٹل تھا To Hare or to be اس نے اس حقیقت کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ قرآن کی بارگاہ سے یہ دونوں نعمات مل جاتی ہیں۔ اگر فرصت اور توفیق مل گئی تو میں اس موضوع پر ایک جامع تصنیف مرتب کرنا چاہتا ہوں۔

سیکولرازم میں صرف روٹی ملتی ہے۔ قرآنی نظام میں سب کچھ ملتا ہے۔ اور مذہب میں نہ وہ ملتا ہے نہ یہ۔ اس میں اجتماعیت کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس میں انفرادی نجات مقصود ہوتی ہے۔ اس عقیدہ سے محض ذاتی اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جسے خود فریبی سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہے۔ جہاں تک محسوس و مرئی نتائج کا تعلق ہے ـــ مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید ـــ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

(ضمناً) پاکستان میں ہمارے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں درحقیقت سیکولرازم رائج ہے لیکن ہم کھلے بندوں اس کا نام لینے سے جھجکتے (اور جھینپتے) ہیں۔ اسی بنا پر ہم قوم میں سیکولرازم کا سا تغیرِ نفس بھی پیدا نہیں کرتے۔ نہ ہی ہمارے ہاں دین (قرآنی نظام) ہے۔ اسی لئے ہم قرآنی اقدار کے لئے تغیرِ نفس پیدا کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ یہاں تغیرِ نفس کے بغیر تعمیرِ احوال کی کوشش کی جا رہی ہے اور (بدقسمتی سے) اسے "احیاءِ اسلام" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ تغیرِ نفس کے بغیر تغیرِ احوال کی کوشش کرنا اور سمجھنا کہ اس میں ہمیں کامیابی ہو جائے گی، درحقیقت خدا کو چیلنج دینے کے مترادف ہے۔ خدا کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۸/۵۳) تغیرِ نفس کے بغیر تغیرِ احوال، تم تو ایک طرف، خدا بھی نہیں کرتا۔ اور ہم اُس سے (زبانِ حال سے) کہہ رہے ہیں کہ "تم دیکھ لینا ہم تغیرِ نفس کے بغیر ہی تغیرِ احوال کر کے دکھا دیں گے" (معاذ اللہ)۔ ایسا سمجھنے والوں کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے: فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۱۸/۱۰۵) "ان کا کیا کرایا سب رائگاں جائے گا"۔ اس کا نقصان اتنا ہی نہیں ہوگا کہ ہماری تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ ہم دنیا کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ اس طرح اسلام کا احیاء ہو رہا ہے۔ جب ہماری کوششیں ناکام رہ جائیں گی تو دنیا اسلام کے متعلق یہ رائے قائم کرے گی (اور ایسا کرنے میں وہ حق بجانب ہو گی) کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ اس میں دوبارہ زندہ ہونے کی سکت اور صلاحیت ہی نہیں۔

اسلام کے اس (مزعومہ) احیاءِ نو کے لئے ہم کر یہ رہے ہیں کہ فقہ کے صدیوں کے فرسودہ (اور ناقابلِ عمل) قوانین میں قدرے ترمیم کر کے انہیں اسلامی قوانین کے نام سے نافذ کرتے ہیں ـــ اور ستم ظریفی یہ کہ انہیں نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ یہ ناممکن العمل ہیں[1]۔ ہم اتنا نہیں سمجھتے کہ

---

[1] یہ سطور اپریل ۱۹۸۳ء میں لکھی گئی تھیں۔

جب تک قوانین کا احترام دل میں نہ ہو' ان پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ قوانین کے احترام کا (قرآنی) طریق یہ ہے کہ پہلے قانون کی پوری پوری وضاحت کی جائے۔ پھر سمجھایا جائے کہ اس کی غرض و غایت' علت و حکمت' مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ وہ کس طرح ہمارے لئے مفید ہے۔ اس سے کیا کیا فوائد مرتب ہوں گے۔ اس سے ہماری دنیا اور عاقبت کس طرح سنورے گی۔ اس سے تغیرِ نفس پیدا ہو گا اور قانون کا احترام اعماقِ قلب سے اُبھرے گا۔ تغیرِ نفس کے بغیر قانون سازی یا نفاذِ قانون کی صورت میں ہوتا یہ ہے کہ اِدھر قانون مرتب کرنے کی کوشش ہو رہی ہوتی ہے اور اُدھر قوانین شکن عناصر یا افراد' اس قانون سے گریز' اغماض یا فرار کی راہیں تراش رہے ہوتے ہیں۔

جرائم کس طرح مٹ سکتے ہیں

قانون کس طرح اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے' اس کے لئے قرآن کریم نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے۔ اس کا ارشاد ہے: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ. "اے رسولؐ! تیرا رب اس حقیقت پر گواہ ہے کہ یہ لوگ کبھی صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے جب تک اپنے متنازعہ امور میں تجھے حکم نہ بنائیں اور فیصلہ کے لئے تیری طرف رجوع نہ کریں"۔ یہاں تک قانون کی رُو سے کیا اور کرایا جا سکتا ہے۔ اس کے آگے ہے: ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۴/۶۵)" پھر جو فیصلہ تو دے' اس کے خلاف اپنے دل میں (اپنے نفس میں) بھی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ کریں اور یوں قانون کی اطاعت کریں"۔ قانون کے مطابق فیصلہ سے دل میں گرانی محسوس نہ کرنا' تغیرِ نفس کے بغیر ناممکن ہے اور قانون کے نتیجہ خیز ہونے کا یہی طریق ہے۔ یہ جو دنیا میں (بالعموم) اور ہمارے ہاں بالخصوص اچھے اچھے قوانین کی موجودگی میں جرائم کی تعداد بڑھتی جاتی ہے' اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دلوں میں قوانین کا احترام نہیں پیدا ہوا! اور یہ احترام تغیرِ نفس کے بغیر ناممکن ہے۔

اور تغیرِ نفس صحیح تعلیم و تربیت اور اربابِ اثر و اقتدار کی سیرت و کردار کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے چائے کے لئے پانی کی پتیلی چولھے پر رکھیں لیکن نیچے آگ نہ جلائیں۔

یہ ہے اس عظیم اصول کی اہمیت جسے قرآن نے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے اور جس کے تعویذ بنا کر ہم نفسیاتی امراض کے مریضوں کے گلے میں ڈال دیتے ہیں ___ بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا؟

آیت (۸/۵۳) سے پہلے بھی ان اقوام کا ذکر تھا جنہوں نے تغیرِ نفس پر مبنی نظامِ حکومت کے بجائے قوت اور استبداد کی رُو سے اپنا تسلّط قائم رکھا تھا۔ ان میں سرِفہرست فرعونی نظام آتا ہے جو شخصی حکومت کے جَور وظلم میں ضرب المثل ہے۔ اور اس آیت کے بعد پھر اسی شخصی نظام کا ذکر آتا ہے تاکہ اس تقابل سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے کہ بہترین نظام وہ ہے جو اقدارِ خداوندی کی رُو سے تغیرِ نفس پر مبنی ہو اور بدترین نظام شخصی حکومتوں کا ہے۔

(۸/۵۴) كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝

یہی وہ قانون تھا جس کے مطابق (جیساکہ پہلے کہا جا چکا ہے) قومِ فرعون اور ان کی پیشرو اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے نشوونما دینے والے قوانین کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں، اُن کے جرائم کی پاداش میں پکڑ لیا اور قومِ فرعون کو غرق کردیا۔ یہ تمام اقوام، جو اس طرح تباہ ہوئیں، وہی تھیں جنہوں نے ظلم و استبداد پر کمر باندھ رکھی تھی۔

اَهْلَكْنٰهُمْ (انہیں ہم نے ہلاک کردیا) کے ساتھ بِذُنُوْبِهِمْ اور ــــــ كُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ کا اضافہ کرکے یہ واضح کردیا کہ ان کی ہلاکت ان کے ــــــ اپنے جرائم کا نتیجہ تھی۔ چونکہ وہ واقع ہوئی تھی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ ان کے متعلق کہا:

(۸/۵۵) اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

یاد رکھو! معیارِ خداوندی کے مطابق، بدترین مخلوق وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی سے

سرکشی برتتے ہیں اور لاکھ سمجھایئے وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے (۷/۱۷۹؛ ۸/۲۲)

اگر ان دیگر مقامات کو بھی ساتھ ملا لیا جائے جہاں ہٰتِ اللّٰہ وَ آیت کا ذکر آیا ہے (۲/۱۸؛ ۷/۱۷۹؛ ۸/۲۲؛ ۱۶/۷۶) تو واضح ہو جائے گا کہ اقدارِ خداوندی سے سرکشی برتنے والوں کو بدترین خلائق کیوں کہا گیا ہے۔

اس پائندہ اصول (کہ تغیرِ نفس کے بغیر تغیرِ احوال ناممکن ہے) اور اس کی تائید میں اقوامِ سابقہ کی تاریخی شہادت کے بعد، پھر ان مخالفین کا ذکر کیا جو حضورؐ کے مقابلہ کے لئے میدانِ جنگ تک میں اُتر آئے تھے۔ فرمایا کہ:

(۸/۵۶-۵۷) اَلَّذِیْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا یَتَّقُوْنَ ۝ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ۝

(اسی قسم کی یہ قوم ہے جو اب تمہارے مدِمقابل ہے) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب تو ان سے کوئی معاہدہ کرتا ہے، تو یہ ہر بار اپنے عہد و پیمان کو توڑ ڈالتے ہیں اور عہد شکنی کے نتائج سے بالکل نہیں ڈرتے (۵۶)۔

سو اگر یہ لوگ میدانِ جنگ میں تمہارے سامنے آئیں تو انہیں ایسی سخت سزا دو کہ یہ خود بھی متوحش ہو کر بھاگ کھڑے ہوں اور جو لوگ، اسی مقصد کے لئے ان کے پیچھے آرہے ہیں، انہیں دیکھ کر وہ بھی بھاگ اٹھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ لوگ عبرت پکڑیں اور آئندہ کے لئے یاد رکھیں کہ عہد شکنی کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔

جو لوگ عہد و پیمان کے بھی پابند نہ ہوں، ضروری ہے کہ ان کی قوت توڑ دی جائے۔ ان کی عہد شکنی اور پیمان فراموشی کا تو یہ عالم تھا۔ ان کے برعکس جماعتِ مومنین کو اس آئین کا پابند کیا گیا تھا جس کی رو سے عہد و پیمان کی اہمیت اس قدر تھی کہ

(۸/۵۸-۵۹) وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ

عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۝ وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ۝

معاہدات کی پابندی

(عہد کی پابندی اتنی اہم ہے کہ) اگر تمہیں کسی پارٹی کی طرف سے عہد شکنی کا اندیشہ ہو، تو تم انہیں اطلاع دیئے بغیر یونہی معاہدہ نہ توڑو، بلکہ انہیں اس کی اطلاع دے کر معاہدہ ختم کرو اور اس طرح دونوں ایک سطح پر آجاؤ۔ اور اس طرح قبل از وقت معاہدہ توڑنے سے انہیں کوئی نقصان پہنچتا ہو تو اس کی تلافی کر کے اُن سے مساوات کا سلوک کرو۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے بدعہدی کو کبھی پسند نہیں کیا جا سکتا (۸/۵۸)۔

جو لوگ قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی اختیار کر کے بدعہدیوں پر اُتر آتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ خدا کے قانونِ مکافات کی دست بُرد سے آگے نکل جائیں گے۔ وہ اسے کبھی شکست نہیں دے سکتے۔ وہ اسے بے بس نہیں کر سکتے (۵۹)۔

آپ دنیا بھر کے قوانینِ جنگ کا مطالعہ کیجئے۔ جس بلند اصول کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس کی مثال آپ کو شاید ہی کہیں مل سکے۔ یہ معاملہ ان لوگوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے جن کے متعلق ابھی ابھی کہا گیا ہے کہ وہ عہد و پیمان کی کوئی پرواہ ہی نہیں کرتے۔

اس کے ساتھ ہی جماعتِ مومنین سے کہہ دیا کہ تم اپنی حفاظتی تدابیر کی طرف سے غافل نہ ہو جانا۔ اپنی سرحدوں کی پوری پوری حفاظت کرنا۔

(۸/۶۰) وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ

اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○

لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ تم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاؤ اور سمجھ لو کہ مخالفین کو یونہی شکست ہو جائے گی۔ انہیں شکست تمہارے ہاتھوں ہی سے ملے گی۔ اس لئے تم دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رہو۔ امکان بھر سامانِ حفاظت فراہم کرو۔ اپنی سرحدوں کو فوجی چھاؤنیوں سے مستحکم رکھو' (کیونکہ مملکت کا استحکام اس کی سرحدوں کے استحکام کے بغیر ممکن نہیں) تاکہ تم' ان کے ذریعے' ان لوگوں کو خائف رکھ سکو جو تمہاری ذات کے بھی دشمن ہیں اور نظامِ خداوندی کے بھی دشمن ہیں اور ان کے علاوہ' انہی جیسے اور دشمنوں کو بھی جن کا تمہیں ابھی علم نہیں ہوا۔ اللہ کو ان کا علم ہے۔ ان تمام انتظامات کے لئے روپے کی ضرورت ہوگی۔ سو تم سمجھ لو کہ تم نظامِ خداوندی کے قیام اور استحکام کے لئے جو کچھ بھی خرچ کرو گے' وہ تمہیں پورا پورا واپس مل جائے گا۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی۔

"مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ" کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ سامانِ حفاظت زمانے کے تقاضوں اور حالات کے مطابق ہوگا۔ اگر صدرِ اوّل میں اس کے لئے پیادہ فوج اور گھوڑوں کے رسالے کافی تھے تو آج توپوں' مشین گنوں' ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کی ضرورت ہوگی (۸/۱۶؛ ۴۲/۳۶)۔

اس کے بعد پھر جنگ کے اصولوں کی طرف توجہ دلائی گئی۔ فرمایا؛

(۸/۶۱-۶۲) وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ○

اور اگر تمہارا دشمن صلح کی طرف مائل ہو تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ۔ (یہ نہ خیال کرو کہ اب ہمیں فتح حاصل ہونے لگی تھی تو وہ صلح کی طرف مائل ہو گیا۔ ہم صلح کیوں کریں؟

یاد رکھو! اس جنگ سے مقصد فتنہ فرو کرنا تھا۔ اگر وہ صلح سے فرو ہو جاتا ہے تو یہی تمہاری فتح ہے)، تم اپنا بھروسا قانونِ خداوندی پر رکھو جس کے مطابق تم جنگ اور صلح کرتے ہو۔ یہ اُس خدا کا قانون ہے جو سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے (۶۱)۔

اور اگر دشمن (اپنے آپ کو مائل بہ صلح ظاہر کر کے) تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ رکھتا ہو، تو (اے رسولؐ!) تم گھبراؤ نہیں۔ تمہارے لئے خدا کا قانون کافی ہے، اُس خدا کا قانون جس نے اپنی مدد سے اور اس جماعتِ مومنین کے ذریعے، تمہیں اس قدر سامانِ تقویت بہم پہنچایا ہے (۶/۵۲؛ ۲۸/۱۸؛ ۴۸/۲۹)۔ (دین کا غلبہ قانونِ خداوندی کی اطاعت اور صحابہؓ کی رفاقت ہی سے ممکن ہوا تھا)۔ (۶۲)

یہ اصول جس قدر بیش بہا، بلند پایہ اور بے مثال ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کا مقصد جنگ کرنا نہیں، بلکہ امن و سلامتی کی فضا قائم کرنا ہے۔ میدانِ جنگ میں جب دشمن پسپا ہو رہا ہو، اس کی طرف سے صلح کا پیغام آئے تو فریقِ غالب اوّل تو اسے درخورِ اعتناہی نہیں سمجھے گا اور اگر اس کی ضرورت بھی سمجھے گا تو شکست خوردہ دشمن سے ذلت آمیز شرطیں منوائے گا۔ لیکن قرآن کی تلقین و ہدایت یہ ہے کہ جن حالات میں بھی دشمن آمادہ بہ صلح ہو، اس کی پیشکش کو قابلِ قبول سمجھو۔ حتیٰ کہ اگر حالات سے یہ بھی مترشح ہو رہا ہو کہ وہ شکست کے نقصانات سے بچنے کے لئے صلح کی پیشکش کو بطور حربہ استعمال کر رہا ہے، تو بھی اسے یونہی مسترد نہ کرو۔ دشمن اگر دھوکا بھی دینا چاہے گا تو تمہارا کچھ نقصان نہیں ہو گا۔ تمہارے پاس ایسے نقصانات سے محفوظ رہنے کے لئے کافی ساز و سامان ہے۔ (بقولِ غالبؔ) ؎

بے دست و پائیم کہ ہنوز از دفورِ عشق ۔۔۔ سوداست در سرم کہ بساماں برابر است

؎ یہاں سامانِ تقویت کے ضمن میں دو عناصر کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے: قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے حاصل ہونے والی نصرت اور جماعتِ مومنین کی رفاقت۔ قرآنِ کریم میں صحابہ کبارؓ کی عظمت کے متعلق مختلف مقامات پر ذکر کیا گیا ہے (دیکھئے انڈکس)۔ لیکن اس آیت اور اس کے ساتھ آیت (۸/۶۴) میں ان کا مقامِ بلند اُبھر اور نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ کامیابیوں کے لئے خدا کی نصرت کے بعد اور کیا چاہیئے؟ یہ ہر طرح سے کافی ہو گی۔ لیکن حضورؐ سے کہا گیا کہ تمہاری کامیابی کے لئے دو

عناصر ضروری ہیں ـــ خدا کی نصرت اور جماعتِ مومنین کی رفاقت۔ آیت (۸/۶۴) میں اسے اور بھی نکھار کر بیان کر دیا جہاں کہا کہ

(۸/۶۴) يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝

صحابہؓ کی عظمت

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا (یعنی اُس کی نصرت) تیرے لئے بھی کافی ہے اور مومنین کے لئے بھی جو تیرا اتباع کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ اے رسولؐ! تیرے لئے خدا (کی نصرت) اور یہ جماعتِ مومنین جو تیرا اتباع کرتی ہے کافی ہیں۔ چونکہ آیت (۸/۶۲) میں کہا گیا ہے کہ " خدا نے تجھے اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کے ذریعے تقویت پہنچائی ہے "، اس لئے آیت (۸/۶۴) کا دوسرا مفہوم زیادہ موزوں نظر آتا ہے یعنی یہ کہ کامیابی کے لئے خدا کی تائید و نصرت اور جماعتِ مومنین کی رفاقت دونوں ضروری ہیں۔

(۸/۶۳) وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝

اور تمہاری جماعت کے افراد کے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی ہے۔ یہ وہ گراں مایہ متاع ہے جو دنیا بھر کی دولت خرچ کرنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ صرف قانونِ خداوندی پر ایمان لانے سے ممکن تھا (جس سے ان کی توجہ انفرادی مفاد پرستیوں سے ہٹ کر، زندگی کے بلند نصب العین کی طرف منتقل ہو گئی اور یہ چیز ان میں قلبی یگانگت کا موجب بن گئی)۔ خدا کا یہ قانون غلبہ اور تدابیر دونوں اپنے اندر رکھتا ہے۔

جماعتِ صحابہؓ کی اس خصوصیت کا کہ ان کے دل باہمدگر پیوست تھے، دیگر مقامات پر بھی ذکر آیا ہے (بالخصوص دیکھئے مطالب الفرقان جلد چہارم صفحات ۸۲ - ۱۸۵)۔

صحابہؓ کی اس قسم کی جماعت اور رسول اللہ جیسا معلم اور مربی! وہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (۳/۱۳۸)
بالائے ہر بالاتر کے مقام پر فائز کیوں نہ ہو جائے؛ فرمایا:

(۸ / ۶۵-۶۶) يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ○

اے رسولؐ! تو اپنے عملی پروگرام کے ذریعے اپنی جماعت کی کمیوں اور کمزوریوں کو رفع کرتا رہ، تاکہ یہ جہادِ زندگی میں مردانہ وار حصہ لینے کے قابل ہو جائیں۔ اس سے ان میں

سو مجاہد ہزار پر بھاری

ایسی توانائی پیدا ہو جائے گی کہ اگر تم میں بیس سپاہی ثابت قدمی دکھائیں گے تو وہ مخالفین کے دو سو سپاہیوں پر غالب آجائیں گے۔ اور اگر ایک سو ایسے جانباز ہوں گے تو وہ فریقِ مقابل کے ایک ہزار پر غالب آجائیں گے۔ یہ اس لئے کہ تمہارے مخالفین، عقل و فکر سے کام لینے کے بجائے انتقام اور نفرت کے جذبات سے اندھے ہو کر میدانِ جنگ میں آتے ہیں۔ اور کامیابی کے لئے اوّلین شرط یہ ہے کہ لڑنے والے سمجھ اور سوچ سے کام لیں (۶۵)۔

لیکن یہ ایک اور دس کی نسبت (یعنی ایک سو کا ایک ہزار پر غلبہ حاصل کر لینا) اُسی

صورت میں ہے جب کمی' تعداد کے اعتبار سے ہو، سامانِ حرب وضرب میں تمہاری اور دشمن کی پوزیشن یکساں ہو. لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس وقت پوزیشن ایسی نہیں. تم تعداد میں بھی کم ہو اور سامان کی بھی قلت ہے. اس لئے' اس وقت نسبت صرف ایک اور دو کی ہوگی. اگر تم میں ایک سو سپاہی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے' تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے. اگر ایک ہزار ہوں گے تو دو ہزار پر فتح پالیں گے. یہ سب خدا کے اُس قانون کی رُو سے ہوگا جس کی تائید اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو ثبات اور استقامت سے کام لیتے ہیں (۶۶).

آیات کا مفہوم واضح ہے. البتہ دو نکات خصوصی توجہ کے متقاضی ہیں. ایک تو یہ کہ ان مخالفین کی شکست کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ سراسر جذبات سے مغلوب ہوتے ہیں، عقل وفکر سے کام نہیں لیتے. جنگ کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ وہ جذبات کے زور پر لڑی جاتی ہے. جس فوج میں جذبات کی جس قدر شدت ہوگی' وہ اسی قدر بے جگری سے لڑے گی. یہ بھی درست ہے. لیکن قرآن کریم جنگ میں بھی تَفَقُّہ اور تعقل

میدانِ جنگ میں عقل وفکر

(عقل وفکر) کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتا. میدانِ کارزار میں ہوش وحواس کا بجا رکھنا اور عقل وفکر سے کام لینا ـــــ کارِ ہر دیوانہ نیست ـــــ اس سے اس امر کا اندازہ لگ سکتا ہے کہ قرآنی تعلیم وتربیت نے جماعتِ مومنین کی فکری صلاحیتوں کو کس قدر پختہ کر دیا تھا کہ وہ میدانِ جنگ میں بھی اندھے جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے تھے. ورنہ یہاں تو اچھے اچھے دانشوروں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ؎

مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؒ　　　مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ دیوانہ

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ خدا کی نصرت کے لئے استقامت (صبر) شرط ہے. زندگی کے اس اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ـــــ جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیّاد ہوتا ہے.

بنا بریں کامیابی کے عناصرِ ترکیبی یہ ہوں گے:

۱. قوانینِ خداوندی پر یقینِ محکم اور اُن کی اطاعتِ پیہم. اس سے نصرتِ خداوندی حاصل ہوگی. اس کے ساتھ حالات کے مطابق' سامانِ حرب وضرب اور حفاظتی تدابیر.

۲. جماعت کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کے ساتھ الفت اور محبت' رشتۂ مودّت اور یگانگت'

قلب و دماغ میں ہم آہنگی اور یک رنگی اور امیرِ جماعت کا کامل اتباع۔

۳۔ تصادمات کا نہایت استقامت سے مقابلہ، ہجومِ مشکلات میں پاؤں میں لغزش نہ آنے دینا۔

یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں تو اپنے سے دُگنے بلکہ دس گنے دشمنوں پر بھی غلبہ حاصل ہو جائے گا۔



اب جنگ کے سلسلہ میں اگلے اصلاحی اقدام کی طرف آیئے۔ شروع میں بتایا جا چکا ہے کہ اس سلسلہ کا پہلا قدم مالِ غنیمت کی تقسیم تھا جس کی رو سے یہ (لوٹ کا مال بننے کے بجائے) مملکت کی تحویل میں آجاتا تھا۔ تاکہ وہ اسے حسبِ ضرورت صرف میں لائے۔ اس سے جنگ کا وہ جذبۂ محرکہ ختم ہو جاتا تھا جو اُس زمانے کے عربوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔

جیساکہ پہلے بتایا جا چکا ہے ان کے لئے جنگ کا دوسرا جذبۂ محرکہ جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانا تھا۔ نزولِ قرآن کے وقت غلام اور لونڈیاں عربی معاشرہ کا جزو بن چکی تھیں۔ ابتداءً یہ جنگ میں گرفتار قیدیوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ بعد ازاں انہیں فروخت بھی کیا جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق حتمی طور پر کہہ دیا کہ انہیں رہا کرنا ہوگا — زرِ فدیہ لے کر، اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو احساناً (۴۷/۴)۔ اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ انڈکس میں غلامی کا عنوان دیکھئے' نیز جنگ کا۔

جنگِ بدر جس کا تذکرہ زیرِ نظر ہے' اسلام میں پہلی جنگ تھی۔ اور ایسا نظر آتا ہے کہ اُس وقت تک جنگ کے قیدیوں کے متعلق حتمی احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس جنگ میں دشمن کے جو سپاہی گرفتار ہوئے تھے اُن کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غلامی کے خلاف قرآن کے احکام اس سے پہلے نازل ہو چکے تھے۔ اس لئے یہ سوال تو نہیں تھا کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنا کر سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

جنگ کے قیدیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ قیدیوں کو قتل کر دیا جائے (بلکہ یہاں تک کہ ہر شخص اپنے رشتہ دار قیدیوں کو خود قتل کر دے) تاکہ یہ فتنہ ختم ہو جائے۔ لیکن ابوبکر صدیقؓ کی رائے تھی کہ ان سے زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضورؐ نے اس رائے سے اتفاق کیا اور قیدیوں سے زرِ فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا گیا۔ جو ناداری کی وجہ سے زرِ فدیہ نہ دے سکے' انہیں احساناً چھوڑ دیا گیا۔

جب تک انہیں رہا نہیں کیا گیا، انہیں صحابہؓ میں بانٹ دیا گیا تھا کہ وہ انہیں بطور مہمان اپنے ہاں رکھیں۔ جن کے پاس کپڑے نہیں تھے، انہیں کپڑے فراہم کئے گئے۔ (حضرت) عباس کشیدہ قامت تھے اس لئے کسی کا کُرتہ انہیں پورا نہیں آتا تھا۔ عبداللہ بن اُبی (جو اسلام نہیں لایا تھا اور دراز قد تھا) نے اپنا کُرتہ منگا کر (حضرت) عباس کو دیا۔ (حضرت) عباس، حضورؐ کے چچا تھے۔ آپؐ نے اسے اپنے اوپر احسان تصور کیا۔ عبداللہ بن اُبی تمام عمر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتا رہا، لیکن اس کی وفات پر حضورؐ نے خود اپنا کُرتہ کفن کے لئے بھیجا۔ بخاریؔ کی روایت کے مطابق، یہ کُرتہ اس کُرتے کے بدلے میں تھا جو اس نے (حضرت) عباس کے لئے بھیجا تھا۔

کس قدر منفعت بخش رہا ابن اُبی کا یہ سودا! جب زلیخا مصر کے بازار سے حضرت یوسفؑ کو نیلام میں خرید کر لے گئی تو اس پر (غالباً مولانا جامیؒ نے) لکھا ہے کہ اُس نے اس سودے پر کہا کہ

درا ہم چند دادم، جاں خریدم تعالیٰ اللہ چہ ارزاں خریدم!

یہ تو شاعری تھی۔ عبداللہ بن اُبی کا سودا فی الحقیقت ایسا منفعت بخش تھا جس کی مثال نہیں۔

جن قیدیوں کو رہا ہونے تک صحابہؓ میں بانٹ دیا گیا تھا، انہیں کس طرح رکھا گیا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے جسے خود ایک قیدی (ابوعزیز) نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس انصاری نے مجھے اپنے گھر رکھا تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ وہ صبح و شام کھانا لاتے تو کھانا میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوروں پر گزارہ کرتے۔ مجھے شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا۔ لیکن وہ اسے ہاتھ نہ لگاتے اور یہ کہہ کر زبردستی مجھے کھلا دیتے کہ آپ ہمارے مہمان ہیں۔

یہ وہ عرب تھے جو کل تک جنگی قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو اپنی لونڈیاں بنایا کرتے تھے۔

آپ نے غور فرمایا کہ تغیرِ نفس سے کس طرح خارجی کائنات بدل جاتی ہے۔

اوپر کہا گیا ہے کہ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ان قیدیوں کا فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا جائے۔ ان قیدیوں میں ایک ایسا بھی تھا جسے ہم آج بھی چشمِ تصور کے سامنے لاتے ہیں تو آنکھوں میں نور اور قلب میں سرور پیدا ہو جاتا ہے۔

بیٹی کا ہار!

ان قیدیوں میں حضورؐ کے داماد (حضرت زینبؓ کے شوہر) ابوالعاص بھی تھے جو اُس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ حضرت زینبؓ ابھی مکہ میں ہی تھیں۔ آخر محمد (صلعم) کی بیٹی تھیں۔ دل کے نازک گوشوں پر نگاہ رکھتی تھیں۔ حضورؐ نے اپنی شادی کے وقت ایک

ہار حضرت خدیجہؓ کو تحفتہً دیا تھا۔ بیٹی (حضرت زینبؓ) کی شادی کے وقت ماں نے وہی ہار بیٹی کے گلے میں ڈال دیا اور اب بیٹی نے وہی ہار شوہر کے فدیہ میں بھیج دیا۔ اس ہار نے زمانے کی طنابوں کو پچیس تیس سال پیچھے کھینچ دیا اور حضورؐ کو وفا شعار بیوی کی یاد دلادی جس نے تمام مصائب اور مشکلات میں بڑی جگر سوزی اور دلدوزی سے ساتھ دیا تھا۔ گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کرکے پردۂ سیمیں کی طرح نگاہوں کے سامنے آگئے اور حضورؐ کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ ذرا حضورؐ کے مقام کو سامنے لائیے۔ بہ حیثیتِ رسولؐ اور سربراہِ مملکت، مسلمانوں کے جان ومال کے مختار ہیں۔ آپؐ کے کسی فیصلہ کے خلاف مجالِ سرتابی تو ایک طرف، کسی کے دل میں گرانی تک محسوس نہیں ہوسکتی۔ لیکن چونکہ اس معاملہ کا تعلق آپؐ کی ذات کے ساتھ تھا، اس لئے خود فیصلہ نہیں فرماتے۔ صحابہؓ سے کہتے ہیں کہ اگر تم متفق ہو تو اس ہار کو واپس لوٹا دیا جائے۔ سب نے بطیبِ خاطر رضامندی کا اظہار کیا اور ہار واپس کردیا گیا۔

یہ تھا حضورؐ کا وہ اُسوۂ حسنہ جسے اللہ تعالیٰ نے امت کے لئے "بہترین نمونہ" قرار دیا تھا۔ ہمارے ہاں اتباعِ سنت کے ضمن میں جھگڑا اس پر کیا جاتا ہے کہ نماز میں ہاتھ سینے پر باندھے جائیں یا ذرا نیچے، یا مسواک اتنی بڑی ہونی چاہیئے یا اُتنی بڑی۔ اگر ان فروعات کے بجائے زور اتباعِ اُسوۂ رسول اللہ پر دیا جاتا تو امت کی حالت کچھ سے کچھ ہوتی۔

ان تمہیدی وضاحتوں کے بعد جنگ کے قیدیوں سے متعلق آیات کی طرف آئیے۔ فرمایا:

(۸/۶۷-۶۸) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهٗٓ أَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيدُ الْاٰخِرَةَ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَآ أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

یاد رکھو! اس خیال کو اپنے دل میں کبھی نہ آنے دو کہ تم دشمن کے زیادہ سے زیادہ آدمی

گرفتار کر لو تاکہ اُن کے زرِ فدیہ سے تمہارے پاس بہت سا مال جمع ہو جائے (۶۷/۴۱)۔
جنگ سے تمہارا مقصد دولت حاصل کرنا نہیں۔ تمہارے پیشِ نظر نظامِ خداوندی کا قیام ہے۔ اس کے لئے تمہیں ملک میں ایسا غلبہ و اقتدار حاصل ہونا چاہیئے جس سے حق کے مخالفین بے دست و پا ہو کر رہ جائیں۔ تم قریبی پیش پا افتادہ مفاد حاصل کرنا چاہتے ہو اور قانونِ خداوندی کی نگاہ مستقبل پر ہے۔ یاد رکھو! قانونِ خداوندی، غلبہ اور حکمت، دونوں کو اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ (اس سے تم نے سمجھ لیا ہو گا کہ یہ بات نبی کے شایانِ شان کیوں نہیں تھی کہ وہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے بجائے اپنی نگاہ دشمن کے قیدیوں کو گرفتار کرنے پر رکھتا۔ تم غلطی سے ایسا کرنے لگے تھے) (۶۷)۔
اگر قانونِ خداوندی میں، اس قسم کی فروگزاشتوں سے درگزر کر دینے کی گنجائش پہلے سے موجود نہ ہوتی، تو جو کچھ تم کرنے لگے تھے اس پر تمہاری سخت گرفت ہو جاتی (۶۸)۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، عربوں کے ہاں جنگ کے محرکات دو ہی تھے — مالِ غنیمت اور جنگ کے قیدی جنہیں غلام بنا لیا جاتا تھا۔ مالِ غنیمت کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہو گا، مملکت کی تحویل میں رہے گا۔ اور اب جنگی قیدیوں کے سلسلہ میں کہہ دیا کہ تمہاری نگاہ اس پر نہیں ہونی چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ قیدی گرفتار ہوں۔ مقصد احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہے جس کے لئے دشمن کو ایسی شکست ہونی چاہیئے کہ وہ حق کی مخالفت کے لئے سر اُٹھانے کے قابل نہ رہے۔
جہاں تک ان قیدیوں کا تعلق تھا، اُن سے کہا گیا کہ

(۸/۷۰-۷۱) يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ قُل لِّمَن فِيٓ أَيْدِيكُم مِّنَ ٱلْأَسْرَىٰٓ إِن يَعْلَمِ ٱللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ أُخِذَ مِنكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَإِن يُرِيدُوا۟ خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا۟ ٱللَّهَ مِن قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

اے رسولؐ! ان قیدیوں سے، جو تمہاری گرفت میں آ چکے ہیں کہہ دو کہ اگر ہم نے قانونِ خداوندی کی رُو سے دیکھا کہ تمہارے دل میں خیر سگالی کے جذبات موجود ہیں، تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے، تمہیں اس سے بہتر واپس دے دیا جائے گا اور تمہاری ہر طرح سے حفاظت کی جائے گی۔ اللہ کے قانون میں حفاظت اور رحمت کا سامان موجود ہے (۷۰)۔

لیکن اگر یہ نظر آیا کہ تمہارے دل میں عہد شکنی اور خیانت کے جذبات پرورش پا رہے ہیں، تو تم پہلے بھی خیانت کر کے دیکھ چکے ہو کہ تمہارا کیا حشر ہوا تھا۔ اس نے کس طرح، جماعتِ مومنین کو تم پر غلبہ عطا کر دیا تھا۔ اللہ کا قانون علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تمہاری نیت کیا ہے اور یہ بھی کہ تمہاری تخریبی کاروائیوں کی مدافعت کے لئے کیا تدبیر کرنی چاہیئے۔

قرآن کریم کی وسعتِ قلبی اور کشادہ نگہی پر غور فرمایئے۔ دنیا کے کسی آئین و قوانین میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا منشاء امن و آزادی کی فضا پیدا کرنا ہے، کسی سے انتقام لینا نہیں۔ اس کی سیاست میں زیادہ سے زیادہ عفو و درگزری ہے۔ مؤاخذہ صرف ناگزیر حالات میں ہے۔



ان احکام کے درمیان غنیمت کے متعلق ایک آیت آتی ہے، یعنی ـــــ

(۸/۶۹) فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

البتہ: یہ مالِ غنیمت جسے تم نے فتح کے بعد حاصل کیا ہے، اسے حلال و طیّب سمجھ کر کھاؤ۔ لیکن اس باب میں بھی ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یاد رکھو! حفاظت اور رحمت کا سامان، قوانینِ خداوندی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، یہ حکم اجتماعی ہے اور مملکت سے متعلق جس کی تحویل میں مالِ غنیمت دیا گیا تھا۔



یہ ہیں اسلام میں پہلی جنگ سے متعلق احوال و کوائف و احکام جو اس سورہ میں آئے ہیں۔ (بدر کا

لفظ صرف ایک جگہ آیا ہے، یعنی سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۲۳ میں بملاحظہ ہو مطالب الفرقان، جلد چہارم، صفحہ ۲۰۴)۔ اِس جنگ کی اہمیّت کا اندازہ اس سے لگتا ہے کہ جماعتِ مومنین حال ہی میں پناہ گزینوں کی طرح مدینہ میں آئی تھی۔ مدینہ کے انصار کے ہاں بھی قریش کے مقابلہ کے لئے عسکری قوّت اور ساز و سامان نہیں تھا۔ ایسے حالات میں قریش کا اپنے عظیم لشکر کے ساتھ یورش کر کے اُمنڈ آنا اس جماعت کو ختم کر دینے کے مرادف تھا۔ یہ ۲ھ کی بات ہے

پہلا رمضان

جب پہلے پہل روزے فرض ہوئے تھے۔ ابھی انہوں نے سترہ ہی روزے رکھے تھے کہ بدر کے میدان میں آنا پڑا۔ قرآن مجید میں روزوں کا مقصد خدا کی کبریائی کا قائم کرنا بتایا گیا ہے۔ (لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۲/۱۸۵)۔ ان مٹھی بھر روزہ داروں نے عملاً بتا دیا کہ خدا کی کبریائی کس طرح قائم کی جاتی ہے۔ نزولِ قرآن کی ابتدا بھی رمضان میں ہوئی تھی اور یہ فتح مبین بھی رمضان ہی کے مہینے میں ہوئی۔ اس پر جس قدر بھی مسرت و بہجت کے جشن منائے جاتے، کم تھے۔ چنانچہ اس فتحِ عظیم پر وہ پہلی عید منائی گئی جو اب ہمارے ہاں محض ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔ سچ ہے۔ ؎

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں　　عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین

اس ہجومِ مومنین کا اندازہ اسی سے لگتا ہے کہ وہ حقیقی مومن صرف (۳۱۳) تھے جنہوں نے قریش جیسے مخالفین کا زہرہ گداز کر دیا تھا اور آج یہ ہجوم قریب ایک ارب پر مشتمل ہے اور باطل کی ہر قوّت کے سامنے ترساں و لرزاں ہے۔

یہی تھے وہ (۳۱۳) جن پر تحسین و تبریک کے پھول برساتے ہوئے، خدائے کردگار نے کہا تھا کہ

(۸/۷۲) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ

ہم نے اس آیت کا آدھا حصّہ یہاں درج کیا ہے۔ (بقایا ذرا آگے چل کر درج کیا جائے گا)۔ اس کا مفہوم یہ ہے:

یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لے آئے اور اس نظام کی خاطر جس چیز کے چھوڑنے کی ضرورت پڑی اسے بلا ادنیٰ تامل چھوڑ دیا۔ حتّیٰ کہ گھر بار تک کو چھوڑ دیا اور یہاں آ گئے اور اپنے مال و جان کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا۔

دوسری طرف وہ مومنین جنہوں نے ان سب کچھ چھوڑ کر آنے والوں کو ٹھکانا دیا اور ان کی ہر طرح سے مدد کی۔

یہی لوگ باہم دیگر ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہیں۔

اگلی آیت میں انہیں ایک ایسی سنہری سند عطا فرمائی گئی ہے جو تا ابد درخشندہ و تابندہ رہے گی۔ فرمایا:۔

(۸/۷۴) وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ ○

تمام صحابہؓ مومن حقا ہیں

پھر سن رکھو! جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لائے اور پھر اس کی خاطر سب کچھ حتّیٰ کہ وطن تک بھی چھوڑ دیا اور اس کے قیام کی خاطر مسلسل جدوجہد کرتے رہے؛ اور وہ لوگ جنہوں نے ان خانہ ویرانوں کو رہنے کا ٹھکانا دیا اور ان کی ہر طرح سے مدد کی، تو یہ ہیں وہ لوگ جو فی الحقیقت مومن کہلانے کے مستحق ہیں (یہی پکے اور سچے مومن ہیں)۔ ان کے لئے سامانِ حفاظت اور رزقِ باشرف کی فراوانیاں ہیں۔

اس کے ساتھ آیت (۸/۴) ملائیے اور پھر سوچئے کہ جنہیں خدا کی طرف سے مومنِ حقا (پکے اور سچے مومن) ہونے کا سرٹیفکیٹ عطا ہو جائے جنہیں بلند مدارج، مغفرت اور رزقِ کریم کے وعدے دیئے جائیں ان کی بلندیٔ مرتبت میں کوئی شبہ ہو سکتا ہے؟ اور یہ سرٹیفکیٹ ان میں سے منتخب افراد کے لئے نہیں تھا۔ تمام مہاجرین و مجاہدین اور انصار کے لئے یکساں تھا۔ اتنا ہی نہیں کہ جن صحابہؓ کا اس آیت کے زمانۂ نزول

کے وقت اس زُمرے میں شمار ہوتا تھا، یہ سندِ خداوندی انہی کے لئے تھی. فرمایا:

(۸/۷۵) وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۠

جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت بھی کی اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کیا، تو یہ لوگ بھی تم میں سے ہی ہیں (یہ سب اس برادری کے افراد ہیں جو ایمان کی بنیادوں پر متشکل ہوئی ہے)۔ اگرچہ جہاں تک قانونِ وراثت وغیرہ کا تعلق ہے، رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں. یہ فیصلہ اُس خدا کا ہے جو سب کچھ جانتا ہے (ان آیات نیز (۸/۴) سے صحابہ کبارؓ کا مقام واضح ہو جاتا ہے)۔

لہٰذا، نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں جس قدر بھی حضورؐ کے ساتھی (مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَهٗۤ (۴۸/۲۹)) تھے جنہیں صحابہؓ کہہ کر پکارا جاتا ہے، ان سب کے لئے خدا کا یہ اعلان تھا. ان میں کسی قسم کی تفریق کرنا قرآن کی کھلی ہوئی مخالفت ہے (انڈکس میں صحابہؓ کا عنوان دیکھئے). نہ ہی یہ ذمہ داری ہمارے سپرد کی گئی ہے کہ ہم ان کی فہرستیں مرتب کریں.

آیت (۸/۷۵) میں ایک استثنار کی گئی ہے. قرآن نے تمام مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں (ان میں مرد، عورتیں سب شامل ہیں). لیکن اخوت کا یہ رشتہ دینی ہے. قرآن میں نسبی رشتوں کے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں، وہ اس (اخوتِ دینی) کے باوجود اپنی جگہ برقرار ہیں.



ان کے مقابلہ میں غیر مسلموں کے متعلق فرمایا:

(۸/۷۳) وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ

تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ○

(ایک طرف یہ جماعتِ مومنین ہے جس کے افراد ایک دوسرے کے دوست اور بہی خواہ ہیں۔ دوسری طرف) وہ لوگ ہیں جو اس نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں۔ لہٰذا، اگر تم وہ کچھ نہ کرو گے جس کا اوپر حکم دیا گیا ہے (یعنی ان کا مقابلہ) تو ملک میں فتنہ برپا ہو جائے گا اور بڑی خرابی پیدا ہو جائے گی۔

قرآنِ کریم ہر مقام پر مسلم اور غیر مسلموں کو دو الگ الگ فریق قرار دیتا ہے، جو ایک دوسرے کے مخالف ہی نہیں، معاند ہیں۔ اسی کو دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔

آیت (۸/۷۲) کا ایک حصہ باقی رہ گیا تھا جسے اب سامنے لایا جاتا ہے۔ انڈکس میں "ہجرت" کا عنوان دیکھئے۔ اسی سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ دین یا اسلامی نظام اور مملکت کے قیام میں اس مرحلہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مختصر الفاظ میں اسے دُہرا دیا جائے کہ اقامتِ دین کا مدعی، اپنے پیغام کو اُسی سرزمین سے شروع کرتا ہے جس میں وہ مقیم ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ دیکھے کہ اس نظام کے لئے وہ سرزمین سازگار نہیں، اور کوئی اور خطۂ ارض اس کے لئے زیادہ مساعد ہے، تو وہ اس خطّے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اسے اصطلاح میں ہجرت کہتے ہیں۔ وہ وہاں اپنے پروگرام کا آغاز کرتا ہے۔ اس کی جماعت کے کچھ لوگ اس کے ساتھ ہی ہجرت کر لیتے ہیں۔ کچھ ان کے بعد آہستہ آہستہ ادھر آتے رہتے ہیں۔ ان اَلسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ کو بڑی مشقتیں برداشت کرنا اور بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ ان کی کوششوں اور قربانیوں کے بعد جب اُس جگہ اسلامی مملکت قائم ہو جاتی ہے تو یہاں وہاں بکھرے ہوئے مومنین وہاں کھچے چلے آتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں اتنی سختیاں ہوتی ہیں کہ انہیں وہاں سے نکلنے بھی نہیں دیا جاتا۔ ان کی امداد کے لئے آیت (۲/۲۷۳) میں تاکید آئی ہے۔ مکّہ کے کمزور محصورین کو وہاں سے نکالنے کے لئے آیت (۴/۷۵) میں حکم دیا گیا تھا۔

لیکن اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو وسعت، استطاعت اور امکان کے باوجود ہجرت نہیں کرتے اور غیر اسلامی علاقہ اور نظام میں پاؤں توڑ کر بیٹھے رہتے ہیں، اُن کے خلاف بڑے سخت احکام دیئے گئے۔ فرمایا۔

(۸/۷۲) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

لیکن جو لوگ جماعتِ مومنین میں شامل تو ہو گئے، لیکن انہوں نے اپنے وطن کو نہیں چھوڑا (اور بلاعذر، غیر خداوندی نظام میں، مخالفین کے ساتھ رہنا گوارا کر لیا)، تو ان کی اعانت و رفاقت کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں، تا آنکہ وہ ہجرت کر کے تمہارے ساتھ نہ آملیں (۴/۹۷)۔

جو اسلامی مملکت کی طرف نہ آئیں

البتہ اگر وہ وہاں بحالتِ مجبوری، گھر چکے ہوں (۴/۷۵) اور دین کے معاملہ میں تم سے کوئی مدد مانگیں تو تم پر اُن کی مدد واجب ہے، بشرطیکہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف نہ ہو جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اللہ کا قانون تمہارے تمام اعمال کو دیکھتا ہے۔

غور فرمایئے! ان چند الفاظ میں کتنے اہم اصول بیان کر دیئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جماعتِ مومنین کے لئے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں سے اپنے تعلقات منقطع کریں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کے ساتھ یہی نقطہ موضوعِ نزاع تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہندوستان کے جمہوری نظام میں (جو مغربی جمہوریت کے اصولِ اکثریت کی رُو سے بہرحال غیر اسلامی تھا) ہمیں "مذہب" کی آزادی ہوگی، اس لئے ایک الگ خطۂ ارض حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُن سے کہا جاتا کہ غیر اسلامی نظام کے تحت، محض نماز، روزہ کی آزادی کا نام اسلامی زندگی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی، اسلامی نظام ہی کے تابع ممکن ہے جس کے لئے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کا قیام ضروری ہے۔ بنا بریں، اصولی طور پر ان کی پوزیشن ایسی ہی تھی، جیسی آیت زیرِ نظر میں اُن مسلمانوں کی بتائی گئی ہے جو اسلامی نظام کی طرف منتقل ہو جانے کے امکان کے باوجود اُدھر منتقل ہو کر نہ آئیں، یعنی وہ اسلامی نظام پر غیر اسلامی نظام کو ترجیح دیں۔ اس سلسلہ میں سورۃ النساء کی آیات (۴/۹۷-۱۰۰) بھی دیکھئے۔

اسلامی نظام قائم ہوجانے کے بعد جو مسلمان (امکان کے باوجود) اس طرف منتقل ہونا نہ چاہیں، بلکہ غیر اسلامی نظام میں مطمئن ہوکر بیٹھے رہیں، اُن میں اور ان لوگوں میں، جو یہ کہیں کہ اسلامی مملکت قائم کرنے کی ضرورت ہی نہیں، غیر اسلامی مملکت میں بھی اسلام پر عمل ہوسکتا ہے، کیا فرق ہے ؟

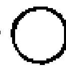
تحریکِ پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء کے ساتھ یہی نقطۂ نزاع تھا اور اُن کی اِس روش نے اس تحریک کو سخت نقصان پہنچایا تھا ــــــــ تشکیلِ پاکستان کے بعد وہ اِدھر منتقل ہوکر آگئے اور اپنے سابقہ موقف کی خود تردید کردی۔

کہا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ اگر وہ لوگ دین کے معاملہ میں تم سے مدد کے طالب ہوں تو اُن کی مدد کرنا ضروری ہے۔

لیکن اس میں پھر ایک استثنا کردی! کہا کہ اگر ان کی اِس طرح مدد کرنا کسی ایسے معاہدہ کے خلاف ہو جو تم نے کسی غیر قوم کے ساتھ کر رکھا ہے، تو پھر ان کی مدد نہیں کی جاسکتی۔

غور فرمایئے کہ قرآنِ کریم معاہدات کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ امداد کے طالب مسلمان ہیں۔ وہ دین کے کسی معاملہ میں مدد کے خواہاں ہیں۔ لیکن اگر یہ چیز کسی ایسے معاہدہ کے خلاف جاتی ہے جو تم میں اور کسی غیر مسلم قوم میں طے پاچکا ہے، تو پھر ان کی مدد نہیں کی جاسکتی۔ (انڈکس میں جنگ اور معاہدات کے عنوان دیکھئے)۔

اللہ اکبر! یہ ہیں قرآنی سیاست کے اصول !!



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دسواں پارہ ——————— نویں سورۃ



تیسرا باب

سُوْرَۃُ التَّوْبَۃِ

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط

۱۔ مرکزِ نظامِ اسلامی (کعبہ) کا جماعتِ مومنین کی تحویل میں آجانا۔
۲۔ حجِ اکبر کے دن کا اعلامیہ۔
۳۔ معاہدات کی اہمیت۔
۴۔ جنگ کے مقاصد۔
۵۔ دین، رسوم و مناسک کی ادائیگی کا نام نہیں۔
۶۔ جزیہ کا مفہوم۔
۷۔ علماء و مشائخ کو خدا بنالینا۔
۸۔ الدّین کا تمام ادیان (انسانوں کے وضع کردہ نظامہائے حیات) پر غلبہ۔
۹۔ مال و دولت جمع کرنے کے خلاف سخت وعید۔
۱۰۔ منافقین کی عذر تراشیاں اور حیلہ جوئیاں۔
۱۱۔ منافقین کے لئے استغفار کا مفہوم۔
۱۲۔ اعراب (صحرانشین بدوؤں) کی حالت۔
۱۳۔ صدقات کی قبولیت۔
۱۴۔ صدقات، زکوٰۃ نہیں۔
۱۵۔ مسجدِ ضرار ـــــــ ہماری مساجد کی کیفیت۔
۱۶۔ مومنین اور خدا کا معاہدہ۔
۱۷۔ جنگ میں پیچھے رہ جانے والے صحابہؓ۔
۱۸۔ تَفَقُّہ فی الدّین حاصل کرنے کا طریق۔
۱۹۔ اسلام ـــــــ شمشیر اور قرآن کا امتزاج۔

تیسرا باب

سُوْرَةُ التَّوْبَةِ

نویں سورۃ

قرآنِ کریم کے اسلوب و ترتیب کے مطابق، ہر سورۃ کے آغاز میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھا جاتا ہے، لیکن اس سورۃ کے شروع میں بِسْمِ اللّٰه نہیں لکھی جاتی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ حتمی طور پر معلوم نہیں تھا کہ یہ سورۃ سابقہ سورۃ (الانفال) ہی کا حصہ ہے یا الگ سورۃ ہے۔ اس اختلاف میں تطبیق کی صورت یہ پیدا کی گئی کہ اسے تسلیم تو الگ سورۃ ہی کیا گیا، لیکن اس کے آغاز میں بِسْمِ اللّٰه نہ لکھی گئی — چونکہ مطالب الفرقان میں اہمیت حوالوں کو ہے اور حوالے کے لئے اسے نویں سورۃ تسلیم کیا گیا ہے اس لئے ہمارے نزدیک سرِ آغاز بِسْمِ اللّٰه کے سوال کی چنداں اہمیت نہیں رہتی۔ یہ نویں سورۃ ہے۔

نظامِ اسلام میں کعبہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے، اسے سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے (انڈکس میں قبلہ اور کعبہ کے عنوانات دیکھئے)۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی گئی اور وہ آہستہ آہستہ مستحکم بھی ہوتی گئی اور پھیلتی بھی گئی۔ منشاءِ خداوندی کے مطابق کعبہ کو نوعِ انسان کی عالمگیر اجتماعیت کا مرکز قرار پانا تھا۔ وہ تو بعد کی بات تھی، لیکن اس کا آغاز مملکتِ اسلامیہ سے ہونا چاہیئے تھا۔ حضور نبیٔ اکرمؐ کی مدنی زندگی کے ابتدائی آٹھ سال میں صورت یہ تھی کہ اسلامی مملکت قائم تھی (اور اس کا دار الخلافہ مدینہ تھا)، لیکن کعبہ غیر مسلموں (بلکہ اسلام کے دشمنوں) کے قبضہ میں تھا۔ آپ مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ 96 پر دیکھئے۔ خود قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو مشہود کیا ہے کہ رسول اللہ کی نگاہیں کس طرح بار بار آسمان کی طرف اٹھتی تھیں، یہ التجا لئے ہوئے کہ جب کعبہ کو اس اُمت اور اس کے نظام کا مرکز بننا ہے، تو اسے اسی امت کی تحویل میں ہونا چاہیئے نہ کہ مخالفینِ اسلام کے قبضہ میں!

ان ملتجیانہ نگاہوں کو شرفِ باریابی ۸ھ میں حاصل ہوا جب مکّہ فتح ہوا۔ اس کے بعد ۹ھ میں حج فرض ہوا۔ اس میں حضور نبی اکرمؐ بنفسِ نفیس شریک نہ ہو سکے اور اپنی جگہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بطور امیرِ حجاج روانہ فرمایا۔ آپ اس اجتماع کی اہمیت کا اندازہ لگائیے۔ تیرہ سالہ مکّہ کی زندگی اور آٹھ نو سال کی مدنی زندگی اسی روزِ سعید کے انتظار میں گزری تھی۔

حجِ اکبر اس اعتبار سے قرآن میں اسے یَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ (۹/۳) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس کے ایجنڈا میں سرِفہرست یہ نکتہ تھا کہ اس امر کا اعلان کر دیا جائے کہ اب سے کعبہ کی تولیت خالصۃً امتِ مسلمہ کے ہاتھ میں رہے گی اور کوئی غیر مسلم اس میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ مکّہ ۸ھ میں فتح ہوا تو وہاں کے غیر مسلم (جنہیں قرآن، اہلِ کتاب سے تمیز کرنے کے لئے مشرکین کہہ کر پکارتا تھا) اسلام لے آتے تھے، لیکن جو قبائل، ملک کے اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے تھے، ان میں بیشتر ہنوز مشرک تھے۔ لیکن مملکتِ مدینہ کے ساتھ ان کے معاہدات تھے۔ اُن کی اِطّلاع کے لئے اس تبدیلی کا اعلان مملکتِ اسلامیہ کی طرف سے تھا۔ لیکن قرآن نے اپنے مخصوص اسلوب کی رُو سے 'اسے "خدا اور رسول" کی طرف سے اعلان قرار دیا ہے۔

مشرکین سے مُراد اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ قرآن میں جہاں مشرکین کے ساتھ معاہدات، ان معاہدات کی تنسیخ یا اُن کے خلاف اعلان کا ذکر آیا ہے، اس سے مُراد اُس زمانہ کے مخالفینِ اسلام تھے نہ کہ ساری دنیا اور مستقبل تک کے تمام مشرکین۔ کعبہ کی تولیت (اس کے نظم و نسق) میں غیر مسلموں کو شریک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن انہیں (مخصوص شرائط کے تحت) کعبہ میں آنے جانے کی اجازت تھی۔ قرآنِ کریم نے مملکتِ اسلامیہ سے کہا ہے کہ انہیں حج کے اجتماع میں مبصرین کی حیثیت سے، شرکت کی دعوت دو تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے (مطالب الفرقان جلد سوم، ص۲۳۵)۔ نیز تاریخ سے اس امر کی شہادت بھی ملتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں غیر مسلم کعبہ میں آتے جاتے تھے (شاہکارِ رسالت ص۲۷۳، ایڈیشن چہارم (بلا ترمیم) ۱۹۸۷ء)

اس اجتماعِ عظیم میں اعلان کیا گیا کہ:

(۹/۱) بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ

مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۞

اے جماعتِ مومنین! تم اُن مشرکینِ عرب کے متعلق، جن کے ساتھ تم نے معاہدات کئے تھے، لیکن وہ اپنے معاہدہ پر قائم نہیں رہے (۹/۴)، اعلان کر دو کہ نظامِ خداوندی ان کے معاہدات کو کالعدم قرار دیتا ہے۔

اعلان کے الفاظ کا دبدبہ اور طنطنہ بتا رہا ہے کہ یہ فیصلہ ایک ایسی مملکت کی طرف سے ہو رہا ہے جسے پورا پورا غلبہ و تسلط حاصل ہے اور وہ اپنے معاملات میں بلا شرکتِ غیرے، صاحبِ اقتدار ہے۔

لیکن یہ اعلان اسلامی مملکت کی طرف سے ہو رہا تھا، (کسی سیکولر حکومت کی طرف سے نہیں) اس لئے یہ نہیں کیا گیا کہ اِدھر اعلان ہوا اور اُدھر اُن لوگوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی کہا گیا:

(۹/۲) فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۞

یہ لوگ، اس کے بعد، چار ماہ تک، بلا روک ٹوک، اس مملکت میں رہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد، اگر یہ مملکت کے پُر امن شہری بن کر رہنا چاہیں تو فبہا، ورنہ ان سے جنگ ہو گی۔ (ان سے کہہ دو کہ) تم اپنی خلافِ اسلام حرکتوں سے نظامِ خداوندی کو بے بس اور مغلوب نہیں کر سکتے۔ اس نظام میں اتنی قوت ہے کہ وہ سرکشی اختیار کرنے والوں کو نیچا دکھا دے۔

اعلان کا اگلا حصہ یہ تھا:

(۹/۳) وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا

اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

آج اس اجتماعِ عظیم کے دن ـــــ جو تشکیلِ مملکت کے بعد سب سے بڑے اجتماع کا دن ہے ـــــ تمام لوگوں کی اطلاع کے لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ نظامِ خداوندی مشرکینِ عرب کے عہد و پیمان سے بری الذمہ ہے اب ان کے ساتھ کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا۔ ان سے کہہ دو کہ (اگر تم اپنی سرکشی سے باز آجاؤ تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ لیکن اگر تم نے (صحیح روش سے) اسی طرح منہ موڑے رکھا، تو اس خیال کو دل سے نکال دو کہ تم نظامِ خداوندی کو بے بس کر دو گے۔ تمہیں دردناک سزا دی جائے گی۔

اذان کا مفہوم آیت میں "اذان" کا لفظ آیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگالیجئے کہ اسلامی نظام میں اذان کے معنی کیا ہیں؟ یعنی مملکتِ اسلامیہ کی طرف سے اعلامیہ Proclamation اور آج اذان سے مراد کیا ہے! اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہ فیصلہ اُن لوگوں کے متعلق تھا جنہوں نے معاہدات کی پابندی نہیں کی تھی اور مملکتِ اسلامیہ کے مخالفین کی مدد بھی کرتے رہے تھے۔ جنہوں نے ایسا نہیں کیا تھا، ان کے متعلق اعلان تھا کہ

(۹/۴) اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

البتہ جن مشرکینِ عرب کے ساتھ تم نے معاہدات کئے تھے اور انہوں نے نہ تو اپنا معاہدہ پورا کرنے میں کسی قسم کی کمی کی اور نہ ہی تمہارے خلاف کسی کو مدد دی، تو اُن کے ساتھ،

جتنی مدت کے لئے معاہدہ ہوا تھا' اس مدت کو پورا کرو' اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے' وہی لوگ پسندیدہ ہیں جو معاہدات کی نگہداشت کرتے ہیں۔

اوّل الذکر گروہ کے متعلق جنہیں چار ماہ کی مہلت دی گئی تھی' فرمایا:

(۹/۵) فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

جب چار ماہ کا عرصہ گزر جائے (اور اس کے بعد یہ' نہ تو اس مملکت کے پُرامن شہری بن کر رہنا چاہیں اور نہ ہی کسی دوسری جگہ منتقل ہوں' تو ان کے خلاف لامحالہ جنگ کی جائے گی) اس صورت میں' انہیں جہاں پاؤ قتل کرو' گرفتار کرو' ان کا محاصرہ کرو اور ہر جگہ ان کی تاک میں رہو (اس لئے کہ انہیں فتنہ و فساد پھیلانے کے لئے کُھلا نہیں چھوڑا جا سکتا)۔

لیکن اگر یہ اپنی ان حرکتوں سے باز آجائیں (اور غیر مسلم امن پسند شہریوں کی حیثیت سے یہاں رہنا چاہیں) یا (۹/۱۱) (اسلام لا کر) نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ میں تمہارے شریکِ حال ہو جائیں تو پھر ان سے تعرض نہ کرو۔ نظامِ خداوندی میں امن چاہنے والوں کے لئے حفاظت و حرمت کی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔

یہاں دو تین نکات غور طلب ہیں۔ پہلے یہ کہا کہ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ ــــــ "جب وہ مہینے گزر جائیں جن کا احترام لازماً کیا جائے گا" ــــــ جیسا کہ مطالب الفرقان' جلد سوم' (صفحہ ۲۸) میں بتایا گیا ہے' قرآنِ کریم کی رُو سے سال میں چار ماہ ایسے رکھے گئے ہیں جن میں جنگ ممنوع قرار پائی ہے۔ انہیں اشھر الحرام (حرمت کے مہینے) کہا جاتا ہے لیکن زیرِ نظر آیت میں حُرمت کے مہینے وہ ہیں جن

کے متعلق اعلان میں کہا گیا ہے کہ وہ مخالفین کے لئے مہلت کا وقفہ ہیں. ان میں ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی. مملکت کے اعلان کو واجب الاحترام قرار دینا، قرآن کے نظامِ سیاست ہی کا حصہ ہو سکتا تھا!

اگلا نکتہ یہ ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ اس کے بعد ــــ "انہیں جہاں پاؤ قتل کرو" تو اس سے مراد یہ نہیں کہ ان کا قتلِ عام شروع کر دو. مطلب یہی ہے کہ پھر ان کے خلاف، ان حدود و شرائط کے مطابق، جو قرآن نے متعین کی ہیں، ان کے خلاف جنگ کی جائے گی.

اقامت الصلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ

اس کے بعد کہا کہ اگر یہ اپنی سرکشی سے باز آجائیں اور "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کے اسلامی مملکت کے پروگرام میں تمہارے ساتھ شریک ہو جائیں، تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی متصور ہوں گے (۹/۱۱). مقصد تو یہی ہے کہ اسلام لا کر یہ لوگ دین کے سارے نظام میں تمہارے شریکِ حال ہو جائیں، لیکن اس میں "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" خصوصیت کے ساتھ کہا گیا ہے. قرآن کریم کی ان دو اصطلاحات کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بڑی وضاحت سے بیان ہو چکا ہے (دیکھئے انڈکس). ان مقامات سے آپ دیکھ لیں گے کہ دین کا سارا نظام انہی دو محوروں کے گرد گردش کرتا ہے. نظامِ صلوٰۃ میں دین کا معاشرتی اور سیاسی پہلو آجاتا ہے اور ایتائے زکوٰۃ میں اس کا معاشی گوشہ. دیگر مقامات میں اسلامی مملکت کے قیام کے بنیادی مقاصد یہی دو اساسی نکات قرار دیئے گئے ہیں (مثلاً ۲۲/۴۱). قرآن کریم کی رُو سے، یہ دو گوشے اس قدر اہم اور جامع تھے کہ سارا دین سمٹ کر ان کے اندر آجاتا تھا. لیکن مذہب (یعنی ہمارے مروجہ اسلام) میں ان گوشوں کا مطلب ہے نماز کی چند رکعتوں کی ادائیگی اور اپنے بے حد و نہایت جمع کردہ مال میں سے اڑھائی فیصد خیرات! ٹھیک کہا تھا اقبالؒ نے کہ

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے	شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل	یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست	یہ مذہبِ مُلا جمادات و نباتات

ہمارا مذہب پرست طبقہ اتنا بھی نہیں سوچتا کہ قرآن نے کہا ہے: اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ ــــ اگر ان لوگوں (جماعتِ مومنین) کی اپنی مملکت قائم ہو گئی، تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا

کریں گے۔ اس سے واضح ہے کہ ان فرائض کی ادائیگی کے لئے اپنی مملکت کا قیام لازمی ہے۔ لیکن اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا جو مفہوم اب لیا جاتا ہے، اس کے لئے اپنی مملکت کی قطعاً ضرورت نہیں۔ وہ ہر مملکت میں ادا کئے جا سکتے ہیں، جیسا ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران ان اصطلاحات کا مفہوم نیشنلسٹ علماء اور مطالبۂ پاکستان کے حامیوں کے درمیان بنیادی وجۂ نزاع تھا۔

بہر حال قرآن نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو پھر تمہارے دینی بھائی بن جائیں گے۔ اس کے بعد ایک ایسا درخشندہ اصول بیان فرمایا جسے اسلام کے نظامِ عدل و آزادی کا بنیادی ستون کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ مخالفین کے ساتھ جنگ ہو رہی ہے۔ ان کا کوئی فرد مسلمانوں کے ہاں پناہ کا طالب ہے۔ اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے گا۔ فرمایا:

(۹/۶) وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ ○

اگر ان مشرکین میں سے (جن کے ساتھ معاہدات ختم کر دیئے گئے ہیں) کوئی تمہارے پاس آ کر پناہ مانگے تو اسے پناہ دو۔ پھر اسے اچھی طرح سمجھا دو کہ قوانینِ خداوندی کی رُو سے، اس نظام میں اس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ اگر اس کے لئے یہ پوزیشن قابلِ قبول نہ ہو اور وہ مملکت سے چلا جانا چاہے، تو تم اُسے (بہ حفاظت) اُس کی پناہ گاہ تک پہنچا دو۔

یہ اس لئے کہ یہ لوگ، جہالت کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔ (ورنہ اگر یہ علم و عقل سے کام لے کر سوچتے تو انہیں صاف نظر آ جاتا کہ نظامِ خداوندی میں رہنا اُن کے کئے کس قدر منفعت بخش ہے۔

مذہبی آزادی

وہ بے شک تمہارا دشمن ہے، تمہارے خلاف مصروفِ جنگ و جدال ہے۔ لیکن ایک انسان کی حیثیت سے تمہارے ہاں پناہ لینے کے لئے آ گیا ہے۔ اس کی مخالفت اور عداوت کو بھول جاؤ اور اُسے پناہ دو۔ پناہ دینے کے بعد کیا کرو؟ اسے زبردستی مسلمان کر لو؟ کہا کہ

قطعاً نہیں۔ اس کے سامنے قرآن کی تعلیم پیش کرو۔ اگر وہ اسے قابلِ قبول نہ سمجھے اور اپنے ہاں واپس جانا چاہے، تو اسے اپنی حفاظت میں اس مقام تک پہنچاآؤ جہاں وہ کہے کہ اسے امن حاصل ہو جائے گا۔ ان کی مخالفت کی وجہ یہ بتائی کہ انہیں قرآن کی تعلیم کا علم نہیں۔ انہیں ضروری معلومات بہم پہنچادو پھر دیکھو اُن کا ردّ عمل کیا ہوتا ہے۔

جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے، وہ زیادہ نہیں تو قرآن کے اس حکم ہی کو دیکھیں اور خود فیصلہ کرلیں کہ اسلام نے کس قدر مذہبی آزادی عطا کی ہے! یہ پناہ گزین، غیر مسلم، ہر طرح مسلمانوں کے قبضے میں تھا اس سے جو چاہے منوایا جا سکتا تھا۔ لیکن اُس کے متعلق بھی کہا کہ اسے قرآن سناؤ۔ اگر وہ اسلام قبول نہ کرنا چاہے، تو اسے اپنی حفاظت میں اُس کے مامن تک پہنچا آؤ۔ (دین میں جبر کے عنوان پر سابقہ جلدوں میں بہ تفصیل لکھا جا چکا ہے)۔



اس کے بعد چار آیات بِس معاہدات ہی کے متعلق مزید تصریحات آتی ہیں۔ آیات مع اُن کے مفہوم کے درجِ ذیل ہیں:

(۹/۷) كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝

(تم سوچو کہ جو لوگ اس طرح بار بار عہد شکنی کریں) نظامِ خداوندی کی رُو سے اُن کے عہد کو عہد کس طرح سمجھا جائے۔ عہد ان کا قابلِ اعتناء ہو گا جن کے ساتھ تم نے مسجدِ حرام کے نزدیک (اب) عہد کیا ہے سو جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں، تم بھی عہد کو استوار رکھو۔ اس لئے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے وہی لوگ پسندیدہ ہیں جو اپنے عہد کی نگہداشت کرتے ہیں۔

(۹/۸) كَيْفَ وَإِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ إِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَأَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

ان لوگوں سے بھلا کیا عہد ہو سکتا ہے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ اگر تم پر غالب آجائیں تو عہد و پیمان تو ایک طرف رہا، وہ معاشرہ کے عام ضوابط و واجبات تک کو بھی بالائے طاق رکھ دیں۔ ان کی پاسداری بھی نہ کریں۔ یہ چکنی چپڑی باتوں سے تمہیں راضی رکھنا چاہتے ہیں اور دل میں تمہارے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات بھرے رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو (معاہدات کی رُو سے طے شدہ حدود و قیود سے بھی) اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں۔

(۹/۹) اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ إِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

یہ لوگ ذرا سے فائدے کے لئے، جھٹ سے قوانینِ خداوندی کو بیچ ڈالتے ہیں اور لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ جو کچھ یہ کرتے ہیں، وہ کس قدر بُرا ہے!

(۹/۱۰) لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ إِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝

اس نظام کو قبول کرنا تو ایک طرف رہا، ان کی حالت یہ ہے کہ (ان میں سے) جو شخص اس نظام کو تسلیم کر لیتا ہے، یہ اس کے ساتھ، عام معاشرتی تعلّقات و روابط کی بھی پاسداری نہیں کرتے (۴۲/۲۳)، نہ ہی کسی عہد و پیمان کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے

ہی حدود شکن واقع ہوتے ہیں۔

ان (اور ان جیسے دیگر مقامات) سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ وہ جاہلیت کا زمانہ تھا اس لئے وہ لوگ نہ بین الاقوامی روابط کی اہمیت کو سمجھتے تھے اور نہ ہی عہد و معاہدات کی پابندی کو ضروری خیال کرتے۔ لیکن سوال عہدِ جاہلیت اور (موجودہ) دورِ تہذیب کا نہیں۔ ہمارا دورِ تہذیب اس باب میں عہدِ جاہلیت سے بھی دس قدم آگے ہے۔ ہمارے زمانے میں میکیاولی سیاست کا دور دورہ ہے جسے عرفِ عام میں سیکولرازم کہا جاتا ہے۔ معاہدات کے متعلق میکیاولی کی تعلیم یہ ہے کہ:

میکیاولی سیاست

بادشاہ کے لئے صفتِ روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل و فریب کے جال بچھا سکے۔ اس کے ساتھ خوئے شیری بھی تاکہ وہ بھیڑوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں۔ اس لئے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن وجوہات کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا تھا، وہ باقی نہیں رہیں، تو اسے بلا تامل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نگاہ فریب دلائل بہم پہنچاتے۔

دورِ حاضر کی سیاست کا مدار سیکولرازم پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ قومیں کسی مستقل اقدار کی پابند نہیں ہیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف اپنا مفاد ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت قوت کے سوا کوئی ذریعہ نہیں جس سے آپ کسی قوم کو کسی معاہدہ کی پابندی پر مجبور کر سکیں۔ مشہور مقنن سولن کا قول ہے کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہوتا ہے جو اپنے سے کمزور کو بآسانی پھنسا لیتا ہے اور زوردار کی سانس سے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ چونکہ معاہدہ کرنے والے فریقین کے من میں چور ہوتا ہے اس لئے معاہدہ کے مسودہ میں سیاسی زبان Diplomatic Language استعمال کی جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک صاف اور سیدھے معاملہ کے متعلق معاہدہ کے مسودہ میں الفاظ کے انتخاب اور اتفاق پر فریقین کے کئی

معاہدات کی پابندی

کئی دن بحث و مباحثہ میں لگ جاتے ہیں اور جب کوئی نزاعی مقام آتا ہے تو وہ معاہدہ اعلیٰ سے اعلیٰ بین الاقوامی اداروں اور عدالتوں میں پیش ہوتا ہے کہ وہ اس کے صحیح معانی متعین کریں۔ جن اقوام نے ابھی کل ہی اس معاہدہ پر (کافی سوچ

بچار کے بعد) متفقہ طور پر دستخط کئے تھے، وہ اس کے مفہوم پر متفق نہیں ہوتیں اور اگر وہ متفق ہوں بھی تو کوئی قوت انہیں اس کی پابندی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ یہ صرف اخلاقی اقدار پر ایمان ہے جو افراد (اور اقوام) کو عہد و پیمان (معاہدات) کا پابند بنا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے عہد و پیمان کی پابندی پر (خواہ وہ انفرادی ہوں خواہ اجتماعی) اس قدر زور دیا ہے اور اسے جماعتِ مومنین کا شعارِ زندگی قرار دیا ہے (۲/۱۷۷ ؛ ۸/۲۳) اور اس ضمن میں خدا نے خود اپنی مثال پیش کی ہے کہ: فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ (۲/۸۰) "خدا اپنے عہد کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا"۔ بلکہ یہاں تک کہ ــــ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ (۹/۱۱۱) "خدا سے زیادہ عہد کی پابندی کرنے والا کون ہو سکتا ہے"؟

یہ وہ قوم ہو گی جو بلا کسی جبر و جور کے اپنے معاہدات کی پوری پوری پابندی کرے گی۔ چونکہ معاہدات کرتے وقت ان کے من میں چور نہیں ہو گا، اس لئے وہ معاہدہ کے وثیقہ میں پُرپیچ اور ذو معنی الفاظ استعمال نہیں کر سکے گی، کیونکہ ان کے خدا کا حکم ہے ــ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا (۳۳/۷۰) "ہمیشہ صاف، سیدھی غیر مبہم زبان استعمال کرو"۔

یہ تھے وہ دو فریق جن کے معاہدات کا ذکر مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے ــــــ ایک فریق سیکولرازم کا حامی، دوسرا فریق احکام خداوندی کا پابند!

اِس کے بعد پھر اسی بات کو دُہرایا جس کا ذکر آیت (۹/۵) میں کیا جا چکا ہے، یعنی:

(۹/۱۱) فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

بایں ہمہ اگر یہ لوگ اپنی موجودہ روش کو چھوڑ کر اسلام لے آئیں اور اس طرح نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کے قیام میں تمہارے شریک ہو جائیں، تو وہ تمہارے بھائی بن جائیں گے۔
ہم اُن لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں اپنے قوانین کو نکھار کر بیان کر دیتے ہیں۔

اس کے برعکس، اگر یہ لوگ عہد شکنی کریں اور معاہدات کے پابند نہ رہیں، تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں ہو گا کہ ان کے خلاف جنگ کی جائے۔

(۹/۱۲) وَاِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا

فِیْ دِیْنِکُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْکُفْرِ ۙ اِنَّھُمْ لَآ اَیْمَانَ
لَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَنْتَھُوْنَ ○

لیکن اگر یہ لوگ، معاہدہ کر لینے کے بعد، پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور نظامِ خداوندی کے خلاف طعن و تشنیع شروع کر دیں، تو دپھر اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا کہ آئینِ کفر کے ان سرغنوں کے خلاف جنگ کی جائے۔ پھر ان کا عہد ہی نہیں رہے گا ـــــــــ

اور یہ جنگ اس لئے کی جائے گی کہ یہ لوگ ظلم و سرکشی سے باز آجائیں۔

جنگ سے متعلق جو آیات بھی آپ کے سامنے آئیں، ان میں دیکھتے جائیے کہ قرآنِ کریم نے کن حالات میں جنگ کی اجازت دی ہے اور کون سے مقاصد کے لئے؟ اسی آیت کے آخری الفاظ پر غور فرمائیے۔

جنگ کا مقصد

جنگ اس لئے ناگزیر ہو گئی تھی کہ یہ لوگ عدل و انصاف سے سرکشی برتتے تھے۔ ملک میں ظلم و فساد برپا کرتے تھے۔ انہیں ہزار سمجھایا، لیکن وہ ظلم و تعدّی سے باز نہ آئے۔ مجبوراً طاقت کا استعمال کرنا پڑا۔ لَعَلَّھُمْ یَنْتَھُوْنَ ○ تاکہ یہ اپنی ان انسانیت سوز حرکات سے باز آجائیں، جنگ ختم کر دی جائے۔ اس کی تاکید میں کہا:

(۹/۱۳) اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّکَثُوْٓا اَیْمَانَھُمْ وَھَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَھُمْ بَدَءُوْکُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ اَتَخْشَوْنَھُمْ ۚ فَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْہُ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○

تم خود ہی سوچو کہ ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کرنے میں کیا تأمّل و توقّف ہو سکتا ہے، جنہوں نے اپنے معاہدات کو توڑ ڈالا ہے، جنہوں نے اس بات کا تہیّہ کر لیا کہ رسول کو، اس کے گھر بار سے باہر نکال دیں گے۔ (اور جب وہ گھر بار چھوڑ کر مدینہ آ گیا تو اس پر بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔) اور تمہارے خلاف جنگ کرنے کی پہل بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ لہٰذا اب کون سی بات باقی رہ گئی ہے جو ان کے خلاف قدم نہ اٹھایا جائے؟ کیا تم ان سے

ڈرتے ہو؟ سُن رکھو کہ اگر تم خدا پر ایمان رکھتے ہو، تو پھر صرف خدا کا قانون ایسا ہے جس کی خلاف ورزی کے نتائج سے تمہیں ڈرنا چاہیئے (اس کے سوا کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں)۔

لہٰذا، یہ ضروری ہو گیا ہے کہ

(۹ / ۱۴-۱۵) قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

تم ان کے خلاف جنگ کے لئے نکلو اور پھر دیکھو کہ خدا کس طرح انہیں، تمہارے ہاتھوں سے سزا دلواتا ہے (۸/۱۷؛ ۴۰/۲۲؛ ۵۹/۲)، انہیں ذلیل و رسوا کرتا ہے اور تمہیں ان پر غلبہ عطا کرتا ہے، ایسا غلبہ جس سے جماعتِ مومنین کے دلی دکھ دُور ہو جائیں گے۔

اور وہ کرب و بے چینی جس میں یہ مومنین، اتنا عرصہ تک، ان مخالفین کے ہاتھوں مبتلا رہے ہیں، سب ختم ہو جائے گی۔ (ان مخالفین میں سے کچھ تو ختم ہو جائیں گے اور باقی تائب ہو کر اسلام لے آئیں گے۔ تمہیں اس پر تعجب تو ضرور ہو گا کہ ان کے اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی خدا کی طرف سے ان کے لئے بازآفرینی کا دروازہ کھلا رہے گا؟ ہاں! وہ کھلا رہے گا)۔ ہمارا قانونِ مشیّت یہ ہے کہ جو شخص (یا قوم) بھی چاہے کہ خدا اپنی عنایات کو اس کی طرف مبذول کر دے (اور وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق بنا لے) تو خدا اپنی توجہات اس کی طرف پھیر دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اُس کے اُس قانون کے مطابق ہوتا ہے جو سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

یہاں ایک نکتہ غور طلب ہے۔ سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے کہ عالمِ انسانیت میں خدا اپنی ذمہ داریاں انسانوں (جماعتِ مومنین) کے ہاتھوں پوری کراتا ہے، براہِ راست ایسا نہیں کرتا۔ اس ضمن

خدا اپنی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پوری کرتا ہے

ہیں مطالب الفرقان، جلد اول، صفحات ۱۸۴ - ۱۷۹ اور جلد چہارم صفحات ۲۶۰ ؛ ۲۷۷ - ۲۷۳ ملاحظہ فرمایئے۔ یہاں کہا کہ کشمکشِ حق و باطل میں خدا ان مخالفوں کو سرنگوں کرنا چاہتا ہے (یُخْزِهِمْ) اور تمہیں ان پر غلبہ عطا کرنا چاہتا ہے (یَنْصُرْکُمْ عَلَیْهِمْ) لیکن یہ سب کچھ کرانا تمہارے ہاتھوں ہی سے چاہتا ہے (یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَیْدِیْکُمْ) یہ ہے خدا اور بندۂ مومن کا تعلق۔ خدا اپنے مقاصد کی تکمیل جماعتِ مومنین کے ذریعے کرتا ہے، براہِ راست خود نہیں کرتا (حالانکہ وہ ایسا کرنے پر ہر آن قادر ہے)۔

چونکہ خدا کے مقاصد مومنین کے ہاتھوں ہی سے حاصل ہوتے اور تکمیل تک پہنچتے ہیں اس لئے مومن کی ساری زندگی جدوجہدِ مسلسل کی زندگی ہوگی۔ یہ نہیں کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا اور پھر سمجھ لیا کہ اس سے وہ جنت کا مستحق ہوگیا ہے اسے کچھ اور کرنا ہی نہیں؛

(۹/۱۶) اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۠

اے جماعتِ مومنین! کیا تم سمجھ رہے ہو کہ چونکہ تم نے ایمان کا اقرار کر لیا ہے اس لئے اب تمہارے لئے سب کچھ خود بخود ہوتا چلا جائے گا اور تمہیں کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی؟ یہ خیالِ خام ہے۔ دعوائے ایمان کے بعد یہ بھی دیکھا جائے گا کہ تم میں سے کون ہے جو نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے مصروفِ جدوجہد رہتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ اور جماعتِ مومنین کے سوا کسی کو اپنا دوست اور راز دار نہیں بناتا۔ یاد رکھو! خدا کی نگاہ تمہارے کاموں پر ہوتی ہے۔ فقط ایمان کا دعوے کافی نہیں ہوتا (۲۱۴/۲ ؛ ۱۴۱/۳ ؛ ۲ - ۱/ ۲۹)۔

اس موضوع پر سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے [انڈکس میں "مومنین" کا عنوان دیکھئے اور جنگ (جہاد) کا عنوان بھی]۔ آیت زیر نظر کی تحدّی قلب حساس میں لرزش پیدا کر دیتی ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا...... کیا تم اس وہم و گمان میں مبتلا ہو؟ کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو؟ کیا تمہاری یہ خوش فہمی ہے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے گا کہ تم، جو جی میں آئے، کرو (یا نہ کرو) جنت کا پٹّا تمہارے نام لکھ دیا گیا ہے؟ وہ تمہاری ہو چکی ہے؟ اس میں تمہارا گھر بن چکا ہے؟ حالانکہ ابھی تک یہ دیکھا ہی نہیں گیا کہ تم وہ کام بھی کرتے ہو یا نہیں جو تمہیں جنت کا مستحق بنائیں گے۔

جنّت کا استحقاق

خدا کی اس وارننگ نے ہماری خوش فہمی اور خود فریبی کی کتنی ہی خیالی جنتوں کو ہم سے چھین لیا! اس سے آپ نے سمجھ لیا کہ ہمیں قرآن کو سمجھ کر پڑھنے سے کیوں روکا جاتا ہے؟ اس لئے کہ اس سے ہمارے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی جنت فروشی کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس سے اُن کے اِس اعلان کی قلعی کُھل جاتی ہے کہ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَدَخَلَ الْجَنَّةَ ــــــ جس نے کہہ دیا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

قرآن کی رُو سے جنت اتنی ارزاں نہیں مل جاتی ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے		لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ نے یہ حقیقت نکھار کر بیان کر دی کہ خدا کی میزان میں وزن اعمال کا ہے، الفاظ کا نہیں۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل روایت کو ہمارے ہاں کے واعظ بڑی خوش عقیدگی سے، جھوم جھوم اور گا گا کر بیان کرتے ہیں۔ روایت کا ایک حصہ تو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور دوسرا حضرت عمرؓ کی طرف۔ میں نے اسے ملخصاً اپنی کتاب شاہکارِ رسالت (صفحہ ۷۵) میں درج کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

> روایت ہے کہ ایک دفعہ نبیٔ اکرمؐ تنہا کسی طرف تشریف لے گئے۔ جب آپؐ کی واپسی میں دیر ہو گئی، تو صحابہؓ کو تشویش لاحق ہوئی اور وہ آپؐ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکلے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے آپؐ کو ایک باغ کے اندر پا لیا۔ حضورؐ نے انہیں اپنے نعلین (جُوتے) عنایت فرمائے اور کہا کہ انہیں لے جاؤ اور جو شخص بھی باہر ملے اسے میری طرف سے خوشخبری دے دو کہ جس شخص نے بھی کلمۂ شہادت پڑھ لیا، وہ جنت میں چلا جائے گا۔

اگلا حصّہ حضرت عمرؓ سے متعلق ہے اور وہ یوں کہ:

حضرت ابو ہریرہؓ باغ سے باہر آئے تو سب سے پہلے ان کی ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی. جب انہوں نے حضورؐ کی دی ہوئی خوشخبری آپ کو سنائی تو آپ (حضرت عمرؓ) نے حضرت ابو ہریرہؓ کے سینے پر ہاتھ مارا اور کہا کہ ابو ہریرہؓ! اسی وقت رسول اللہؐ کی طرف واپس چلو. جب یہ دونوں حضورؐ کی خدمت میں پہنچے تو آپؐ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور ابو ہریرہؓ کو اس خوش خبری کے عام کر دینے سے کیوں روکا؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ:

حضورؐ! ایسا نہ کیجئے. مجھے ڈر ہے کہ لوگ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں گے. انہیں عمل کرنے دیجئے.

اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اچھا! انہیں عمل کرنے دیجئے. (بحوالہ طنطاوی، عمرؓ ابن خطاب)

روایت زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ وضعی ہے. جو رسولؐ اپنی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ تاکید کرے کہ:

اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے پیغمبر کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو میں تمہیں خدا کے عذاب سے نہیں بچا سکوں گا.

کیا وہ اس قسم کا اِذنِ عام جاری کر دے گا کہ جس نے کلمہ پڑھا وہ جنّت میں داخل ہو جائے گا؟ باقی رہا روایت کا وہ حصّہ جس کا تعلق حضرت عمرؓ سے ہے، تو وضع کرنے والے نے اس سے (بزعمِ خویش) حضرت عمرؓ کا مقام تو بہت بلند کر دیا لیکن یہ نہ سوچا کہ اِس سے اُس نے حضور نبیؐ اکرمؐ کو (معاذ اللہ) کس مقام پر پہنچا دیا! بہر حال، قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ تم اس زعمِ باطل میں مبتلا نہ ہو جانا کہ محض کلمہ پڑھ لینے سے تم جنّت میں چلے جاؤ گے (۳/۱۴۱) اس کے لئے تو عمر بھر مجاہدانہ زندگی بسر کرنی ہو گی.

اس کے بعد چند آیات میں وضاحت سے بتایا کہ مومن کی زندگی کیا ہے اور اس کا مطلوب و مقصود کیا. سب سے پہلے یہ واضح کیا کہ خدا کا متعیّن فرمودہ پروگرام اُن لوگوں کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچے گا جو خالصتہً اُس کے احکام کی اطاعت کریں گے. جو ان سے انکار کریں گے، تو وہ ایک طرف رہے. جو اس میں کسی اور کی بھی اطاعت شامل کریں گے، وہ بھی اس میں حصّہ نہیں لے سکیں گے. فرمایا:

(٩/١٧) مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِى النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ○

یہ بھی سُن رکھو کہ تمہارا نظام، خالص قوانینِ خداوندی کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، اس لئے جو لوگ ایک خدا کے قوانین و احکام کے اطاعت گزار نہ ہوں، بلکہ مختلف نظریاتِ زندگی کے حامل ہوں، تمہارے نظام کا قیام ان کے ہاتھوں سے نہیں ہوگا۔ یہ تمہاری مساجد (یعنی نظامِ خداوندی کے قیام و نفاذ کے مراکز) کی آبادی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ یہ ان کی بربادی کا باعث بنیں گے (٢/١٨٧)۔ نہ ہی اس نظام کا قیام ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہوگا جو تمہاری جماعت میں تفرقہ پیدا کریں (٩/١٠٧)۔ یہ بھی درحقیقت مشرک ہی ہوتے ہیں (٣٠/٣١)۔ ان کا تو وجود ہی اس حقیقت کی شہادت ہے کہ یہ اس نظام کے خلاف ہیں۔ یہ اپنے کفر و شرک پر اپنے خلاف خود آپ گواہ ہیں۔

(بہرحال، تم ان سے بالکل خائف نہ ہو) جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اس سے کبھی وہ نتائج مرتب نہیں ہوں گے جو ان کے پیشِ نظر ہیں۔ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی۔ وہ کبھی ثمر بار نہیں ہو سکیں گی۔

مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ١٥) میں بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کی رُو سے "مسجد" کا مفہوم کیا ہے۔ اس سے مراد وہ عمارت ہی نہیں جس میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ مسجد کا یہ محدود مفہوم مذہب کا پیدا کردہ ہے

مسجد کا مفہوم

جس میں عبادت کے معنی پرستش ہوتے ہیں اور مسجد پرستش گاہ کو کہا جاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے مساجد، اسلامی نظام کے مراکز کا نام ہے جن میں جملہ کاروبارِ مملکت سرانجام پاتے تھے۔ کعبہ، یعنی مسجد الحرام کو ان سب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس سورہ کی آیت نمبر ١ (٩/١) میں بتایا گیا ہے کہ کعبہ کے ملّتِ اسلامیہ کی تولیت میں آجانے کے بعد مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا تھا کہ اب اس کے نظم و نسق سے مشرکین کو کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ اسے خالصتہً امّتِ مسلمہ

سرانجام دے گی۔ اسی کا اعادہ زیرِ نظر آیت میں کیا گیا ہے۔ یہ حصّہ "لَا" ہے۔ اگلی آیت کا متن "اِلَّا" سے متعلق ہے، جس میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ـــ

(۹/۱۸) اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝

نظامِ خداوندی کے مراکز کی تعمیر اور آبادی صرف ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہوگی جو خدا اور اس کے قانونِ مکافات اور حیاتِ اُخروی پر یقین رکھیں اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کا نظام قائم کریں اور ان کے دل میں، قانونِ خداوندی کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے سامنے سعادت اور خوشگواری کی راہ کھلی دیکھ لیں گے۔

اس کے بعد ایک ایسا اہم اصول سامنے لایا گیا ہے جو مذہب اور دین کے فرق کو اُبھار کر سامنے لے آتا ہے۔ فرمایا:

(۹/۱۹) اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینے اور خانہ کعبہ کی آبادکاری کے مختلف کام سرانجام دینے سے، انسان اُس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو قوانینِ خداوندی اور حیاتِ اُخروی پر ایمان رکھے اور نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے لئے مسلسل جدّوجہد کرے۔ (تم اپنے ذہن سے کچھ ہی کیوں نہ سمجھو) معیارِ خداوندی کے مطابق یہ کبھی برابر

نہیں ہو سکتے۔ یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مشیت کبھی ایسے لوگوں کو سعادت کی راہ نہیں دکھاتا جو ظلم سے باز نہ آئیں (اور اس قسم کے خیراتی کام کر کے اپنے آپ کو فریب دے لیں کہ ہم نے بڑا تیر مارا ہے۔ حقیقی عمل اُس نظام کا قیام ہے جس سے دنیا میں ظلم باقی نہ رہے)۔

مذہبی مراسم کی ادائیگی

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۷ (۲/۱۷۷) میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ مذہب اور دین میں فرق کیا ہے۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان، جلد سوم صفحہ ۱۵۴ میں ملے گی، نیز جلد اوّل صفحہ ۸۴ میں قرآن کریم کی رُو سے، مذہب نام ہے پرستش کی چند رسومات ادا کر دینے کا اور دین سے مراد ہے پورے کا پورا نظامِ زندگی۔ زیرِ نظر آیت میں اسی بنیادی حقیقت کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ایک زاویہ نگاہ یہ ہے کہ مذہبی رسوم و شعائر کو میکانکی طور پر ادا کر لیا جائے تو فریضۂ خداوندی ادا ہو جاتا ہے۔ دوسرا تصورِ حیات یہ ہے کہ خدا کے ہر مقرر کردہ پروگرام کے حصول کے لئے مسلسل مصروفِ جدّ و جہد رہنا دین کا مقصود ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ دونوں تصورات خدا کی نگاہ میں یکساں نہیں۔ اوّل الذکر حاملین کو اس نے "راہ گم کردہ ظالم" قرار دیا ہے۔ اسلام کو مذہب قرار دینے والوں کے لئے یہ نکتہ دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ وہ انہیں راہ گم کردہ ظالمین قرار دیتا ہے۔

(ضمناً) متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کی رُو سے اجزائے ایمان پانچ ہیں، اللہ، رسلؐ، ملائکہ، کتب، آخرت پر ایمان۔ کہیں کہیں وہ، ان میں سے بعض کا ذکر (اختصاراً) کرتا ہے، بعض کا نہیں۔ وہ ان میں سے کسی کا ذکر کرے یا نہ کرے، اجزائے ایمان بہرحال یہ تمام (پانچ کے پانچ) ہیں۔

اگلی دو آیات میں اس اجمال کی تفصیل بیان کر دی؛

(۹/۲۰-۲۲) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ

مُّقِيمٌ ۝ خٰلِدِينَ فِيهَآ اَبَدًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيمٌ ۝

یاد رکھو! جو لوگ خدا کے متعین کردہ نصب العین حیات پر یقین رکھتے ہیں اور نظام خداوندی کے قیام و بقا کے لئے اپنی جان و مال سے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں اور اس بلند مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ چھوڑنا پڑے اسے بلا تامل چھوڑ دیتے ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے مدارج، معیارِ خداوندی کے مطابق، بہت بلند ہیں اور یہی لوگ کامیاب و کامران اور فائز المرام ہیں۔

ان کا نشوونما دینے والا انہیں اس بات کی خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لئے سامانِ نشوونما اور عنایاتِ خداوندی کی فراوانی ہوگی۔ انہوں نے اپنی زندگی کو قوانینِ خداوندی سے یکسر ہم آہنگ کر رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک ایسی خوشگوار زندگی ہے جس میں سدا بہار نعمتیں ہوں گی۔

یہ لوگ زندگی کی ان شادابیوں سے ہمیشہ بہرہ یاب رہیں گے اور آپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کتنا بڑا اجر ملتا ہے۔

یہ ہے مومن کی زندگی اور دین کے تقاضے۔ جنت کی طرف لے جانے والے یہی راستے ہیں۔

سابقہ جلدوں میں یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین کو بڑی شدت سے روکا ہے کہ وہ غیر مسلموں کو اپنا دوست اور رازدان نہ بنائیں۔ (انڈکس میں "کفار کے ساتھ تعلقات" کا عنوان دیکھئے۔ نیز زیرِ نظر باب میں آیت (۹/۱۶) جو ابھی ابھی گزر چکی ہے)۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے آئندہ دو آیات میں پوری وضاحت اور سخت تاکید کے ساتھ دُہرا دیا۔ فرمایا:

(۹ / ۲۳-۲۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيمَانِ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الظّٰلِمُوْنَ ○ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ع

اے ایمان والو! (اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سے سمجھ لو کہ آئینِ خداوندی کی رُو سے، اپنوں اور بیگانوں کی تفریق نسلوں اور خاندانی رشتوں کی بنا پر نہیں ہوگی، بلکہ نظریۂ زندگی کے اشتراک کی رُو سے ہوگی۔ لہٰذا، اور تو اور، اگر) تمہارے باپ اور بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ پسند کریں، تو تم انہیں بھی اپنا دوست مت بناؤ۔ یاد رکھو! اس تنبیہہ کے بعد بھی جو انہیں دوست رکھے گا، تو وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ یہ قانونِ خداوندی سے سرکشی کے مرادف ہوگا۔

(اے رسولؐ!) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور دیگر اہلِ خاندان اور مال و دولت جو تم کماتے ہو اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور وہ مکانات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو، اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں خدا اور اس کے رسولؐ (نظامِ خداوندی) اور اس (کے قیام و بقا) کی راہ میں جدّوجہد سے زیادہ عزیز ہوگی، تو پھر (تم اپنی اس روش کے نتائج کا) انتظار کرو، تا آنکہ قانونِ خداوندی کی رُو سے اس کے ظہورِ نتائج کا وقت آ جائے۔ یاد رکھو! خدا کبھی اُس کو سعادت اور کامیابی کی راہ نہیں دکھاتا جو صحیح راستے کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل جائے۔

آپ نے دین کا تقاضا ملاحظہ فرما لیا! اس کے بعد آپ دیکھئے کہ جو لوگ مسلموں اور غیر مسلموں کو

غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات

ملاکر، ایک (متحدہ) قومیت متشکل کرنے کے دعویدار تھے (اور آج بھی اُسی سُر کو الاپتے چلے جاتے ہیں) بارگاہِ قرآنی سے انہیں کیا جواب ملتا ہے؟ عزیزوں، رشتہ داروں تک ہی نہیں، اگر اسلامی مملکت و نظام کے مقابلہ میں دُنیا کی کوئی متاع اور کشش بھی زیادہ عزیز ہوگئی تو قوم گمراہ ہوگئی اور اس کا شمار فاسقین کے زمرہ میں ہوگا۔ قرآن نے دین کو اَلْعَقَبَةُ (۹۰/۱۲) سے تعبیر کیا ہے، یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔ تو وہ اسی قسم کے صبر آزما مقامات کی بناء پر کہا ہے۔ اسلام میں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

عشق میں ایک تم ہمارے ہو — باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

عرب جاہلیت میں زندگی قبائلی تھی اور قبیلہ کی تشکیل نسبی رشتوں کی بناء پر ہوتی تھی۔ یہی رشتہ دار ایک دوسرے کی اعانت اور تقویت کا موجب ہوتے تھے۔ قرآن کریم نے تشکیلِ امت کا اصول ایمان کا اشتراک قرار دیا جس کی وجہ سے ان عزیزوں، رشتہ داروں سے نہ صرف قطعِ علائق کرنا پڑا بلکہ وہ مخالفین کی صف میں کھڑے ہوگئے۔ جو لوگ ہزارہا سال سے قبائلی (یعنی رشتہ داری) کی جتھہ بندی کی زندگی کے خوگر تھے، ان کے لئے یہ تبدیلی بڑی جرأت آزما تھی۔ اُن کے دل میں یہ خیال اُبھرتا ہوگا کہ اگر کل کو کوئی مصیبت آپڑی تو ہمارا معاون اور مددگار کون ہوگا! اُن کے اِس واہمہ کے ازالہ کے لئے انہیں یاد دلایا کہ جو لڑائیاں انہوں نے لڑی ہیں، ان میں نہ صرف یہ کہ انہیں اُن سابقہ "اپنوں" کی حمایت اور اعانت حاصل نہیں تھی، وہ لڑائیاں خود اُنہی "اپنوں" کے خلاف لڑی گئی تھیں۔ اُن سے کہا کہ تم سوچو کہ ان لڑائیوں میں تمہاری مدد کس نے کی تھی؟ ان لڑائیوں میں سے بھی مثال کسی ایسی جنگ کی نہیں دی جس میں مسلمانوں کا شروع سے آخر تک پلڑا بھاری رہا ہو۔ مثال اُس جنگ کی دی جس میں انہیں ایسی شکست ہوئی تھی کہ ان کے

جنگِ حنین کی یاد دہانی

لشکر کا پتا نشان تک نہیں ملتا تھا۔ اس قسم کی شکست کے بعد، انہیں اُسی میدان میں، اُس وقت نہایت قابلِ رشک کامیابی حاصل ہوگئی تھی۔ یہ جنگِ حنین تھی جس کی یاد قرآن نے دلائی ہے۔ یہ جنگ، فتح مکہ کے بعد شوال ۸ھ میں لڑی گئی تھی:

(۹ / ۲۵-۲۶) لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ

اِذۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ كَثۡرَتُكُمۡ فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡكُمۡ شَيۡـًٔا وَّضَاقَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا رَحُبَتۡ ثُمَّ وَلَّيۡتُمۡ مُّدۡبِرِيۡنَ ۞ ثُمَّ اَنۡزَلَ اللّٰهُ سَكِيۡنَتَهٗ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَعَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَاَنۡزَلَ جُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا وَعَذَّبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ ۞

(تم ان چیزوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہو اور اپنے ان رشتہ داروں سے اس لئے تعلقات وابستہ رکھنا چاہتے ہو کہ تمہیں یاد رہے کہ ان کے بغیر تم بے یار و مددگار رہ جاؤ گے۔ حالانکہ تم خود مشاہدہ کر چکے ہو کہ) اللہ نے بہت سے نازک مواقع پر کس طرح تمہاری مدد کی ہے۔ بالخصوص جنگِ حنین کے موقع پر، جب تم اپنی تعداد کی کثرت پر اترا گئے، لیکن دشمن کے مقابلے میں، تمہاری کثرت، تمہارے کسی کام نہ آسکی اور زمین، اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ اٹھے۔

پھر اللہ نے مومنین اور اپنے رسولؐ کے دل میں سکون پیدا کر دیا (۴۸/۴) اور (تمہارے قلوب کی دنیا میں) وہ لشکر اتارے جنہیں تم آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے (۸/۱۰؛ ۹/۴۰؛ ۳/۱۲۵؛ ۴۱/۳۰)۔ جب اس طرح تمہارے دلوں کو سکون حاصل ہو گیا تو میدانِ جنگ کا نقشہ بدل گیا اور فریقِ مخالف کو سخت سزا ملی — زندگی کی صحیح روش سے انکار کرنے والوں کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔

قرآنِ کریم میں جنگِ حنین کا ذکر اسی مقام پر آیا ہے۔ تاریخ سے اس کی جو تفاصیل سامنے آتی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

مکہ عربوں کا قومی مرکز تھا۔ اس کے فتح ہو جانے سے مختلف قبائلِ عرب کے حوصلے پست ہو گئے اور انہوں نے جوق در جوق آکر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا (يَدۡخُلُوۡنَ فِيۡ دِيۡنِ اللّٰهِ

اَفْوَاجًاۙ ﴿۱۱۰﴾) واضح رہے کہ مکہ فتح ہونے پر کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا(2:256) لیکن ہوازن اور ثقیف کے دو جنگجو قبیلے ایسے تھے جن کی آتشِ حسد و عداوت اور بھی بھڑک اٹھی اور انہوں نے بڑے شدو مد سے مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ نبی اکرمؐ کو معلوم ہوا تو آپؐ مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ مکہ اور طائف کے درمیان، حنین کی وادی میں، دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ بدر اور احزاب کے زمانہ میں مسلمان کمزور اور قلیل التعداد ہوتے تھے۔ اس لئے انہیں اپنی قوتِ بازو سے کہیں زیادہ بھروسا تائید و نصرتِ قوانینِ خداوندی پر ہوتا تھا۔ حنین کی جنگ میں قریب بارہ ہزار کی مسلح فوج، ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ، اس دبدبہ اور طنطنہ سے صف آرا ہوئی کہ بعض مجاہدین کی زبان پر بے اختیار آ گیا کہ آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے؟ دنیا میں مادی قوتیں نہایت ضروری ہیں، لیکن اگر مادی قوتیں، قوتِ قلب (جسے قوتِ ایمانی کہتے ہیں) کو کمزور کرنے کا باعث بن جائیں تو یہی مادی قوتیں اس قوم کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ قوتِ ایمانی کی کمزوری کے معنی یہ ہیں کہ انسان ان اصول و اقدار کے مقابلہ میں، جن کے تابع مادی قوت کو رکھا جاتا ہے، مادی قوت کو زیادہ اہمیت دے دے۔ یہ

شکست

بات کسی وقت یونہی سہواً بھی ہو جاتی ہے۔ یہی چیز اُس وقت ہوئی تھی۔ قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ پہلے ہی حملہ میں ایسی شکست کھائی کہ بارہ ہزار کے لشکر کا کچھ پتا ہی نہ تھا کہ کہاں تتر بتر ہو گیا۔ چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ دشمنوں کا ریلا، بھرے ہوئے سیلاب کی طرح موجیں مار رہا تھا۔ اپنی فوج شکست کھا کر بھاگ رہی تھی۔ اس خلفشار میں ایک پیکرِ استقامت تھا جو روشنی کے بلند مینار کی طرح اپنے مقام پر کھڑا تھا۔ نہ کوئی گھبراہٹ تھی اور نہ پریشانی، نہ مایوسی تھی اور نہ ہزیمت کے کوئی آثار۔ یہ پیکرِ ہمت و استقلال خود ذاتِ گرامی تھی جنابِ **محمد** رسول اللہؐ کی۔ اس تشتت و انتشار کے عالم میں آپؐ نے پوری جمعیتِ خاطر سے دائیں طرف مڑ کر آواز دی کہ یا معشر الانصار! نہ معلوم اس آواز میں کیا اثر تھا کہ بھاگنے والوں کے قدم وہیں رُک گئے اور پوری دل جمعی سے آواز دی کہ لبیک یا رسول اللہ لبیک! پھر حضورؐ نے بائیں جانب

یہی صدا بلند کی اور اس کا یہی جواب گونج کر واپس آیا۔ پھر آپؐ نے دشمنوں کو مخاطب کر کے آواز دی کہ " اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب " (بحوالہ بخاری) " میں خدا کا پیغمبر ہوں اس میں کچھ جھوٹ نہیں۔" اس لئے ہو نہیں سکتا کہ باطل ہم پر غالب آجائے۔ چند ثانیوں میں پوری فوج پھر اسی مرکزِ حق و صداقت کے گرد جمع تھی اور اس کے بعد ایک ہی حملہ میں میدان صاف تھا۔ (معراجِ انسانیت صفحات ۲۸۹-۲۸۸، پانچواں ایڈیشن (طلوع اسلام) ۱۹۹۴ء)

یہ تھی وہ نصرت و اعانت جو انہیں ایسی پریشانی اور درماندگی کے عالم میں ملی تھی۔ یہ مدد قبائل کی طرف سے نہیں حاصل تھی، قوانینِ خداوندی کے اتباع سے میسر آئی تھی۔ اس کے بعد ان سے کہا کہ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔ یہ قوانین ابدی ہیں اور جب بھی کوئی ان پر عمل پیرا ہوگا، ان کے نتائج سامنے آجائیں گے۔

(۹/۲۷) ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

اور خدا کا یہ قانون اس کے بعد بھی جاری و ساری ہے کہ جس جماعت سے کوئی غلطی ہو جائے اور اس کے بعد وہ اپنی اصلاح کر لے، تو خدا کی برکات پھر اس جماعت کی طرف لوٹ کر آجاتی ہیں (یعنی ایک بار کی لغزش سے قوم ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ نہیں ہو جاتی)۔ قانونِ خداوندی میں، لغزش کے مضر اثرات سے حفاظت اور مرحمت کی گنجائش بھی رکھ دی گئی ہے۔

حنین کی جنگ کے عواقب میں (تاریخ میں) دو ایک ایسے مراحل کا ذکر آتا ہے جو، جہاں فکری اعتبار سے بڑے بلند ہیں، وہاں سوز و گداز کی ایک دنیا بھی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں ـــــ سوز و گداز کا یہ عالم ہے کہ میں قریب پچاس سال سے مسلسل قرآن مجید کو وجۂ شادابیٔ قلب و نگاہ بناتے ہوئے ہوں لیکن میری کیفیت یہ ہے کہ میں جب بھی غزوۂ حنین کے ان مقامات پر پہنچتا ہوں، بلا ساختہ دل میں جذبات کا تلاطم برپا ہو جاتا ہے جو آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے۔ یہ بخیلی ہوگی اگر میں قارئین کو اس میٹھے درد کی لذت میں شریک نہ کروں۔

طائف کا محاصرہ

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج کفار طائف میں جاکر جمع ہوگئی۔ حضورؐ نے جاکر شہر کا محاصرہ کیا۔ بیس دن تک محاصرہ رہا اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ ان کا زور ٹوٹ چکا ہے تو آپؐ محاصرہ اٹھاکر واپس تشریف لے آئے۔

حنین میں بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ آیا تھا۔ اس کی تقسیم میں حضورؐ نے یہ رعایت ملحوظ رکھی تھی کہ قریشِ مکّہ میں سے جو لوگ فتح مکّہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے اُن کی تالیفِ قلوب کے لئے انہیں زیادہ حصّہ دیا جائے (واضح رہے کہ تالیفِ قلب سے مراد "رشوت" یا لالچ نہیں ہوتا۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے دین کی خاطر کسی قسم کا نقصان اٹھایا ہو، اُن کے اِس نقصان کی تلافی کرکے ان کی دلجوئی کا سامان کردیا جائے)۔ اس سے انصار کے بعض افراد کے دل میں غالباً یہ خیال اُبھرا کہ یہ لوگ چونکہ

مالِ غنیمت کی تقسیم

رسولؐ اللہ اور مہاجرین کے اہلِ قبیلہ اور اعزّہ و اقارب ہیں، اس لئے انہیں زیادہ مال دیا گیا ہے۔ نبیؐ کریم کو بحیثیتِ امیرِ ملّت، تقسیمِ غنیمت کے کلّی اختیارات حاصل تھے۔ آپؐ کے فیصلوں کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں ہوسکتی تھی۔ حضورؐ چاہتے تو ایک لفظ سے اس خیال کو اُبھرنے سے روک دیتے، لیکن یہ مستبدانہ آمریت تصوّر میں بھی نہیں لائی جاسکتی تھی۔ حضورؐ نے انہیں جمع کیا اور ایک ایسا خطبہ ارشاد فرمایا جو ایک طرف فنِ بلاغت میں اعجاز کا حکم رکھتا ہے اور دوسری طرف اُن قلبی تعلقات کو نکھار کر سامنے لا رہا ہے جو حضورؐ کو انصار کے ساتھ تھے۔ حضورؐ نے انصار کو مخاطب کرکے فرمایا:

"کیا یہ سچ نہیں کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے تم میں اتّفاق و ائتلاف پیدا کیا۔ تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے تمہیں دولت مند کردیا؟" آپؐ یہ فرماتے جاتے تھے اور انصارؓ ایک ایک فقرہ پر کہتے جاتے تھے کہ خدا اور رسولؐ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔

آپؐ نے فرمایا کہ نہیں تم ٹھیک جواب نہیں دے رہے۔ تم یہ جواب دو کہ:

محمدؐ! جب اور لوگوں نے تجھے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ جب لوگوں نے تجھے

چھوڑ دیا تو ہم نے تمہیں پناہ دی. تو مفلس آیا تھا ہم نے تیری ہر طرح کی مدد کی!

یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ تم یہ کہتے جاؤ اور میں ایک ایک فقرے پر کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ:

اے انصارؓ! یہ سب سچ ہے، لیکن کیا تم یہ پسند نہیں کرو گے کہ یہ لوگ اُونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے جاؤ!

اب کسے یارائے ضبط تھا. مجمع کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں اور انہوں نے پکار کر کہا کہ یا رسولؐ اللہ! انہیں سب کچھ دے دیجئے اور ہمارے لئے صرف "محمدؐ" کو رہنے دیجئے۔

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دُعا کے بعد

اکثر کا یہ حال تھا کہ روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس کے بعد حضورؐ نے انہیں سمجھایا کہ اس رعایت سے کیا مقصود[1] تھا۔ اور یوں اُن کے "دل" کے ساتھ "دماغ" کو بھی مطمئن کر دیا کہ حضورؐ کا فیصلہ کس طرح عدل و انصاف پر مبنی تھا۔ اسلام میں بات منوائی ہی دل اور دماغ کے پورے پورے اطمینان کے ساتھ جاتی ہے۔ اس میں نہ آمرانہ استبداد ہوتا ہے اور نہ ہی خالص جذباتی اپیل۔ اس میں "عشق اور زیرکی" دونوں کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔

حنین کے چھ ہزار قیدی ابھی تک محصور تھے۔ آپؐ نے انتظار کیا کہ ان کے اعزہ و اقارب آئیں تو فدیہ کی بات کی جائے۔ لیکن ان میں سے کوئی نہ آیا تو آپؐ نے' ایک سفارت کی درخواست پر سب کو احساناً چھوڑ دیا کہ یہی قرآن کا حکم ہے۔ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ إِمَّا فِدَاءً (۴۷/۴)　　(معراجِ انسانیت صفحات ۲۹۱-۲۹۰)

جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کے مدعی اس حکمِ خداوندی اور عملِ رسولؐ اللہ پر غور کریں۔



---

[1] بحوالہ بخاری و فتح الباری۔

غیر مسلم اعزہ و اقربا سے قطعِ علائق کی تاکید کے بعد پھر دین کی اس اصل کو دہرایا کہ ـــــ حق و باطل میں شراکت نہیں ہوسکتی، اس لئے مشرکین کو نظم و نسقِ مملکتِ اسلامیہ میں دخیل اور شریک مت کر۔

(۹/۲۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

اے جماعتِ مومنین! اس حقیقت کو بھی سمجھ رکھو کہ (کعبہ کی تولیت اس قوم کے ہاتھ میں رہ سکتی ہے جو خدائے واحد کے قوانین کی مطیع و محکوم ہو۔ مشرکین کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوسکتا) ان کی قلبی نجاست کی وجہ سے انہیں، اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے کہ یہ نظامِ خداوندی کے اس پاکیزہ مرکز کو ملوث کریں۔ اس لئے، یہ مشرکین، اس سال کے بعد مسجدِ حرام کے قریب تک نہ جائیں۔ اگر تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ ان کے یہاں نہ آنے سے تمہیں کاروبار میں نقصان ہوگا اور تم مفلس ہو جاؤ گے، تو اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق تمہیں اس قدر سامانِ رزق عطا کر دے گا کہ تم کسی کے محتاج اور دست نگر نہیں رہو گے۔ یاد رکھو! خدا جب کسی بات کا حکم دیتا ہے تو اسے اس کا خوب علم ہوتا ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ اس کے پروگرام میں، اس کے لئے بھی ضروری تدابیر موجود ہوتی ہیں۔

نجس کے معنی یہاں پر کہا گیا ہے کہ مشرک نجس ہیں، انہیں مسجد الحرام کے قریب نہ آنے دو۔ تو نجس کے معنی جسمانی کثافت یا آلودگی نہیں۔ امام راغب نے کہا ہے کہ نجاست دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو محسوس ہو اور دوسری وہ جسے چشمِ بصیرت سے دیکھا جا سکے، جیسے دل کی آلودگی، نگاہ کی ناپاکی (لغات القرآن، مادہ ن۔ ج۔ س)۔ یہاں مشرکین کی اسی نجاست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جیسے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے!

اللہ تعالیٰ نے قرآن کے متعلق کہا ہے کہ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (۵۶/۷۹) ــــ "مطہرین کے سوا اسے کوئی مَس نہیں کر سکتا"۔ تو اس کا مطلب یہی ہے کہ قرآن کے حقائق و معارف کا ادراک وہی لوگ کر سکتے ہیں جو غیر قرآنی معتقدات، تصوّرات، نظریات اور خیالات کو قلب و دماغ سے نکال کر، دل و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ اس کی طرف آئیں۔ اسی طہارت (پاکیزگی) کے مقابلہ میں مشرکین کی نجاست کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ویسے، مسجد الحرام یا قرآنِ کریم کے پاس آنے کے لئے قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ جسمانی پاکیزگی کی اہمیت بھی واضح اور ایک نفسیاتی تقاضا ہے (ہو سکتا ہے کہ مملکت کے سیاسی مصالح کے پیشِ نظر ان دشمنوں کو کچھ وقت کے لئے اسلام کے مرکز، مکہ میں آنے سے روک بھی دیا گیا ہو)۔

یہ جو کہا گیا کہ تمہیں یہ خطرہ لاحق ہے کہ مشرکین کو ادھر آنے سے روک دیا گیا تو اس سے تمہارے کاروبار پر مضر اثر پڑے گا تو اس خدشہ کی وجہ یہ تھی کہ مکہ تمام قبائلِ عرب اور دیگر غیر عرب بستیوں کا کاروباری مرکز بھی تھا۔ قرآنِ کریم نے ان سے کہا کہ اوّل تو اسلامی مملکت کے اس قدر عظیم مقاصد کے مقابلہ میں اگر تمہیں کچھ مالی نقصان بھی ہو جائے تو اس کا خیال نہیں کرنا چاہیئے (۹/۲۴)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں اس کا بھی یقین دلا دیا کہ تمہیں یہ نقصان بھی نہیں ہوگا۔ اسلام کا معاشی نظام ایسا ہمہ گیر ہے کہ وہ اس قسم کے بدیہی موانعات کے باوجود یوں ثمر بار ہوگا کہ تمہیں کسی کا محتاج نہیں ہونے دے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کے نزدیک معاشی تقاضوں کو بھی کس قدر اہمیت حاصل ہے!



پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی اوّلین مخاطب قوم دو گروہوں میں منقسم تھی۔ ایک مشرکینِ عرب جن سے مراد ایسے لوگ تھے جو نہ کسی خاص مذہب کے پابند تھے اور نہ ہی کسی آسمانی کتاب کی پیروی کے مدعی۔ دوسرے 'اہلِ کتاب' تھے جن سے مراد ایسے لوگ تھے جو اپنے آپ کو انبیاء سابقہ میں سے کسی نبیؑ کا متبع کہتے تھے۔ انہیں قرآن، اہلِ کتاب کہہ کر پکارتا ہے، جن میں سرِ فہرست یہودی اور عیسائی تھے (انڈکس میں "اہلِ کتاب" کے تحت تفصیلات ملیں گی)۔ قرآنِ کریم کا 'رسالتِ محمدیہؐ' پر ایمان لانے کا مطالبہ عالمگیر انسانیت سے تھا، جس کے معنی یہ تھے کہ وہ اہلِ کتاب سے بھی اسی طرح ایمان کا مطالبہ کرتا تھا جس طرح مشرکینِ عرب سے۔ ااس کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۸۳، جلد دوم

صفحہ ۱۸۲، جلد سوم، صفحہ ۷۳، نیز انڈکس)۔

مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے کی تفصیلات سابقہ آیات میں سامنے آ چکی ہیں۔ اگلی آیت میں اہلِ کتاب کے ساتھ جنگ کرنے کا ذکر ہے۔ فرمایا:

(۹/۲۹) قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ۝

مشرکین کے علاوہ اُن اہلِ کتاب سے بھی جنگ کرو، جن کا یہ حال ہے کہ وہ نہ تو خدا اور آخرت پر (اس طرح) ایمان رکھتے ہیں (جس طرح تم ایمان رکھتے ہو ۲/۱۳۷) اور نہ ہی اُن امور کو اپنے اوپر واجب ٹھہراتے ہیں جنہیں نظامِ خداوندی واجب قرار دیتا ہے اور نہ ہی اس حق و صداقت پر مبنی نظام کی اطاعت اختیار کرتے ہیں (یعنی اس مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس کے قوانین و احکام کا احترام اور اطاعت نہیں کرتے) تاآنکہ ان کی سرکشی کی قوت ٹوٹ جائے۔ وہ حکومت سے معاہدہ کریں جس کی رُو سے حکومت ان کی جان، مال، آبرو، معابد وغیرہ کی حفاظت کا ذمہ لے اور وہ اس حفاظت و آسائش کے عوض، حکومت کا ٹیکس ادا کریں (اس طرح، وہ اس مملکت میں امن و امان سے باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں)۔

جزیہ کا مفہوم

اس آیت میں جزیہ کا لفظ آیا ہے جو ان اعتراضات کے پیشِ نظر جو غیر مسلم (بالخصوص عیسائی) اس کے خلاف عائد کرتے چلے آ رہے ہیں، تفصیلی وضاحت کا متقاضی ہے۔

اسے ہم اپنی کتاب، شاہکارِ رسالت، سے پیش کرتے ہیں:

جزیہ کا لفظ قرآنِ کریم میں صرف ایک جگہ آیا ہے۔ اس کے لغوی معانی اور جس مقام پر قرآنِ کریم میں یہ لفظ آیا ہے، اس سے اس کا پورا پورا مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔ ذمّی یا اہل الذمّہ کے الفاظ قرآنِ کریم میں

جزیہ اور ذمّی

نہیں آئے. یہ جزیہ کا لازمی یا فطری نتیجہ تھے. یا یوں کہیئے کہ جزیہ اور ذمّہ لازم و ملزوم تھے. اب ان اصطلاحات کا مفہوم سامنے لایئے.

قرآنِ کریم میں جن مقاصد کے لئے مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے یا جن حالات میں ان پر جنگ کرنا فرض ہوجاتا ہے، ان کی تفصیل سابقہ باب (جہاد) میں دی جاچکی ہے. اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے. مختصراً یہ کہ اسلام میں جنگ کی اجازت (یا حکم) حسبِ ذیل حالات میں ہے؛

۱. اپنی مملکت کی حفاظت کے لئے.
۲. مظلومین کی امداد کے لئے، خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں بھی ہوں.
۳. اگر کسی جگہ لاقانونیت پھیل جائے اور کوئی قدرِ انسانیت محفوظ نہ رہے، تو اس کی روک تھام کیلئے.
۴. غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کے تحفّظ کے لئے.

جب اسلامی مملکت ان مقاصد میں سے کسی مقصد کے لئے جنگ کرنے کا فیصلہ کرتی تھی تو یہ نہیں کہ اس علاقہ پر یکایک حملہ کر دیا جاتا تھا. وہ وہاں کی حکومت اور باشندوں پر واضح کرتی تھی کہ ان کے خلاف اس اقدام کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے. اس کے بعد ان کے سامنے تین شرطیں رکھ دی جاتی تھیں.

۱. اگر تم برضا و رغبت، دل و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد، اسلام کو سچّا دین سمجھو تو اسے اختیار کرلو. اس صورت میں، تم ہم میں سے ہوجاؤ گے.
۲. اگر ایسا نہیں چاہتے تو تم صرف ہمارے اقتدار کی برتری کو تسلیم کرلو. تمہاری مملکت بھی تمہارے پاس رہے گی اور ہم تمہاری جان و مال، عزّت، آبرو، مذہب، معابد، غرضیکہ ہر قابلِ حفاظت شے کی حفاظت کا ذمّہ لیں گے. اور
۳. اگر تمہیں یہ بھی منظور نہیں تو پھر فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا.

یہ صورت تھی جنگ سے پہلے کی. اگر معاملہ جنگ تک پہنچ جاتا اور اس علاقہ کو فتح کرلیا جاتا تو اس مفتوح قوم کے سامنے، پہلی دو شکلیں پھر سے رکھ دی جاتیں، یعنی اگر بطیبِ خاطر اسلام لانا چاہو تو ہم میں سے ہوجاؤ اور اگر ایسا نہ چاہو تو پھر ہمارے اقتدار کی برتری تسلیم کرکے، ہماری ذمّہ داری قبول کرلو. جو قوم اس پر رضامند ہوجاتی، اس سے معاہدہ کرلیا جاتا ——— یعنی مفتوح قوم کے ساتھ معاہدہ ——— اگر وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوتے تو پھر ان کے ملک کو اپنے زیرِ اقتدار لے آیا جاتا. جو قوم اس دوسری شرط کو قبول کرلیتی،

یعنی اسلامی مملکت کے زیرِ حفاظت آجانے کی شرط کو، تو اس سے تھوڑا سا ٹیکس وصول کر لیا جاتا۔ اسے جِزیہ کہا جاتا ہے۔ جِزیہ کے لغوی معنی ہیں کسی خدمت کا صلہ یا معاوضہ۔ ایسا معاوضہ جو اس خدمت کے لئے کافی سمجھا جائے اور اس سے زیادہ کچھ اور طلب نہ کیا جائے۔ اگرچہ بظاہر یہ ٹیکس، اُس حفاظت کے بدلے میں لیا جاتا تھا جس کی ذمہ داری اسلامی مملکت پر عائد ہو جاتی تھی۔ لیکن درحقیقت یہ علامت Token ہوتی تھی اس امر کی کہ اس قوم نے اسلامی حکومت کے اقتدار کی برتری کو تسلیم کر لیا ہے اور عہد کیا ہے کہ وہ اس کے خلاف بغاوت نہیں کرے گی۔ (لغت میں، لفظ جِزیہ معاہدہ کے معنوں میں بھی آتا ہے) چنانچہ قرآنِ کریم میں جس مقام پر یہ لفظ آیا ہے، وہاں سے اس مفہوم کی وضاحت سامنے آجاتی ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کرو۔ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۹/۲۹) تا آنکہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر، تمہارے اقتدار کی برتری کو تسلیم کر لیں (وَهُمْ صٰغِرُوْنَ) اور اس کی علامت کے طور پر جزیہ دینا قبول کر لیں۔

جِزیہ کی رقم

جزیہ کی رقم کتنی ہوتی تھی، اس کے متعلق تاریخ میں مختلف بیانات ملتے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کی مقدار ہر قوم کے حالات کے مطابق ہوتی تھی۔ لیکن تاریخ میں جو زیادہ سے زیادہ شرح ملتی ہے اسے امام ابویوسفؒ نے کتاب الخراج میں اس طرح درج کیا ہے کہ مالداروں سے اڑتالیس درہم سالانہ، متوسط الحال لوگوں سے چوبیس درہم اور کم آمدنی والوں سے بارہ درہم۔ واضح رہے کہ درہم تقریباً ایک چونی کے برابر ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے جزیہ کی رقم زیادہ سے زیادہ بارہ روپے فی کس سالانہ اور کم از کم تین روپے سالانہ ہوتی تھی۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، اپاہج، محتاج اس سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ یہ قلیل سی رقم انہیں ادا کرنی پڑتی تھی اور اس کے عوض انہیں، ان کی جان، مال، عزت، آبرو، مذہب، معابد، حتیٰ کہ ان کی مملکت کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی تھی۔ آپ سوچئے کہ کیا دنیا میں اس سے زیادہ سستا سودا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے! آپ صرف اپنے گھر کی رکھوالی کے لئے چوکیدار ملازم رکھیں، تو ایک روپیہ ماہوار (بارہ روپے سالانہ) پر وہ کبھی نہیں ملے گا! اور پھر یہ معاملہ کیا جاتا تھا مفتوحہ قوم کے ساتھ۔ یہ ضمانت، زبانی کلامی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لئے ان کے ساتھ باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوتا تھا۔ ان معاہدات کی تفصیل تو "فتوحات" کے سلسلہ میں سامنے آئے گی لیکن

ذمیوں کے ساتھ معاہدات

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ اتنی سی رقم کے عوض مفتوحہ اقوام کو کس کس قسم کے تحفظات کی ضمانت دی

جاتی تھی۔ اس مقام پر دو ایک معاہدات کا (مثال کے طور پر) درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ نجران (یمن) کے عیسائیوں کے ساتھ خود حضور رسالتمآبؐ نے جو معاہدہ کیا تھا اُس کے الفاظ یہ تھے۔

> نجران اور اس کے گردو پیش کے باشندے، اللہ کے جوار (ہمسائیگی) اور محمدؐ رسول اللہ کی ذمہ داری میں ہیں۔ ان کے اموال، جانیں، اراضیات، مذہب، ان کے غائب اور حاضر خاندان، ان کی عبادت گاہیں غرضیکہ ان کی ہر چیز جو ان کے قبضہ میں ہے، تھوڑی ہو یا بہت، سب محفوظ رہیں گی۔ کسی پادری کو اس کے منصب سے، کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے، کسی کاہن کو اس کی کہانت سے ہٹایا نہیں جائے گا۔ نہ کوئی شخص ان کے کسی فرد کو نقصان پہنچائے گا، نہ ہی ان پر کسی قسم کی سختی کی جائے گی، نہ ہی کوئی اور ان پر حملہ آور ہو سکے گا۔ ان میں کا جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا، اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ اس طرح کہ ان میں نہ کوئی ظالم ہو گا نہ مظلوم۔ کسی کے جرم کی وجہ سے کسی اور کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

رسول اللہؐ کے بعد، حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اس معاہدہ کی باقاعدہ تجدید کی اور ایسا ہی حضرت عمرؓ نے بھی کیا۔ لیکن ان کے دورِ خلافت میں، اہلِ نجران نے سازشیں اور بغاوتیں شروع کر دیں تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ وہ شام اور عراق کی طرف منتقل ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں انہیں یہ فرمان لکھ کر دیا کہ:

> ان میں سے جو شخص جانا چاہے، وہ ہر طرح سے محفوظ رہے گا اور کوئی مسلمان انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائے گا۔ رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ کے معاہدات کی سختی کے ساتھ پابندی کی جائے گی۔

انہیں اس امر کی ضمانت دی اور عراق اور شام کے گورنروں کو لکھ کر بھیجا کہ:

۱۔ جس علاقے میں یہ اہلِ نجران آباد ہوں، انہیں فراخدلی کے ساتھ زمینیں دی جائیں۔
۲۔ مسلمان ان کے جان و مال کی پوری پوری حفاظت کریں۔
۳۔ کوئی دوسرا بھی ان پر ظلم نہ کرنے پائے۔ اگر اس کی نوبت آجائے تو مسلمان خود اس کی مدافعت کریں۔
۴۔ انہیں دو سال تک سرکاری محاصلات کی معافی دی جائے۔

اسی طرح جب، خیبر کے یہودیوں کو ان کی سازشوں کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا پڑا، تو ان کی تمام غیر منقولہ

جائداد (باغات اور زمینوں) کا حساب لگا کر رقم ان کے حوالے کر دی۔

۲۔ دوسرا عہدنامہ جسے ہم مثال کے طور پر درج کرنا چاہتے ہیں، وہ ہے جسے حضرت عمرؓ نے باشندگانِ ایلیاء (بیت المقدس) کو لکھ کر دیا تھا۔ وَھُوَ ھٰذَا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ یہ وہ امان نامہ ہے جو عبداللہ[1] (اللہ کے بندے) عمرؓ امیرالمؤمنین نے اہلِ ایلیاء کو لکھ کر دیا ہے۔

> یہ امان، ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہلِ مذاہب کے لئے ہے۔ اس طرح پر کہ نہ ان کے گرجاؤں کو ڈھایا جائے گا، نہ انہیں مسکن بنایا جائے گا۔ حتیٰ کہ ان کے احاطے کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ نہ ان کی صلیبوں یا ان کی جائدادوں میں کوئی کمی کی جائے گی۔ مذہب کے معاملہ میں ان پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جائیگا۔ نہ ہی ان میں سے کسی کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی جائے گی۔ ایلیاء میں ان کے ساتھ یہودی نہیں رہنے پائیں گے۔ اہلِ ایلیاء پر فرض ہوگا کہ وہ دیگر شہروں کی طرح جزیہ ادا کریں اور یونانیوں اور چوروں کو اپنے ہاں سے نکال دیں۔ ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا، اس کی جان اور مال محفوظ رہیں گے تا آنکہ وہ اپنی پناہ گاہ میں پہنچ جائے۔ جو ایلیاء ہی میں رہنا چاہے، اسے بھی امن ہوگا بشرطیکہ وہ بھی اہلِ ایلیاء کی طرح جزیہ ادا کرے۔ ایلیاء والوں میں سے جو لوگ یونانیوں کے ساتھ چلے جانا چاہیں، ان کے جان و مال اور صلیبوں کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے تا آنکہ وہ اپنی پناہ گاہ تک پہنچ جائیں۔ اگر یہ لوگ اپنی فصلوں کے کاٹنے تک یہاں رہنا چاہیں تو بھی انہیں ہر طرح کا امن ہوگا۔

جو کچھ اس امان نامہ میں تحریر ہے اس پر خدا و رسول کا، خلفاء کا اور تمام مسلمانوں کا ذمہ ہے۔

---

[1] اپنے آپ کو عبداللہ (اللہ کا بندہ، محکوم) کہنا ازرہِ انکسار نہیں۔ یہ عظیم انقلابی اعلان ہے۔ مومن دنیا میں کسی (بڑی سے بڑی) طاقت کا بھی محکوم (عبد) نہیں ہوتا۔ وہ صرف قوانینِ خداوندی کا محکوم ہوتا ہے۔ اسی لئے (قرآنی شہادت کے مطابق) ہر رسول سب سے پہلے اسی عبدیّت (صرف خدا کی محکومیّت) کا اعلان کرکے، دنیا کی ہر طاقت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتا ہے۔ یہی اعتراف و اعلان اُن رسولوں کے متبعین کرتے تھے — خدا کے عبد اور ساری کائنات کے حاکم۔

اس ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم تھا کہ آپؓ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ایک مکتوب میں لکھا:۔

اپنے لشکر کو ذمیوں کی بستیوں سے دور ٹھہراؤ اور وہاں صرف وہی لوگ جائیں جن کی دیانت پر تمہیں پورا پورا اعتماد ہو۔ وہاں کے کسی باشندے کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے کیونکہ ان کی عزت اور حرمت کا تم نے ذمہ لے رکھا ہے اور تم پر اس کی پابندی لازم ہے۔ اہلِ ذمہ پر کسی قسم کا ظلم کر کے، دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔

اُس دورِ ہمایوں میں پابندیٔ عہد کی ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جنہیں دیکھ کر آج کا انسان محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔

معاہدات کی پابندی کی احتیاط کی انتہا

حضرت عبادہؓ بن صامت، ایک دفعہ دمشق کے ایک گاؤں کے قریب سے گزرے۔ رفیقِ سفر سے کہا کہ گاؤں کے کسی درخت سے مسواک کاٹ لائیے۔ وہ اُٹھا ہی تھا کہ آپ نے اُسے یہ کہہ کر روک دیا کہ ان کے ساتھ جو معاہدہ ہوا ہے، اس میں اس قسم کی کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ہمیں یہاں سے مسواک نہیں لینی چاہیئے۔ اسی طرح، حضرت ابو درداؓ کا جب کسی اہل ذمہ کے گاؤں پر سے گزر ہوتا اور آپ وہاں پانی پینے یا جانور کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتے تو روانگی کے وقت، ایک ایک پائی کا حساب کر کے قیمت ادا کر دیتے اور اس میں یہ کہہ کر کچھ زاید بھی شامل کر دیتے کہ ہم ان کے درختوں کے سایہ تلے بھی تو بیٹھے تھے۔ اس آسائش کا بھی معاوضہ دینا چاہیئے۔

اسے نہ بھولئے کہ یہ ان کے مفتوحہ علاقے تھے اور وہاں کے باشندے ان کے محکوم!

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اہل الذمہ اپنے مذہب کے معاملات میں آزاد ہوتے تھے۔ "مذہب" میں ان کے

اہل الذمہ کے شخصی قوانین

عقائد، پرستش اور دیگر مذہبی رسوم ہی شامل نہیں تھے۔ اس میں ان کے شخصی قوانین Personal Laws بھی شامل تھے اور ان معاملات میں وہ اپنے مقدمات کے فیصلے بھی آپ ہی کر لینے کے مجاز تھے۔ انہیں اپنے رسوم و رواج کی کس حد تک آزادی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے ہیں تو اذرعات کے عیسائی باجے بجاتے اور پھول برساتے آپ کے استقبال کے لئے نکلے۔ آپ نے انہیں روکنا چاہا تو حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ سے کہا کہ انہیں ان کے حال پر رہنے دیجئے۔ روکئے نہیں۔ انہیں ان کے رسوم و رواج کی آزادی ہے۔ (اس سے واضح ہے کہ اگر کسی معاہد قوم کے رسوم و رواج ہمارے دین

سے نہیں ٹکراتے' تو انہیں اس کی بھی آزادی ہوگی کہ وہ اس کا مظاہرہ خود مسلمانوں کے سامنے بھی کر سکیں۔ عیسائی اہل الذمّہ کو اس کی بھی اجازت ہوتی تھی کہ وہ اپنی عید کے دن صلیب کا جلوس نکال لیں اور دن

اُن کی زبان

رات میں جب جی چاہے ناقوس بجائیں' البتہ نماز کے اوقات اس سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔[1] حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کی دفاتری زبان بھی نہیں بدلی تھی۔ اسلام سے پہلے عراق کا دفتر فارسی زبان میں' شام کا رومی زبان میں اور مصر کا قبطی زبان میں تھا۔ ان ممالک کے فتح ہونے کے بعد' دفاتری کاروبار انہی زبانوں میں باقی رکھا گیا۔

بہرحال' یہ ہے جزیہ کی حقیقت اور ذمّیوں کے ساتھ صدرِ اوّل کی اسلامی حکومتوں کا سلوک' اُس جزیہ کی حقیقت اور اُن ذمّیوں کے ساتھ سلوک جن کے متعلق غیر مسلم مصنّفین (بالخصوص عیسائیوں) نے اس قسم کا پروپیگنڈا کر رکھا ہے کہ ان کے الفاظ کے سنتے ہی' ایک ناواقف کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور وہ مسلمانوں کو دنیا کی وحشی ترین قوم خیال کرنے لگتا ہے۔ یہ کیفیت تھی صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی جن کی حکومت اقدارِ خداوندی کے خطوط پر متشکّل تھی اور جن کی سیرت حضور نبیِ اکرمؐ کے اُسوۂ حسنہ کے قالب میں ڈھلی ہوئی۔

ان کے بعد' سلاطین نے کیا کیا' اس کا ذمّہ دار نہ اسلام ہے' نہ صدرِ اوّل کے مسلمان۔ اس کے

مُسلمان بادشاہوں کی روش

ذمّہ دار وہ خود ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کے جرائم کی سزا (بیچارے) اسلام کو بھگتنی پڑتی ہے۔ (میری اس کوشش کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ صدرِ اوّل کی تاریخ (یعنی قرآنی معیار کے مطابق صحیح تاریخ) دنیا کے سامنے پیش کی جائے تاکہ اسلام کے دامن سے وہ دھبے دُھل سکیں جو ہماری نادانستہ عاقبت نااندیشیوں یا دانستہ مفاد پرستیوں نے اس پر ڈال رکھے ہیں۔ وَمَا تَوْفِيقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔



یہ تو رہے آئینی اور قانونی تحفّظات جو ان غیر مسلم ذمّیوں کو حاصل تھے۔ بہ حیثیت انسان اُن کے احترام کی کیا کیفیت تھی' اس کا اندازہ ایک ایسے واقعہ سے لگائیے جو قامت میں کہتر ہے لیکن قیمت میں

---

[1] فقہ کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان ان کے خنزیر یا خمر کو ضائع کر دے تو اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ (درالمختار)

دُرِ یتیم کی طرح بے بہا۔ ایک دفعہ حمص کے حاکم حضرت عمیر بن سعدؓ کے مُنہ سے ایک ذمی کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے:

" اَخزَاکَ اللّٰہ ۔۔۔ خدا تجھے رسوا کرے ۔۔۔ اس پر انہیں اس قدر ندامت اور تاسّف ہوا کہ سیدھے بارگاہِ خلافت میں حاضر ہو کر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور کہا کہ میں نے محسوس کیا ہے کہ میں اس منصب کا اہل ہی نہیں۔ بہتیرا سمجھایا لیکن وہ استعفیٰ واپس لینے پر آمادہ نہ ہوتے۔

(شاہکار رسالت صفحہ ۳۲۵)

اہلِ کتاب سے ایمان کا مطالبہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب یہ لوگ پہلے ہی خدا پر ایمان رکھتے تھے، تو ان سے پھر خدا پر ایمان لانے کے مطالبہ کے کیا معنی تھے ؛ وہ خدا پر کس قسم کا ایمان رکھتے تھے، اس کی تشریح اگلی آیت میں کر دی جہاں کہا کہ :

(۹/۳۰) وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ ○

(یہ اہلِ کتاب وہ ہیں، کہ ان کے پاس خدا کی طرف سے وحی آجانے کے بعد بھی ان کی حالت یہ رہی کہ ان میں سے) یہودیوں نے 'مصری دیوتا عزیر OSIRIS کو خدا کا بیٹا تسلیم کر لیا اور اس کی پرستش شروع کر دی اور عیسائیوں نے مسیح کو خدا کا بیٹا بنا لیا۔ کیا اسے' خدا پر ایمان " کہا جائے گا؟ اگر یہ خدا پر ایمان ہے' تو پھر کفر و شرک کسے کہا جائے گا؟ یہ بلا سوچے سمجھے اس قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں جن کی ان کے پاس، اس کے سوا کوئی سند اور دلیل نہیں کہ وہ لوگ جو اُن سے پہلے ہو گزرے ہیں، اس قسم کے عقائد رکھتے تھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا ۔۔۔۔ خدا انہیں غارت کرے۔ یہ صحیح راستے کو چھوڑ کر کس طرف بہکے بہکے چلے جاتے ہیں؟

عزیر کے متعلق مطالب الفرقان جلد دوم، صفحہ ۲۵۴ پر تشریح کی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جو اور "خدا" بنا رکھے تھے ان کے متعلق کہا:

(۹/۳۱) اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

(اتنا ہی نہیں، بلکہ) یہ لوگ اپنے علماء و مشائخ کو، خدا سے ورے ہی، اپنا خدا بنا لیتے ہیں (اور ان کی خود ساختہ شریعت کو دینِ خداوندی سمجھنے لگ جاتے ہیں) اور مسیح ابنِ مریم کو بھی خدا تسلیم کر رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ صرف خدائے واحد کی اطاعت اختیار کریں۔ اس کے سوا کائنات میں کسی اور کا اقتدار و اختیار نہیں۔ وہ اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریکِ حکم کر لیا جائے (۱۸/۲۶؛ ۱۸/۱۱۰)۔

احبار و رہبان کو خدا کس طرح بنایا جاتا ہے، اس کی وضاحت ایک حدیث میں اس طرح کی گئی ہے:

حضرت عدی بن حاتمؓ سے مروی ہے کہ جب میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عیسائی تھا اور میرے گلے میں صلیب پڑی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے دیکھ کر فرمایا — عدی! اس بُت کو گلے سے اتار پھینک۔ اُس وقت آپؐ سورۃ توبہ کی (مندرجہ بالا) آیت تلاوت فرما رہے تھے۔ میں نے عرض کیا — یا رسول اللہ! ہم نے ان لوگوں کو کبھی رب نہیں بنایا۔ فرمایا، کیا یہ واقعہ نہیں کہ خدا نے جو چیز حرام کی ہے، اسے یہ لوگ تمہارے لئے حلال قرار دیتے ہیں اور تم اسے حلال سمجھنے لگ جاتے ہو اور خدا نے جو چیز حلال قرار دی ہے، اسے یہ لوگ حرام کہہ دیتے ہیں اور تم اسے حرام سمجھنے لگ جاتے ہو؟ میں نے کہا کہ بے شک واقعہ یہی ہے، تو فرمایا کہ یہی تو انہیں خدا بنا لینا ہے۔　　(جامع بیان العلم۔ ابنِ عبد)

خود ہم نے اپنے احبار و رہبان (فقہاء، علماء، مشائخ) کو کس طرح خدا بنا رکھا ہے، اس کے متعلق گزشتہ

جلدوں میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے (دیکھئے جلد چہارم صفحہ ۵۵۲ - ۵۵۱) ہمارے ہاں حلال و حرام کا تعین فقہ کی مرتب کردہ فہرستوں کی رُو سے ہوتا ہے، نہ کہ خدا کی کتاب کی رُو سے۔ فقۂ حنفی کی مشہور اور بنیادی کتاب **ھدآیۃ** کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ھدایۃ کالقرآن ___ ہدایہ قرآن کی مثل ہے"۔ ان تفصیلات کے لئے انڈکس میں عنوانات ___ احبار و رہبان، مذہبی پیشوائیت، فقہ اور فقہا، حرام اور حلال وغیرہ دیکھئے اور ان کا گہرے غور و فکر سے مطالعہ کیجئے تاکہ ہم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے کہ ہم بھی وہی کچھ کر رہے ہیں جو کچھ وہ قومیں کر رہی تھیں جن کے مسلک اور معتقدات کی قرآنِ کریم اس شدت سے مخالفت اور تردید کرتا ہے۔ ہم قرآن میں یہ کچھ پڑھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ یہ تنبیہات اور تنذیرات اقوامِ سابقہ یا دیگر مذاہب کے متبعین کے متعلق ہیں۔ ہم سے ان کا تعلق نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس خود فریبی سے ہم خدا کے عذاب سے تو نہیں بچ سکتے جو اس قسم کے شرک کا لازمی نتیجہ ہے (اور ہم صدیوں سے اس عذاب میں مبتلا چلے آرہے ہیں)۔

جہاں تک حضرت عیسیٰؑ کو خدا بنا لینے کا تعلق ہے، انڈکس میں عنوانات "عیسیٰؑ اور مسیح" دیکھئے ___ اس باب میں بھی ہم نے حضور نبی اکرمؐ کے متعلق جو عقائد وضع کر رکھے ہیں، اس کے لئے انڈکس میں عنوان "غلوٗ" دیکھئے۔ اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اقوامِ سابقہ یا دیگر مذاہب کے متبعین کو جن جن امور سے منع کیا تھا، ہم وہ سب کچھ کرتے ہیں، لیکن اُنہیں باطل پرست اور اپنے آپ کو حق کے پیرو سمجھتے ہیں! لیکن اس خود فریبی سے حقیقت تو نہیں بدل سکتی۔



جیسا کہ سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آچکا ہے، نبی اکرمؐ کی دعوت کی مخالفت مشرکین عرب کی طرف سے بھی ہوئی تھی اور اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کی طرف سے بھی۔ یہ مخالفت کس بات کی تھی؟ یہ لوگ انسانوں کے وضع کردہ قوانین و ضوابط یا رسوم و مناسک کا اتباع کرتے تھے اور قرآن کی دعوت یہ تھی کہ اتباع و اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو سکتی ہے، غیر اللہ کی نہیں خواہ اسے انبیاءؑ کی طرف (غلط) منسوب کر دیا جائے اور خواہ وہ علماء و مشائخ کے وضع کردہ ہوں ___ یعنی خدا کی اطاعت بالمقابل انسانوں کی اطاعت ___ قرآن نے ان کی مخالفت کے متعلق کہا:

(۹/۳۲) يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ خدا کے اس نور (قرآن) کو جو انہیں اس قسم کی تاریکیوں سے نکالنے کے لئے آیا ہے (۵ ، ۱۴/۱) پھونکیں مار مار کر بجھا دیں (۶۱/۸) لیکن ان کی ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا (یعنی اس نظام کو تمام نظامہائے عالم پر غالب کرے گا) خواہ یہ بات ان مخالف لوگوں کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔

شمعِ قرآنی کو بجھانے کی مذموم کوششیں

نور اللہ سے مراد خدا کی راہنمائی ہے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر وحیٔ خداوندی کو نور سے تشبیہ دی ہے اور جہاں یہ نور (روشنی) نہیں اسے ظلمات (تاریکیاں) کہہ کر پکارا ہے۔ دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۲۶۲ (نیز ۱۴/۱؛ ۵۷/۹)۔ سورۃ النور (اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) میں فضائے کائنات میں پھیلی ہوئی آسمانی راہ نمائی کو اللہ کا نور کہا گیا ہے جسے محسوس شکل میں قرآن کے الفاظ میں محفوظ کر دیا گیا ہے (۲۴/۳۵) (تشریح اس آیت کی اپنے مقام پر آئے گی)۔ سورۃ المائدہ میں اہلِ کتاب سے کہا گیا ہے: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۵/۱۵)— "تمہاری طرف منجانب اللہ ایک نور آ گیا یعنی یہ کتابِ مبین"۔ سورۃ الاعراف میں جماعتِ مومنین کے متعلق کہا گیا ہے؛ وَاتَّبَعُوا

نور

النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ (۷/۱۵۷) — "وہ اس نور کا اتباع کرتے ہیں جسے رسول اللہ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (۴/۱۷۵) — "اے نوعِ انسان! تمہارے ربّ کی جانب سے تمہاری طرف واضح دلائل و براہین آ گئے، یعنی اس نے تمہاری طرف درخشندہ روشنی نازل کر دی"۔ سورۃ الزمر میں اسلام کو نور کہا گیا ہے (۳۹/۲۲)۔

جیسا کہ مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۰۴ پر بتایا جا چکا ہے، قرآن کو نور اور نورِ مبین کہنے میں ایک لطیف اور بلیغ یہ نکتہ بھی مضمر ہے کہ یہ خود بھی روشن ہے اور انسانی زندگی کی تاریک راہوں کو بھی روشن کرتا ہے۔ روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے تعارف اور نمود کے لئے کسی دوسری روشنی کی محتاج نہیں

ہوتی۔ روشن چراغ کو کسی دوسرے دیئے سے تلاش نہیں کیا جاتا۔ اس کی اپنی روشنی دیکھنے والے کو خود بخود اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ قرآنِ کریم خود قرآن سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اسے اپنے آپ کو سمجھانے کے لئے خارجی سہاروں کی ضرورت نہیں۔ البتہ جس طرح چراغ کی روشنی سے وہی مستفید ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے' اسی طرح قرآنی تعلیم سے وہی فیض یاب ہو سکتا ہے جو علم اور عقل سے کام لے۔ قرآن کی روشنی اور عقل کی آنکھ' آسمانی راہنمائی سے مستفید ہونے کے لئے کافی ہے۔

پھر روشنی کا خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر شے کے متعلق واضح کر دیتی ہے کہ اس کی اصل و حقیقت کیا ہے۔ تاریکی میں آپ رسّی کو سانپ سمجھنے لگتے ہیں۔ روشنی آ جانے کے بعد نظر آ جاتا ہے کہ وہ رسّی ہے' سانپ نہیں۔ کافروں پر یہ روشنی اس لئے گراں گزرتی ہے کہ جن ہستیوں کو انہوں نے خدا بنا رکھا ہے' یہ روشنی ان کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتی ہے۔

آیت زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ یہ لوگ اس چراغ کو پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں لیکن ان کی یہ سعی لاحاصل کارگر نہیں ہو سکے گی۔ سورۃ النور کی جس آیت (۲۴/۳۵) کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے' اس میں نورِ قرآن کو ایک مثال کی رُو سے یوں سمجھایا گیا ہے کہ (گویا) ایک جگمگاتا چراغ ہے جو ایسے طاق میں رکھا گیا ہے جو تین اطراف سے بند ہے کہ ہر طرح محفوظ رہے اور سامنے سے کھلا ہے کہ اس کی روشنی فضا میں پھیل سکے۔ اس چراغ کو شیشے کے فانوس میں رکھ دیا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں کوئی چیز حائل نہ ہو اور ہر طرف کی مخالف ہواؤں سے محفوظ بھی رہے۔ دورِ حاضر کی ایجاد کی رُو سے یوں سمجھئے کہ یہ ایک بجلی کا قُمقمہ (بلب) ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بلب کی روشنی کو پھونکوں سے بجھایا نہیں جا سکتا۔ قرآن کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں مخالفت کی کس قدر آندھیاں اٹھیں' کس قدر جھکّڑ چلے' لیکن قرآن کے کسی ایک حرف کو مٹانا تو ایک طرف' اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ سکے۔

لیکن اس سے صرف قرآن کی محفوظیت ثابت ہوئی۔ اسے محفوظ رکھنے کا مقصد اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے جہاں فرمایا:

(۹/۳۳) هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ

كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ○

اللہ نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ حیات یعنی دینِ حق دے کر بھیجا ہی اس لئے ہے کہ یہ نظام تمام نظامہائے عالم پر غالب آئے، خواہ یہ بات اُن لوگوں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے جو خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریکِ حکومت کرنا چاہتے ہیں (۴۸/۲۸)۔

(آیات (۹/۳۲-۳۳) کو (۹-۶۱/۸) میں بھی دہرایا گیا ہے اور (۹/۳۳) کو (۴۸/۲۸) میں)۔

قرآنی نظام غالب آکر رہے گا

یہ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے بڑی اہم ہے اور اس کے غیر قرآنی مفہوم سے جو غلط فہمیاں بلکہ گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ اس کے متعلق تفصیلی گفتگو کی جائے۔ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ بعثتِ نبیِ اکرمؐ اور نزولِ قرآن سے مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے جو نظامِ زندگی (الدین) متعین کیا ہے، وہ انسانوں کے خود ساختہ تمام نظامہائے حیات پر غالب آجائے، یعنی انسان اسی نظام کے تابع زندگی بسر کرے اور اس طرح ہر قسم کی غلامی سے نجات حاصل کرے۔

سب سے پہلے یہ کہ (جیسا کہ سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے) اسلام، دین ہے، مذہب نہیں۔ یہ جو ہم آئے دن اہلِ مذاہب کے ساتھ مناظروں اور مباحثوں سے ان کے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی افضلیت ثابت کرتے ہیں، یہ اصولی طور پر بے معنی ہے۔ جب اسلام مذہب ہے ہی نہیں، تو اس کا مذاہب سے مقابلہ کیا؟ اسلام ایک نظامِ حیات ہے، اس کا دنیا کے نظامہائے حیات کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیئے۔ مثلاً شہنشاہی نظامِ حکومت، آمریت، مغربی جمہوریت، سیکولرازم، نیشنلزم، انٹرنیشنل ازم، نظامِ سرمایہ داری، سوشلزم اور کمیونزم وغیرہ کے ساتھ مقابلہ۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ یہ تمام غیر خدائی نظامہائے حیات پر غالب آجائے تو اس سے یہی مراد ہے۔ مذاہب نے تو اپنی موت آپ مرجانا ہے، اس لئے مذاہب پر غالب آنے کے معنی کیا؟

اسلام ایک نظامِ حیات (الدین) ہے، جسے قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ نظام، دنیا کے ہر نظام پر غالب آئے گا۔

اس نظام کے غالب آنے کی ایک شکل یہ ہے کہ جو قوم اس نظام کو اپنے ہاں متشکل کرے، اگر کسی

دوسرے نظام کی حامل قوم، اس نظام کو ناکام بنانے کے لئے اس سے متصادم ہوگئی، تو وہ کامیاب نہیں ہوگی۔ اس نظام کی حامل قوم، مخالف قوم پر غالب آئے گی۔ عہدِ نبیٔ اکرمؐ میں یہ نظام کس طرح متشکل ہوا تھا، اسے قرآنِ کریم کی آیات (۴۸/۲۸-۲۹) میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اُس جماعت کو جس کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوا تھا، کہیں امتِ مسلمہ کہیں جماعتِ مومنین اور کہیں حزب اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے اور واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ان پر کوئی قوم غالب نہیں آسکے گی۔ اصولی طور پر کہا گیا ہے کہ

اسلام کے غلبے سے مراد

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِىْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِىٌّ عَزِيْزٌ (۵۸/۲۱) ــ "اللہ نے یہ لکھ دیا ہے، (اس کا غیر متبدل قانون ہے کہ وہ (خدا) اور اس کے رسولؐ غالب آکر رہیں گے، اس لئے کہ خدا (کا نظام) بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔" اگلی آیت میں ان قوموں کو جن کے ہاتھوں اس نظام کو یہ غلبہ حاصل ہوگا حزب اللہ کہا اور اعلان کر دیا کہ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ع (۵۸/۲۲) ــ "یہ اللہ کی پارٹی ہے جو یقیناً کامیاب ہوگی۔" اور اس کی مخالف پارٹی جسے حزبُ الشیطان کہا گیا ہے، ناکام رہے گی (۵۸/۱۹) (نیز ۵/۵۶ : مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۱۵۳)۔ دوسری جگہ انہیں "خدا کے لشکر" کہا گیا (۳۷/۱۷۳)۔ سورۃ النّساء میں اور بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ع (۴/۱۴۱)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۴۲۷۔ سورۃ آلِ عمران میں کہا: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۳/۱۳۹) "تم مومن ہو تو تم سب پر غالب رہو گے۔" صدرِ اوّل میں جب جماعتِ مومنین نے اس نظام کو متشکل کیا تھا، تو یہ تمام دعاوی سچ ثابت ہو کر سامنے آگئے تھے۔ یہ دین کے غلبہ اور جماعتِ مومنین کے اعلون ہونے کی پہلی شکل تھی۔ ان امور کی مزید تفصیل کے لئے مطالب الفرقان جلد دوم (صفحہ ۳۰۲ اور ۳۶۲)، جلد سوم (صفحہ ۳۰۲) اور جلد چہارم (صفحہ ۲۶۳) بھی دیکھئے۔

آپ دیکھیں گے کہ ان تمام آیات میں جن میں اس جماعت کے غلبہ و تسلط اور برتری و افضلیت کا ذکر آگیا ہے، اسے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ سے مشروط کیا گیا ہے، یعنی یہ صورت اُس وقت تک باقی رہے گی جب تک تم اس نظام کو باقی رکھو گے۔ اگر تم نے اس نظام کو چھوڑ دیا تو تم دنیا کی باقی قوموں جیسی ایک قوم بن جاؤ گے جن کا بس نام "مسلمان" ہوگا۔ ان دونوں حیثیتوں سے کیا فرق پیدا ہوتا ہے اس کے متعلق فارس کے شکست خوردہ گورنر ہرمزان نے جو کچھ حضرت عمرؓ سے کہا تھا، عبرت و بصیرت کی ہزار داستانیں

ھرمزان کا حقیقت کُشا بیان

اپنے اندر رکھتا ہے۔ جب وہ قیدی ہو کر حضرت عمرؓ کے سامنے آیا، تو آپ نے اسے کہا کہ ہرمزان! میں تم سے ایک اہم سوال کا جواب سننا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے حالت یہ تھی کہ تم (ایرانی) ہم عربوں کو اس قدر حقیر اور کمزور سمجھتے تھے کہ ہمارے ساتھ جنگ کرنا بھی اپنے لئے باعثِ ننگ تصوّر کیا کرتے تھے۔ اب وہی ہم عرب ہیں اور وہی تم ایرانی۔ لیکن حالت یہ ہے کہ عرب تمہاری سلطنت کے علاقوں کے علاقے فتح کئے جا رہے ہیں۔ تمہارے سپاہی تو ایک طرف، افسروں تک کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکے چلے جا رہے ہیں۔ تمہارا شہنشاہ اپنی جان بچانے کے لئے بھاگے بھاگے پھر رہا ہے۔ یہ انقلاب کس طرح واقع ہو گیا؟

اُس نے کہا کہ عمرؓ! بات بڑی صاف اور سیدھی ہے۔ پہلے جب ہماری جنگ تمہارے ساتھ ہوتی تھی، تو ایک طرف ہم ہوتے اور دوسری طرف تم (عرب)۔ اب جنگ میں ایک طرف ہم (ایرانی) تنہا ہوتے ہیں اور دوسری طرف" تم اور تمہارا خدا"۔ ان دونوں قوتوں کا مقابلہ کرنا، ایرانی تو ایک طرف، دنیا کی کسی طاقت کے بس کی بھی بات نہیں۔

یہ تھی لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ کی عملی تفسیر۔ مسلمان دنیا کی غالب ترین قوم تھے جب خدا کا نظام اُن کے ساتھ تھا۔ جب اُنہوں نے اسے چھوڑ دیا تو یہ "بے یار و مددگار" رہ گئے۔

سوال یہ ہے کہ جب کوئی ایسی قوم نہ رہے جو اس نظام کو قائم کرے یا مستحکم رکھے اور اس طرح یہ نظام (غالب رہنا تو ایک طرف)، باقی ہی نہ رہے تو کیا یہ صورتِ حال ابدی طور پر ایسی ہی رہے گی؟ یہ تو اس نظام کی شکست ہو گی۔

اس سوال نے ہمارے نوجوان طبقہ کو اس قدر متأثر کیا ہے کہ وہ عام طور پر کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ اسلام آج[1] سے ہزار ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے زمانے میں تو اس قابل تھا کہ ایک اچھا نظام قائم کر سکے لیکن اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے۔ اب اسلام (اُن کے طنز آمیز الفاظ میں) "ایک چلا ہوا کارتوس ہے"۔ وہ اسلام کے مستقبل کے متعلق پہلے ہی مایوس تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام، اسلامی قوانین، اسلامی شریعت کے احیاء کے نام سے جو (ناکام) کوششیں ہو رہی ہیں۔ ان سے وہ دل برداشتہ ہی نہیں، برگشتہ خاطر ہو رہے ہیں اور اسلام کی طرف سے متنفر

---

[1] نوشتہ ۸۳-۱۹۸۲ء

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

ہی نہیں بلکہ سرکش۔ میں نے اس موضوع پر مطالب الفرقان، جلد اول، (صفحہ ۲۴۱ اور ۲۵۸) میں مختصر الفاظ میں روشنی ڈالی تھی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس کے متعلق تفصیلاً گفتگو کی جائے، اس طرح کہ اس کے تمام گوشے بیک وقت سامنے آجائیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام ایک خاص زمانے میں زندہ قوت بننے کے بعد ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا ہے یا اس میں زمانے کی امامت کی اب بھی صلاحیت ہے؟

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلام کہتے کسے ہیں؟ اس کائنات میں خدا کے متعین کردہ غیر متبدل، اٹل قوانین کارفرما ہیں جن کے مطابق یہ کارگہِ عظیم اس حُسن و خوبی کے ساتھ سرگرمِ عمل ہے۔ عام اصطلاح میں انہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوانین کروڑہا کروڑ سالوں سے اسی طرح کارفرما چلے آرہے ہیں۔ نہ یہ آج تک ناکام ثابت ہوئے ہیں، نہ تھک کر کسی مقام پر رُک گئے ہیں، نہ ہی ان کے نتائج و اثمار میں کسی قسم کا نقص یا خلفشار رُونما ہوا ہے۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ (۶۷/۳) تم تخلیقِ خداوندی میں کہیں کوئی خلل نہیں پاؤ گے۔

جس طرح خدا نے خارجی کائنات کے لئے اٹل قوانین متعین کئے ہیں، اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی ایسے محکم اصول اور مستقل اقدار مقرر کئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، افراد اور اقوام کو زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور انسانی معاشرہ سکون و اطمینان کا گہوارا اور عروج و ارتقار کا طیارہ بن جاتا ہے۔

لیکن اشیائے کائنات اور انسانی دنیا میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اشیائے کائنات ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انہیں ان کی خلاف ورزی کا اختیار ہی نہیں لیکن

انسانی دُنیا

انسان کو صاحبِ ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا، اسے اس کا اختیار ہے کہ جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے ان سے سرکشی اختیار کرلے۔ جب کوئی قوم ان کے مطابق زندگی بسر کرے گی تو وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہوگی۔ جب وہ انہیں چھوڑ دے گی تو وہ ذلتوں اور پستیوں کے جہنم میں جا گرے گی۔ اگرچہ بات بالکل واضح ہے لیکن میں دو ایک مثالوں سے اس کی مزید وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ یہ دل کی گہرائیوں میں

اُتر جائے۔ ایک مریض کسی ڈاکٹر سے علاج کراتا ہے اور اس کے نسخے سے اسے آرام آنا شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اس نسخہ کا استعمال چھوڑ دیتا ہے اور پھر بیمار ہو جاتا ہے! اس سے کیا آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ نسخہ ناکام رہ گیا یا یہ کہیں گے اس مریض نے اس نسخہ کو چھوڑ کر مرض کو پھر بلا لیا؟

یا (مثلاً) ایک شخص کسی خاص مقام تک جانے کے لئے موٹر میں سوار ہوا۔ راستے میں اس نے موٹر کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ریسٹ ہاؤس میں جا کر سو گیا اور یوں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ نہ سکا۔ کہیئے! آپ اس کے متعلق یہ کہیں گے کہ اس موٹر میں اس کی صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ اگلا راستہ طے کر سکتی یا اُس مسافر کی تن آسانی کا ماتم کریں گے!

یا (مثلاً) ایک شخص چھت پر جانے کے لئے سیڑھیوں پر چڑھا۔ لیکن نصف سیڑھیوں پر پہنچ کر پہلے بیٹھ گیا اور پھر نیچے اُتر آیا۔ فرمایئے! آپ اس پر یہ کہیں گے کہ اس مکان کی سیڑھیاں بڑی نازک ہیں جو کسی کو چھت تک نہیں لے جا سکتیں یا اس شخص کی دُوں ہمتی کو الزام دیں گے؟

یا (مثلاً) ہمارے ہاں" بائیں طرف چلو Keep to the left ٹریفک کا قانون ہے۔ ایک عرصہ تک ہمارا معاشرہ اس قانون کے مطابق چلتا رہا تو ٹریفک کا کوئی حادثہ نہ ہوا۔ اس کے بعد ایک دن ہر راہ رو یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ میں اس قانون کی پابندی نہیں کروں گا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ فرمایئے! کیا آپ اس سے یہ نتیجہ مرتب کریں گے کہ اس سے پہلے تو اس قانون میں ٹریفک کے حادثات روکنے کی صلاحیت تھی لیکن اس کے بعد اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ یہ بالکل بے کار ہو گیا ہے! یہ اس قابل تھا ہی نہیں کہ بڑھتی ہوئی ٹریفک کا ساتھ دے سکے۔

ان مثالوں کے بعد آپ پھر اصل موضوع کی طرف آجایئے۔ اسلام نے زندگی کے کچھ اصول (قوانین) دیئے۔ ایک قوم نے ان کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کیا۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کی درخشندگی اور تابناکی سے آج بھی تاریخ کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔ مجھے اس باب میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ اس سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کرتے جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام آگے نہیں چل سکا۔ اس حد تک تو وہ بھی معترف ہیں کہ اسلام نے اُس زمانے میں نہایت شاداب نتائج پیدا کئے تھے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس کے بعد اسلام میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ اس قسم کے نتائج پیدا کرتا چلا جائے۔ ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ،

۱۔ کیا ایسا ہوا تھا کہ وہ قوم ان قوانین پر بدستور عمل پیرا رہی لیکن اس کے باوجود وہ ان ثمر بار نتائج سے محروم ہوگئی جن سے وہ پہلے بہرہ یاب ہوئی تھی یا اس نے ان قوانین کا اتباع چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ ان نتائج سے محروم ہوگئی۔

۲۔ اگر واقعہ یہ ہو کہ وہ قوم ان قوانین کے مطابق بدستور زندگی بسر کرتی رہی، لیکن اس کے باوجود عروج واقبال سے محروم ہوگئی تو پھر یہ سمجھنا درست ہوگا کہ ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ آگے چل سکتے۔ لیکن اگر واقعہ اس کے خلاف ہو، یعنی حقیقت یہ ہو کہ اس قوم نے ان قوانین کی پابندی چھوڑ دی تھی تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں۔ اور اگر ان پر آج بھی عمل پیرا ہوا جائے تو اس سے وہی نتائج مرتب ہو سکیں جو اُس زمانے میں ہوئے تھے۔ آئیے! ان سوالات پر حقیقت پسندانہ انداز سے غور کریں اور جذبات سے الگ ہٹ کر دیکھیں کہ تاریخی شواہد اور واقعاتِ عالم کا مطالعہ ہمیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔



انہوں نے اسلام کو چھوڑ دیا

پہلے ہم اس سوال کو لیتے ہیں کہ کیا اُس قوم نے اسلام کے اصولوں کا اتباع بدستور جاری رکھا تھا یا انہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس سلسلہ میں مَیں اس مقام پر صرف چند ایک اصولوں کا ذکر کروں گا اور وہ بھی اجمالاً۔ ان کا تفصیلی تذکرہ اگلے سوال کے جواب میں سامنے آئے گا

۱۔ ملوکیّت اسلام نے اصول یہ دیا تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے۔ حکومت کا فریضہ قوانینِ خداوندی کا نافذ کرنا ہے جن کا اطلاق مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہوگا، حتّٰی کہ ان سے سربراہِ مملکت بھی مستثنٰی نہیں ہوگا۔ امت کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے اور معاشرہ میں عزّت وتکریم کا معیار جوہرِ ذاتی اور سیرت وکردار کی بلندی ہوگا، نہ کہ موروثی اور خاندانی وجاہت و ثروت۔ اس اصول نے ملوکیّت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افرادِ معاشرہ کو وہ حقیقی آزادی حاصل ہوگئی جس سے ان کی مضمر

صلاحیتیں دنوں میں سرسبز و شاداب ہو کر نکھر اور اُبھر آئیں. اُس قوم نے اپنی ہمعصر اقوام میں جو اس قدر امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا' اس کا بنیادی سبب یہی تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد اُنہوں نے اسلام کے اس بنیادی اصول سے انحراف برت کر' اپنے ہاں ملوکیت کا نظام قائم کر لیا اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو استبدادِ ملوکیت کے تحت ہوا کرتا ہے ——— یعنی شرفِ انسانیت کی تذلیل۔

۲۔ برہمنیت اسلام نے یہ اصول دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں. ہر شخص بلا کسی درمیانی واسطہ کے براہِ راست قوانینِ خداوندی کی اطاعت کر سکتا ہے. اس سے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو گیا اور یوں اس استبداد کی زنجیریں کٹ گئیں جس نے انسانیت کے قلب اور دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا. اس آزادی سے' انسانوں کو حریتِ فکر و نظر نصیب ہوئی اور وہ تمام رکاوٹیں دور ہو گئیں جو علمی تحقیق اور فکری کاوش کے راستے میں بُری طرح حائل تھیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ قوم چند دنوں میں علم و بصیرت کی فضائے بسیط میں بے محابا پرواز کے قابل ہو گئی۔ اس کے بعد اُس قوم نے اس اصول سے سرکشی برتی اور اپنے ہاں پھر سے برہمنیت کو رائج کر لیا. یہ وہ عذاب ہے جس میں یہ قوم اب تک ماخوذ چلی آ رہی ہے۔

۳۔ سرمایہ داری اسلام نے یہ اصول دیا کہ یہ چیز وجہِ ذلّتِ انسانیت ہے کہ کوئی شخص روٹی کے لئے کسی دوسرے شخص کا محتاج ہو. نظامِ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری لے. اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہو گا کہ ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں اور فاضلہ دولت کسی شخص کے پاس نہ رہے. اس سے جہاں تمام افرادِ قوم رزق کی پریشانیوں سے محفوظ ہو گئے' وہاں معاشرہ ہوسِ زراندوزی کی لعنت سے بھی پاک ہو گیا. اس قسم کے نظام میں عروج و ارتقاء کی راہیں جس برق رفتاری سے کشادہ ہو جاتی ہیں' اس کی شہادت تاریخ کے اوراق سے مل سکتی ہے. لیکن کچھ عرصہ کے بعد' جب اس قوم نے ملوکیت کو اپنے ہاں پھر سے رائج کر لیا' تو نظامِ سرمایہ داری کی لعنت بھی ساتھ ہی آ گئی. حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت' مذہبی پیشوائیت' سرمایہ داری' ایک ہی شجرۃ الزّقوم کے برگ و بار ہیں. جب یہ قوم اسلامی اصولوں پر کاربند تھی تو حالت یہ تھی کہ بائیس لاکھ مربع میل پر

پھیلی ہوئی سلطنت کے سربراہ (عمر فاروقؓ) کے تہبند پر دس دس بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے تھے لیکن جب ان میں ملوکیت بار پاگئی تو کیفیت یہ تھی کہ اُموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک جب (سیر و تفریح کے لئے نہیں) حج کے لئے چلا ہے تو چھ سو اونٹوں پر صرف اس کے کپڑے لدے ہوئے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہوگی کہ اس قوم نے اسلامی اصولوں کو چھوڑ دیا تھا یا باقی رکھا تھا!

۴۔ تکریمِ انسانیت اسلام نے یہ اصول دیا تھا کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان صرف انسان ہونے کی جہت سے، یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس ایک اصول نے نسلی اور خاندانی تفاوت و امتیازات کی ساری عمارت منہدم کرکے رکھ دی اور وہ خطۂ ارض، مساواتِ انسانیہ کے نور سے جگمگا اٹھا۔ اس معاشرہ میں حبش کا ایک غلام (بلالؓ) سردارانِ قریش سے زیادہ واجب التعظیم قرار دیا گیا کہ سیرت و کردار کی رُو سے وہ اُن سے ممتاز تھا۔ اور امیر المومنین (حضرت عمرؓ) کے جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے روم کے ایک مزدور (صہیبؓ) کو منتخب کیا گیا۔ نسلی امتیازات اور گروہ بندانہ تفریقات کے مٹنے کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ امت میں وحدت پیدا ہوگئی۔ یہ وہی چٹان تھی جس سے ٹکرا کر مخالفت کی ہر قوت پاش پاش ہو جاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے پھر نسلی امتیازات کو بیدار کر لیا جس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ امت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ خلافتِ راشدہ تک تو سلطنت امتِ مسلمہ کی تھی، لیکن اس کے بعد مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ امت کی حکومت کہیں قائم نہیں ہوئی۔ یہ حکومتیں بنو امیہ، بنو عباس، بنو فاطمہ کی تھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

۵۔ غلامی تکریمِ انسانیت کا فطری نتیجہ غلامی کا ختم کر دینا ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت جو غلام اور لونڈیاں عرب معاشرہ میں موجود تھے، قرآن نے انہیں رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنا دیا اور آئندہ کے لئے اس لعنت کو ختم کر دیا۔ معاشرہ میں جذب کردہ غلاموں کو مقام کیا دیا گیا تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب حضرت عمرؓ سے، ان کی شہادت کے وقت کہا گیا کہ اپنے جانشین کے بارے میں آپ اپنی رائے دیں تو آپ نے کہا کہ اگر ابی حذیفہؓ کا آزاد کردہ غلام، سالمؓ موجود ہوتا تو میں خلافت کے لئے اس کا نام تجویز کرتا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس قوم نے شرفِ انسانیت کے اس اصول کو ترک کر دیا اور اپنے ہاں غلامی کو پھر رائج کر لیا۔ نتیجہ یہ کہ خلیفہ کے حرم میں ہزاروں کی تعداد میں لونڈیاں ہوتی

تھیں اور بغداد میں ان کی خرید و فروخت کے لئے ایک بازار مخصوص تھا جہاں حکومت کی زیرِ نگرانی انسانیت بکتی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بتانے کے لئے کہ اس قوم نے اسلام کے اصولوں کو چھوڑ کر پھر سابقہ روش اختیار کر لی تھی، انہی مثالیں ہی کافی ہونگی۔ بنابریں، آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام نے کچھ وقت کے لئے تو خوشگوار نتائج مرتب کئے تھے لیکن اس کے بعد اس میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔



کیا اسلام میں اب بھی اس کی صلاحیت ہے؟

اس کے بعد ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ کیا اسلام میں اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت ہے؟ اور اس سوال کے جواب میں، میں یہ کہوں گا کہ "اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت" تو ایک طرف، اس چودہ سو سال میں دنیا میں چلا ہی اسلام ہے، کوئی دوسرا نظام چلنے کے قابل ہی نہیں ہوا۔ میرا یہ جواب بڑا تعجب انگیز نظر آئے گا۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے، محض جذباتی نعرہ نہیں۔ اس کے لئے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔

قرآنِ کریم میں ہے کہ جو ابدی اصول اور مستقل اقدار، انسانی راہ نمائی کے لئے منجانب اللہ عطا ہوئے ہیں، ان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ راستے کے موانعات کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھیں اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ سورۂ فاطر میں ہے: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (۳۵/۱۰) ان نظریاتِ حیات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اوپر کو اُبھرتے ہوئے، عروج وارتقاء کی اس منزل تک پہنچ جائیں جسے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ ان نظریات کو قرآن نے الحق کہہ کر پکارا ہے اور ان موانعات کو جو ان کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ باطل سے تعبیر کرتا ہے، اور اسی کشمکشِ حق و باطل کے متعلق کہتا ہے کہ: بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) الحق

کائناتی رفتار

باطل پر اس شدت سے ضربات لگاتا رہتا ہے، تا آنکہ باطل کا بھیجا نکل جاتا ہے اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کہتا ہے کہ اس طرح باطل کی شکست اور حق کی فتح ——— یا یوں کہئے کہ ان نظریاتِ حیات کے اپنی

منزلِ مقصود تک پہنچنے کی رفتار بڑی سُست ہوتی ہے۔ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ (۳۲/۵) ان کی اس رفتار کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار کی رُو سے ایک ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اسے آپ انسانی تاریخ کی رفتار کہہ لیجئے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ انسانوں کی کوئی جماعت ان نظریات کو اپنی زندگی میں عملاً رائج کرلے، تو پھر ان کے نتائج، انسانی حساب و شمار کے مطابق دنوں میں مرتب ہو جاتے ہیں چنانچہ جہاں اس نے کہا ہے کہ: إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ ان نظریات میں از خود اُبھرنے کی صلاحیت موجود ہے، اس کے بعد کہا ہے کہ: وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۵/۱۰) انسانی اعمالِ صالح کی قوت، انہیں تیزی سے اوپر اٹھا دیتی ہے۔ یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

عقل کا تجرباتی طریق

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان، اپنی عقل و فکر اور تجربہ و مشاہدہ کی رو سے، مسائلِ حیات کے حل کرنے کی کوشش میں لگا چلا آرہا ہے۔ غاروں کے زمانے سے لے کر اس دورِ تہذیب و تمدن تک کی تاریخ اس کی انہی کوششوں کی مسلسل داستان ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ وہ Trail and Error کے طریق سے معاملات کو سمجھتی اور سلجھاتی ہے۔ وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے، اس پر عمل پیرا ہوتی ہے سینکڑوں برس کی لاتناہی خاراشگافیوں کے بعد، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر پھر کوئی اور نظریہ وضع کرتی ہے اور اسی طریق پر، اس کا تجربہ کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح صدیوں کے پیہم ناکام تجارب کے بعد وہ کسی صحیح نظریہ تک پہنچتی ہے۔ عقل کے اس تجرباتی طریق کی رُو سے ایک صحیح نظریہ تک پہنچنے کے لئے، جہاں انسان کو ہزاروں سال کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے، وہاں آگ، اور خون کی سینکڑوں خندقیں بھی پھاندنی پڑتی ہیں۔ اس کے برعکس، وحیٔ خداوندی انسان کو پہلے ہی دن صحیح نظریاتِ حیات عطا کر دیتی ہے۔ ان نظریات کی صداقت کو (علیٰ وجہ البصیرت) تسلیم کرکے، ان کے مطابق عمل پیرا ہو جانے والی جماعت، ان راستوں کو، جنہیں تنہا عقلِ انسانی نے قرن ہا قرن میں طے کیا تھا، اور وہ بھی اس قدر جانکاہ مشقتوں کے بعد، چند دنوں میں، نہایت امن و سکون کے ساتھ طے کر جاتی ہے۔ اس طرح ان نظریات کے وہ نتائج، جو عقل کے تجرباتی

طریق کی رو سے، ہزار ہا سال میں جاکر برآمد ہونے تھے، چند دنوں میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں. اس سے ظاہر ہے کہ انسانی علم و عقل بھی، رفتہ رفتہ، ان صحیح نظریات تک پہنچ جاتی ہے جنہیں وحی نے عطا کیا تھا، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ عقل کی راہیں بڑی طول طویل اور پُر از خطرات و صعوبات ہوتی ہیں اور وحی کی روشنی میں یہ راستہ طرفۃ العین میں طے ہو جاتا ہے اور نہایت امن و سلامتی کے ساتھ ــــــــ

افلاطون Plato نے ہزاروں سال پہلے اس حقیقت کو پا لیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ،

یہ (اربابِ فکر) کچھ بنائیں گے. اسے پھر مٹائیں گے. یہی کچھ کرتے رہیں گے تا آنکہ وہ انسانی راستوں کو حتی الامکان، خدائی راستوں سے ہم آہنگ کر لیں گے. Republic

اقبالؒ نے اسی حقیقت کو اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ: ؎

ہر دو امیرِ کارواں، ہر دو بمنزلے رواں
عقل بہ حیلہ می بَرَد، عشق بُرد کشاں کشاں



صدرِ اوّل میں اسلام

اس تمہیدی وضاحت کے بعد اصل موضوع کی طرف آئیے. انسان، تنہا عقل کی رُو سے، زندگی کے طول طویل راستوں پر گامزن چلا آ رہا تھا ــــــ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا، ٹھوکریں کھاتا، ہڈیاں تڑواتا ــــــ کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، قندیلِ وحی نے ان راستوں کو یک دم روشن کر دیا. عرب میں بسنے والی قوم نے اس کے عطا کردہ نظریاتِ حیات کو اپنایا اور برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی. اس کے بعد اُس قوم نے وحی کی راہنمائی کو چھوڑ دیا اور کاروانِ انسانیت پھر عقل کے تجرباتی طریق سے شاہراہِ حیات پر گامزن ہو گیا. اب اس کی رفتار پھر سُست ہو گئی. رفتار تو بے شک سُست ہو گئی لیکن اس کا ہر قدم اٹھتا اُسی منزل کی طرف جا رہا ہے جس طرف اسے وحی کی روشنی لے جا رہی تھی ــ چنانچہ تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان آج سے چودہ سو سال پہلے جن غلط نظریات کو سینے سے لگائے ہوئے تھا، اب رفتہ رفتہ انہیں چھوڑتا جا رہا ہے اور ان نظریات کی طرف آ رہا ہے جنہیں قرآن نے عطا کیا تھا. یہ ہے مطلب میرے اس کہنے کا کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، اسلام ہی آگے چلا ہے.

اسلام کے خلاف نظریات سب ناکام ثابت ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ آیئے' اس کی چند ایک مثالیں سامنے لائیں۔



۱۔ حقِ حکومت

چھٹی صدی عیسوی میں' ساری دنیا میں' اندازِ حکومت ملوکیت تھا جس کی رُو سے' راجہ کو ایشور کا اوتار' قیصر کو خدائی اختیارات کا حامل اور کسریٰ کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا۔ عین اُس ماحول میں قرآن نے آکر کہا کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں' خواہ اسے ضابطۂ قوانین' حقِ حکومت اور نبوت تک بھی کیوں نہ مل گئی ہو' کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اس ایک اصول کی رُو سے' قرآن نے' ملوکیت تو ایک طرف' حکومت کی کوئی ایسی شکل باقی نہ رہنے دی جس میں انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اب رہا یہ کہ پھر حکومت ہو کس طرح سے؟ اس نے کہا کہ حکومت انسانوں کی نہیں ہوگی' بلکہ ان مستقل اقدار اور اصولوں کی ہوگی جو خدا کی طرف سے عطا کئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے' امت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' باہمی مشاورت سے' اپنے معاملات طے کرے گی (۴۲/۳۸)۔ اس میں مذہبی پیشوائیت کا بھی کوئی دخل نہیں ہوگا' اس لئے یہ نظام تھیاکریٹک بھی نہیں ہوگا۔ اس اصول کے مطابق مسلمانوں نے نظامِ حکومت قائم کیا جس کے انسانیت ساز نتائج وجہِ شادابیٔ عالم بن گئے۔ اس کے بعد' اس قوم نے اس اصول کو چھوڑ دیا اور انسان پھر تنہا عقل کی رُو سے' ایک اطمینان بخش نظامِ حکومت کی تلاش میں چل نکلا۔ اب آپ دیکھئے کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں' انسان کا قدم ملوکیت کی طرف اٹھا ہے یا یہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا کسی ایسے نظام کی تلاش کرتا رہا ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ وہ اپنی اس تلاش میں' ہزاروں خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کے بعد' اس نظام تک پہنچ پایا ہے جسے جمہوریت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملوکیت کے مقابلہ میں جمہوری نظام' اسلام سے زیادہ قریب ہے۔

مغرب کا جمہوری نظام

لیکن چونکہ یہ نظام' مستقل اقدار کے تابع نہیں' اس لئے مکمل طور پر اسلامی نظام نہیں بن سکا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان

اس نظامِ جمہوریت سے مطمئن بھی نہیں۔ خود مغرب کے بڑے بڑے مفکرین اور سیاستدان اس نظام کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ مثلاً فرانسیسی مفکر Rene Guenn لکھتا ہے:-

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ پہلے کبھی وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی........ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان میں کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رُو سے سمجھایہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر بھی لگایا جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔

Crisis of the Modern World

اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

"اکثریت کے فیصلوں" کے متعلق ایک اور مفکر، پروفیسر الفریڈ کوبن لکھتا ہے کہ:-

(یہ اصول بنیادی طور پر غلط ہے، اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ وہ کہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔

The Crisis of civilization

پروفیسر کوبن نے کہا ہے کہ "فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو"۔ سوال یہ ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ فلاں فیصلہ درحقیقت صحیح ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ معیار، وہ مستقل اقدار ہیں جو وحی کی رُو سے عطا ہوتی ہیں۔ دیکھئے اس باب میں اٹلی کا مشہور مدبر میزینی کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدت عقائد نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت) یا زیادہ انسان (جمہوریت)، بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی ہوتی ہے، خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانۂ حکومت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ یاد رکھیے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی، اس کا کوئی حق مسلم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا حق ہی نہیں فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

C.F. GRIFFIN　　　INTERPRETTER OF MAN

ہم سمجھتے ہیں کہ میزینی نے بات دو ٹوک الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ عصرِ حاضر کی ساری کشمکش یہی ہے۔ میکیاولی اصولِ سیاست جسے سیکولر نظامِ حکومت کہا جاتا ہے، خواہ وہ مارکسی نظام ہو یا مغرب کا جمہوری نظام، کا ملخص یہ ہے کہ دنیا میں غیر متبدل اصول یا مستقل اقدار کوئی نہیں۔ انسان اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے میں اختیارِ مطلق رکھتا ہے۔ اس کے اس اختیار پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ اس کے برعکس، اسلام نے یہ کہا تھا کہ اگر انسان امن و سلامتی سے ترقی کی راہیں طے کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے فیصلوں کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار مستقل اقدار کو قرار دے۔ میزینی نے یہی کہا ہے۔ دیکھئے کہ اس باب میں دیگر مفکرین کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر BREND عصرِ حاضر کی بے لگام سیاست

کے متعلق لکھا ہے:۔

انسانوں کی کوئی جماعت ہو' ایک فرد کو' ایک محدود حلقہ کے اندر اور خاص شرائط کے ماتحت ہی جذبات کی آزادی دی جاتی ہے. اگر وہ اپنے جذبات کو' اس محدود حلقہ سے باہر اور ان محدود شرائط کو توڑ کر بروئے کار لانے کی کوشش کرے تو وہ جماعت اس کی روک تھام کی تدبیر کرتی ہے. لیکن آج کوئی ایسا اقتدارِ اعلیٰ نہیں جو اقوام پر بھی اسی قسم کی پابندی عائد کر سکے. اس لیے اقوام کو اپنے جذبات کو بے لگام چھوڑنے کی پوری آزادی حاصل ہے. آج اقوامِ عالم کی حالت بالکل عہدِ طفولیت کی سی ہے جس میں بچہ ہر اُس پابندی کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے جذبات کے راستے میں حائل ہو۔

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو!
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہاں دین سے مراد یہی مستقل اقدارِ خداوندی ہیں' نہ کہ مذہبی پیشوائیت کے وضع کردہ رسوم و عقائد۔

جس زمانے میں متحدہ اقوام کا "حقوقِ انسانیت کا منشور" زیرِ تدوین تھا' اس کے ادارہ UNESCO نے اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کر کے دنیا بھر کے مفکرین اور سیاستدانوں کے پاس بھیجا. اس ادارہ نے بعد میں' ان مشاہیر کے جوابات کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا تھا جس کا تعارف Jacques Maritain نے لکھا تھا. اس نے اس تعارف میں کہا تھا کہ:۔

انسانیت کے حقوق کی Definition کی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے. حقوقِ انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو. اسی کو فلسفۂ زندگی کہا جاتا ہے۔

" فلسفۂ زندگی مستقل اقدار کا دوسرا نام ہے. اسی کو اخلاقیات کہا جاتا ہے اور اخلاقیات کے متعلق راشڈل لکھتا ہے کہ:۔

ان سے مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ:۔

مستقل اقدار کے معنی یہ نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کرے کہ مستقل قدر کیا ہے۔ مستقل اقدار کو عالمگیر ہونا چاہیئے جسے ہر شخص تسلیم کرے اور ان کا معترف ہو۔

Between Man and Man

یہ اقدار ملتی کہاں سے ہیں، اس کے متعلق غور سے سنیئے اور سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اس کا کہنے والا کوئی ملّا یا پادری نہیں۔ کہنے والا عصرِ حاضر کا سب سے بڑا سائنٹسٹ آئن سٹائن ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جا سکتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیاد عقلِ انسانی پر نہیں ہوتی۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں، اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

Out of my later days

جس نظام میں ان اقدار کو نظر انداز کر دیا جائے، اس کا حشر کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق، اس عالمگیر شہرت کے حامل دانشور کی زبان سے سنیئے جس کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ یعنی The making of Humanity کا مصنّف، برفا۔ وہ لکھتا ہے:۔

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدبّر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط اور ادھر ادھر کی جزئی مرمّت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے، اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔

یہی مفکر آگے چل کر لکھتا ہے:۔

وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی شخص کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے، وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے

اس ناانصافی کی وجہ سے انجامِ کار تباہ ہو جاتی ہے۔

برفا نے یہاں کسی نظام کی کامیابی کے لئے عدل کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ عدل کا عمومی مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ جو فیصلہ ملک کے مروجہ قانون کے مطابق ہو، وہ عدل کہلائے گا۔ لیکن قرآنِ کریم اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلے کو عدل کہا جائے گا۔ لیکن جس قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے اگر وہی عدل پر مبنی نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا۔ اس لئے اس نے کہا کہ ملک کے قوانین کو اَلْحَقّ کے مطابق ہونا چاہیے، یعنی مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق (7/181) تاکہ جو فیصلے اس قانون کے مطابق کئے جائیں وہ فی الواقع مبنی بر عدل کہلا سکیں۔ دیکھئے اس باب میں دورِ حاضر کا ایک مشہور فلسفۂ قانون کا ماہر EMIL BRUNNER کیا کہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب Justice and the Social order میں لکھتا ہے:۔

عدل کا مفہوم

جو شخص فی الواقع سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم ورواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض چھوٹے لوگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔



میں نے کہا تھا کہ قرآنِ کریم نے اصول یہ دیا تھا کہ:۔

1. کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس لئے ملوکیت، آمریت وغیرہ سب نظامِ حکومت باطل ہیں۔ انسان کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔
2. لیکن اس مشاورت میں ایک شرط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا اور وہ یہ کہ کوئی فیصلہ ان اقدار کے خلاف

نہ ہو جو حق مطلق کی حیثیت رکھتی ہیں اور وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں۔

ایک قوم نے، آج سے چودہ سو برس پہلے، اس اصول کو نظامِ حیات بنایا اور دنیا نے اس کے نتائج دیکھ لئے۔ اس کے بعد، اس قوم نے اس اصول کو ترک کر دیا اور باقی دنیا کے ساتھ انسانوں کے وضع کردہ نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ گئی۔

۳۔ اس کے بعد، عقل کے تجرباتی طریق نے انسان کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ ملوکیت، آمریت وغیرہ نظام غلط ہیں۔ اس کے برعکس، نظامِ مشاورت صحیح نظام ہے جسے جمہوریت کہا جاتا ہے۔

میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اس حد تک، دنیا میں اسلام کا پیش کردہ اصول آگے چلا ہے یا وہ اصول جو پیچھے سے چلا آ رہا تھا اور اسلام نے اسے باطل ٹھہرایا تھا۔

۴۔ لیکن ہمارے زمانہ تک، عقلِ انسانی ہنوز، اسلامی اصول کے ایک حصہ کو اپنا سکی ہے، یعنی ملوکیت کی جگہ مشاورتی نظام کو۔ اس اصول کے دوسرے حصہ، یعنی یہ کہ اس مشاورت کو مستقل اقدار کے تابع رہنا چاہیئے، تک ابھی نہیں پہنچ سکی۔ بایں ہمہ، اسلامی اصول کے اس حصہ کی صداقت اور اہمیت، دورِ حاضر کے مفکرین کی نگاہوں کے سامنے آ رہی ہے اور وہ اس پر زور دے رہے ہیں کہ اسے بھی اپنایا جائے۔ وہ دن دُور نہیں جب انسان اس اصول کو اپنانے پر بھی مجبور ہو جائے گا، اس لئے کہ اس نظامِ زندگی کے حیات سوز اور تباہ کن اثرات، جسے عصرِ حاضر نے مستقل اقدار کو نظر انداز کر کے تعمیر کیا، اس قدر نمایاں طور پر سامنے آ رہے ہیں کہ خود وہ قومیں جنہوں نے اس نظام کو تشکیل کیا تھا، ان کی وحشت سامانیوں کو دیکھ کر چیخ اٹھی ہیں۔ اس چیخ و پکار کی تفصیل میں جانے کے لئے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت[1] ہو گی۔ میں اس مقام پر دو ایک اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔ کچھ عرصہ پہلے لارڈ اسنل SNELL نے The New World کے نام سے ایک اہم کتاب لکھی تھی۔ وہ اس میں کہتا ہے:-

> نوعِ انسان کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دَور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت تہذیب ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور یہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف مڑ گیا تو وہ

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" جس سے یہ اقتباسات لئے گئے ہیں۔

اسے برباد بلکہ فنا کردے گا۔ یوں تو انسان کی طول طویل تاریخ میں بہت سے حوادث آئے ہیں لیکن موجودہ حادثہ نہ صرف ان سے وسعتوں اور پہنائیوں میں بڑا ہے بلکہ یہ ان سب سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے۔ پہلے حوادث خاص خاص خطوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور متعین مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔ جنگ ہوتی تھی تو کسی ایک مقصد کے لئے ——— کبھی خام پیداوار کے لئے، کبھی مال کی منڈیوں کی تلاش میں، کبھی دفاعی مقصد کی غرض سے ——— وہ لڑائیاں خاندانی وجاہت اور مادی تفوق کے لئے ہوتی تھیں۔ لیکن گزشتہ جنگ (یعنی دوسری جنگِ عظیم) کو دیکھئے۔ اس کی ظلمت، انسانی قلب کی گہرائیوں میں دکھائی دے گی: نسلی افتخار، جذباتِ تغلّب و تسلّط اور مملکت کے متعلق غلط فلسفہ۔

لہٰذا، جو مصیبت ہمارے سامنے ہے اس کے متعلق ہمیں کبھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے پہلے منظم شر کی قوتیں کبھی اس قدر زورآور نہیں ہوئی تھیں۔ اب تو ان سے نجات کا راستہ ہی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر ملک ویرانہ بن رہا ہے اور اس ویرانے پر افلاس، امراض اور اموات کے شیاطین منڈلا رہے ہیں .... انسانیت اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں سے کچلی جا رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے۔ یہ مصیبتیں نتیجہ ہیں اُن میکانکی قوتوں کا جنہیں انسان نے ایجاد تو کر دیا، لیکن ان پر قابو پانا نہ سیکھا۔ ہر جگہ ریب و شکوک اور اخلاقی اقدار کی شکست کا اندوہناک احساس، انسانی قلوب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ زندگی اس بیم و رجا، فتح و شکست، امید و یاس کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ اگر ہم نے اپنی ناتواں زندگیوں کی شکستہ عمارت کو از سرِ نو محکم بنیادوں پر استوار نہ کیا تو ہماری تقدیر بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔

حکیمِ مشرق نے اس سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

یہ تو ہے عصرِ حاضر کی اقدار فراموش دنیا کی اجتماعی زندگی کا نقشہ۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے، علمِ تحلیلِ نفسی کے عظیم محقق ڈاکٹر ینگ نے آج سے بہت پہلے لکھا تھا کہ:

> عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں ان وحشیانہ قوتوں کے مقابلہ میں جن پر وہ اپنے دَور کی معاشی اور سیاسی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی دنیا کی حالت۔ اور اگر وہ اس اندھی دنیا سے جہاں تعمیر و تخریب کی قوتیں ہر لحظہ ترازو کے پلڑوں کو اٹھاتی جھکاتی رہتی ہیں، اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔
>
> Modern Man in Search of Soul

عصرِ حاضر کے راہ گم کردہ انسان کی یہی وہ قلبی کیفیت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مارؔ عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

میں پوچھنا چاہتا ہوں اسلام کو ناکام کہنے والوں سے کہ اقوامِ دورِ حاضر کی یہ چیخ و پکار، اسلامی نظامِ زندگی کی طرف دعوت دے رہی ہے یا اس سے دُور بھاگنے کی تلقین کر رہی ہے؟



نظریۂ قومیت

اب ایک اور سوال کو سامنے لائیے۔ انسان نے جب مل جُل کر رہنے کی زندگی شروع کی تو اسے لامحالہ کسی ایسی بنیاد کی تلاش ہوئی جس سے افراد مل کر ایک جتھہ بن سکیں۔ اُس دَور میں یہ بنیاد خون کے رشتوں کے سوا اور کونسی ہو سکتی تھی۔ اس سے ایک خاندان کے افراد مل کر ایک جتھہ بن گئے۔ انہی خاندانوں نے وسعت اختیار کر کے قبائل کی شکل اختیار کر لی اور قبائل وسیع تر ہو کر، نسلی امتیازات کے حلقے بن گئے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں، یہی امتیاز، قومیت کا معیار تھا۔ اسلام نے یہ انقلابی آواز اٹھائی کہ قومیت کا یہ معیار غلط ہے۔ اس وقت بھی اس کے نتائج بڑے خطرناک مرتب ہو رہے ہیں لیکن جب انسانی آبادی اور بڑھی اور وسائلِ رسل و رسائل اور

ذرائع مواصلات عام ہوتے تو قوموں کا باہمی تصادم خود نوعِ انسانی کو تباہ کر دے گا۔ اس نے کہا کہ قومیت کا معیار، خون، رنگ، نسل، زبان کے اشتراک کے بجائے، فکر و نظر کی ہم آہنگی ہونا چاہیئے۔ اسی کو آیڈیالوجی یا ایمان کا اشتراک کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اس اشتراک کو کسی خاص خطۂ زمین تک محدود نہیں ہونا چاہیئے۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) اسے تمام نوعِ انسان کو محیط ہونا چاہیئے۔ بالفاظِ دیگر، اس نے کہا کہ رنگ، نسل، زبان یا وطن کے اشتراک کی بنا پر مختلف قومیں تشکیل کرنے کے بجائے نظریاتِ زندگی کے اشتراک کی بنا پر عالمگیر انسانیت کی برادری کی تشکیل کرنی چاہیئے۔ اس بنیاد پر اُس نے ایک اُمت کی تشکیل کی جس نے زندگی کے غلط نظاموں کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا...... اس کے بعد اُس اُمت نے بھی اس اصول کو فراموش کر دیا اور پھر انہی قدیم معیاروں کے مطابق ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس کے بعد دنیا، عقل کے تجرباتی طریق کی رُو سے، اسلام کے پیش کردہ اصولِ اجتماعیت کی طرف آ رہی ہے یا اس کے خلاف جا رہی ہے۔ پیدائش کے لحاظ سے انسانی تفریق کی بدترین شکل ہندوستان میں رائج تھی جہاں بھارت سے باہر کے انسانوں کو انسان نہیں بلکہ ملیکش (ناپاک حیوان) سمجھا جاتا تھا اور بھارت کے اندر بسنے والے انسانوں کو چار ورنوں (ذاتوں)۔۔۔۔۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر۔۔۔۔۔ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ یہ تقسیم اٹ تھی، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ برہما کی بنائی ہوئی ہے اور اس لئے ان کے دھرم کا بنیادی حصہ ہے۔ آج وہاں یہ ساری تقسیم آئینی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ انسانی معاشرہ کی یہ تبدیلی قرآن کے دیئے ہوئے اصولوں کی کامیابی کا ثبوت ہے یا اس کی ناکامی کی دلیل۔ اس سے کبھی آگے بڑھیئے۔ اس سے پہلے دنیا کی ساری آبادی مختلف نسلوں میں بٹی ہوئی تھی ۔۔۔۔۔ اصولی طور پر، سیاہ، سفید، سرخ اور زرد نسلوں میں اور فروعی طور پر ہر نسل کے اندر سینکڑوں شاخوں میں۔ عصرِ حاضر کی سائنٹیفک تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نسلوں کی یہ تفریق یکسر غیر فطری ہے۔ کسی نسل کو دوسری نسل پر کوئی تفوق حاصل نہیں۔ اور عملاً ان نسلوں کا امتیاز مٹتا چلا جا رہا ہے۔ کہیئے کہ دنیا اسلام کے قریب آ رہی ہے یا اس سے دُور چلی جا رہی ہے؟

لیکن عقلِ انسانی کا تجرباتی عمل ابھی یہیں تک پہنچ سکا ہے۔ اس نے ہنوز انسان کو وطن کی تنگنائے سے باہر نہیں نکالا، یعنی اب انسانوں کی تفریق اور قوموں کی تقسیم، وطن کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے۔ اس نظریہ کو نیشنلزم کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنے وضع کردہ اس نظریہ کے

نتائج سے مطمئن ہے یا اس کے ہاتھوں نالاں ہے. اس کا جواب بھی ہم سے نہیں، خود اس نظریہ پر عمل پیرا اقوامِ مغرب کی زبانی سنیئے ـــــــ پروفیسر الفریڈ کوبن' جس کا ذکر پہلے آچکا ہے' اس باب میں لکھتا ہے:

قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا اور عداوت پر پرورش پاتا ہے. ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اُس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو. پھر ان قوموں کا جذبہ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا. جونہی کوئی قوم اپنے حقِ استقلال و خود مختاری کو مسلّط کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لیے خود مختاری کی مدّعی ہوں. ان وجوہات کی بنا پر لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظامِ حکومت کے لئے نیشنلزم کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے.

پروفیسر میتسن اپنی کتاب Creative Freedom میں لکھتا ہے کہ:

جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے. جس طرح افراد میں باہمی تنازعہ کی بنیاد جذبہ انانیّت ہوتا ہے، ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اس بنیاد سے لگ سکتا ہے.

پروفیسر ولیم برنڈ نے' دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ پر لکھا تھا کہ:

اغلب یہی ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد اقوامِ یورپ چند سال تک نبرد آزمائی میں نہیں الجھیں گی. کیونکہ ان میں سے بعض تو بہت تھکی ہوئی ہوں گی اور بعض کو ان کے فاتحین دبا کر رکھیں گے. لیکن نیشنلزم کا وہ جذبہ جو جنگ کا اصلی ذمہ دار ہے' باقی رہے گا. اس لئے مستقبل میں جنگ کو ختم کرنے کے لئے آج کی سیاستدانی کی پرکھ اسی سے ہو گی کہ موجودہ جنگ کے بعد نیشنلزم کے اس جذبہ کے متعلق کیا تدبیر اختیار کی جاتی ہے.

Foundations of Human Conflict

برٹرینڈ رسل' اپنی کتاب The hopes for a changing world میں لکھتا ہے:

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے' وہ نیشنلزم ہے. اس لئے نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے. (بظاہر) تماشا یہ کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز

ہے۔ لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم اچھی چیز ہے۔
بڑی مصیبت یہ ہے کہ یورپ نے نیشنلزم کو محض ایک سیاسی مسلک کی حیثیت سے ہی اختیار نہیں کیا بلکہ اسے مذہب کی پوزیشن دے رکھی ہے۔ وہاں وطن کو ایک دیوتا سمجھا جاتا ہے جس کی پرستش ہوتی ہے — آلڈوس ہکسلے اس باب میں بڑی وضاحت سے لکھتا ہے اور بہ تکرار و اصرار لکھتا ہے کہ:

> نیشنلزم ایک بُت پرستانہ/مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ وہ مذہب جو فساد و تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی خدا پرست مذہب فلاح اور وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا سا مسلک ہے۔

دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔

> نیشنلزم، جسے ہم نے ایک بُت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے۔ یہ ان میں سے ہر قوم کا "مملکتی مذہب" ہے، یعنی خدا کے بجائے قوم کی پرستش جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان پچاس دیوتاؤں میں سے ہر ایک دیوتا کا پجاری، باقی انچاس پجاریوں کو ملیکشی تصور کرتا ہے۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رُو سے عالمگیر انسانیت، خدائے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کے بجائے علیحدگی، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں، اس کا وجوب ہوتا ہے۔ یاد رکھئے! ہر نیشنلزم ایک بُت پرستانہ مذہب ہے۔[1]

ضمناً، ہکسلے نے نیشنلزم کو آج ایک "باطل خدا" کہا ہے۔ اقبالؒ نے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کہا تھا کہ ؎

اِس دَور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

---

[1] حوالوں کے لئے دیکھئے میری کتاب — انسان نے کیا سوچا؟ — (صفحہ ۲۴۱-۲۴۰)۔

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور اس کا نتیجہ یہ بتایا تھا کہ :-

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے　　تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے　　کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اور اس کے بعد مسلمانوں سے تاکید کی تھی کہ : ؏
اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

بہر حال، میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس نیشنلزم کے ہاتھوں، جسے اسلام نے فسادِ آدمیت کی بنیاد قرار دیا تھا، خود اقوامِ مغرب کے مفکر اور سیاستدان اس قدر گریاں و نالاں ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں اسلام کو چلا ہوا کارتوس کہنے والوں سے کہ اقوامِ یورپ کا یہ واویلا، اسلامی اصولِ قومیت کی صداقت کی شہادت ہے یا اس کے ناکارہ ہونے کی دلیل!

یہ اس مسئلہ کا منفیانہ پہلو تھا، یعنی نیشنلزم کی تباہ کاریوں کے خلاف اقوامِ مغرب کا نالہ و شیون۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں اس فساد کا علاج کیا ہے؟ پروفیسر برنڈ نے کہا تھا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم قومیت کی جگہ بین الاقوامیت (انٹرنیشنلزم) کو فروغ دیں۔ اس کے خلاف مسٹر EMERY REVES نے کہا کہ :-

ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ (اقوامِ متحدہ کی ناکامی اس کا بیّن ثبوت ہے) جو مسئلہ دنیا کے سامنے ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں فساد برپا کر رکھا ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر دے۔ اس کا حل انسانی

عالمگیریت ہے یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ The Anatomy of peace

کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ پادری TEILARD-D- CHARDIN جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب Building of the Earth میں لکھتا ہے:۔

اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصبات کو ختم کر دیں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرۂ ارض کی تعمیر نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر HUGH MILLER اپنی کتاب میں جس کا نام ہی اس نے Communicty of Man رکھا ہے، لکھتا ہے:۔

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اُس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی، لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندان، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اُسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہمدگر جوڑ دے۔ انسانی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہونا چاہیئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

جی نہیں چاہتا کہ میں یہ کہے بغیر آگے بڑھ جاؤں کہ جو کچھ اس مفکر نے کہا ہے، وہ گویا قرآنی آیات کا ترجمہ ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹) نوعِ انسان، شروع میں ایک ہی برادری تھی، لیکن اس کے بعد اس نے باہمی اختلاف پیدا کر لیا اور مختلف خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ اس میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کے لئے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملی (۲/۲۱۳)۔ اس نے کہا ہے کہ انسانیت کی بارگاہ میں سب سے بڑے مجرم وہ ہیں جو يَقْطَعُوْنَ

مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ (۲/۲۷) جس بکھری ہوئی انسانیت کو جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں اور اس طرح دنیا میں فساد برپا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

عزیزانِ من! آپ قرآنِ کریم کی ان آیاتِ جلیلہ پر غور کیجئے اور پھر پروفیسر ٹلر کے مذکورہ بالا اقتباس کو دیکھئے اور پھر بتایئے کہ کیا وہ انہی آیات کا ترجمہ نہیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ اپنے غلط نظریات کا ستایا ہوا انسان آخرالامر کس آستانہ پر پہنچ کر پکارتا ہے کہ

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

انسان جس عالمگیر انسانی برادری کی تلاش میں ہے، اس کی تشکیل کا طریق کیا ہوگا، اس کے متعلق سویڈن کا مشہور ماہر اقتصادیات GUNNER MYARDAL لکھتا ہے:-

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اُسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرت کر سکے سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔

اور اس کے بعد یہ مفکر لکھتا ہے کہ:-

ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی ہی حسین دنیا کا تصوّر محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔ Beyond the Welfare State

اس "مذہب" کے متعلق جو MYRDAL کی روح کے نشیمن میں جلوہ بار ہے، ایک ممتاز ماہر نفسیات ERIC FROMM لکھتا ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی جو:-

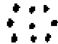
انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ

وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کردے گا، جو مشرق و مغرب کی تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔

قرآنِ کریم اُس دین کی یہی خصوصیات بتاتا ہے جسے اس نے عالمگیر انسانیت کے لئے بطور ضابطۂ حیات تجویز کیا ہے۔ اس مفکر نے کہا ہے کہ زمانے کے تقاضوں کی رُو سے اس مذہب کی نمود ہوگی اور قرآنِ کریم نے یہی طریق اپنے مستور حقائق کی نمود کے لئے بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)۔

(جوں جوں علمِ انسانی ترقی کرے گا اور انسانی تقاضے بڑھیں گے) عالمِ انفس و آفاق کے مستور حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے اور جوں جوں یہ حقائق بے نقاب ہونگے، یہ حقیقت سامنے آتی جائے گی کہ جو کچھ قرآن نے کہا تھا وہ صداقت پر مبنی تھا۔



یہ مذہب اسلام ہی ہوسکتا ہے

اب رہا یہ سوال کہ دنیا کو جس عالمگیر مذہبِ انسانیت کی تلاش ہے کیا وہ اسلام کے سوا کوئی اور بھی ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں، ایک غیر مسلم کی زبان سے سنئے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ غیر مسلم کون ہے اور کس پایہ کا مفکر ہے۔ یہ عصرِ حاضر کا سب سے بڑا مؤرخ، پروفیسر آرنلڈ ٹوئن بی ہے۔ وہ اپنی کتاب The World and the West میں لکھتا ہے ــــ اور دیکھئے کہ وہ ایسا لکھتے وقت ہمارے مُنہ پر کتنے زور سے طمانچہ مارتا ہے ــــ وہ کہتا ہے کہ:۔

مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ہیں جن کا باعثِ فوز و فلاح ہونا بے حد مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ تُرک اور بعض دیگر اسلامی ممالک نیشنلزم کے

تصوّر سے بھی اسی طرح متاثر ہوتے جارہے ہیں جس طرح اور مغربی تصوّرات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان، بلا لحاظ اختلافِ نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں، ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایک تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دنیا کا حشر کیا ہوگا؟ آج جبکہ مغربی صنعت کاری کی وجہ سے دنیا میں "فاصلہ" کا تصوّر آہستہ آہستہ مٹتا جارہا ہے، مسلمانوں کا اخوتِ باہمی کا عقیدہ یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے اور یہی عقیدہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے، برعکس مغربی عقیدہ کے جس نے یورپ میں محض قومیت کے معیار پر درجنوں آزاد مملکتوں کو پیدا کر رکھا ہے جن میں سے ہر ایک، دوسری سے الگ ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے، اس میں یورپ کے اندر کم وبیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں ہوسکتا۔ (خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن) یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا کہ وہ اس کے تصوّرات حیات کو آنکھیں بند کئے اپنائے چلے جارہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عالمگیر مودّت واخوت کے تصوّر کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصوّر اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصوّر، ویسے تو انسانی فلاح کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے، لیکن اس ایٹم کے دَور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔

پروفیسر ٹوئن بی کے نزدیک، دنیا میں عالمگیر برادری متشکل کرنے کا واحد ذریعہ اسلامی نظریۂ اجتماعیت ہے۔ اور اسے یہ غم کھائے جارہا ہے کہ اگر یہ نظریہ بھی باقی نہ رہا تو دُنیا کا کیا حشر ہوگا! میں پوچھنا چاہتا ہوں اپنے ہاں کی فریب خوردہ ذہنیتوں سے کہ کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے یا دنیا اسے اپنی نجات کے لئے آخری سہارا قرار دے رہی ہے! اور پھر میں پوچھنا چاہتا ہوں قومیت زدہ مسلمانوں سے کہ وہ سوچیں کہ دُنیا اُن کے ساتھ کیا توقعات وابستہ کئے ہوئے ہے اور وہ کس طرف جارہے ہیں؟ غالب نے کسی ایسے ہی حسرت آمیز منظر سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ؎

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری　　تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

نظامِ سرمایہ داری

اب میں انسانی زندگی کے ایک اور اہم گوشے کی طرف آنا چاہتا ہوں. یہ وہ گوشہ ہے جس نے عصرِ حاضر میں خاص طور پر بڑی اہمیّت اختیار کر رکھی ہے یعنی معاشی نظام کا مسئلہ. انسانی زندگی کا مدار زمین کی پیداوار پر ہے. جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی اس نے دیکھا کہ اس ذریعۂ زیست پر بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا قبضہ چلا آرہا ہے اور وہ اپنی مقبوضہ زمین پر مزارعوں ہی سے نہیں، غلاموں سے کام کراتے ہیں. قرآن نے آکر یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ نہ ذرائع پیداوار پر افراد کی ملکیت ہو سکتی ہے، نہ کسی انسان کے پاس اس کی ضروریات سے زائد (فاضلہ) دولت رہ سکتی ہے. اس سے ایک طرف تو غلامی کا خاتمہ ہو گیا اور دوسری طرف نظامِ سرمایہ داری کی بساط اُلٹ گئی اور قرآن کی حامل قوم نے ایسا معاشرہ متشکّل کر کے دکھا دیا جس میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم تھا اور نہ ہی کوئی تن آسان دولت پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا. اس طرح دنیا کو بتا دیا گیا کہ یہ نظام ممکن العمل بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی ـــــ مسلمانوں نے کچھ عرصہ بعد اس نظام کو ختم کر دیا اور قرآنی اصول پھر اپنی کائناتی رفتار سے آگے بڑھنے لگے.

آپ سوچئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، انسان کے قدم نظامِ سرمایہ داری کی طرف اُٹھے ہیں یا اُس نظامِ معیشت کی طرف، جسے قرآن نے وجۂ حریّتِ انسانیت قرار دیا تھا! آج اس باب میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں. آج اس نظام کا غلغلہ ساری دنیا میں بلند ہو رہا ہے. کیا یہ اس امر کی زندہ شہادت نہیں کہ اسلامی نظامِ معیشت ہی آگے چلا ہے اور اسی میں یہ صلاحیّت ہے کہ یہ عالمگیر انسانیّت کے لئے حیات بخش نظام بن سکے. لیکن عقل کا تجرباتی طریق ابھی اس نظام کے مادّی پیکر تک پہنچ سکا ہے. اس کی روح تک ہنوز اس کی رسائی نہیں ہوئی. وہ اس کی بالائی عمارت کو چُھو سکا ہے، اس کی بنیادوں کو ابھی نہیں پا سکا. اور یہی وجہ ہے کہ وہ نظام، اوّل تو اپنی پہلی منزل ـــــ یعنی سوشلزم ـــــ میں ٹھٹھر کر رہ گیا ہے. آخری منزل ـــــ کمیونزم ـــــ تک پہنچ ہی نہیں پایا. اور دوسرے سوشلزم بھی ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں کے جھگڑوں کے زور سے فضائے عالم پر چھا جانے کی کوشش میں مصروف ہے، قلب و دماغ کے اطمینان سے زندگی کی بنیاد نہیں بن رہا. یہ اس لئے کہ اس قسم کے معاشی نظام کی بنیاد جس تصوّرِ حیات پر استوار ہو سکتی ہے، وہ اس کی نگاہوں سے ہنوز اوجھل ہے. وہ بنیاد ہے مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت پر ایمان. وہ ایمان، جس کی بنا پر اس ذمّہ داری کو قبول کرنے والے (عمر فاروقؓ) نے کہا تھا کہ:

اگر (انسان تو ایک طرف) دجلہ کے کنارے ایک کُتا بھی بھوک سے مرگیا تو خدا کی قسم، عمرؓ سے اس کی بھی باز پُرس ہوگی۔

"باز پُرس" کا اِس قسم کا احساس، صرف حیاتِ آخرت کے ایمان سے پیدا ہوتا ہے اور جب تک یہ احساس بیدار نہ ہو، یہ معاشی نظام کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ گوئٹے نے کس قدر بلیغ انداز میں کہا ہے کہ تسلسلِ حیات کے بغیر تو اِس دنیا کی زندگی بھی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ میں کیوں نہ اس کے اپنے الفاظ Quste کردوں۔ اس نے کہا ہے کہ:

That man is dead even in this life who has no belief in another

سوشلزم، عقل کے تجرباتی طریق کا قدمِ اوّل ہے۔ اس کے عملی نفاذ کے بعد جب اس تجربہ میں مزید اضافہ ہوگا تو وہ اس بنیاد تک بھی پہنچ جائے گی جس کے بغیر یہ عمارت استوار نہیں ہوسکتی۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر روس کے متعلق کہا تھا کہ:

فکرِ اُو در تُند بادِ لا بماند
مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند!
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں

اس لئے کہ: ؎

درمقامِ لَا نیاساید حیات　　سوئے اِلّا می خرامد کائنات



بُنیادی حقوقِ انسانیّت

ہمارے زمانے میں بنیادی حقوقِ انسانیت Fundamantel Human Rights

؎ (1) Qusted by DIXON in the Human Situation

کا بڑا چرچا ہے اور اقوامِ متحدہ (U.N.) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اُس نے ان حقوق کو متعین کر کے ان کا چارٹر شائع کر دیا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بنیادی حقوق کا تصور سب سے پہلے قرآنِ کریم نے دیا تھا اور انہیں نہایت وضاحت سے بیان بھی کر دیا تھا۔ میں ان حقوق کی تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ اس لئے اجمالاً چند ایک کے تذکرہ پر اکتفا کروں گا۔ دیکھئے، قرآنِ کریم کی رُو سے وہ حقوق کیا ہیں :-

۱۔ تکریمِ آدمیت، یعنی ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے (۱۷/۷۰)۔
۲۔ جنسی مساوات۔ زندگی کے کسی شعبہ میں مرد اور عورت میں کوئی تفاوت نہیں۔
۳۔ مدارج کا تعیّن افراد کے جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار کی رُو سے کیا جائے گا۔
۴۔ اطاعت صرف قانون کی ہو گی، اشخاص کی نہیں۔
۵۔ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا حق ادا کیا جائے گا۔ اسے عدل کہا جاتا ہے۔ اور جس شخص میں کوئی کمی ہو گی اس کی کمی پوری کی جائے گی۔ اسے احسان کہا جاتا ہے۔
۶۔ ہر شخص کو رزق (سامانِ زیست) مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہو گی۔
۷۔ جان کی حفاظت کا حق۔
۸۔ جو چیز قانوناً کسی کی ملکیت میں دی جائے اُس کی حفاظت کا حق۔
۹۔ سکونت کا حق　　۱۰۔ عصمت کی حفاظت کا حق۔
۱۱۔ شادی میں انتخاب کا حق۔　　۱۲۔ حسنِ ذوق Aesthetic Taste کا حق۔
۱۳۔ مذہبی آزادی کا حق۔
۱۴۔ سچی بات کہنے کا حق۔　　۱۵۔ مظلوم کو فریاد کا حق۔
۱۶۔ پرائیویسی کا حق۔　　۱۷۔ حیثیتِ عرفی کے تحفّظ کا حق۔
۱۸۔ اثباتِ جرم کے بغیر ہر ایک کو بے گناہ تصور کئے جانے کا حق[1]۔

یہ اور اسی قسم کے دیگر حقوق کا تعین قرآنِ کریم نے اُس زمانے میں کیا جب دنیا میں افراد کے حق کا تصوّر

---

[1] ان تمام حقوق کے قرآنی حوالے میرے مجموعہ مضامین "بہارِ نَو" میں ملیں گے۔

بھی کہیں نہیں تھا۔ آپ غور کیجئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، انسانی فکر نے ان حقوق کا تقاضا کیا ہے یا اس نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے: اور اگر اس نے ان حقوق کا مطالبہ کیا ہے تو کیا یہ اسلام کی کامیابی کی دلیل ہے یا اس کی ناکامی کا ثبوت؟ اسلام کی ناکامی تو ایک طرف، فکرِ انسانی اس باب میں بھی ہنوز اسلام سے پیچھے ہے۔ اسلام نے ان حقوق کو ابدی اور غیر متبدل قرار دیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کا کوئی نظام ان میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس، اقوامِ متحدہ کے متعین کردہ حقوق کی کیفیت کیا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے ان حقوق کے تعین کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن نے دنیا بھر کے دانشوروں سے مشورہ کرنے کے بعد جو رپورٹ شائع کی تھی، اس میں لکھا تھا:-

> یہ حقیقت بدیہی ہے کہ یہ تمام حقوق، بالآخر انسانی حقوق ہیں اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں اور انہیں قابلِ ترمیم و تبدل قرار دیا جائے۔ حتیٰ کہ جن حقوق کو غیر مشروط کہا جاتا ہے ان میں بھی، ان حقوق کا مالک ہونے اور ان کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق ہے۔ ملکیت بجا ہے لیکن اُن کا استعمال ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہوگا جو ان پر ازروئے قانون عائد کی جائیں گی۔

اور "ازروئے قانون" ان حقوق کی جس طرح مٹی پلید کی جاتی ہے، اس کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں! یہی وجہ ہے کہ یونیسکو کے سوالنامہ کا جواب دیتے ہوئے شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر Quincy Wright نے کہا تھا کہ:-

> تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر کبھی بھروسا نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں حقوقِ انسانیت کا احترام کرے گی۔ گذشتہ دنوں اقلیتوں پر جس قدر مظالم کئے گئے ہیں ان سے انسانی ضمیر کانپ اٹھا ہے۔

یہ اس لئے کہ دنیا کی ہر مملکت اپنے آپ کو اقتدارِ مطلق (ساورنٹی) کی مالک سمجھتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو پامال کر دے تو اُس سے کوئی باز پُرس کرنے والا نہیں ہوگا۔ ان کے برعکس، قرآنی مملکت پر مستقل اقتدارِ خداوندی کا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ اپنے ہر فیصلہ اور عمل کے لئے قانونِ مکافات کی عدالت میں جوابدہ ہوتی ہے۔ فکرِ انسانی کا تجرباتی طریق ہنوز اس مقام تک نہیں پہنچا جس کی وجہ سے بنیادی حقوق کے

چارٹر تو شائع ہو جاتے ہیں، ان پر عمل درآمد کہیں نہیں ہوتا۔

اس مقام پر میں ایک اور اعتراض کی طرف آنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ عادت ہے کہ دنیا میں جہاں کوئی اچھا نظریہ سامنے آیا، انہوں نے کہہ دیا کہ اسلام میں یہ پہلے ہی سے

مسلمان یونہی کہہ دیتے ہیں

موجود ہے۔ جب دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر صحیح نظریہ پہلے ہی سے اسلام کے اندر موجود ہے، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اسلام سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے اور ان کے اس قسم کے دعویٰ کا اُن کے پاس ثبوت کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں جو کچھ کہتا ہوں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں اور متعیّنہ، اتھارٹی کی بنا پر کہتا ہوں۔ میری اتھارٹی قرآنِ کریم ہے جس کے متعلق ساری دنیا کو تسلیم ہے کہ وہ چودہ سو سال سے دنیا میں بغیر کسی تبدیلی کے موجود ہے۔ میں نے جو کچھ اس وقت کہا ہے (یا اِس سے پہلے بھی جو کچھ کہتا چلا آرہا ہوں) ان میں سے ایک ایک دعویٰ کی تائید میں قرآن کی آیات موجود ہیں اور جب بھی کوئی طلب کرے، انہیں پیش کرنے کے لئے تیار ہوں ؎

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

غلط فہمی کی وجہ

جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "اسلام آگے نہیں چلا"؛ جہاں تک میں نے غور کیا، ان کی غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ وہ، (ہم) مسلمانوں کو اور اسلام کو مرادف سمجھ لیتے ہیں اور اسی وجہ سے انتہائی جسارت کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ اگر اسلام میں فی الواقع ایسی صلاحیت موجود ہے جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے تو پھر مسلمانوں کی حالت اس قدر پست کیوں ہے؟ اس اعتراض کا جواب میں شروع ہی میں دے چکا ہوں اور وہ یہ کہ اسلام کے صدرِ اوّل میں مسلمان کچھ عرصہ تک اس اسلام پر کاربند رہے جو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا لیکن اس کے بعد انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور اپنی خود ساختہ روشوں پر کاربند ہو گئے۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ لہٰذا، موجودہ مسلمان اور اسلام ایک دوسرے کے مرادف نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بنابریں، مسلمانوں کی موجودہ حالت کو اسلام کے لئے بطور دلیل پیش کرنا بنیادی طور پر غلط ہے

جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ قیاس اور مفروضہ پر مبنی نہیں، ایک حقیقت کا بیان ہے۔ حقیقی اسلام کے بنیادی خط و خال سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ آپ انہیں پیش نظر رکھئے اور پھر دیکھئے کہ تمام عالم اسلام (یعنی مسلمانوں کے ممالک) میں کسی جگہ بھی اسلام کا نظام نافذ العمل ہے؟ آپ کو وہ نظام کہیں بھی رائج نظر نہیں آئے گا۔ ہر ملک میں غیر اسلامی نظام رائج نظر آئے گا۔ اس حقیقت سے واضح ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت سے حقیقی اسلام کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ کرنا یا کوئی رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ حقیقی اسلام کے متعلق، جو کچھ سابقہ صفحات میں کہا گیا ہے، آپ اُس پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ اس میں نظام عالم بننے کی صلاحیت ہے یا نہیں؛ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ہمارا موجودہ اسلام، مُنَزَّل مِنَ اللہ دین نہیں، بلکہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے، اور مذہب کوئی بھی ہو، اس میں زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ پروفیسر HOCKING کے الفاظ میں:-

> یہ تمام مذاہب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادثِ زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے) یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینانِ خویش نے (جو درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر ہی نہیں آسکتی)۔ ان کے عقائد و نظریات کے زنگ نے ان کے افکار و اعمال کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں سے اس قدر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔

Living Religions and a world faith

اسلام ہی غالب رہے گا

لہٰذا جب تک اسلام کو مذاہب کی صف سے نکال کر، دین (ضابطۂ حیات) کی حیثیت سے نہیں سمجھا جائے گا، اس کے زندۂ جاوید ہونے کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکے گی۔ اسلام مذہب کی جامد رسوم کا مجموعہ نہیں۔ وہ زندگی کے غیر متبدل اصول و اقدار کا ضابطہ ہے۔ یہ غیر متبدل اصول قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں اور وہ برابر آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ جیسا کہ آیۂ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ خدا نے الحق پر مبنی دین

(نظامِ حیات) اس لئے بھیجا ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹/۳۳) تاکہ وہ انسانوں کے وضع کردہ ہر نظامِ حیات پر غالب آکر رہے۔ یہی وہ حقیقت کبریٰ تھی جس کے پیشِ نظر گوئٹے نے Ecker Mann سے کہا تھا کہ :-

> اسلام کی تعلیم کبھی ناکام ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے تمام نظامہائے حیات کے باوجود اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ (بحوالہ خطباتِ اقبالؒ)

میں نے اِن صفحات میں اسلامی نظام کے جس قدر اصول آپ کے سامنے پیش کئے ہیں، آپ سوچئے کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ رفتہ رفتہ وہی اصول، انسانوں کے خود ساختہ اصولوں کی جگہ لے رہے ہیں؟ چونکہ یہ اصول ابدی ہیں، اس لئے یہ بھی نہیں کہ انہوں نے کسی خاص زمانے میں تو اپنے انسانیت ساز نتائج مرتب کئے ہوں اور اس کے بعد یہ درخت سُوکھ گیا ہو۔ ان اصولوں کے متعلق کہا یہ ہے کہ: مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ان کی مثال اس پھلدار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِيْٓ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا (۱۴/۲۴) یہ شجرِ طیّب ہر موسم میں پھل دیتا جائے گا، کبھی خشک نہیں ہوگا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

> یہ نغمہ فصلِ گُل و لالہ کا نہیں پابند — بہار ہو کہ خزاں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

نہ ہی یہ اصول یہودیت کی طرح کسی خاص نسل یا قوم کے اندر محدود و محصور رہنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ قرآن ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے، یعنی تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطۂ حیات۔ اگر کوئی قوم انہیں اپنانے کے بعد چھوڑ دے، تو یہ اصول معطّل ہو کر نہیں رہ جاتے۔ انہیں جو قوم بھی اپنا لے گی، ان کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہو گی۔ اس نے خود مسلمانوں سے برملا کہہ دیا تھا کہ: وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا أَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) اگر تم نے ان سے مُنہ موڑ لیا تو تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ تم سے بہتر ہو گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے اِن بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

> محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نواہا باقی است

زخمہ ما بے اثر افتد اگر　　آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی　　از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست　　احتیاجِ روم و شام او را کجاست
حق اگر از پیشِ ما بردارش　　پیشِ قومے دیگرے بگزاردش

یاد رکھئے! دنیا کی کوئی قوم نہ خدا کی چہیتی اولاد ہے' نہ سوتیلی. وہ رب العالمین ہے تمام اقوام کا نشوونما دینے والا. اس لئے جو قوم اس کے عطا کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہوگی' ان کے نتائج سے بہرہ یاب ہو جائے گی. جو انہیں چھوڑ دے گی' ذلیل و خوار ہو جائے گی. ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ

ہست این میکدہ و دعوتِ عام است اینجا　　قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

اس سلسلہ میں انڈکس میں "استبدال و استخلافِ قومی" کا عنوان دیکھئے۔



حرفِ آخر

جو کچھ میں نے ان صفحات میں پیش کیا ہے' آخر میں اسے چند ایک الفاظ میں دہرا دینا چاہتا ہوں کہ دنیا میں آپ کو جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے' یہ صدقہ ہے خدا کی اُس رحمت کا جسے اُس نے تمام اقوامِ عالم کے لئے عام کر دیا تھا. (وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ[21]). دنیا' قرآنی اصولوں اور اُن کی روشنی میں متشکل کردہ قرآنی نظام کے کسی ایک گوشوں کو اپنا چکی ہے. بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کر رہی ہے اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ آگے چل کر اپنائے گی. اس لئے کہ ان کے بغیر نہ انسانی صلاحیتیں اپنی نشوونما ارتقا کی تکمیل تک پہنچ سکتی ہیں' نہ حسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے. لہٰذا' بزمِ ہستی میں جہاں روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہے' وہ اسی آفتابِ عالمتاب کی ضیا باریوں کے تصدق سے ہے اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول کھلتا ہے' وہ اسی جانِ بہار کی نکہت پاشیوں کا رہینِ منت ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو　　آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است



ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنی نظام کی مخالفت، مشرکین عرب اور اہل کتاب کے احبار و رہبان (مذہبی پیشوا) دونوں کرتے تھے۔ یہ دراصل ان کا معاشی مسئلہ تھا۔ مشرکین اس کا کھلے بندوں اعتراف و اظہار کرتے تھے۔ مذہبی پیشوا اسے مذہب کے مقدس نقاب میں چھپاتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کا نظام

مذہبی پیشوائیت کا نظامِ سرمایہ داری

سرمایہ داری، سیکولر نظام سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ سیکولر نظامِ سرمایہ داری میں، سرمایہ دار کچھ سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت کو غصب کرتا ہے لیکن مذہبی سرمایہ دار، ایک پائی کا سرمایہ لگائے بغیر عوام کا استحصال کرتا ہے۔ وہ اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں اور منتیں کرتے ہیں کہ ان کی اس نذرِ محقر کو شرفِ قبولیت عطا فرما دیا جائے۔ اس کاروبار کو برقرار رکھنے کے لئے یہ حضرات طرح طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے سابقہ آیات سے پیوستہ ان دونوں گروہوں کی تخریب کاری کو بے نقاب کر دیا جہاں کہا کہ:-

(۹/۳۴-۳۵) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ۝

علماء و مشائخ (مذہبی پیشواؤں) میں سے جنہیں لوگ خدائی درجہ دیتے ہیں، اکثر کی یہ

حالت ہوتی ہے کہ وہ جھوٹ اور فریب سے لوگوں کا مال مفت میں کھاتے ہیں۔ اُن کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں، لیکن درحقیقت اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس راستے کی طرف آنے نہ پائیں۔ اس راستے میں سب سے بڑی روک خود ان کا وجود ہے۔ اے رسولؐ! تم اُن کے اِن علماء و مشائخ کو اور ان کے ساتھ اُن لوگوں کو جو (اُن کی خود ساختہ شریعت کی آڑ میں نظامِ سرمایہ داری کو منشائے خداوندی کے عین مطابق سمجھ کر) سونے چاندی (دولت) کے ڈھیر جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے عام نہیں کرتے، الم انگیز عذاب کی خبر سنا دو (۳۴)۔

(نظامِ خداوندی کے دور میں) اس مال کو جہنّم کی آگ میں تپایا جائے گا (جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں ۷-۱۰۴/۶؛ ۱۸-۷۰/۱۷) اور اس سے ان کی پیشانیاں ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال جسے تم نے تنہا اپنے لئے جمع کر رکھا تھا (اور دوسروں کو اس سے محروم کر رکھا تھا)۔ سو جو کچھ تم نے یوں جمع کر رکھا تھا اُس کا اب مزہ چکھو (۳۵)۔

اِس مقام پر قرآنِ کریم نے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے خلاف دو جرم عائد کئے ہیں۔ ایک یہ کہ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ——— اور دوسرے یہ کہ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ ہم پہلے دوسرے جرم کو لیتے ہیں۔ دُنیا کے ہر مذہب میں مذہبی پیشواؤں کو انسان اور خدا کے درمیان وسیلہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے توسط کے بغیر خدا کی پرستش نہیں ہو سکتی۔ اُن کی وساطت کے بغیر خدا تک نہ بندوں کے نذرانے جا سکتے ہیں، نہ ان کی دعاؤں کی وہاں تک رسائی ہو سکتی ہے۔ انہیں خدا کی طرف لے جانے والے راستے کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔

دنیا کے مذاہب کا یہ عقیدہ اور مسلک ہے؛ اور ان سب کے خلاف، قرآن کا انقلاب آفریں اعلان کہ جن کے متعلق تم سمجھتے ہو کہ یہ خدا تک لے جانے والے راستے میں تمہارے قائد ہیں، درحقیقت اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہیں۔ جب تک انہیں راستے سے ہٹایا نہیں جائے گا، تم خدا تک پہنچ ہی نہیں سکو گے۔

مذہبی پیشوائیت کے خلاف

آپ نے غور فرمایا کہ یہ کس قدر عظیم انقلابی اعلان ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ انسانیت کو تباہ کرنے کے لئے تین ہی لعنتیں ہیں:

ملوکیت یا انسانوں کی حکومت (فرعون)، نظام سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان)۔ اُس نے ایک ایسا نظام قائم کیا جس میں ان تینوں کا وجود ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو یہ تینوں عذاب، ملت پر مسلط ہو گئے۔ شخصی حکومت اور نظامِ سرمایہ داری کو چھوڑیئے۔ مذہبی پیشوائیت (علماء و مشائخ) کا جال ہم پر اس وسعت اور گہرائی سے چھایا ہوا ہے کہ ہم اس کے پھندے سے نکل ہی نہیں سکتے۔ یاد رکھئے! جب تک مذہبی پیشوائیت کا وجود باقی ہے، اسلام ہمارے ہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔ (قرآن کے الفاظ میں) اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اِن کا وجود ہے۔ یہ بات ہم تک ہی محدود نہیں، انبیاء گزشتہ اور اقوامِ سابقہ کی جو تاریخ قرآن نے بیان کی ہے، اس میں آپ دیکھیں گے کہ ان کی دعوت کی سب سے بڑی مخالفت مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ نے ان کے متعلق کیا کہا تھا، اس کی تفصیل مطالب الفرقان، جلد دوم صفحہ ۱۶۳ پر گزر چکی ہے اور ان کی عام حالت اس جلد کے صفحہ ۲۲۰ پر۔ انڈکس میں مذہبی پیشوائیت اور احبار و رُہبان کے عنوانات کے تحت مزید تصریحات ملیں گی۔

قرآن نے ان کے خلاف دوسرا جُرم یہ عائد کیا ہے کہ انہوں نے مذہب کو ذریعہ معاش Profession بنا رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت ہے ہی معاشی مسئلہ۔ ان کی آمدنی کا یہ ذریعہ بند ہو جائے تو یہ اپنے لئے ایک وقت کی روٹی بھی کما نہیں سکتے۔ آپ سوچئے کہ لاکھوں، کروڑوں بے کار انسانوں کا انبوہ جو ملک کی پیداوار میں کوئی حصہ نہ لیں اور پھر محنت کشوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کریں، ملک کی تباہی کا باعث نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا! مطالب الفرقان کی سابقہ جلدوں میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ملاحظہ ہو (بالخصوص جلد اوّل (صفحات ۶۲؛ ۲۵۲)، جلد دوم (صفحہ ۱۹۴) جہاں زیرِ نظر آیت (۹/۳۴) بھی آ گئی ہے اور (صفحہ ۲۴۰) جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ خود ہی شریعت کے احکام وضع کرتے ہیں اور انہیں احکامِ خداوندی کہہ کر (فتووں کی شکل میں) عوام کے ہاتھ بیچتے ہیں۔



جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، دونوں ایک ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے دونوں کا ذکر ایک ہی آیت (۹/۳۴) میں کیا ہے اور (۹/۳۵) میں اس کی مزید تفصیل بیان کر دی ہے۔ سابقہ جلدوں میں قرآن کے معاشی نظام کے موضوع پر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ انڈکس کی

دولت جمع کرنے کے خلاف

مدد سے ان تفاصیل کو ایک بار پھر دیکھ لیجئے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآنی نظام کے مطابق مال و دولت کو جمع کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس میں ہر فرد اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق نہایت دیانتداری سے کام کرتا ہے۔ اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنے لئے بقدرِ ضرورت رکھ کر باقی سب اسلامی نظام کی تحویل میں دے دیتا ہے تاکہ اس سے دیگر حاجتمندوں کی ضروریات پوری کرے۔ لہٰذا' (اس نظام میں) کسی کے پاس زائد از ضرورت مال و دولت جمع رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کے مختلف مقامات میں' دولت جمع کرنے کو عذابِ جہنم کا مستوجب بتایا جاتا ہے۔ انہی میں ایک (زیرِ نظر) آیت بھی ہے جو مطالب الفرقان' جلد دوم صفحہ ۳۴۰ پر درج ہے۔

جب خلافت' ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو اس کے ساتھ ہی نظامِ سرمایہ داری بھی دوبارہ زندہ ہو گیا۔ لیکن اس کے راستے میں ایک رکاوٹ تھی۔ قرآنِ کریم میں مال و دولت جمع کرنے کے خلاف اس قدر کثرت سے آیا ہے کہ اس کی موجودگی میں سرمایہ داری کا جواز ملنا مشکل کیا' ناممکن تھا۔ اس کے لئے حل یہ نکالا گیا کہ جتنا جی چاہے مال و دولت جمع کرو' مگر اس میں سے سال کے بعد تھوڑے سے پیسے (بالعموم

مودودی مرحوم اور نظامِ سرمایہ داری

اڑھائی فیصد) "خدا کی راہ میں" دے دو تو باقی مال حلال و طیب ہو جاتا ہے۔ اسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

یہ عقیدہ و مسلک کیسے پیدا کیا گیا تھا' اس کے متعلق مطالب الفرقان' جلد دوم (صفحہ ۲۰۹) دیکھئے۔ اسے "اسلام کا معاشی نظام" کہہ کر پکارا جاتا ہے' اور جس کا ہمارے زمانے میں سب سے زیادہ پروپیگنڈا مودودی مرحوم نے کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مطالب الفرقان' جلد سوم صفحہ ۴۷۶)۔

اب اسلام نام رہ گیا ہے (۱) ہزار سال پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ فقہی احکام کا' جس کی اجارہ دار مذہبی پیشوائیت ہے اور (۲) نظامِ سرمایہ داری کا۔ یہ (انسانوں کا خود ساختہ اسلام) زمانے کے تقاضوں سے رفتہ رفتہ مٹتا جا رہا تھا' لیکن اسے پاکستان میں حیاتِ نو عطا کی جا رہی ہے۔ مغرب کی استعمار پرست مملکتیں Fundamentalism کا فریب انگیز نام دے کر اس کی اس حیاتِ نو کے لئے تقویت کا موجب بن رہی ہیں[1]۔ اقبالؒ نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

---

[1] یہ سطور وسط ۱۹۸۳ء میں لکھی جا رہی ہیں۔

چنیں دَورِ آسماں کم دیدہ باشد　　کہ جبریلِ امیں را دل خراشد
چہ خوش دَیرے بنا کردند آنجا　　پرستد مومن و کافر تراشد

(ارمغانِ حجاز)

اسلام کے صدرِ اوّل میں اسلام کے خلاف جو کچھ ایران نے کیا تھا' اب وہی کچھ مغرب کی قوتیں کر رہی ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب" شاہکارِ رسالت" کا آخری باب)۔

قریش کے ہاں کوئی منظم مذہب تو نہیں تھا' لیکن کعبہ کی تولیت کے سلسلہ میں وہ جن رسوم وآداب کے پابند تھے' انہیں مذہبی تقدس سا حاصل تھا۔ اور جن قبائل کے سپرد وہ ذمہ داریاں تھیں' اُن کا منصب مذہبی پیشواؤں کا سا سمجھا جاتا تھا۔ یہود ونصاریٰ کے تذکرہ کے تسلسل میں اُس نے قریش کے مذہبی پیشواؤں کے کاروبار کی بھی ایک جھلک دکھائی ہے۔ اسی کا تعلق نسیٔ کی رسم سے تھا جس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد سوم (صفحہ ۲۳۱) میں آچکی ہے۔ آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں گے تو ذیل کی آیات کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

نسیٔ کی رسم

(۹ / ۳۶-۳۷) اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوۡرِ عِنۡدَ اللّٰهِ اثۡنَا عَشَرَ شَهۡرًا فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ مِنۡهَاۤ اَرۡبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰ لِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظۡلِمُوۡا فِيۡهِنَّ اَنۡفُسَكُمۡ ‌ وَقَاتِلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ كَآفَّةً ‌ ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ۝ اِنَّمَا النَّسِىۡٓءُ زِيَادَةٌ فِى الۡكُفۡرِ‌ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يُحِلُّوۡنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوۡنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوۡا

عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۟ۧ

(یہ ہیں ـــــ مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے ـــــ وہ باطل نظام جنہیں ختم کرنے کے لئے خدا کا یہ نور ـــ قرآن ـــ اور اس کا رسولؐ آیا ہے. اس مقصد کے لئے عندالضرورت جنگ بھی کرنی پڑے گی. اس سلسلہ میں چند تمہیدی اصول پھر سُن لو. سب سے پہلے یہ کہ) جنگ مسلسل جاری نہیں رکھی جائے گی. (بین الاقوامی معاہدات کی رُو سے) سال میں چار مہینے ضرور ایسے رکھے جائیں جن میں جنگ ملتوی کردی جائے (۲/۲۱۷). (جب ایک دفعہ جنگ ملتوی کر دی جائے تو اس سے مشتعل جذبات میں سکون پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر و بیشتر ایسا ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد جنگ ختم ہو جاتی ہے) یہ محکم قانون ہے اس کی پابندی ضرور کرو.

قاعدہ تو تمہارے ہاں اب بھی یہ موجود ہے لیکن تم اس سلسلہ میں کرتے یہ ہو کہ (ہر تیسرے سال ایک مہینہ کا اضافہ کر کے) بارہ مہینوں کے بجائے تیرہ مہینوں کا سال بنا لیتے ہو اور پھر اُن مہینوں میں گڑبڑ کر دیتے ہو جن میں جنگ روک دی گئی ہے (۳۷).

یہ غلط ہے. اِس سے وہ مقصد فوت ہو جاتا ہے جس کے لئے ان مہینوں میں جنگ کو ناجائز قرار دیا گیا ہے. یہ مہینے متعین ہونے چاہئیں اور ہر ایک کو معلوم ہو. اس کے لئے تم کرو یہ کہ سال کے بارہ مہینے ہی شمار کرو (کبھی بارہ اور کبھی تیرہ کا حساب مت رکھو). یہ چیز اُس قانونِ فطرت کے مطابق ہے جو خدا نے تخلیقِ ارض و سماء کے وقت مقرر کیا تھا (یعنی زمین، سورج کے گرد ایک سال میں چکر پورا کرتی ہے. اس مدت کی تقسیم بارہ ماہ سے کر لینی چاہیئے). سو، ان مہینوں میں گڑبڑ مچا کر خواہ مخواہ اپنے اوپر زیادتی مت کرو. تم (اے جماعتِ مومنین) ان مہینوں کو چھوڑ دو اور باقی سال میں، ان مخالفین سے پورے زور سے

جنگ کرو، جس طرح یہ تم سے پوری شدّت سے جنگ کرتے ہیں۔ اس میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ لیکن جنگ میں بھی قوانینِ خداوندی کو نظر انداز نہ ہونے دو۔ یاد رکھو' خدا کی تائید و نصرت اُنہی کے ساتھ ہوتی ہے جو ہر حال میں اُس کے قوانین کی نگہداشت کرتے ہیں اور کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتے (۳۶)۔

یاد رکھو! جن مہینوں میں جنگ کرنا جائز قرار دیا جائے' انہیں اپنی جگہ سے ہٹا دینا' معاہدات کا عملی انکار اور بین الاقوامی قانون سے سرکشی ہے۔ اور بہت بڑی سرکشی۔ یہ لوگ کرتے یہ ہیں کہ ایک ہی مہینے کو ایک سال جنگ کے لئے جائز قرار دیتے ہیں اور دوسرے سال اسے ناجائز ٹھہرا دیتے ہیں۔ اس طرح ان مہینوں کی گنتی تو پوری کر لیتے ہیں جن میں خدا نے جنگ کو حرام قرار دیا ہے، لیکن مہینوں کو اِدھر اُدھر کر دینے سے' عملاً خدا کے حرام قرار دیئے ہوئے کو حلال ٹھہرا دیتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ اس سے ہم کسی جُرم کے مرتکب نہیں ہوتے — بلکہ اسے بڑی خوبی کی بات خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ سیدھی سی بات ہے کہ جو امور ایک مرتبہ بین الاقوامی طور پر طے پا جائیں' کسی ایک قوم کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ خود ہی ان میں تغیّر و تبدّل کرلے۔ اس قسم کی قوم پر' جو ایسی حرکات کی مرتکب ہو' کبھی کامیابی کی راہ کشادہ نہیں ہوتی (۳۷)۔

ناپختہ ایمان والے مُسلمان

ابتدائے اسلام میں جماعتِ مومنین میں، ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جن کا ایمان ہنوز پختہ نہیں ہُوا تھا۔ ان کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ابھی مومن نہ کہیں۔ سورۃ الحجرات میں ہے: قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ (۴۹/۱۴)— "یہ اعراب (بدو) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ان سے کہو کہ وہ ایسا نہ کہیں بلکہ یوں کہیں کہ ہم نے مملکتِ اسلامیہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ اس لئے کہ ابھی تک ایمان اُن کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔" یہ تھے وہ لوگ جو مشقت طلب مہمات میں شامل ہونے سے ہچکچاتے تھے۔ آیات نمبر ۳۸ لغایت نمبر ۴۲ میں روئے سخن انہی کی طرف ہے۔

فرمایا:

(۹/۳۸) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ

سَبِيلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْاَرْضِ ۚ اَرَضِيتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيلٌ ○

اے جماعتِ مومنین! (معاشرہ میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ) دنیاوی مفاد کی خاطر جنگ کرنے کے لئے تو وہ ہر وقت آمادہ ہوں گے، لیکن) جب ان سے کہا جائے کہ وہ حق و صداقت کی راہ میں جنگ کے لئے نکلیں تو اُن کے پاؤں من من بھر کے ہو جاتے ہیں. زمین سے اُٹھتے ہی نہیں. ان سے کہو کہ کیا تم بلند انسانی مفاد اور مستقل اقدار کو چھوڑ کر، طبعی زندگی کے مفاد کو پسند کرتے ہو؟ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ طبعی زندگی کے مفاد کتنے ہی گراں بہا کیوں نہ دکھائی دیں، وہ انسانی زندگی اور مستقبل کی خوشگواریوں کے مقابلہ میں متاعِ قلیل ہوتے ہیں.

اس کے بعد ہے:

(۹/۳۹) اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

ان سے واضح الفاظ میں کہہ دو کہ اگر تم نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کی خاطر جنگ کے لئے نہیں نکلو گے، تو اس کا نتیجہ تمہارے لئے بڑا الم انگیز ہو گا، یعنی خدا اپنے قانونِ استخلاف و استبدالِ اُمم کے مطابق تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو متمکن کر دے گا (۴۷/۳۸؛ ۴/۶) اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکو گے. یاد رکھو! خدا کی ہر بات اس کے مقرر کردہ قانون اور ضابطہ کے مطابق ہوتی ہے جس پر اسے پوری پوری قدرت حاصل ہے. (اس کا قانون یہ ہے کہ زمین کی وراثت اُسی قوم کے حصے میں آتی ہے جس میں اس کی صلاحیت ہو (۲۱/۱۰۵).

قرآنِ مجید میں قانونِ استبدال و استخلافِ اقوام کے متعلق بڑی وضاحت سے آیا ہے. انڈکس سے متعلقہ مقامات دیکھئے. اس کے بعد اُن سے کہا کہ اگر تم ان مہمات میں رسولؐ کا ساتھ نہ دو گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مشن ناکام رہ جائے گا. خدا نے اس کی مدد ایسے حالات میں بھی کی ہے جب یہ رسولؐ (بظاہر) بے یار و مددگار تھا؛

(۹/۴۰) اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۗ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

اگر تم (نظامِ خداوندی کے سلسلہ میں) رسولؐ کی مدد نہیں کرتے (تو نہ کرو). خدا نے اس کی مدد اس زمانے میں کی تھی (جب وہ بظاہر بے یار و مددگار تھا) جب کفار نے اسے گھر سے باہر نکال دیا تھا. اس حالت میں کہ اُس کے ساتھ، صرف اُس کا ایک رفیق تھا. وہ دونوں اپنی حفاظت کے لئے غار میں چھپے بیٹھے تھے (اور دشمن تعاقب میں تھا. ایسی مایوسی کے عالم میں بھی اُسے خدا کی نصرت پر ایسا محکم یقین تھا کہ جب اس کا رفیق، اس خیال سے کہ رسولؐ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے، متردد دکھائی دیا، تو) اُس نے اُس سے دل کے پورے اطمینان سے کہا کہ مت غمگین ہو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے. اضطراب انگیز حالات میں اللہ نے اپنے رسولؐ کو سکون و قرار عطا فرمایا تھا. (اس کے بعد بدر کے میدان میں جب حالات سخت ناساعد تھے) ایسے لشکروں سے اُس کی مدد کی جنہیں تم نہیں دیکھ سکتے تھے (۹/۲۶). اس طرح اُس نے مخالفین کو سرنگوں کر دیا. اس کے بعد تم دیکھ رہے

ہو کہ نظامِ خداوندی کو کس طرح سرفرازی و سربلندی، غلبہ و تسلط حاصل ہوتا چلا جا رہا ہے. اس نظام میں تدابیر اور قوت دونوں موجود ہیں ــــــ نصب العین اس قدر بلند، بازوؤں میں قوت، ذہن میں حسنِ تدابیر کی صلاحیت، اس کے بعد کامیابی کے لئے اور کس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے ؟ (یاد رکھو! کامیابی سے مراد ہے دینِ خداوندی کا غالب آنا اور ہر نظامِ باطل کا مغلوب ہونا. اسلام میں جنگ سے بھی یہی مطلوب و مقصود ہے نہ کہ جوعِ الارض).

ہجرت کا واقعہ ہجرت کے متعلق تفصیل کے ساتھ مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۵۲ - ۴۵ ؛ صفحہ ۳۰۸ پر لکھا جا چکا ہے. ملائکہ کی مدد کے متعلق مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۲۰۵ - ۲۰۴ پر، نیز آیت (۹/۲۶) کے تحت سابقہ صفحات میں اور اسلامی جنگ کا مقصد چار لفظوں میں بیان کر دیا، وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ــــــ

" ہر غیر خداوندی نظام (کفر) مغلوب ہو جائے اور نظامِ خداوندی غالب آ جائے. اور یہ کامیابی، قوت اور حکمت دونوں کی رُو سے حاصل ہو کیونکہ خدا عزیز بھی ہے اور حکیم بھی."

اس کے بعد ان مذبذبین کے متعلق کہا کہ

(۹/۴۲) لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلَٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ع

(باقی رہے یہ ڈھلمل یقین کے لوگ، سو ان کی حالت یہ ہے کہ) اگر تم انہیں ایسی لڑائی کے لئے کہتے جس میں انہیں فائدہ پڑا نظر آ جاتا اور سفر بھی زیادہ صعوبت انگیز نہ ہوتا، تو یہ ضرور تمہارے پیچھے چل پڑتے. لیکن اب ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ سفر انہیں بڑا لمبا اور پُر مشقت نظر آتا ہے. (اصل بات تو یہ ہے. لیکن یہ طرح طرح کی بہانہ سازیاں کریں گے

اور) قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم میں اس کی استطاعت ہوتی تو ہم ضرور آپ کے ساتھ چلتے۔ یہ لوگ اس قسم کی منافقانہ باتوں سے اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں (کسی کا کچھ نہیں بگاڑ رہے)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ سراسر جھوٹ بول رہے ہیں۔

آیت کے آخری الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ ان (مذبذبین) میں منافق بھی شامل تھے۔ بہرحال یہ جو بھی تھے، قرآن کریم نے جماعتِ مومنین کے متعلق ارشاد فرمایا:

(۹/۴۱) انْفِرُوا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○

(لہٰذا، اے جماعتِ مومنین! تم اس کا خیال نہ کرو کہ تم مخالفین کے مقابلہ میں کچھ ہلکے ہو) تم ہلکے ہو یا بھاری، تم فراخی کی حالت میں ہو یا تنگی کی، تمہارے پاس اسلحہ بھی پورا ہے یا نہیں، تم ان باتوں سے نہ گھبراؤ۔ تم باہر نکل پڑو اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے، سرتوڑ کوشش کرو (تمہارا یقینِ محکم اور ثبات و استقامت تمہاری کمیوں کو پورا کر دے گا)۔ اگر تم بات کو اچھی طرح سمجھ لو تو تمہارا مقابلہ کے لئے نکل کھڑے ہونا، تمہارے لئے بہتر ہے۔

تاریخ کا بیان ہے کہ یہ آیات (اور ان کے بعد اسی مضمون کی دیگر آیات) کا تعلق جنگِ تبوک سے ہے۔ عہدِ نبویؐ میں اُس وقت تک جتنی جنگیں ہوئی تھیں ان کا سلسلہ اندرونِ عرب تک محدود تھا۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوتوں کو دیکھ کر رومی سلطنت کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ اس قوت کو یہیں روک دینا چاہیئے مبادا یہ بڑھتے بڑھتے ان تک بھی جا پہنچے۔ غسانیوں کا عیسائی خاندان رومی مملکت کے زیرِ اثر شام پر حکمران تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اس خاندان کو متعین کیا۔ انہوں نے اس مہم کے لئے بڑی تیاریاں شروع کیں، جن کی خبریں مدینہ تک بھی پہنچیں اور عرب کے دیگر علاقوں میں بھی عام ہوئیں۔ اب مداخلت ضروری تھی۔ اس لئے حضورؐ نے مجاہدین کو

جنگِ تبوک

تیاری کا حکم دیا۔ موسم سخت گرم تھا اور سُوءِ اتفاق کہ ملک میں قحط پڑ رہا تھا۔ اس لئے جنگ کے لئے حالات سخت ناسازگار تھے۔ لیکن مہم کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا یہ معرکہ اخلاص و منافقت اور ایمان کی پختگی اور ناپختگی کی کسوٹی بن گیا۔ سورۃ توبہ کی بیشتر آیات کا تعلق اسی سے ہے۔ اس کی ابتداء آیت (۹/۴۲) سے ہوئی۔ جنگ کی تیاری کا حکم ہوا تو یہ اعراب اور منافقین مختلف قسم کے (جھوٹے) عذر لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے کہ انہیں پیچھے رہ جانے کی اجازت دی جائے۔

منافقین کے متعلق مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۲۲۳ پر بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہہ دیا تھا کہ ہم نہیں بتائیں گے کہ ان میں سے کون کون منافق ہے۔ تمہیں انہیں اپنے قیاس سے خود پہچاننا ہوگا (۴۷/۳۰)۔ جنگِ تبوک کے سلسلے میں جو لوگ (جھوٹے) عذر پیش کر کے جنگ سے مستثنیٰ رہنے کی اجازت طلبی کے لئے حاضر ہوئے تھے (معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے) انہیں اجازت دے دی۔ اس پر ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

(۹/۴۳) عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ○

تم نے (اے رسولؐ!) ان کی منافقانہ عذرداریوں کو سچا سمجھ کر) انہیں پیچھے رہنے کی اجازت دے دی۔ (تم نے کشادہ نگہی سے کام لیا، لیکن ان کی نیت نیک نہیں تھی۔ بہرحال) اللہ نے اسے درگزر کر دیا ہے۔ (اگر تو ذرا توقف کرتا تو) تجھ پر آشکارا ہو جاتا کہ تمہاری جماعت میں کون سچا ہے اور کون جھوٹی عذرداریاں کرتا ہے۔

فیصلہ کے اعتبار سے تو یہ بات اتنی اہم نہیں، لیکن اس میں ایک نکتہ پوشیدہ ہے جو بڑا اہم اور اصولی ہے۔ انڈکس میں آپ "رسول" کے عنوان کے تحت دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی نبوی حیثیت اور بشری حیثیت میں نمایاں طور پر فرق کر دیا ہے۔ نبی کی حیثیت سے آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی جس میں آپ کی اپنی مرضی یا خیال یا خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کے بعد آپؐ جو کچھ ارشاد فرماتے یا فیصلے کرتے، وہ آپ کی بشری

حضورؐ کا اجتہادی سہو

حیثیت سے تھا جس میں اجتہادی سہو کا امکان تھا. قرآنِ کریم میں (زیرِ نظر آیت کے علاوہ) دیگر مقامات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے. لیکن ہمارے ہاں جب دین، مذہب سے بدلا تو یہ عقیدہ وضع ہوا کہ حضورؐ اپنی زندگی کے ہر سانس میں نبی تھے. حضورؐ کا ہر قول، ہر عمل، ہر فیصلہ وحی کی رُو سے ہوتا تھا (اس موضوع پر ہم، وحی کے عنوان کے تحت سابقہ جلدوں میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں). زیرِ نظر آیت بھی ان کے اس عقیدہ کی تردید کرتی ہے. ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کا (ان لوگوں کو اجازت دینے کا) فیصلہ وحی کی رُو سے ہوتا تو خدا کی طرف سے تادیب کیوں ہوتی؟

اس کے بعد متعدد آیات میں منافقین کی اسی قسم کی حرکات کا ذکر ہے. ہم ان آیات اور ان کے مفہوم کے درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، بجز اس کے جہاں کوئی نکتہ تشریح طلب ہو.

(۹/۴۴) لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ فی الواقع اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ ہم اپنے مال و جان سے جہاد کرنے سے معذور ہیں، اس لئے ہمیں اجازت دے دی جائے کہ ہم جنگ میں شریک نہ ہوں (وہ تو ایسے مواقع کے آرزومند رہتے ہیں). اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جو اپنے فرائض کی نگہداشت کرتے ہیں (اور کون ہیں جو ان سے جی چراتے ہیں).

(۹/۴۵) اِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ۝

اس قسم کی اجازتیں وہی لوگ مانگا کرتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر سچے دل سے یقین

نہیں رکھتے۔ حیاتِ آخرت اور مکافاتِ عمل پر ایمان رکھنے والا موت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ ان کے دلوں میں شکوک ہیں اور اسی وجہ سے وہ متذبذب ہیں۔ (ورنہ ایمانِ محکم کے بعد عمل میں تذبذب کیسا؟)۔

(۹/۴۶) وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ○

(یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ) اگر ان کی نیت جنگ میں شرکت کی ہوتی تو یہ (کچھ نہ کچھ) سفر کی تیاریاں کرتے ــــ اور یہ اچھا ہی ہے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ نہ جانے کا ہی فیصلہ کر لیا اور پیچھے رُک گئے۔ ورنہ اگر یہ مزید منافقت برتتے اور ساتھ چل پڑتے تو نظامِ خداوندی کے حق میں یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی (اس کا نتیجہ نقصان رساں ہوتا)۔

(۹/۴۷) لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْ اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ○

یہ، بجز اس کے، کچھ نہ کرتے کہ تمہاری جماعت میں انتشار پیدا کرتے۔ تمہیں مصیبت میں ڈالنے کے لئے بھاگے بھاگے پھرتے۔ ہر طرح کی خرابی کے لئے کوشش کرتے۔ اور (تم جانتے ہو کہ، تمہارے اندر ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کی باتوں پر دھیان دھرنے والے ہیں (یا خود ان کے جاسوس ہیں)۔ اس لئے ان کا تمہارے ساتھ جانا تمہارے لئے بڑی خرابی کا موجب ہوتا۔ خدا خوب جانتا ہے کہ کون لوگ ظلم و زیادتی کرنے والے ہیں۔

(۹/۴۸) لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ○

(ان کی یہ حرکتیں کچھ نئی نہیں) اس سے پہلے بھی یہ لوگ فتنہ انگیزی کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے تمہارے خلاف ہر قسم کا الٹ پھیر کر کے دیکھ لیا ہے۔ ان سب کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہی کہ حق آگے بڑھ گیا، خدا کا نظام غالب آگیا اور یہ کڑھتے ہی رہ گئے۔

(۹/۴۹) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ○

ان میں وہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے رہنے کی اجازت دے دیجئے۔ مجھے مصیبت میں نہ ڈالئے۔ (ایسے لوگوں کو اس کا احساس نہیں کہ یہ اپنی حرکات سے) مصیبت میں تو پہلے ہی پڑے ہوئے ہیں (منافق کی زندگی راحت اور اطمینان کی زندگی تھوڑی ہوتی ہے؟) جہنم کی آگ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور اس میں پڑے جل بھن رہے ہیں۔

(۹/۵۰) اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ○

ان کی یہ حالت ہے کہ اگر تمہیں کوئی خوشگوار واقعہ پیش آتا ہے تو وہ ان پر بہت شاق گزرتا ہے۔ اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے، تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے ہی دور اندیشی سے کام لے کر اپنا انتظام کر لیا تھا۔ یہ کہہ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔

(۹/۵۱) قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

ان سے کہو کہ ہمیں جو واقعہ بھی پیش آئے گا، قانونِ خداوندی کے مطابق پیش آئے گا (دنیا میں سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے)۔ وہی ہمارا کارساز و کارفرما ہے ——— اور ایک ہم ہی پر کیا موقوف ہے، جو لوگ بھی اس کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں، انہیں اس پر پورا پورا بھروسا رکھنا چاہیئے۔

(۹/۵۲) قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۖ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ○

ان سے کہہ دو کہ تم ہمارے متعلق دو ہی باتیں سوچ سکتے ہو ——— یا ہم میدانِ جنگ میں مارے جائیں اور یا فاتح و منصور واپس آئیں۔ ہمارے لئے یہ دونوں باتیں بڑی خوشگوار ہیں۔ اس کے برعکس، ہم تمہارے متعلق اس کا انتظار کرتے ہیں کہ تم پر قانونِ خداوندی کے مطابق کہیں باہر سے کوئی تباہی آجائے یا خود ہمارے ہاتھوں سے تمہیں سزا مل جائے۔ سو تم اپنے خیال کے مطابق انتظار کرو اور ہم اپنے اس تصور کے مطابق انتظار کرتے ہیں۔ پھر دیکھو نتیجہ کیا نکلتا ہے! تم میدانِ جنگ میں شکست کھا جاؤ گے (۹/۱۴)۔ مال و دولت وجہِ عذاب بن جایا کرتے ہیں (۹/۵۵؛ ۹/۸۵)۔

(۹/۵۳) قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۖ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ○

(اور اگر یہ منافق چاہتے ہیں کہ) طوعاً و کرہاً کچھ مالی امداد دے کر جنگ میں جانے سے بچ جائیں، تو ان سے کہہ دو کہ تمہاری مالی امداد ہرگز قبول نہیں کی جائے گی، اس لئے کہ تم صحیح راستے کو چھوڑ کر، غلط راہوں کی طرف نکل گئے ہو۔

(۹/۵۴) وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ○

ان سے کہہ دو کہ ان کی مالی امداد قبول نہ کئے جانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دعویٰ ایمان صرف زبانی ہے یہ درحقیقت خدا اور اس کے رسول پر ایمان نہیں رکھتے، ان سے انکار کرتے ہیں۔ تمہارے صلوٰۃ کے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں تو مارے 'بندھے' محض دکھاوے کی خاطر (۴/۱۴۲) اور ایسے رسمی طور پر جس سے کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہ ہو (۵/۱۰۷)۔ اور اگر مالی امداد دیتے ہیں تو بطیب خاطر نہیں، بلکہ سخت مجبوری اور ناگواری سے۔ (لہٰذا، ایسے لوگ اس نظام کے ارکان کیسے بن سکتے ہیں جس نظام کی ساری عمارت دل کی رضا و رغبت پر استوار ہوتی ہے)۔

اس آیت (۹/۵۴) میں کہا ہے کہ ان منافقین کی صلوٰۃ "کسالیٰ" ہوتی ہے۔ اس کی تشریح مطالب القرآن جلد چہارم میں صفحہ ۲۲۹ پر گزر چکی ہے۔ اسے ایک بار پھر دیکھ لیجئے، کیونکہ پیش کردہ نکتہ بڑا اہم ہے جس کا اطلاق ہماری نمازوں پر بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔

اس کے بعد پھر متعدد آیات میں منافقین کا مزید ذکر ہے:

(۹/۵۵) فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ

اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○

اِس میں شبہ نہیں کہ ان کے پاس مال و دولت بھی بہت ہے اور ان کے افرادِ خاندان کی تعداد بھی کثیر ہے جس کی وجہ سے ان کا جتھہ کافی بڑا ہے۔ لیکن یہ باتیں تمہارے لئے وجہ تعجب نہیں ہونی چاہئیں۔ یہی چیزیں تو ہیں جو انہیں نظامِ خداوندی کی طرف آنے نہیں دیتیں۔ اس لئے انہی کی وجہ سے ان کی دنیاوی زندگی ان کے لئے وبالِ جان بن جائے گی اور یہ اپنے آپ کو کفر ہی کی خاطر ہلاک کریں گے (۹/۵۵)۔

(۹/۵۶) وَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ○

یہ لوگ خدا کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ وہ تمہیں میں سے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تم میں سے نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ بڑے بزدل ہیں (اور منافقت برتنا ہی وہ ہے جو بزدل ہو) اس لئے اپنے آپ کو تم ہی سے ظاہر کرتے ہیں۔

(۹/۵۷) لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَ هُمْ يَجْمَحُوْنَ ○

ان کی حالت یہ ہے کہ اگر انہیں کہیں پناہ گاہ مل جائے یا کوئی غار یا کسی قسم کا اور چھپنے کا مقام نظر آجائے تو یہ تمہارا ساتھ چھوڑ کر اُس کی طرف یوں لپک کر چلے جائیں جیسے کوئی جانور رسّہ تڑا کر بھاگ رہا ہو۔ (اگر یہ تمہارے ساتھ ہیں تو محض اس لئے کہ انہیں کہیں اور پناہ کی جگہ نظر نہیں آتی)۔

مالی معاملات میں الزام کمینہ فطرت مخالفین کا سب سے ذلیل حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مخالف جماعت، بالخصوص اُس کے سربراہ کے خلاف، مالی معاملات میں خیانت کا (جھوٹا) الزام لگا دیتے ہیں۔ اس الزام کے نتائج جس قدر زود رس ہو سکتے ہیں ظاہر ہے ....

اگلی آیت میں ان کے اس کمینہ حربہ کا ذکر کیا گیا ہے:

(۹/۵۸) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ○

(ان میں بعض لوگ بڑی کمینہ حرکات تک اتر آتے ہیں. مثلاً) وہ تمہارے خلاف یہ الزام تراشتے ہیں کہ تم نے صدقات کی تقسیم میں دیانت داری سے کام نہیں لیا (مقصد ان کا اس سے یہ ہے کہ اس طرح تمہاری جماعت میں افتراق اور بدظنی پیدا ہو جائے). حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ اگر تو انہیں، اُن کے حق سے کچھ زیادہ دے دیتا تو یہ بہت خوش ہو جاتے (اور پھر تمہاری تقسیم، عین مطابقِ حق وانصاف قرار پا جاتی). لیکن چونکہ تم نے انہیں زیادہ نہیں دیا، اس لئے اس طرح بگڑ بیٹھے ہیں (اور الزامات تراش کر اپنا غصہ نکال رہے ہیں).

اس کی وضاحت مطالب الفرقان، جلد اوّل (صفحہ ۲۱۲) میں کی جا چکی ہے. اس کے برعکس صحیح شیوہ یہ ہونا چاہیئے تھا:

(۹/۵۹) وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ○ۧ

ان کے لئے کیا ہی اچھا ہوتا کہ انہیں، نظامِ خداوندی کی طرف سے جو کچھ حصۂ رسدی ملا تھا، اس پر مطمئن ہو جاتے (۷/ ۵۹) اور کہتے کہ جو کچھ ہمیں، قاعدے اور قانون کے مطابق ملا ہے، وہ ہمارے لئے کافی ہے. اس کے بعد ہمیں نظامِ خداوندی بہت کچھ دیگا.

ہم اپنے دل کی پوری کشادہ اور ارادے کی وسعت کے ساتھ اس نظام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اس میں جو کہا گیا ہے ـــــ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ـــــ تو اس کا صحیح مفہوم (بلکہ یوں کہئے کہ مروجہ غلط مفہوم کی تردید) سورۃ انفال کی آیت (۸/۴۱) کے تحت گزر چکی ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ صدقات کے مصارف کیا ہیں؛

(۹/۶۰) اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

صدقاتؔ[1] کے متعلق (یعنی اُس مال کے متعلق جسے مملکت رفاہِ عامہ کے لئے صرف کرتی ہے) یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی تقسیم کسی کے ذاتی مفاد یا انفرادی جذبات کی تسکین کے لئے نہیں ہوگی۔ یہ درحقیقت اُن لوگوں کا حق ہے:

۱۔ جو اپنی نشوونما کے لئے دوسروں کے محتاج ہوں، یعنی کسی وجہ سے خود کمانے کے قابل نہ ہوں۔
۲۔ جن کا چلتا ہوا کاروبار یا نقل و حرکت (کسی وجہ سے) رُک گئی ہو۔
۳۔ جو لوگ صدقات (مملکت کی اس آمدنی) کی وصولی پر مامور ہوں (ان کی کفالت کے لئے)۔

---

[1] یہ احکام اُس زمانے سے متعلق ہیں جب ہنوز اسلامی نظامِ مملکت مکمل طور پر متشکل نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت کسی ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جو عطیات وصول کئے جاتے تھے انہیں صدقات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ آجکل ہمارے ہاں ان مدات کو "زکوٰۃ" کی مدات سمجھا جاتا ہے جو صحیح نہیں۔ قرآن کریم کے پیش کردہ معاشی نظام کی رُو سے مملکت کی ساری آمدنی "زکوٰۃ" ہے کیونکہ اسے نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے صرف کیا جاتا ہے ("ایتائے زکوٰۃ" کے معنی نشوونما دینا ہے) جسے آجکل زکوٰۃ کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔

۴۔ جن کی تالیفِ قلوب مقصود ہو (یعنی جو لوگ ویسے تو نظامِ خداوندی کی طرف آنے کے لئے تیار ہوں لیکن بعض معاشی موانع اُن کے راستے میں اس طرح حائل ہوں کہ وہ انہیں اس طرف آنے نہ دیں۔ اُن موانع کے دُور کرنے میں اُن کی امداد کی جائے۔
۵۔ جو لوگ دوسروں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں، انہیں آزادی دلانے کے لئے۔
۶۔ ایسے لوگ جو دشمن کے تاوان یا قرض کے بوجھ کے نیچے اس طرح دب گئے ہوں کہ اس کا ادا کرنا اُن کے بس میں نہ ہو۔
۷۔ نیز، اُن باہر سے آنے والوں کا جنہیں مالی امداد کی ضرورت لاحق ہو جائے۔
۸۔ ان کے علاوہ، اور جو کام بھی نظامِ خداوندی کے لئے مفید اور نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ممد و معاون ہوں، انہیں سرانجام دینے کے لئے یہ خدا کے ٹھہرائے ہوئے ضوابط ہیں اور اللہ کے ٹھہرائے ہوئے ضوابط علم و حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

قرآنِ کریم کے معاشی نظام کی رُو سے، تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشو و نما مہیا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں الزکٰوۃ کہا جاتا ہے۔ یہ اسلامی مملکت کی ساری کی ساری آمدنی کو محیط ہو گی۔ جہاں تک افراد کی کمائی کا تعلق ہے، وہ اس میں سے اتنا لیں گے جو ان کی ضروریات کی کفایت کرے۔ اس سے زیادہ مملکت کی تحویل میں دے دیں گے تاکہ وہ اس سے اپنی "زکٰوۃ" کی ذمہ داریوں کو پورا کرے (تفصیل اِن امور کی سابقہ جلدوں میں، معاشی نظام 'زکٰوۃ اور صدقات' کے عنوان میں گزر چکی ہے)۔ یہ اُس وقت ہو گا جب اسلام کا معاشی نظام قائم ہو جائے گا۔

جب یہ نظام ہنوز قائم نہیں ہو گا (زیرِ تکمیل ہو گا) اُس زمانے میں اصحابِ ثروت، اس نظام کے قیام کے لئے عطیات دیں گے۔ اُس وقت اس نظام کی آمدنی کی مدات یہ ہوں گی: مالِ غنیمت (انفال بھی اس میں شامل تھا) اور اصحابِ ثروت کے عطیات۔ ان عطیات کو صدقات کہہ کر پکارا گیا ہے (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد سوم (صفحہ ۴۹۱)۔ سابقہ آیات میں منافقین نے انہی صدقات کی تقسیم کے سلسلہ میں حضورؐ کے

صدقات کے مصارف نہ کہ زکٰوۃ کے

خلاف الزام تراشی کی تھی۔ زیرِ نظر آیت میں انہی صدقات کے مصارف کا ذکر ہے۔ جب اسلام کا معاشی نظام قائم ہو گیا تو پھر صدقات کی ضرورت نہ رہی۔ اُس وقت ہر فرد کی زائد از ضرورت کمائی مملکت کی تحویل

میں چلی جاتی تھی، لہٰذا، نہ اُن کے پاس صدقات دینے کے لئے کچھ رہتا تھا، نہ ایسے محتاج ہوتے تھے جن کی مدد کے لئے (انفرادی طور پر) صدقات دیئے جاتے۔

لیکن جب دینؔ، مذہب سے بدل گیا اور زکوٰۃ نام رہ گیا اُس ۲½ فیصد کا جو اپنی جمع شدہ دولت میں سے خیرات کے طور پر نکال دیا جاتا ہے تو قرآن نے جو مصارف صدقات کے بتائے تھے اُن کے متعلق کہہ دیا کہ وہ زکوٰۃ کے مصارف ہیں، حالانکہ قرآن نے نہ زکوٰۃ کو صدقات کہا ہے، نہ زکوٰۃ کے مصارف متعیّن کئے ہیں۔ قرآن نے جسے زکوٰۃ کہا ہے، اس کے مصارف متعیّن کئے ہی نہیں جا سکتے۔ اس کے مصارف اسلامی مملکت کا بجٹ مقرر و متعیّن کرے گا اور یہ ظاہر ہے کہ اس بجٹ میں حسبِ ضرورت تبدیلی ہوتی رہے گی۔

لیکن ہمارے ہاں، صدقات کے انہی مصارف کو زکوٰۃ کے مصارف کہا جاتا ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ قرآن نے یہ مصارف، صدقات کے بتائے ہیں، انہیں زکوٰۃ کے مصارف کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے!

آپ نے غور فرمایا کہ جب دینؔ کو مذہب میں تبدیل کیا گیا تو اسے کس کس قسم کے مقدس نقاب اوڑھائے گئے!

قرآنِ کریم نے صدقات کے جو مصارف بتائے ہیں، ان کی تشریح مفہوم سے ہو گئی ہو گی۔ حوالوں کے لئے حسبِ ذیل مقامات دیکھئے:

۱۔ فقراء (۲/۲۷۳؛ ۲/۲۷۱؛ ۵۹/۸) — ۲۔ مساکین (۹۰/۱۶؛ ۲/۱۷۷؛ ۴/۳۶؛ ۱۷/۲۶؛ ۳۰/۳۸ و ۵۹/۷)۔

۳۔ ابن سبیل (۲/۱۷۷؛ ۴/۳۶؛ ۱۷/۲۶؛ ۳۰/۳۸؛ ۵۹/۷) — ۴۔ فی الرّقاب (فكّ رقبة ۹۰/۱۳)۔

اس فہرست میں "فی الرّقاب" خصوصیت سے غور کے قابل ہے۔ سورۃ البلد میں دین کے جو بنیادی فرائض بتائے گئے ہیں، ان میں سرِفہرست "فَكُّ رَقَبَةٍ" ہے (۹۰/۱۳) یعنی "انسانوں کی گردنیں آزاد کرانا"۔

غلاموں کو آزاد کرانا

یہ بندھی ہوئی گردنیں، انفرادی طور پر غلاموں اور لونڈیوں کی ہوں گی اور اجتماعی طور پر اُن قوموں کی بھی جو دوسری قوموں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ قرآنی نظام قائم کرنے والی اُمتِ مسلمہ کا فریضہ ہو گا کہ وہ ہر مقام پر انسانوں کو محکومی اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرائے۔ دینؔ کے اس بنیادی فریضہ کی روشنی میں یہ کہنا کہ اسلام میں غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت ہے، کس قدر قرآن میں تحریف اور دینؔ کی مخالفت ہے؟ جو دین فَكُّ رَقَبَةٍ (گردنوں کو آزاد کرانے) کو بنیادی فریضہ قرار دے، کیا وہ خود غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت دے گا؟

یہ ہمارے دورِ ملوکیت کا اسلام (مبنی بر فقہ اور روایات) ہے جس نے ہر خلافِ اسلام روش کو اسلام بنا دیا اور وہی اسلام ہمارے ہاں رائج چلا آرہا ہے۔



اس کے بعد پھر منافقین کا ذکر کیا گیا:

(۹/۶۱) وَمِنۡهُمُ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ النَّبِىَّ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ اُذُنٌ‌ ؕ قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّـكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ‌ ؕ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ○

ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو (طرح طرح کی باتیں کرکے) نبیؐ کو اذیت پہنچاتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو کانوں کا کچا ہے' ہر ایک کی بات سنتا ہے. ان سے کہو کہ (یہ کان کا کچا نہیں' اگرچہ) یہ حقیقت ہے کہ یہ ہر ایک کی سن لیتا ہے. اور یہ چیز تمہاری بہتری کے لئے ہے کہ تم اپنی ہر بات اس تک پہنچا سکتے ہو. (اس نے اپنے ہاں حاجب و دربان مقرر نہیں کر رکھے. نہ ہی وہاں یہ حالت ہے کہ اُس تک خاص خاص لوگوں ہی کی رسائی ہو سکتی ہو. باقی رہا یہ الزام کہ یہ ہر ایک کی بات کا یقین کر لیتا ہے' تو یہ کس طرح ممکن ہے؟ اس لئے کہ یہ رسولؐ) خدا کے قوانین پر محکم یقین رکھتا ہے' اس لئے یہ صرف ان لوگوں کی باتوں پر اعتماد کرتا ہے جو اُس کی طرح' خدا کے قوانین پر یقین رکھتے ہیں (۵۹/۶ ؛ ۱۷/۳۶).

اس سے یہ نہ سمجھ لو کہ یہ پارٹی بازی کی عصبیت کی وجہ سے' جماعتِ مومنین کی باتوں پر اعتماد کرتا ہے. اس کا پیغام و نظام تمام نوعِ انسان کے لئے باعثِ رحمت ہے (۲۱/۱۰۷) لیکن یہ واضح ہے کہ اس رحمت سے وہی لوگ مستفیض ہو سکتے ہیں جو اس پیغام کی صداقت پر یقین رکھیں. یہ وجہ ہے کہ جماعتِ مومنین اس سے بہرہ یاب ہو جاتی ہے. اور جو لوگ رسولؐ کے لئے وجۂ اذیت بنتے ہیں' وہ اس سے محروم رہ کر الم انگیز تباہیاں

مول لے لیتے ہیں۔

آپ غور فرمایئے کہ حق و صداقت کے داعی کو کس کس قسم کی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں میدان

طعن و تعریض کے تیر

جنگ کا تصادم تو ان کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ زبان کے تیروں کے زخم فولاد کی سناں کے مقابلہ میں زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔ یہی تھے وہ زخم جن کے اندمال کے لئے خود خدا کو یہ شفقت آمیز تاکید کرنی پڑی کہ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (۲۰/۱۳۰) "یہ لوگ جو باتیں تیرے خلاف کرتے ہیں انہیں ہمت اور استقامت سے برداشت کرو۔" اور تلخ باتوں کے برداشت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کا اثر نہ لیا جائے۔ کسی کی بات کی تلخی آپ کے اثر لینے کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اگر آپ اثر نہ لیں گے تو بات ہوا میں تحلیل ہو کر بے اثر ہو جائے گی۔ لیکن اس کے لئے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے بعد منافقین کے ایک اور حربہ کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ منافق کرتے یہ ہیں کہ حکومت سے بالا بالا، افراد سے یارانہ گانٹھتے ہیں اور اس طرح جماعت کے اندرونِ خانہ معاملات تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں، نیز اس سے جماعت کے اندر پھوٹ پڑ جانے اور حکومت کے خلاف جذبات پیدا ہونے کا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے۔

جماعتِ مومنین کو منافقین کے ساتھ قطع تعلق کی تاکید کی گئی ہے۔ اس کا ذکر مختلف مقامات میں آچکا ہے۔ یہاں کہا کہ؛

(۹/۶۲) یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِیُرْضُوْكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ○

اے جماعتِ مومنین! یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تمہارے سامنے قسمیں کھا کھا کر تمہیں راضی کر لیں۔ لیکن تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ (یہاں افراد کے راضی کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔) اصل سوال خدا اور رسولؐ (نظامِ خداوندی) کو راضی کرنے کا ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اس نظام کی صداقت پر سچے دل سے ایمان لائیں۔

منافقین کے ساتھ قطعِ علائق

یہ رہنمائی ایک ابدی اصول اپنے اندر رکھتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں افراد کے کسی غیر کے ساتھ ذاتی تعلقات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی دوستی اور دشمنی، یگانگت اور بیگانگی، تعلقات اور لاتعلقی، سب اجتماعی فیصلوں کے تابع ہونی چاہیئے۔ اس سے اُن کا اجتماعی نظم و نسق بھی قائم رہے گا اور نظامِ حکومت بھی مستحکم۔

(۹/۶۳) اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ۝

کیا انہیں اس کا علم نہیں کہ جو شخص نظامِ خداوندی کی مخالفت کرتا ہے تو اس کے لئے جہنّم کا عذاب ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا — اور یہ عذاب کیا ہے؟ بہت بڑی ذلت و رسوائی! (نظامِ خداوندی کی مخالفت درحقیقت بلند اخلاقی اقدار کی مخالفت ہے، جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟)۔

منافقین کو ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اُن کی منافقت کا پردہ چاک نہ ہو جائے —

(۹/۶۴) يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۝

یہ منافق اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں مسلمانوں کی طرف کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو اُن باتوں کو ظاہر کر دے جو ان منافقین کے دل میں پوشیدہ ہیں۔

ان سے کہو کہ تم (زندگی سے مذاق کر رہے ہو) مذاق کئے جاؤ۔ جس بات کا تمہیں اندیشہ ہے، وہ تو ہو کر رہے گی۔ منافقت کب تک چھپی رہ سکتی ہے۔ وہ ایک دن ضرور ظاہر

ہو کر رہتی ہے۔

یہ لوگ دین کو Seriously نہیں لیتے۔ اسے ہنسی مذاق کا کھیل سمجھتے ہیں؛

(۹/۶۵) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَ نَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ○

اگر تم ان سے پوچھو (کہ تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو تو) یہ کہہ دیں گے کہ ہم تو یونہی دل لگی کی باتیں کرتے تھے۔ ان سے کہو کہ کیا تم خدا سے اس کے احکام و قوانین سے اور اس کے رسول سے دل لگی کرتے ہو! (اور سوچتے نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟)۔

دین کو مذاق سمجھنے والے

دین کو Seriously نہ لینے والوں کے لئے سخت وعید آئی ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد چہارم ص۵۳۲ و جلد پنجم صفحات ۴۸ اور ۲۰۴)۔

اس کے بعد قرآنِ کریم نے ان سے واضح طور پر کہہ دیا کہ اس قسم کی بہانہ سازیوں سے کچھ حاصل نہیں۔ تمہیں اس روش کو چھوڑ دینا چاہیئے۔

(۹/۶۶) لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ○ۧ

لیکن یہ سب باتیں یونہی بہانہ سازی کی ہیں۔ (سچی بات، کیوں نہیں کہتے کہ) تم ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کر چکے ہو۔ (لیکن تم میں بھی دو گروہ ہیں: ایک ان کا جو جان بوجھ کر جرمِ کفر کے مرتکب ہوتے ہیں)۔ یہ مجرمین کا گروہ ہے۔ انہیں ضرور سزا دی جائے گی۔

(دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو یونہی' دوسروں کی دیکھا دیکھی' بغیر جانے بوجھے' ان کے پیچھے لگ گئے ہیں. اگر یہ لوگ صحیح راستہ پر آجائیں تو) ان سے بازپُرس نہیں ہو گی.

قرآن مجید کی کشادہ نگہی قابلِ غور ہے. جو لوگ محض دیکھا دیکھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے' ان سے رعایت برتی گئی. انہیں موقع دے دیا کہ وہ ان کا ساتھ چھوڑ کر' صحیح روش اختیار کر لیں تو ان کے سابقہ جرائم سے درگزر لیا جائے گا.

ان گروہوں میں تمیز کرنے کے بعد کہا کہ منافقت درحقیقت ایک قلبی کیفیت اور نفسیاتی عارضہ ہے. ان کی مخالفت کی روش اور انداز و اسالیب میں فرق ہو سکتا ہے' لیکن علتِ مرض سب کی ایک ہی ہے.

(۹/۶۷) اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

یاد رکھو! منافق مرد اور منافق عورتیں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں. ان کی حالت یہ ہے (کہ شیوۂ مومنین کے بالکل برعکس) جن باتوں سے قانونِ خداوندی منع کرتا ہے' یہ لوگوں کو ان کے کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور انہیں قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ (نظامِ خداوندی کے لئے خرچ کرنے سے) روکے رکھتے ہیں. جب انہوں نے اس طرح نظامِ خداوندی کو چھوڑ دیا تو نظامِ خداوندی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا (۵۹/۱۹) اور اپنی برکات و ثمرات سے انہیں محروم کر دیا' اس لئے کہ منافق (خواہ زبان سے کتنا ہی اقرار کیوں نہ کریں' درحقیقت) خدا کا راستہ چھوڑ کر' دوسری راہوں پر چل نکلتے ہیں.

اِس سورت میں ذرا آگے چل کر مومنین کے متعلق کہا ہے کہ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹/۷۱). ان کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بتایا گیا ہے اور منافقین کا اُن کے برعکس' امر بالمنکر اور نہی

عن المعروف۔ یہی تفریق ان دونوں گروہوں میں مابہ الامتیاز ہے۔ یہ تفریق بڑی جامع ہے جس میں دین کی مخالفت کا ہر گوشہ آجاتا ہے۔ ان کا انجام کیا ہوگا، فرمایا:

(۹/۶۸) وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝

یہ وجہ ہے کہ منافقین کا حشر بھی کفار جیسا ہی ہوگا۔ حقیقت کے اعتبار سے ان دونوں میں کچھ فرق نہیں، دونوں کا ٹھکانا جہنم ہے (بلکہ منافق جہنم کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے (۴/۱۴۵)) یہ اس سے نکل نہیں سکیں گے۔ یہی ان کے اعمال کا صحیح صحیح بدلہ ہے ــــ یعنی نظامِ خداوندی کی برکات و ثمرات سے محرومی اور ہمیشہ رہنے والی تباہی۔

اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ کشاکشِ حق و باطل شروع سے چلی آرہی ہے اور مومنین کے مقابلہ میں کفار کے ساتھ منافقین کا گروہ شانہ بشانہ چلا آرہا ہے۔

(۹/۶۹) كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۗ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۗ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

(ان سے کہہ دو کہ) تمہاری حالت بالکل ان لوگوں کی سی ہو چکی ہے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ وہ قوّت میں بھی تم سے بڑھ کر تھے اور دولت اور افرادِ خاندان کی کثرت کی وجہ سے ان کی جتھہ بندی زیادہ مضبوط تھی۔ لیکن وہ ان چیزوں سے صرف تھوڑے سے وقت کے لئے فائدہ اٹھا سکے (اس کے بعد تباہ ہو گئے) سو تم بھی، انہی کی طرح، ان چیزوں سے کچھ وقت کے لئے فائدہ اٹھالو اور جس طرح وہ بیہودہ اور فضول باتوں میں اپنی زندگی ضائع کرتے رہے، تم بھی ضائع کرتے ہو۔

یاد رکھو! یہی لوگ ہیں جن کے تمام پروگرام، خواہ وہ قریبی مفاد کے لئے ہوں یا مستقبل کے لئے ـــــ دنیا کے لئے ہوں یا آخرت کے لئے ـــــ سب بلا نتیجہ رہ جاتے ہیں، یعنی وہ نتائج مرتب نہیں کرتے جن کے لئے انہیں بروئے کار لایا جاتا ہے۔ ان کے حصے میں نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔

تاریخی حقائق اس کے شاہد ہیں؛

(۹/۷۰) اَلَمۡ یَاۡتِہِمۡ نَبَاُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوۡدَ ۬ۙ وَ قَوۡمِ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اَصۡحٰبِ مَدۡیَنَ وَ الۡمُؤۡتَفِکٰتِ ؕ اَتَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظۡلِمَہُمۡ وَ لٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ○

کیا ان لوگوں تک، اقوامِ سابقہ کی سرگزشت نہیں پہنچی ـــــ یعنی قومِ نوحؑ، قومِ عادؑ، قومِ ثمودؑ، قومِ ابراہیمؑ، اہلِ مدین کی ـــــ نیز دیگر اقوام کی جن کی بستیاں الٹ دی گئی تھیں۔ ان کے رسول، ان کے پاس واضح قوانین لے کر آئے (لیکن انہوں نے ان سے سرکشی اختیار کی اور اس طرح، اپنے جرائم کی پاداش میں تباہ ہو گئے۔ یاد رکھو!) خدا نے ان پر زیادتی نہیں کی تھی ـــــ خدا کسی پر بھی زیادتی نہیں کرتا ـــــ انہوں نے خود اپنے آپ پر زیادتی کی اور ان کے اعمال ان کو لے ڈوبے۔

اس کے برعکس:

(۹/۷۱) وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

(یہ تو گروہِ منافقین کی حالت تھی۔ ان کے برعکس دوسرا گروہ) مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ہے۔ یہ سب نصب العین ایمان کے مشترک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے دوست اور رفیق ہوتے ہیں۔ یہ اُن باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں ضابطۂ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور اُن سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ ہر معاملہ میں خدا اور اس کے رسولؐ (نظامِ خداوندی) کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما سے فیضیاب ہوں گے اور دنیا دیکھ لے گی کہ خدا کا قانون کس طرح قوت وحکمت پر مبنی ہے۔

آیت (۹/۶۷) میں بتایا گیا ہے کہ منافقین معروف سے روکتے ہیں اور منکر کا حکم دیتے ہیں یہاں جماعتِ مومنین کا فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر بتایا گیا ہے۔ یہ اس سے پہلے بھی متعدد بار آچکا ہے

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

(انڈکس میں عنوان اَمر کے تحت دیکھئے)۔ خود نبی اکرمؐ کا بھی یہی فریضہ بتایا گیا ہے۔ دیکھئے مطالب الفرقان جلد پنجم (صفحہ ۴۰۸)۔ سابقہ صفحات میں زیرِ آیت (۷/۱۹۸) میں بھی اس کی تشریح کی جاچکی ہے۔ المعروف ہر وہ کام جس کی تائید قرآن سے ہوتی ہو اور جسے اسلامی مملکت Approve کرتی ہو۔ اس کے برعکس، منکر وہ ہے جو قرآن کے خلاف ہو اور اسلامی مملکت کے آئین وضوابط اس کی ممانعت کرتے ہوں۔ امتِ مسلمہ اور حکومتِ اسلامی کا یہی فریضہ ہے، بلکہ یوں کہئے کہ اس کی ہستی کی وجۂ جواز

یہی ہے. جو مملکت اس فریضہ کو ترک کر دے یا اس کی سرانجام دہی میں تغافل برتے، وہ اسلامی نہیں رہتی. اُس کی اِس روشِ حیات کا نتیجہ ہے :

(۹/۷۲) وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

یہ ہیں وہ مومنین ـــــ مرد اور عورت ـــــ جن کے لئے قانونِ خداوندی کی رُو سے زندگی کی سدا بہار خوشگواریاں ہیں جن سے یہ ہمیشہ متمتع ہوتے رہیں گے ـــــ فردوس منظر چمنستاں میں آرائش و آسائش کا نہایت پاکیزہ ساز و سامان، عمدہ رہنے کی جگہ اور ان سب سے بڑھ کر ایک اور چیز یعنی ان کی ذات کی ایسی نشوونما جس سے وہ (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگ و یک رنگ ہو جائے (۹/۱۰۰ و ۳۸ - ۴۲/۳۶ و ۷۶/۳۱). یہ تھا وہ اصل مقصود جس کی خاطر وہ یہ سب کچھ کیا کرتے تھے. اس مقصد کا حصول، ان کی حقیقی کامیابی ہے ـــــ اور کتنی عظیم القدر ہے یہ کامیابی (جس سے ان کی ذات، زندگی کے مزید ارتقائی مدارج طے کرنے کے قابل ہو جائے گی) (۱۲/۵۷ و ۸/۶۶).

جنّت عدن "جنّتِ عدن" قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے. مادّہ کے اعتبار سے عدن کے معنی "قیام گاہ" کے ہیں. لہٰذا جنّتِ عدن سے مراد وہ باغات ہیں جن میں راحت و آرام سے قیام کیا جائے (جنّت کا مفہوم سابقہ جلدوں میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے).

رضوان اللہ یہاں جنّت کی نعماء بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ. رضوان کے مفہوم کے لئے انڈکس میں رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ دیکھئے جہاں مرضات اللہ وغیرہ کا بھی مفہوم آگیا ہے (بالخصوص مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۶۰ - ۲۵۹).

مومن کی زندگی کا منتہیٰ جنّت ہے، لیکن اس سے بھی بلند درجہ رضوان اللہ کا ہے۔ یوں سمجھئے کہ جنّت کی زندگی آسائشوں کے تعلق سے ارتقاء کی اگلی منزل ہے تو نفسِ انسانی (انسانی ذات) کی صفاتِ خداوندی سے (تا بحدِ بشریت) ہم آہنگی، شرف و مجدِ انسانیّت کی رفعتوں کا مقام ہے۔ ان آسائشوں کے ساتھ اس ہم آہنگی کو فوزالعظیم کہا گیا ہے۔ واضح رہے کہ رضوان مّن اللہ اکبر کا مقام قرآنِ کریم کی اطاعت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے لئے (تصوّف کی قسم کے) الگ مسالک و مشارب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تصوّف کا رضوان تو بلکہ قرآن کے خلاف ہوتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "تصوّف کی حقیقت")۔ یہ سب مومن ہی کی خصوصیات ہیں۔ خود اسی آیت میں دیکھئے رضوان مّن اللہ اکبر کا وعدہ مومنین اور مومنات ہی سے کیا گیا ہے۔ نعمائے حیات اور انسانی ذات کی نشوونما دونوں قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس سے (عام اصطلاح میں) "روح اور مادّہ کی ثنویت" ختم ہو جاتی ہے۔

انسان، طبیعی جسم اور اس کی ذات دونوں (یکجا) کا نام ہے۔ (میں نے "دونوں کے مجموعہ" یا "دونوں کے مرکّب" کے الفاظ قصداً استعمال نہیں کئے، کیونکہ ان سے بہت سی فلسفیانہ الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں)۔

جماعتِ مومنین کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد، پھر رُوئے سخن منافقین کی طرف مبذول ہوا۔ کہا کہ جب یہ لوگ دلائل و براہین کی رُو سے کوئی بات سننا اور سمجھنا نہیں چاہتے اور نظامِ خداوندی کی مخالفت میں انتہا تک پہنچ چکے ہیں، تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کی دراز دستیوں کی روک تھام قوت کے ذریعے کی جائے۔

(۹/۷۳) يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

اے رسولؐ! تم ان منافقین اور کفار کے خلاف، (جو نظامِ خداوندی کی مخالفت میں انتہا تک پہنچ چکے ہیں) پوری پوری جدّ وجہد کرو اور شدّت اور سختی سے ان کا مقابلہ کرو تاآنکہ یہ تباہیوں اور بربادیوں کے جہنّم میں پہنچ جائیں اور دیکھ لیں کہ زندگی کا یہ ٹھکانا کس قدر

صعوبت انگیز ہے (9/123)۔

ان کی حالت یہ ہے کہ

(9/74) يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

ان کے کیریکٹر کی یہ حالت ہے کہ یہ کفر کی باتیں کرتے رہتے ہیں ——— باتیں ہی نہیں کرتے بلکہ درحقیقت، بظاہر اسلام لانے کے بعد پھر کفر کی زندگی اختیار کر چکے ہیں تمہاری تخریب کے لئے ہر قسم کے منصوبے باندھتے رہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں ان میں، ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ حالت ان کی یہ ہے، لیکن اس کے بعد جب ان سے پوچھا جائے تو خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہہ دیں گے کہ ہم نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی!

ان سے کوئی پوچھے کہ تم جو جماعتِ مومنین سے اس طرح انتقام لے رہے ہو تو کس بات کا؟ ان کا بالآخر جرم کیا ہے؟ یہی نا کہ نظامِ خداوندی نے انہیں اس قدر خوشحال کیوں کر دیا ہے؟

بہرحال، یہ لوگ اب بھی اپنی روش سے باز آجائیں تو ان کے لئے بہتر ہوگا۔ لیکن اگر یہ اپنے وعدوں سے اسی طرح پھرتے رہے تو خدا کا قانونِ مکافات، انہیں دنیا اور آخرت دونوں میں سخت ترین سزا دے گا اور ان کی حالت یہ ہو جائے گی کہ دنیا میں ان کا کوئی حامی اور مددگار نہیں ہوگا۔

ان منافقین میں بیشتر یہودی تھے۔ (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) اہلِ مدینہ ..... اور اس کے گرد و پیش کے قبائل کا مالی نظم و نسق انہی کے ہاتھ میں تھا۔ سود پر ان کا گزارہ تھا۔ اس کے لئے (ہر سرمایہ دار کی طرح) ان کی انتہائی خواہش اور کوشش تھی کہ وہاں کی آبادی خوشحال نہ ہونے پائے، مفلس و محتاج رہے تاکہ ان کی رگِ جان ان کے پنجہ میں رہے۔ اسلام آنے کے بعد وہاں قرآنی نظام کا آغاز ہو گیا۔ اسی سے مسلمانوں کو مرفہ الحالی نصیب ہو گئی اور یہودیوں کے دست نگر اور محتاج نہ رہے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی جو وہ اسلامی نظام (اور مسلمانوں) کے خلاف اس قدر مذموم کوششیں اور سازشیں کرتے رہتے تھے۔

قرآن نے جو کہا تھا کہ یہ تباہ و برباد ہوں گے اور دنیا میں ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہو گا، تو یہ بات اُس زمانے میں کہی گئی تھی جب ہنوز اسلامی مملکت کو اتنی طاقت حاصل نہیں ہوئی تھی، لیکن آنے والے واقعات نے بتا دیا کہ قرآن نے جو کچھ کہا تھا وہ کس طرح سچ ہو کر رہا۔ عربی قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہودیوں کو (اُن کی پیہم سازشوں اور سرکشیوں کی وجہ سے) ملک بدر کر دینا پڑا تھا (اس کی تفصیل سورۃ الحشر (سورۃ نمبر ۵۹) میں ملے گی)۔

دعویٔ ایمان کی عملی تصدیق کے لئے قدمِ اوّل یہ تھا کہ مومن اپنی کمائی میں سے کم از کم اپنی ضروریات کے لئے رکھے اور زیادہ سے زیادہ مفلسوں اور محتاجوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے۔ لیکن منافقین اس اندازِ معیشت کو گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے۔

(۹/۷۵-۷۷) وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○

ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو وعدے کیا کرتے تھے کہ اگر اللہ ہمیں رزق کی فراوانی عطا کر دے

توہم اسے نظامِ خداوندی کی راہ میں خرچ کرکے، اپنے قول کو سچ کر دکھائیں گے اور اس طرح صالحین کے زمرہ میں شامل ہو جائیں گے ——— یعنی اُن لوگوں کے زمرے میں جو لوگوں کے کام سنوارتے ہیں (۷۵)۔

لیکن جب اللہ نے انہیں رزق کی فراوانی عطا کر دی، تو انہوں نے سب کچھ اپنے ہی لئے سمیٹ لیا اور اپنے وعدوں سے صاف پھر گئے ——— اور اب تک ان سے پھرے ہوئے ہیں (۷۶)۔

ان کی ان مسلسل وعدہ خلافیوں اور کذب بیانیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ منافقت (کی وہ زندگی جسے انہوں نے شروع میں وقتی مصلحت کے طور پر اختیار کیا تھا) ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئی۔ اب یہ وہاں سے مرتے دم تک نہیں نکل سکتی (۷۷)۔

منافقت کی زندگی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ شروع شروع میں تو اسے مصلحتاً اختیار کیا جاتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ یہ عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو پھر اصلاح (ناممکن نہیں تو) مشکل ضرور ہو جاتی ہے۔ منافق اس خود فریبی میں مبتلا ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے، اس کی حقیقت کا کسی کو علم نہیں ہوگا۔ اگر اُس کو اس کا یقین ہو کہ لوگ اس کی فریب دہی سے بخوبی واقف ہیں، تو پھر منافقت کی روش جاری نہیں رکھے گا ——— یا اپنی اصلاح کر لے گا اور یا کھلے بندوں غلط کار بن جائے گا۔ جن منافقین کا یہاں ذکر چلا آرہا ہے، وہ بھی اسی فریبِ نفس میں مبتلا تھے کہ ان کی زیرِ نقاب حرکتوں سے کوئی واقف نہیں۔ کہا کہ

(۹/۷۸) اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۚ

کیا انہیں اس کا علم نہیں کہ اللہ ان کے خفیہ رازوں اور پوشیدہ مشوروں سے واقف ہے، اس لئے کہ وہ غیب کی باتوں کو جانتا ہے اور اچھی طرح سے جانتا ہے۔

"خدا کے باخبر ہونے" کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب ہو کر رہے گا۔ یہ ہزار نقاب اوڑھیں، اُس کے قانون کی نگاہوں سے کچھ بھی پوشیدہ

نہیں رہ سکتا. اصل یہ ہے کہ اگر انسان کا اس حقیقت پر ایمان (یقین) ہو کہ جو کچھ میں کرتا ہوں (خواہ وہ دل کے ارادے اور نگاہ کی خیانت ہی کیوں نہ ہو (۴۰/۱۹))، وہ سب خدا کے علم میں ہے اور اس کا نتیجہ اُس کے قانونِ مکافات کے مطابق مرتب ہو کر رہے گا، تو وہ منافقت نہیں کرے گا. اگر چور کو واردات سے پہلے علم ہو جائے کہ اسے پولیس کا سپاہی دیکھ رہا ہے، تو وہ چوری نہیں کرے گا (چوری منافقت ہی کی ایک قسم ہے). وہ یا تو چوری سے تائب ہو جائے گا اور پُرامن شہری بن جائے گا اور یا ڈاکہ زنی کرے گا (ڈاکہ زنی کفر ہے).

منافقت دل کا مرض (نفسیاتی روگ) ہے جس میں انسان دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوشی حاصل کرتا ہے. اس اذیت رسانی کی متعدد شکلیں ہو سکتی ہیں. ان میں طنز و تشنیع اور طعنہ زنی سب سے زیادہ زہر آلود ہوتی ہے. زیرِ نظر منافقین کی بھی یہی روش تھی اور اس تیر افگنی میں وہ کسی کو بھی نہیں بخشتے تھے، حتیٰ کہ ذاتِ رسالتمآبؐ کو بھی نہیں (۹/۵۸). ان کی حالت یہ تھی کہ

(۹/۷۹) اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

ان کی حالت یہ ہے کہ جماعتِ مومنین میں سے جو لوگ، نظامِ خداوندی کے لئے دل کی رضامندی سے مالی امداد کرتے ہیں، یہ انہیں ریاکاری کا طعنہ دیتے ہیں اور جو (مومنین) ایسے ہیں کہ اُن کے پاس دینے کے لئے روپیہ پیسہ نہیں ہوتا، لیکن وہ اس مقصدِ عظیم کے لئے اپنی محنت پیش کر دیتے ہیں، تو یہ (منافقین) ان کی غریبی پر ان کی ہنسی اڑاتے ہیں. لیکن یہ نہیں جانتے کہ خدا کا قانونِ مکافات خود ان کی ہنسی اڑا رہا ہے (۲/۱۵) کہ یہ کس خود فریبی میں مبتلا ہیں اور انہیں اتنا نظر نہیں آتا کہ یہ، انہی فاقہ کش محنت کرنے والوں کے ہاتھوں، کس طرح ایک الم انگیز عذاب میں مبتلا ہونے والے ہیں.

ابتدائے اسلام میں معاشرہ کی یہ حالت تھی کہ اُن میں کچھ لوگ ایسے تھے جو اسلامی نظام کی تشکیل کے لئے مالی امداد کر سکتے تھے۔ باقی وہ تھے جو اپنی محنت کی پیشکش کر سکتے تھے۔ خدا کے نزدیک ان محنت کشوں کے درجات بھی کم نہ تھے۔ اس نظام کی تعمیر اور استحکام میں ان سب کا برابر کا حصہ تھا۔ فٹ بال یا ہاکی کے میچ میں، گول کیپر خواہ ایک بار بھی گیند کو نہ چھو سکے، میچ کی کامیابی میں وہ بھی برابر کا شریک ہوتا ہے۔ "ٹیم ورک" میں تقسیم کار کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔ ذرا آگے چل کر آپ دیکھیں گے (۹/۹۲ میں) کہ ان نادار و فاقہ کشوں کی حالت یہ تھی کہ جہاد کا اعلان ہوتا ہے، لیکن ان کے پاس سواری نہیں ہوتی کہ وہ لشکر میں شامل ہو سکیں۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں (معاشرہ ابھی اس حالت میں ہے کہ) حضورؐ بھی اُن کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ واپس جاتے ہیں تو اس طرح کہ ان کی آنکھوں سے وہ آنسو ٹپکتے ہیں جنہیں "شانِ کریمی موتی سمجھ کر چُن لیتی ہے"۔ ان پیکرانِ خلوص و ایثار کے خلاف، بدبخت منافقین طعنہ زنی کرتے تھے۔ سوچئے کہ اس سے زیادہ گہرا زخم کس نشتر کا لگ سکتا تھا؟

منافقین کی طعنہ زنی

ان مخالفین کی دنایت و خصومت کی یہ حالت تھی اور دوسری طرف وہ ذاتِ رسالتمآبؐ (کہ انہی مخالفین کی ناوک افگنی سے جن کا سینہ چھلنی ہو رہا تھا) جن کے دلِ دردمند کی یہ کیفیت کہ وہ وقفِ اضطراب رہتے تھے کہ یہ کسی طرح تباہی سے بچ جائیں، اس حد تک وقفِ اضطراب کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑا کہ

(۹/۸۰) اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۧ

(اے رسولؐ! ہم جانتے ہیں کہ تمہارا دلِ دردمند اب بھی یہ چاہتا ہے کہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے جس سے یہ لوگ اُس آنے والے عذاب سے محفوظ رہ سکیں، لیکن) تمہاری ہزار آرزوئیں بھی انہیں اس تباہی سے نہیں بچا سکتیں جو خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے

اُن کے اعمال کے بدلے میں، اُن پر آنے والی ہے (تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ لوگ اس نظام پر سچے دل سے ایمان تو رکھتے ہیں، لیکن بعض کمزوریوں کی بنا پر ان پر سہواً کچھ لغزشیں ہو جاتی ہیں. لیکن یہ حقیقت نہیں). یہ لوگ خدا اور رسولؐ (نظامِ خداوندی) سے دل سے انکار کرتے ہیں اور محض ظاہر داری سے اس کا اقرار کرتے ہیں ــــــ اب سوچو کہ جو لوگ اِس طرح صحیح راستے سے الگ ہو جائیں، ان پر سعادت کی راہیں کس طرح کشادہ ہو سکتی ہیں؟ (۶-۵/۶۳؛ ۴/۶۴).

حضورؐ کی رقیق القلبی کا تذکرہ سابقہ جلدوں میں بھی آچکا ہے. انڈکس میں عنوان "رسول اللہ" کے تابع دیکھئے (نیز آیات (۳/۱۵۸)؛ (۵/۴۱)؛ (۱۸/۶)؛ (۳۵/۸)؛ (۶/۳۵)؛ (۲۶/۳).

کفّار کے لئے حضورؐ کی آرزوئے مغفرت

اس آیت میں کہا گیا ہے: اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً اور اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "اگر تم ان کے لئے ستر بار بھی دعائے مغفرت کرو گے" ــــ اور ستر کے متعیّن عدد کے پیشِ نظر بعض روایات بھی کتبِ احادیث میں ملتی ہیں. لیکن جیسا کہ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے (دیکھئے مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۳۵۲ اور جلد سوم صفحہ ۲۶۳)، عربی محاورہ میں "سبع" کا لفظ "بکثرت" کے معنوں میں بھی آتا ہے. اسی لئے میں نے اس کا ترجمہ "ہزار آرزوئیں" کیا ہے. یہ محاورۂ عرب کے مطابق ہے (اسند ان معانی کی میری کتاب لغات القرآن میں ملے گی).

آیات (۴۳-۴۲/۹) میں بتایا جا چکا ہے کہ بعض منافقین نے حضورؐ سے جنگ سے مستثنیٰ رہنے کی اجازت حاصل کر لی تھی. وہ اپنی اس فریب کارانہ کامیابی پر بہت خوش تھے.

(۹/۸۱) فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ○

جو (منافقین تمہارے ہمراہ، جنگ کے لئے نہیں نکلا) پیچھے رہ گئے ہیں، وہ اپنے جی میں بہت خوش ہیں کہ ہم، رسول اللہ کی خواہش کے علی الرغم پیچھے بیٹھے ہیں ـــــ انہیں، راہِ خدا میں، اپنے جان و مال سے جہاد کرنا، بہت ناگوار گزرا۔ (اس لئے یہ خود بھی پیچھے رہے اور دوسروں سے بھی) کہتے رہے کہ دیکھو! اس شدت کی گرمی میں جنگ کے لئے مت نکلو۔ ان سے کہہ دو کہ جہنم کی آگ، موسم کی گرمی سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ اے کاش! یہ لوگ اس حقیقت کو سمجھ سکتے (اگر خدا کے نظامِ عدل و احسان کو شکست ہو جائے اور ظلم و استبداد کے نظام کے تحت زندگی بسر کرنی پڑے تو یہ عذاب کس قدر دردانگیز اور شدید ہوگا)۔

آیت کے آخر میں کہا ہے: لَوْ كَانُوا يَفْقَهُونَ ـــ "اے کاش! یہ لوگ عقل و فکر سے کام لیتے"۔ اس سے واضح ہے کہ اگر غلط کار لوگ، اپنی منفعت پرستی کے جذبات میں بہ جانے کے بجائے، غور و فکر سے کام لیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان کی روش انہیں کس طرح تباہیوں کی طرف لئے جا رہی ہے۔ اس سے یہ بھی عیاں ہے کہ قرآنِ کریم کے نزدیک عقل و فکر کی اہمیت کس قدر ہے۔ جذبات کی رُو سے انسان کے سامنے صرف مفاداتِ عاجلہ ہوتے ہیں، مستقبل پر اس کی نگاہ نہیں ہوتی۔ وحی کی روشنی میں عقل و فکر سے کام لیا جائے تو مستقبل نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے، صرف مفادِ عاجلہ کو زندگی کا منتہیٰ قرار دینے والوں کے انجام کا نقشہ بڑے عبرت آموز انداز میں پیش کیا ہے، ارشاد ہے:

(۹/۸۲) فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۚ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○

یہ اپنی اس "کامیابی" پر بہت خوش ہیں۔ ان سے کہو کہ تم اس موہوم خوشی میں تھوڑا سا ہنس لو۔ اس کے بعد تمہارے لئے عمر بھر کا رونا ہوگا اور یہ رونا ہوگا تمہارے اپنے اعمال کے بدلے میں!

جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔ رنج و راحت، خوشی اور غم، خندہ و گریہ سب اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں ـــــ انفرادی اعمال یا اجتماعی اعمال۔

آخری فیصلہ یہ کہ ان سے معاشرتی تعلقات بھی منقطع کر لئے جائیں۔

۹/۸۳ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ ○

(اگر اس جنگ سے) واپسی پر' پھر ایسی صورت پیدا ہو کہ ان کا کوئی گروہ' تمہارے ساتھ جنگ میں جانے کے لئے تم سے اجازت مانگے' تو ان سے صاف کہہ دینا کہ نہ تم میرے ساتھ کبھی باہر نکل سکتے ہو' نہ ہماری معیّت میں کسی دشمن سے جنگ کر سکتے ہو۔ اس لئے کہ تم وہی ہو جنہوں نے (اُس نازک وقت میں) پیچھے رہ جانے کو ترجیح دی تھی۔ سو اب تم ہمیشہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہو۔ ہمارے ساتھ تمہارا کیا کام ہے؟

۹/۸۴ وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ○

یہی نہیں' بلکہ ان سے معاشرتی تعلقات بھی منقطع کر لو (تاکہ اُنہیں اور اُن جیسے اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ تم اُن کی اِن حرکات کی وجہ سے اُن سے کس قدر ناراض ہو) معاشرتی تعلقات کی ایک صورت' میّت کی تجہیز و تکفین میں شرکت اور اس کے لئے نیک آرزوؤں کا اظہار بھی ہوتی ہے۔ تم اُن کے ساتھ ان باتوں میں بھی شریک نہ ہو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ عمر بھر نظامِ خداوندی سے سرکشی اختیار کئے رہتے ہیں اور اسی انکار و نافرمانی کی حالت میں مر جاتے ہیں (سو ایسے لوگوں سے' معاشرتی تعلقات کیسے رکھے جا سکتے ہیں؟)

(صَلِّ کے مفہوم کے لئے دیکھئے ۹/۹۹؛ ۹/۱۰۳؛ ۳۳/۴۳، ۵۶؛ ۴/۶۴)۔

معاشرتی قطعِ علائق قطع علائق کی آخری شکل یہ ہے کہ جن کے ساتھ ان کی زندگی میں کوئی تعلق نہیں، ان کے مرنے کے بعد بھی ان سے کوئی معاشرتی تعلق نہ رکھا جائے۔ ان آیات میں خطاب تو رسول اللہ سے ہے، لیکن ان احکام کا اطلاق تمام مومنین پر ہوتا تھا۔ انہوں نے بھی ان لوگوں سے اسی انداز سے قطعِ علائق کر لیا تھا۔ میّت سے متعلق رسوم کے مقاطع کے معنی (دراصل) اس کے پسماندگان سے قطعِ علائق ہوتے ہیں کیونکہ میّت کے لئے تو یکساں ہے خواہ کوئی ان میں شریک ہو یا نہ ہو۔

اس آیت سے واضح ہے کہ میّت کے لئے (کسی شکل میں ہی ہو) خیر خواہانہ آرزوؤں کے اظہار کا دستور عربوں کے ہاں پہلے سے چلا آ رہا تھا اور یہ معاشرتی روابط کے اظہار کا طریق تھا۔

جیسا کہ سابقہ جلدوں میں 'معاشیات' کے عنوان کے تابع لکھا جا چکا ہے، جو شخص یا قوم، قوانینِ فطرت کے مطابق اکتسابِ رزق کے لئے محنت کرے گی، اُسے اسی نسبت سے معاشی خوشحالی میسر آجائے گی۔ اس میں مومن اور کافر کی بھی تمیز نہیں ہو گی۔ لیکن کسی قوم کی محض معاشی خوشحالی اُس کے برسرِ حق ہونے کا ثبوت نہیں۔ حق و باطل کا معیار اقدارِ خداوندی یا وحی کا اتباع ہے۔ حق پر وہ ہے جو قوانینِ فطرت کی رُو سے حاصل کردہ رزق کو وحی کے مطابق خرچ اور تقسیم کرتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ جہاں مفلسی اور محتاجی قوموں کی تباہی کا موجب ہوتی ہے، وہاں مال و دولت کی افراط بھی جس میں قوانینِ خداوندی سے اعراض برتا جائے، تباہی لاتی ہے۔ اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے فرمایا،

(۹/۸۵) وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ۝

(جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ ۹/۵۵) ان لوگوں کی مال و دولت کی فراوانی اور افرادِ خاندان کی کثرت تمہارے لئے وجہِ تعجب نہیں ہونی چاہیئے (یہی چیزیں تو انہیں حق و صداقت کے راستے کی طرف آنے نہیں دیتیں)۔ تم دیکھنا کہ یہی چیزیں کس طرح دنیاوی

زندگی میں ان کے لیئے وبالِ جان بن جاتی ہیں اور یہ کفر کی حالت ہی میں ہلاک ہوجاتے ہیں! (۲۸/۵۸؛ ۳۹/۴۹؛ ۴۰/۸۲؛ ۴۶/۲۶)۔

جیسا کہ معلوم ہے، دعوائے ایمان کی صداقت کا معیار جہاد (میدانِ جنگ) ہے۔ مومن نے اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ بیچ دیا ہوتا ہے (۹/۱۱۱) اور اس بیع و شریٰ کی تصدیق عند الطّلب، جان کی قربانی ہوتا ہے۔ منافقین کے کفر و ایمان کی قلعی اسی مقام پر جا کر کھلتی ہے۔ وہ طرح طرح کی بہانہ سازیوں سے گریز کی راہیں نکالتے ہیں۔

(۹/۸۶-۸۷) وَإِذَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَجَٰهِدُوا۟ مَعَ رَسُولِهِ ٱسْتَـْٔذَنَكَ أُو۟لُوا۟ ٱلطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا۟ ذَرْنَا نَكُن مَّعَ ٱلْقَٰعِدِينَ ۝ رَضُوا۟ بِأَن يَكُونُوا۟ مَعَ ٱلْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ۝

ان کی حالت یہ ہے کہ جب کبھی ایسا حکم نازل ہوتا ہے کہ یہ قوانینِ خداوندی پر دل سے یقین رکھتے ہوئے، رسولؐ کی معیّت میں جہاد کے لئے نکلیں، تو ان میں سے جو لوگ صاحبِ استطاعت ہیں، وہ تجھ سے اجازت مانگتے ہیں کہ انہیں پیچھے رہنے والوں میں چھوڑ دو۔

یعنی وہ اپنے لئے یہ پسند کرتے ہیں کہ (مردوں کے ساتھ جنگ میں جانے کے بجائے) چوڑیاں پہن کر عورتوں کے ساتھ گھروں میں بیٹھے رہیں۔ یہ اس لئے کہ ضد اور منافقت کی وجہ سے ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی (ورنہ بات ایسی صاف ہے کہ اس کے لئے لمبے چوڑے دلائل کی بھی ضرورت نہیں (۸۷))۔

ان کے برعکس،

(۹/۸۸-۸۹) لَٰكِنِ ٱلرَّسُولُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ جَٰهَدُوا۟ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ ۚ وَأُو۟لَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلْخَيْرَٰتُ ۖ وَأُو۟لَٰٓئِكَ

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ ع

اس کے برعکس، رسولؐ اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں (جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں) اپنے مال و جان سے جہاد میں شرکت کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں اور خوشگواریاں ہیں اور انہی کی کھیتیاں پروان چڑھیں گی (۸۸)۔
ان کے لئے، ان کے خدا نے ایسا جنتی معاشرہ تیار کر رکھا ہے جس کی شادابی اور شگفتگی میں کبھی فرق نہیں آئے گا — اس دنیا میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی — یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے (۸۹)۔

غور فرمایئے: میدانِ جنگ میں شریک ہونے والوں میں رسولؐ سرِ فہرست ہوتا ہے۔ سربراہ کا یہی وہ عملی نمونہ (اسوہ) ہے جو اس کے رفقاء اور متبعین کے دلوں میں جذبۂ سرفروشی کی روح پیدا کرتا ہے۔

ان معذرت خواہوں میں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اعراب (صحرانشین بدو) بھی شامل تھے۔

(۹/۹۰) وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

(یہ شہری تو ایک طرف رہے) بدوؤں (صحرانشینوں) میں سے بھی بعض لوگ جھوٹے عذر لے کر آرہے ہیں کہ انہیں پیچھے رہنے کی اجازت دی جائے (حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جو جنگ کی طرف لپک کر جایا کرتے ہیں۔ لیکن وہ جنگ، لوٹ مار کے لئے ہوتی تھی اور اب جنگ حق و صداقت کی مدافعت کے لئے ہے۔ اس لئے اس جنگ سے جی چراتے ہیں) حقیقت

یہ ہے کہ ایسی جنگ کے وقت صرف وہی لوگ پیچھے رہتے ہیں جو نظامِ خداوندی سے وابستگی کے دعوے میں جھوٹے ہوتے ہیں. یہ لوگ جو (زبانی دعوائے ایمان کے باوجود اس سے عملاً) انکار کرتے ہیں، الم انگیز سزا کے مستوجب ہیں (۴۹/۱۴).

یہ ٹھیک ہے کہ بعض لوگوں کو جنگ میں شرکت سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا، لیکن یہ وہ لوگ ہوں گے جو فی الواقع معذور ہوں.

(۹/۹۱) لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ

البتہ جو لوگ کمزور یا بیمار ہیں یا جن کے پاس (سامانِ جنگ کے لئے) خرچ کرنے کو کچھ نہیں (۴۸/۱۷)، ان کے لئے پیچھے رہ جانے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ وہ پیچھے رہ کر، نظامِ خداوندی کی بہی خواہی کے لئے کوشاں رہیں، معاشرہ کو انتشار سے بچائیں اور لوگوں میں اس کی خیرسگالی کے خیالات کو عام کریں. اس قسم کے حسن کارانہ انداز سے پیچھے رہ جانے والوں کے خلاف کوئی الزام نہیں. اس لئے کہ نظامِ خداوندی میں سب کے لئے سامانِ حفاظت و مرحمت ہے (بشرطیکہ وہ اپنے اپنے مقام پر اس نظام کے استحکام کے لئے کوشاں رہیں ــــ مجاہدین اپنی جگہ ــــ اور غیر محارب اپنی جگہ).

معذورین کی فہرست میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کا ذکر خصوصیت سے الگ کیا گیا. اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے مستحق بھی تھے کہ ان کا ذکر الگ کیا جاتا. فرمایا:-

(۹/۹۲) وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ

الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ

نہ ہی وہ لوگ پیچھے رہ جانے میں مُوردِ الزام قرار دیئے جاسکتے ہیں جن کی حالت یہ تھی کہ وہ (سفر کے لئے) سواری کی استطاعت نہیں رکھتے تھے' اس لئے وہ تیرے پاس درخواست لے کر آئے کہ اُن کے لئے سواری کا انتظام کردیا جائے ۔ اور تنگی کا یہ عالم تھا کہ تم بھی اس کا انتظام نہیں کرسکتے تھے' اس لئے تم نے بھی اپنی معذوری کا اظہار کردیا ۔ چنانچہ وہ بے بس ہو کر لوٹ گئے درایں عالم کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ان کا دل اس احساس سے پھٹا جاتا تھا کہ افسوس! آج ہمارے پاس اتنا بھی نہیں کہ ہم اس سے جہاد کے لئے سواری کا انتظام کرسکیں!

غور فرمایئے کہ قرآنی معاشرہ کے قیام کے اولیں دور میں معاشی حالت کیا تھی ؟ آسائش کی غرض سے تو ایک طرف 'جنگ کی ضروریات کی فراہمی تک کی بھی گنجائش نہیں تھی ۔

اور اس کے ساتھ مخلصین کے جذبات جن کے تصور سے آج بھی آنکھیں پُرنم ہوجاتی ہیں ۔ اس کے برعکس:-

(۹/۹۳) اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

الزام اُن کے اُوپر ہے جو سب کچھ رکھتے ہوتے (اور جہاد میں جانے کے قابل ہونے کے باوجود) تم سے اجازت مانگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پیچھے عورتوں میں بیٹھے رہیں ۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ! اس لئے نہیں سمجھتے کہ سہل انگاری اور مفاد پرستی کے جذبات نے ان کے دلوں پر مہر لگا رکھی ہے اور اس طرح' سمجھ اور سوچ کی سب راہیں ان پر مسدود ہوچکی ہیں ۔

گیارہواں پارہ شروع

ان کی حالت یہ ہے کہ

(۹/۹۴) يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۭ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

جب تم میدانِ جنگ سے واپس آ وگے، تو یہ لوگ تمہارے سامنے، طرح طرح کی معذرتیں پیش کریں گے۔ ان سے کہہ دینا کہ اس قسم کی بہانہ سازیوں کی باتیں مت کرو۔ ہم ان باتوں پر کبھی یقین نہیں کریں گے، اس لئے کہ اللہ نے ہمیں تمہارے متعلق صحیح صحیح باتیں بتا دی ہیں۔ باقی رہا آئندہ کا معاملہ، سو اللہ اور اس کا رسول (نظامِ خداوندی کا مرکز) تمہارے اعمال پر نگاہ رکھے گا اور تمہاری ہر نقل و حرکت، اُس خدا کے قانونِ مکافات کی کسوٹی پر پرکھی جائے گی جو اُن باتوں سے بھی باخبر ہوتا ہے جو انسانوں کی نگاہ سے اوجھل ہوں اور اُن سے بھی جو محسوس طور پر سامنے آجائیں۔ وہ کسوٹی بتا دے گی کہ تمہارے اعمال کی حقیقت کیا ہے اور تم کس قسم کے سلوک کے مستحق ہو۔

اس جگہ کہا گیا ہے کہ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ "خدا نے ہمیں تمہارے متعلق صحیح صحیح باتیں بتا دی ہیں"۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق وحی کے ذریعہ حضورؐ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ خدا نے تو منافقین کے سلسلہ میں کہا تھا کہ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۭ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ (۴۷/۳۰) — "اگر ہمارا قانونِ مشیئت ایسا ہوتا کہ ہم لوگوں کے جملہ امور وحی کے ذریعے بتا دیتے، تو ہم تمہیں بتا دیتے کہ ان میں کون کون

منافق ہیں، لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے۔ اے رسولؐ! تمہیں ان کی حرکات و سکنات سے خود پہچاننا ہوگا کہ ان میں کون کون منافق ہیں۔ لہٰذا جب کہا کہ (قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰہُ مِنْ اَخْبَارِکُمْ) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منافقت کی علامات اس وضاحت سے بتادی ہیں کہ ہمارے لئے چنداں مشکل نہیں رہا کہ ہم منافقین کو پہچان سکیں۔ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو منافق کی باتیں اس کی منافقت کی غماز ہو جاتی ہیں۔ باقی رہا ان کے اعمال کی جزا کا معاملہ، سو اس کا فیصلہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوگا جس کی نظروں سے ان کا کوئی عمل چھپا ہوا نہیں ——— اور ظاہر ہے کہ فیصلے انسانی اعمال کی رو سے ہوتے ہیں۔ قرآن کے معاشرتی نظام میں بھی اور خدا کی میزانِ اخروی میں بھی "اللہ اور رسولؐ" کی نگاہ اعمال پر ہوتی ہے۔

غور فرمایئے! معاشرتی معاملات میں اور قانونِ مکافاتِ عمل میں کس قدر فرق ہے! معاشرتی معاملات کے فیصلے نظامِ عدل کی رُو سے ہوتے ہیں جو بہرحال انسانوں کا قائم کردہ ہوتا ہے۔ خدا اس میں دخل نہیں دیتا۔ قانونِ مکافاتِ عمل از خود کارفرما رہتا ہے۔ دین کے ضمن میں یہ بڑا اہم نکتہ ہے اور قرآنی تعلیم کا بنیادی اصول۔

اس قسم کے لوگوں سے اعراض برتنے کی تاکید کی گئی۔

(۹/۹۵-۹۶) سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ز وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○

تمہاری واپسی پر یہ لوگ خدا کی قسمیں کھا کھا کر اپنے سچا ہونے کا یقین دلائیں گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو۔ تمہیں چاہیئے کہ ان سے اعراض برتو، اس لئے کہ ان کے دلوں میں نفاق کا مرض ایسا ہے جو ان کے خیالات میں تکدر اور ان کے قلوب میں شکوک و اضطراب

پیدا کرتا رہتا ہے (۵ ۱۲/ ۹)۔ اس لئے یہ، تمہاری جماعت کے سچے رکن نہیں بن سکتے۔ ان
کا ٹھکانا تمہارا جنّتی نظام نہیں، جہنم ہے جو ان کے اعمال کا صحیح صحیح بدلہ ہے (۹۵)۔
یہ سمجھتے ہیں کہ تم لوگوں کو ان سے کوئی ذاتی رنجش ہے، اس لئے اگر تمہیں کسی طرح
راضی کر لیا تو سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس مقصد کے لئے یہ قسمیں کھا کھا کر تمہیں
راضی کرنے کی کوشش کریں گے لیکن انہیں اس کا علم نہیں کہ یہ معاملہ تمہاری ذات سے متعلق
نہیں جو تمہیں ذاتی طور پر راضی کر لینے سے بات رفع دفع ہو جائے گی۔ اس معاملہ کا تعلق
قانونِ خداوندی سے ہے اور قانونِ خداوندی کبھی ان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا جو اس
کا راستہ چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کر لیں۔ لہٰذا انہیں سمجھ لینا چاہیئے تمہارا ذاتی طور
پر راضی کر لینا ان کے لئے ذرا بھی مفیدِ مطلب نہیں ہوگا۔ (نظامِ خداوندی میں محبت یا
عداوت، ذاتی جذبات کی رُو سے نہیں ہوتی، نظام کے نقطۂ نگاہ سے ہوتی ہے (۲۴-۲۳/ ۹؛
۶۲/ ۹)۔ (۹۶)۔

ہم نے آیات (۹/۹۵)؛ (۹/۹۶) کا مفہوم جس انداز سے بیان کیا ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے گویا ان منافقین کی یہ کوشش رسولؐ اللہ کی ذات سے تھی۔ لیکن آیت (۹/۶۲) میں بھی یہی بات کہی گئی ہے۔ وہاں ہم نے یہ مفہوم لیا تھا کہ ان لوگوں کی یہ سازش تھی کہ نظامِ مملکت سے بالا بالا صحابہؓ سے مصالحت کر لی جائے۔ لیکن جس طرح آیت (۹/۶۲) میں صیغے جمع کے تھے، اسی طرح آیات (۹/۹۵)؛ (۹/۹۶) میں بھی جمع کے صیغے ہیں۔ بنا بریں، ان آیات میں بھی یہی مراد ہوگی کہ یہ لوگ نظامِ مملکت سے بالا بالا افرادِ مومنین سے مصالحت کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن اگر ان میں مراد صرف رسولؐ اللہ لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ رسولؐ اللہ کا ذاتی معاملہ ہے، اس لئے اُن سے (مملکتی نہیں بلکہ) ذاتی سطح پر مصالحت کر لی جائے۔ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کے امراء سے مصالحت کی کوشش ہو یا رسولؐ اللہ کے ساتھ ذاتی مفاہمت، یہ دونوں کوششیں، نظامِ اسلامی کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل تھیں۔ اس نظام میں افرادِ مملکت حتیٰ کہ سربراہِ مملکت کی بھی ذاتی پوزیشن کچھ نہیں ہوتی۔ پوزیشن ساری نظامِ مملکت کی ہوتی ہے۔ جس فیصلہ کو نظامِ مملکت کی تائید حاصل ہوگی، وہ قابلِ قبول ہوگا۔ جو اس کے نقطۂ نگاہ سے قابلِ قبول نہیں ہوگا، وہ (جماعتِ مومنین یا سربراہِ مملکت میں سے) کسی

کے نزدیک بھی درخورِ اعتنا نہیں ہوگا۔ اس میں تو مسلک یہ ہوتا ہے کہ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۝ (۶/۱۶۳ - ۱۶۴) "تم کہہ دو کہ میرے تمام فرائضِ زندگی اور ان کے ادا کرنے کے طور طریقے، میرا مرنا اور میرا جینا، خدا کے متعین فرمودہ نظام کے لئے وقف ہیں۔ اس میں کسی اور مقصد، جذبہ یا خواہش کو شامل کرنا شرک ہے (جس کا میں مرتکب نہیں ہو سکتا)۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے جس کے سامنے میرا سر تسلیم خم ہے"۔ (دیکھئے مطالب الفرقان، جلد پنجم صفحہ ۱۵۱)۔ لہٰذا، اگر کوئی فرد یا گروہ اس کی کوشش کرتا ہے کہ اس نظام سے ہٹ کر تمہارے ساتھ ذاتی طور پر مصالحت کرے، تو وہ نہ تمہارے مسلکِ حیات سے واقف ہے، نہ تمہارے نظام سے شناسا۔ اُسے معلوم نہیں کہ تم توحید پر ایمان رکھتے ہو — اور

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے　　یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نظامِ مملکت کے استحکام کے سلسلہ میں کس قدر بنیادی راہنمائی عطا کر رہا ہے۔ عام نظامِ مملکت میں بھی اگر کوئی شخص، اس نظام سے بالا بالا کسی سے کچھ سودا بازی کرتا ہے، تو اُسے مملکت کا غدار کہا جاتا ہے اور یہاں یہ غداری خدا کے ساتھ ہے۔ اس کی وضاحت اگلی آیت میں یہ کہہ کر کر دی کہ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا ...... (۶/۱۶۵) کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور رب کی تلاش کروں؟ کسی اور کو اپنا رب بنالوں؟ اس کا نام شرک ہے اور اسی کو غداری کہا جاتا ہے۔

جن صحرانشین بدّوں (اعراب) کے متعلق کہا تھا کہ ہنوز ان کا ایمان ناپختہ ہے، ان کی کیفیت یہ تھی کہ:

(۹/۵) اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ۝

یہ صحرانشین بدو کفر و نفاق میں، شہریوں سے بھی دو قدم آگے اور سخت متشدد واقع ہوئے

ہیں. اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے حالات ایسے ہیں کہ ان کے لئے قرآنی تعلیم کا اچھی طرح سمجھنا ذرا دشوار ہے. اس کے لئے وقت درکار ہوگا (۴۹/۱۴) اس لئے قانونِ خداوندی کی رُو سے جو سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہے (شہریوں کے مقابلہ میں) ان سے کچھ مختلف سلوک کیا جائے گا).

یہ ان کی ذہنی اور قلبی کیفیت تھی. جہاں تک عمل کا تعلق تھا، ان کی حالت یہ تھی کہ:

(۹/۹۸) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ وہ جو کچھ نظامِ خداوندی کے لئے خرچ کرتے ہیں (جہالت کی بنا پر) اپنے اوپر جرمانہ سمجھتے ہیں اور منتظر رہتے ہیں کہ تم پر کوئی گردش آجائے (تو یہ پلٹ جائیں. یہ نہیں سمجھتے کہ اگر انہوں نے یہی روش جاری رکھی تو) یہ خود بُری گردش کے شکار ہو جائیں گے. یہ اُس خدا کا ارشاد ہے جو سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے.

آپ نے غور فرمایا کہ نظامِ خداوندی کے داعی کو کس کس قسم کے افراد سے واسطہ پڑتا ہے. لیکن وہ اس سے گھبراتا نہیں. وہ ان کی تعلیم و تربیت کے لئے برابر کوشش کرتا رہتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

(۹/۹۹) وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

لیکن انہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جو سچے دل سے اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے خدا کے ہاں بلند درجات اور رسولؐ کی طرف سے تحسین و آفرین کا موجب سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ یقین رکھیں کہ اس سے انہیں واقعی خدا کے ہاں بلند مدارج حاصل ہوں گے اور اللہ انہیں اپنی رحمتوں کے سائے میں داخل کرے گا' اس لئے کہ نظامِ خداوندی میں حفاظت اور رحمت کے سامان موجود ہوتے ہیں۔

یہ وہ (ناپختہ ایمان والے) تھے جن کے متعلق کہا تھا کہ اگر وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت گذار رہے تو ان کے اعمال یقیناً نتیجہ خیز ہوں گے (۴۹/۱۴) ان کی یہ قلبِ ماہیت اس اطاعت کا نتیجہ تھی۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ تازہ تازہ ایمان لائیں اُن کے ایمان کی ناپختگی سے دل برداشتہ نہیں ہو جانا چاہیئے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ اس سے ان کا ایمان (قرآن کے الفاظ میں) ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے گا اور اس کا مظاہرہ ان کے حسنِ عمل سے ہو گا۔

ان کے برعکس' وہ سعادت مند حضرات تھے جو اس نظام کے ایوان کی بنیاد کی اینٹیں بنے تھے۔ ان کے مقامات بڑے بلند تھے۔ ان کا تذکرہ سابقہ جلدوں میں متعدد مقامات پر آچکا ہے (دیکھئے انڈکس)۔ یہاں ان کے متعلق فرمایا:۔

(۹/۱۰۰) وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

اور مہاجرین و انصار میں سے جن لوگوں نے اس نظام کے قیام کے لئے پہل کی' جبکہ حالات بڑے ہی ناسا عد اور واقعات سخت حوصلہ شکن تھے اور جن لوگوں نے حسن کارانہ انداز سے ان کا اتباع کیا — وہ خواہ شہری ہوں یا دیہاتی — تو چونکہ انہوں نے قوانین سے ہم آہنگی اختیار کی' اس لئے اُس کی برکات و سعادات ان سے ہم آہنگ ہو گئیں

اور اُن کے لئے ایسا جنّتی معاشرہ تیار کر دیا گیا جس کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی. وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (اس زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی) اور یہ انسان کی بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے (۶۴-۸/۶۲؛ ۷۵-۸/۷۴؛ ۱۸/۲۸؛ ۴۸/۲۹؛ ۵۷/۱۰).

مفہومِ بالا کے آخر میں جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے' انہیں ضرور دیکھ لیجئے. ان سے صحابہؓ کی رفعت اور عظمت نکھر کر سامنے آجائے گی. ان کے متعلق جو کچھ قرآن نے کہا ہے' وہ ہمارے ایمان کا جزو بن جاتا ہے. اس لئے اس سے انحراف تو ایک طرف اختلاف بھی قرآن سے انکار کے مترادف ہے. اسلام' قرآن پر کاملتہً ایمان لانے کا نام ہے.

اس کے بعد پھر تصویر کا دوسرا رُخ:

(۹/۱۰۱) وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝

اور تمہارے اردگرد بسنے والے بدوؤں میں بعض لوگ منافق ہیں اور مدینہ کے رہنے والوں میں بھی بعض ایسے ہیں کہ منافقت گویا ان کی گھٹی میں پڑ چکی ہے. تم انہیں نہیں جانتے. ہم جانتے ہیں (تمہارا ان کے ساتھ جوں جوں رابطہ بڑھتا جائے گا' تم ان کی رفتار و گفتار سے انہیں پہچانتے جاؤ گے) ہم انہیں (پہلے) دو مرتبہ معمولی سزا دیں گے اور اگر یہ اس پر بھی باز نہ آئے تو انہیں سخت سزا دی جائے گی.

اس میں کہا گیا ہے: "لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ" تم انہیں نہیں جانتے. ہم جانتے ہیں. لیکن (جیسا کہ آیت (۹/۹۴) میں بتایا جا چکا ہے) خدا نے یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ نہیں بتائے گا کہ منافق کون کون سے ہیں. اس کا اندازہ تمہیں خود لگانا ہوگا.

اس کے بعد کہا ہے کہ "سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ" "ہم انہیں دو مرتبہ عذاب دیں گے"۔ لیکن ان پر یہ عذاب جماعتِ مومنین کے ہاتھوں، میدانِ جنگ میں وارد ہوا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ خدا کے پروگرام کے مطابق، جو امور جماعتِ مومنین کے ہاتھوں سرانجام پاتے ہیں، خدا انہیں اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس طرح خدا نے جو ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، انہیں بھی انہی مومنین کے ہاتھوں پوری کراتا ہے۔ قرآن کی رُو سے، خدا اور بندوں کے تعلقات کو سمجھنے کے لئے ان نکات کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ (تفصیل ان امور کی پہلے گذر چکی ہے۔ انڈکس میں دیکھئے عنوان 'خدا')۔

ان کی جوں جوں اصلاح ہوتی گئی، وہ (مخلص) جماعتِ مومنین کے قریب آتے گئے۔ اصلاح کی ابتدا از اپنی غلطیوں کے اعتراف سے ہوتی ہے (دیکھئے عنوان توبہ)۔

۹/۱۰۲ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اور کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انہوں نے کچھ کام اچھے بھی کئے ہیں اور کچھ بُرے بھی۔ (اور چونکہ انہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیا ہے، اس لئے) قانونِ خداوندی کی رُو سے ان کی معذرت قبول کر لی جائے گی۔ قانونِ خداوندی میں (غلطیوں کا اعتراف کر لینے والوں کے لئے) حفاظت و رحمت کی گنجائش رکھی ہوئی ہے۔

اور اس امر کا عملی ثبوت (کہ انہیں مخلص جماعتِ مومنین کی صف میں شریک کر لیا گیا) یہ ہے کہ ان کے عطیات قبول کر لئے جائیں گے۔

۹/۱۰۳ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ

سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ○

لہٰذا' اب تم ان کی مالی امداد قبول کر لیا کرو (جس کا مطلب یہ ہے کہ اب انہیں اس نظام کے ارکان تسلیم کر لیا گیا ہے) اور جماعت کے دیگر ارکان کے ساتھ تعلیم و تربیت سے ان کے قلب و دماغ کی تطہیر اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرو اور ان کے اچھے کاموں کی تحسین و ستائش سے ان کی حوصلہ افزائی کرو۔ اس سے انہیں اطمینانِ خاطر اور سکونِ قلب حاصل ہو جائے گا (اور اپنی سابقہ غلطیوں کی وجہ سے ان کے دل میں جو احساس کہتری پیدا ہو گیا تھا' وہ زائل ہو جائے گا)۔ یقیناً اللہ ہر ایک کی بات سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ یاد رکھو! بطیبِ خاطر مال کی قربانی انسانی ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہوتی ہے (۹۲/۱۸)۔

اس آیت میں چند نکات غور طلب ہیں:

۱۔ جیسا کہ سابقہ آیات سے ظاہر ہے' یہ اُس زمانے کا ذکر ہے' جب ہنوز قرآنی نظام اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا۔ اس نظام میں' ہر فرد اپنی آمدنی میں سے' اپنی ضروریات کے بقدر لے کر باقی سب مملکت کی خدمت میں پیش کر دیتا ہے کہ وہ اس سے حاجتمندوں کی ضروریات پوری کرے (۲/۲۱۹۔ دیکھئے عنوان "معاشی نظام")۔ لیکن جب یہ نظام قائم نہ ہوا ہو' تو افرادِ معاشرہ بطیبِ خاطر' عطیات دیتے ہیں انہیں صدقات کہا جاتا ہے۔ انہی صدقات کے مصارف (۹/۶۰) میں بیان ہوئے ہیں۔

صدقات کی وصولی

۲۔ مال کی بطیبِ خاطر قربانی سے انسان کے بُخل' خود غرضی' مفاد پرستی' تکاثر وغیرہ جیسے جذبات کی تطہیر ہو جاتی ہے۔

۳۔ اور اس سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے (۹۲/۱۸)۔ یہی ایمان ہے جو "زیادہ سے زیادہ محنت کرنے' اس کے ماحصل میں سے کم از کم اپنے لئے رکھنے اور دیگر حاجتمندوں کے لئے زیادہ سے زیادہ دے دینے" کا جذبۂ محرکہ قرار پاتا ہے ــــ وہ جذبۂ محرکہ جس کے نگاہ کے سامنے نہ ہونے سے مارکس نے کہا تھا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل تو اس نظام میں ہے' لیکن میں یہ سمجھ نہیں سکا کہ اس کے لئے جذبۂ

محرکہ کیا ہوگا. اِس لئے اُس نے اپنے پیشِ نظر معاشی نظام "کمیونزم" کو نافذ نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کوئی قرآن کو اساس بنائے بغیر اسے نافذ کر سکتا ہے۔

۴. ان لوگوں کو مخلص جماعتِ مومنین کے زمرہ میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس لئے (ظاہر ہے کہ) انہوں نے اپنے عطیّات بطیبِ خاطر پیش کئے تھے — کسی قسم کی ستائش کی تمنا اور صلہ کی اُمید کے بغیر —

انہیں شاباش دو

لیکن اس کے باوجود حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ اِن کے اِس حُسنِ عمل پر انہیں شاباش دو. اِس سے اِن کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی اور سکونِ قلب بھی حاصل ہوگا. یہی وہ " درود " ہے جس کا تفصیلی مفہوم، مطالب الفرقان جلد سوم صـ۱۱۳ پر آچکا ہے۔

اس کے بعد کہا کہ انہیں بتاؤ کہ جس خدا پر تم ایمان لائے ہو، "اُس کا دامن کس قدر وسیع اور اُس کی نگاہ کس قدر کشادہ" ہے۔

(۹/۱۰۴) اَلَمۡ يَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقۡبَلُ التَّوۡبَةَ عَنۡ عِبَادِهٖ وَيَاۡخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ۝

کیا انہیں اس کا علم نہیں کہ خدا کے بندوں میں سے، جو لوگ اپنی غلطیوں کا احساس کرکے آئندہ کے لئے اُن سے باز رہنے کا تہیہ کر لیتے ہیں، تو ان کی معذرت قبول کر لی جاتی ہے اور (دیگر ارکانِ جماعت کی طرح) ان کے صدقات قبول کر لئے جاتے ہیں. اس لئے کہ قانونِ خداوندی میں اس قسم کی دلی معذرت سے، سامانِ رحمت عطا ہو جانے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

دیکھئے! آیت (۹/۱۰۳) میں رسول اللہؐ سے کہا تھا کہ ان کے صدقات قبول کرو اور یہاں کہا کہ "خدا ان کے صدقات قبول کرتا ہے"۔ غور کیجئے کہ اس حقیقت کو کس طرح قدم قدم پر واضح کیا جا رہا ہے کہ انسان جو کام خدا کے احکام و پروگرام کے مطابق سرانجام دیتا ہے، اسے خدا اپنی طرف منسوب کر لیتا ہے۔

اس کے بعد کہا کہ توبہ کے یہ معنی نہیں کہ تم نے معذرت پیش کی، ہم نے اسے قبول کر لیا اور بات ختم ہوگئی. نہیں! بات ختم نہیں ہوگئی. بات تو بلکہ اب شروع ہوئی ہے. دیکھا یہ جائے گا کہ تمہارے اعمال

(کام) تمہاری معذرت کے پُرخلوص ہونے کی شہادت دیتے ہیں یا نہیں۔

(۹/۱۰۵) وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَ سَتُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۟

ان سے کہہ دو کہ تمہاری معذرت قبول کرلی گئی ہے۔ اب تم اپنے اعمال سے ثابت کرو کہ یہ معذرت دل سے کی گئی ہے۔ اللہ اور اس کا رسولؐ (نظامِ خداوندی کا مرکز) اور مومنین (اس نظام کے ارکان) تمہاری کارکردگی پر نگاہ رکھیں گے۔ تمہارے کام اُس خدا کے قانونِ مکافات کی میزان میں تولے جائیں گے جو ان امور سے بھی باخبر ہوتا ہے جو انسانی نگاہوں سے بھی اوجھل ہوتے ہیں اور ان سے بھی جو محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ وہ میزان ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک وزن بتا دیتی ہے۔

غور کیجئے! اعمال کے متعلق کہا کہ یہ وہ محسوس اور مرئی کام ہیں جنہیں "خدا، رسولؐ اور مومنین" دیکھ سکیں، یعنی جو نظامِ خداوندی اور جماعتِ مومنین کے سامنے آجائیں۔ باقی رہی تمہاری دلوں کی حالت، سو وہ خدا کی نگاہوں میں ہے۔ اس کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب ہوگا۔ یہاں محسوس

محسوس اعمال اور مضمر جذبات

اعمال اور ان کے جذباتِ محرکہ دونوں کا ذکر آگیا۔ محسوس اعمال معاشرہ کی نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں اور اُن کا جذبۂ محرکہ قانونِ مکافاتِ عمل کی نظروں میں۔ محسوس اعمال اور نادیدہ جذبۂ محرکہ، دونوں کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ محسوس اعمال کو، قلبی جذبات ہی کا مظہر ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ منافقت ہے۔ اعمال اور جذبات، دونوں کے پرکھنے کا خارجی معیار قرآن ہے۔ خدا کو "عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَتِ" ماننے کا عملی مفہوم یہی ہے۔



بنیادی طور پر، ذکر اُس جنگ کا چلا آرہا تھا جس میں منافقین نے طرح طرح کی بہانہ تراشیاں کی

تھیں کہ وہ کسی طرح جنگ میں شرکت سے باز رہ جائیں اور پھر طرح طرح کے حربے بھی استعمال کئے تھے۔ جن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ سے واپسی کے بعد مملکتِ اسلامیہ نے ایک "انکوائری کمیٹی" بٹھائی کہ وہ متعلقہ منافقین کے معاملات کا جائزہ لے اور تحقیق کرے کہ ان میں سے کون کس جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ ان میں سے اکثر کے معاملات کا فیصلہ ہوگیا لیکن کچھ ایسے رہ گئے جو مزید تحقیق و تفتیش کے متقاضی تھے۔

(۹/۱۰۶) وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

اس کے بعد ان چند لوگوں کا معاملہ تصفیہ طلب رہ جاتا ہے (۹/۱۱۸) جن کے متعلق (ابھی تحقیقات مکمل نہیں ہوئیں اور) یہ طے نہیں پایا کہ انہیں سزا دی جائے یا معاف کر دیا جائے (اس کا ذکر آگے چل کر (۹/۱۱۸) میں آئے گا)۔ اللہ کا قانون یکسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

عدالتی نظام کی بنیاد ان کا ذکر آیت (۹/۱۱۸) میں آتا ہے' اس لئے ہم بھی ان کی تفصیل وہیں پیش کریں گے۔ آیت زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ " وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ "۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عدالتی قانون بھی علم و حکمت پر مبنی ہونا چاہیئے (Based on Knowledge and wisdom) اور اسی نہج سے تصفیہ طلب امور کے فیصلے ہونے چاہئیں۔ جس فیصلے کے حق میں قرآن کی سند (علم) اور عقل Resason کی تائید نہ ہو' اسے مبنی بر عدل نہیں کہا جائے گا۔

اس کے بعد قرآنِ کریم نے منافقین کی اُس سازش کو بے نقاب کیا ہے جسے اسلام کی جڑ بنیاد کو

مسجدِ ضرار اکھیڑ دینے کے لئے اختیار کیا گیا تھا اور وہ سازش تھی ایک مسجد کی تعمیر۔ سوچئے کہ کیا کسی کے تصور میں بھی آسکتا ہے کہ مسجد کی تعمیر اسلام کی بنیادوں تک کو متزلزل کر دینے کا موجب ہو سکتی ہے؟ لیکن یہ کسی کی قیاس آرائی نہیں۔ خود خدا نے بہ نصِ صریح اسے ایسا قرار دیا ہے۔ یہ مسجد' مسجدِ ضرار کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان کی جلد اوّل کے صفحات ۲۱۵ ـ ۲۱۸ پر آچکی ہے۔ اسے دیکھ لیجئے۔ ہم اس مقام پر متعلقہ آیات اور ان کا مفہوم درج کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

(۹/۱۰۷) وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا ۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّھُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○

اور ان منافقین میں وہ لوگ بھی ہیں (جو اپنی چالوں میں اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کر ڈالی۔ (اور اس طرح یہ ظاہر کیا کہ وہ بڑے پکے مومن اور نظامِ خداوندی کے خدمت گذار ہیں) لیکن اس مسجد سے درحقیقت ان کی غرض یہ تھی کہ اس سے اس نظام کو نقصان پہنچایا جائے اور کفر کی راہیں کشادہ کی جائیں، یعنی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا جائے اور اس طرح یہ مسجد ان لوگوں کے لئے کمین گاہ بن جائے جو پہلے سے نظامِ خداوندی کے خلاف مصروفِ پیکار رہیں۔ یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم نے اس مسجد کو بڑی نیک نیتی سے تعمیر کیا ہے۔ لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ لوگ بڑے جھوٹے ہیں۔

غور فرمایئے! اللہ تعالیٰ نے اس مسجد کو "خدا اور رسولؐ کے دشمنوں کی کمین گاہ" کہہ کر پکارا ہے۔ اسے موجبِ کفر قرار دیا ہے۔ اس کی اس قدر شدید مخالفت کی وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ وہ مسجد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کا موجب تھی۔ لہٰذا کوئی عقیدہ، کوئی عمل، کوئی حرکت جو مسلمانوں میں تفرقہ (فرقہ بندی) پیدا کرنے کا موجب ہو، کفر ہے، خدا اور رسولؐ کے خلاف بغاوت ہے، خواہ وہ مسجد ہی کیوں نہ ہو! اور ہماری ہر مسجد کسی نہ کسی فرقہ سے منسوب ہوتی ہے، اس لئے مسجدِ ضرار۔

اس مسجد کے متعلق حضورؐ سے کہا گیا:

(۹/۱۰۸) لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰى

مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○

تم (اے رسولؐ!) اس مسجد میں قدم نہ رکھنا (جو مسجد، مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کردے، کیا وہ اس قابل ہو سکتی ہے کہ اس میں قدم رکھا جائے؟ تمہارا نہ ان لوگوں سے کچھ واسطہ ہو سکتا ہے نہ ان کی تعمیر کردہ مسجد سے کوئی تعلق (۶/۱۶۰))۔ اس کی مستحق صرف وہ مسجد ہے جس کی بنیاد، پہلے دن سے، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے اصولِ محکم پر رکھی گئی ہے۔ اس میں وہی لوگ آتے ہیں جو فرقہ بندی اور گروہ سازی کے شرک سے پاک اور صاف رہتے ہیں (۳۰/۳۱ — ۳۲)۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قانونِ خداوندی کی رُو سے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ (یاد رکھو! اسلام کی غایت عالمگیر انسانیت کی وحدت ہے (۲/۲۱۳؛ ۱۰/۱۹)۔ اس عظیم پروگرام کا آغاز ایک امّت کی تشکیل سے ہوتا ہے (۲/۱۴۳)۔ لہٰذا جب اس اُمّت میں وحدت نہ رہے، تفرقہ پیدا ہو جائے، تو اسلام کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ اس نہج سے تفرقہ شرک ہے (۳۰/۳۱)۔ ایسے لوگ اُمّتِ محمدیہ کے افراد نہیں کہلا سکتے۔ جس طرح مسجدِ ضرار کے بانیوں کے متعلق کہا (۴/۱۵۰ و ۶/۱۶۰)۔ یہ عذابِ خداوندی کے مستحق ہو جاتے ہیں (۳/۱۰۵))۔

بغرضِ تقابل کہا:-

(۹/۱۰۹) اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

ان سے پوچھو کہ کیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد قوانینِ خداوندی کی نگہداشت

اور منشائے خداوندی سے ہم آہنگی پر رکھی ہو، بہتر ہے یا وہ شخص جس نے یہ بنیاد ریت کے ایسے تودوں کے کنارے پر رکھی ہو جو کٹ کٹ کر دریا میں گرتے چلے جارہے ہوں اور اس طرح وہ عمارت اپنے بنانے والے کو ساتھ لے کر جہنم کے گڑھے میں جاگرے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح قانونِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں، ان پر زندگی کی کامرانی کی راہ کبھی نہیں کھل سکتی۔

(۱۱۰/۹) لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

یاد رکھو! ان کی یہ عمارت، جو انہوں نے اس مقصد کے لئے بنائی ہے، ان کے دل میں کانٹا بن کر کھٹکتی رہے گی۔ اس سے ان کے دل کی بے چینی اور اضطراب بڑھتا چلا جائے گا۔ ان کے غصے اور حسد کی آگ میں کمی نہیں ہوگی، تا آنکہ ان کے دل شدتِ اضطراب سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ ان سے کہہ دو کہ خدا کی یہ باتیں یونہی ڈھکی نہیں، علم و حکمت پر مبنی حقائق ہیں جو واقع ہو کر رہیں گے۔

جیسا کہ مطالب الفرقان جلد اوّل میں بتایا جاچکا ہے، ہماری ہر مسجد کسی نہ کسی فرقے کی مسجد ہے اور اس فرقہ بندی کی شدت کا یہ عالم ہے کہ فرقوں کے باہمی جھگڑوں پر مساجد پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ پولیس آجاتی ہے۔ منتظمین اور متولی جیلوں میں چلے جاتے ہیں۔ اگر کسی ایک فرقہ کی مسجد میں دوسرے فرقہ کا مسلمان نماز پڑھ لیتا ہے، تو اوّل تو اس مسجد کے اتنے حصے کا فرش اکھاڑ دیا جاتا ہے، ورنہ (کم از کم) اسے اچھی طرح دھلوایا جاتا ہے۔ یہ ہے مساجد کے باعثِ تفریق ہونے کا عالم۔ اس تفرقہ کا عملی مظاہرہ دیکھنا ہو تو کسی وقت شہر کی کسی بڑی شاہراہ پر کھڑے ہو جایئے۔ سب مسلمان اکٹھے دکھائی دیں گے، لیکن جونہی نماز کی اذان سنائی دے گی، وہی مسلمان مختلف مساجد میں بٹ جائیں گے، یعنی مساجد میں نہ جانے والے (نماز نہ پڑھنے والے) تو اکٹھے رہیں گے اور مساجد میں جانے والے فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ جن مساجد کا یہ عالم ہو انہیں "مسجد ضرار" نہیں کہا جائے گا تو اور کس نام سے پکارا جائے گا؟

تعمیر شدہ مساجد کو چھوڑیے۔ یہ حضرت نماز کے وقت کس طرح اپنی اپنی الگ "مسجد" بنا لیتے ہیں،

اس کی دو ایک ابھری ہوئی مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۹۷۷ء میں پاکستان میں "نظامِ مصطفٰی" کے قیام کے نام سے ایک تحریک شروع ہوئی تھی جس میں مختلف فرقوں کے علماء حضرات شامل تھے اور اسے "متحدہ محاذ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس "مقدس مقصد" کے لئے متحدہ محاذ میں (شیعہ سُنّی کو چھوڑیئے۔ سُنّیوں میں اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ کو بھی چھوڑ دیئے) حنفی فقہ کے دو فرقے بریلوی اور دیوبندی بھی شامل تھے۔ ان کے متعلق حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی تھی (نام ہم نے حذف کر دیئے ہیں)۔

فرقہ وارانہ نمازیں

"۲۵ اگست ۱۹۷۷ء کی شام، پاکستان متحدہ محاذ کے بڑے بڑے لیڈر جب افطاری کرنے لگے تو اسلامی اخوت اور نظامِ مصطفٰی کے قیام کے دعوے داروں کے درمیان ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ یہ لیڈر جب افطاری کر چکے تو نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگ وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دیوبندی فرقہ کے مفتی صاحب، دس بارہ آدمیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑے اور ان نمازیوں کی امامت مفتی صاحب نے کی، جبکہ بریلوی فرقہ کے نمائندہ جماعت اسلامی کے ارکان سمیت، دوسری طرف کھڑے ہو گئے اور انہوں نے الگ جماعت کرائی۔"

(مساوات، ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء)

اس سے واضح تر بریلوی فرقہ کے مولانا صاحب کی وہ تقریر ہے جو معاصر ایشیا کی (۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء) کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے فرمایا تھا:

ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں اور دیگر تین حضرات (۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء جمعرات کو) جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لئے گئے تاکہ دار العلوم اور ایک مسجد کا سنگِ بنیاد اُن سے رکھوایا جائے۔ تو جب ان سے باتیں ہو رہی تھیں، انہوں نے یہ فرمایا: میں نے سنا ہے کہ آپ بڑے وسیع القلب ہیں۔ آپ میں بڑی رواداری ہے۔ آپ میں بڑی فراخدلی ہے اور پھر فرمانے لگے کہ اس فراخدلی کا نتیجہ یہ ہے کہ جب آپ سہالہ میں تھے، قید کے ان لمحات میں رواداری اور وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلاں صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے یہ رپورٹ ملی ہے۔ میں سُنتا رہا۔ جب ان کی بات ختم ہو گئی تو میں نے جواباً عرض کیا، جنرل صاحب! بڑا افسوس ہے آپ کو غلط اطلاعات دی گئیں۔ ہم

میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ بڑی وسعتِ قلبی ہے۔ لیکن گستاخِ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت، نہیں۔ ہم میں رواداری ہے، لیکن حضور پُرنور کی شان میں تنقیص کرنے والے کے لئے کوئی رواداری نہیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امامِ اہلِ سنّت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلویؒ کا لکھا ہوا مجموعۂ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے جس میں علماء حرمین شریفین کے فتاویٰ موجود ہیں اور مسلکِ اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے۔ ہم اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! اس فتوے پر عمل کرتے ہوئے کوئی بھی شخص ہو، خواہ ڈیرہ اسماعیل خاں کا ہو، ملتان کا ہو، اچھرہ کا ہو، کسی شاتمِ رسولؐ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اور میں نے کہا، جناب والا! یہ چار چار ٹکے کے لوگ ہیں۔ ہم تو حرمین شریفین کے نجدی امام کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے۔ یہ مُلّا جو چار چار ٹکے کے ہیں۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو یہ غلط اطلاع ملی ہے، آپ مطمئن رہیں۔ ہمارے مسلک میں ایسی رواداری، فراخدلی اور وسعتِ قلبی نہیں ہے۔ ہمارے قلب میں شاتمِ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہ آج ہے، نہ آئندہ ہو گی اور اس کے لئے لوگ بہت سی باتیں کہتے ہوں گے۔ قومی اسمبلی میں بھی اذان ہوئی تھی۔ علامہ (۔۔) موجود ہیں۔ ان لوگوں کا رُخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رُخ ان سے دوسری طرف، اس کے دیکھنے والے ایک نہیں، دو نہیں، بے شمار لوگ ہیں۔"

(بحوالہ طلوعِ اسلام، بابت فروری ۱۹۷۸ء صفحہ ۶۲)

یہ انہی دو فرقوں اور ان کے دو نمائندوں کی بات نہیں۔ تمام فرقوں کی یہی حالت ہے (قرآن کی رُو سے فرقہ بندی کتنا سنگین جرم ہے، اس کے لئے انڈکس میں عنوانات تفرقہ اور فرقہ بندی دیکھئے)۔ یہ حالتِ موجودہ تو ان "مساجدِ ضرار" کا کوئی علاج نہیں۔ قرآنی نظام میں فرقوں کا وجود ہی نہیں ہوگا، اس لئے فرقوں کی طرف مساجد کی نسبت بھی نہیں رہے گی۔ اگر کوئی فرقہ اس نسبت کے برقرار رکھنے پر مصر ہوگا تو ظاہر ہے کہ وہ نظام اس مسجد کو مسمار کر دے گا کیونکہ مسجدِ ضرار کو، رسول اللہ کے حکم پر صحابہؓ نے آگ لگا دی تھی۔



ان کے برعکس، مومنین ہیں، جن کی بنیادی خصوصیت ایک آیت میں اس جامعیت اور حسنِ ارتکاز سے بیان کر دی گئی ہے اور اس میں تمام تفصیلات سمٹ کر آ گئی ہیں۔ فرمایا:

۹/۱۱۱ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ وَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ۝

ان (منافقین) کے برعکس، جماعتِ مومنین ہے جس کا نظامِ خداوندی کے ساتھ ایک عظیم معاہدہ ہوتا ہے[1]. اس معاہدہ کی رُو سے، نظامِ خداوندی، ان کا جان و مال خرید لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں انہیں جنت کی زندگی کی ضمانت دے دیتا ہے (یعنی اس دنیا میں ان کی تمام ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی اور ان کی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے تمام وسائل و اسباب کی فراہمی اس نظام کے ذمے ہو جاتی ہے. ۱۱۸-۱۱۹/۲۰). اس معاہدہ کے بعد وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور نظامِ خداوندی کے استحکام کی خاطر، عند الضرورت، جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں نکل آتے ہیں. پھر یا تو دشمن کو قتل کر کے، فاتح و منصور واپس آتے ہیں اور یا خود اپنی جان دے دیتے ہیں اور مرنے کے بعد جنت کی زندگی حاصل کر لیتے ہیں.

---

[1] اس معاہدہ کی رُو سے کہا گیا ہے کہ خدا مومنین سے ان کی جان و مال خرید لیتا ہے اور اس کے عوض انہیں جنت عطا کرتا ہے. یہ معاہدہ محض ذہنی اور اعتقادی نہیں کہ آپ نے دل میں کہہ دیا کہ میں نے اپنا جان و مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیا ہے اور خدا نے آپ کو جنت دے دی. یہ معاہدہ محسوس شکل میں نظامِ خداوندی سے کیا جاتا ہے جسے سب سے پہلے رسول اللہ نے متشکل فرمایا تھا اور جسے حضورؐ کے بعد آپ کے جانشینوں کے ہاتھوں قائم اور مستحکم رہنا تھا. اس دنیا میں جنتی زندگی کا وعدہ بھی اسی نظام کے ہاتھوں پورا ہونا تھا (اخروی جنت کی کیفیت اور ہے) مزید تفصیل کے لئے دیکھئے (۱۲/۴۸).

یہ معاہدہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ سابقہ آسمانی کتابوں، تورات و انجیل ۔۔ میں بھی مذکور تھا
اور اب اُسی کی تجدید قرآن میں کی گئی ہے۔ اس عہد کا پورا کرنا اللہ نے خود اپنے ذمے لے رکھا
ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ سے بڑھ کر، اپنے عہد کو پورا کرنے والا کوئی نہیں۔ سو (اے جماعت
مومنین) تم اس سودے پر، جو تم نے نظامِ خداوندی سے کیا ہے، خوش ہو جاؤ۔ اس لئے
کہ یہی زندگی کی سب سے بڑی کامرانی ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ یہ آیت بڑی جامع ہے۔ اس کی تشریح 'مطالب الفرقان' جلد اوّل صـ۱۱۱ پر بڑی وضاحت سے کی جا چکی ہے۔ اسے ایک نظر ضرور دیکھ لیجئے۔ اس معاہدہ میں جہاں تک جانفروشی کا تعلق ہے، اس کی طرف خود اسی آیت میں یہ کہہ کر اشارہ کر دیا ہے کہ اس کا مقام قتال فی سبیل اللہ (جنگ یا جہاد) ہے۔ جہاں تک مال فروشی کا تعلق ہے، یہ قرآن کے معاشی نظام کا نقطۂ ماسکہ ہے (اس کے لئے انڈکس میں "معاشی نظام" کا عنوان دیکھئے)۔ اس مقام پر ہم اس کے بنیادی خطوخال مختصر الفاظ میں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی رُو سے :-

۱۔ جملہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا مملکت کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ ظاہر ہے کہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں۔ واضح رہے کہ جو مملکت اس ذمہ داری کو اپنے سر پر نہیں لیتی، اسے ان ذرائع کو اپنی تحویل میں لینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

۳۔ جہاں تک افراد کی محنت کے ماحصل کا تعلق ہے، وہ اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے، لینے کے حقدار ہوں گے۔ بقایا دوسرے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مملکت کی تحویل میں چلا جائے گا۔

قرآن کریم کے متعین کردہ اس اقتصادی نظام کی رُو سے، وہ تمام مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں جنہیں آج (جب قرآن کا معاشی نظام نافذ نہیں) بحث و نزاع کا موضوع بنایا جاتا ہے اور بے مقصد وقت اور توانائی ضائع کی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب قرآن کا معاشی نظام نافذ نہیں ہوگا (جیسے کہ آجکل ہماری حالت ہے) اس وقت جیسا کچھ ہو رہا ہے، ویسا ہی ہوتا رہے گا۔ لیکن اسے اسلامی نہیں کہا جائے گا۔ یہ سمجھ لینا البتہ ضروری ہے

کہ جو مملکت قرآن کو اپنا ضابطہ حیات مقرر کرے اور اس کے معاشی نظام کو نافذ کرنے کا پروگرام بنالے، تو وہ اسے، اپنے حالات کے مطابق، بتدریج نافذ کرے گی۔ اس عرصہ کو عبوری دَور کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے اس دَور کے لئے بھی احکام (صدقہ، خیرات، وراثت وغیرہ) دیئے ہیں۔ جب قرآن کا معاشی نظام مکمل طور پر نافذ ہو جائے گا، تو وہ عبوری دَور کے ان احکام کی جگہ لے لے گا (تفصیل ان امور کی میری کتاب "نظامِ ربوبیّت" میں ملے گی)۔



یہ ہے وہ معاہدہ جس سے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے۔

آیت میں ہے کہ جو کچھ یہاں (قرآن میں) کہا گیا ہے، تورات و انجیل میں بھی وہی کچھ کہا گیا تھا۔ تورات یا انجیل اپنی اصلی اور غیر محرّف شکل میں دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں، اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان میں اس باب میں کیا کچھ ہو گا۔ لیکن جس شکل میں بھی وہ آج موجود ہیں، ان میں بھی اس ضمن میں نشاناتِ راہ ملتے ہیں۔ تورات میں مختصر الفاظ میں اور انجیل میں قدرے وضاحت کے ساتھ عہد نامہ عتیق (تورات) کتاب استثنا میں ہے۔

کُتبِ سابقہ میں اس نظام کے آثار

(حضرت موسیٰ نے کہا) اے اسرائیل سُن لے اور اس کے کرنے پر دھیان رکھ تاکہ تیرا بھلا ہو اور تم نہایت فراواں ہو جاؤ، اس زمین میں جس میں شیر اور شہد بہتا ہے ... تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ۔

(استثنا، باب ۶، آیات ۳-۵)

اپنے سارے دل و جان اور سارے زور سے خدا کو دوست رکھنے کا نتیجہ شیر اور شہد کی فراوانیاں ہوں گی۔

انجیل (متی) میں ہے کہ ایک شخص حضرت عیسیٰؑ کے پاس آیا اور آپ سے کہا کہ جو احکام آپ نے مجھے دیئے تھے، میں نے ان پر عمل کر لیا ہے۔ کیا میں اب کامل ہو گیا ہوں ؟ اس پر

یسوع نے اسے کہا کہ اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا! اپنا مال اور اسباب بیچ کر غریبوں کو دے، تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا...... اور وہ نوجوان غمگین ہو کر چلا گیا۔ کیونکہ بڑا مالدار تھا ؟

اور یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت

میں داخل ہونا مشکل ہے۵ اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۵ شاگرد یہ سُن کر بہت ہی حیران ہوئے اور بولے کہ پھر کون نجات پاسکتا ہے۵ یسوع نے ان کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ آدمیوں سے تو نہیں ہوسکتا، لیکن خدا سے سب کچھ ہوسکتا ہے۵ اس پر پطرس نے جواب میں اس سے کہا کہ دیکھ ہم تو سب کچھ چھوڑ کر تیرے پیچھے ہولئے ہیں، پس ہم کو کیا ملے گا۵

یسوع نے ان سے کہا کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہولئے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے اور جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا باپ ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا.........　　　　(متی: باب ۱۹، آیات ۲۰—۲۹)

انہیں اس دنیا کی جنتی زندگی اس نظام کی شکل میں ملی تھی جسے احکامِ خداوندی کی رُو سے قائم کیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد چہارم (صفحات ۱۱۳، ۱۱۴) میں دی گئی ہے۔

یہ تھا خدا کے ساتھ بیع و شریٰ (خرید و فروخت) کے اس معاہدہ کا عملی نقشہ جس کا ذکر سورۂ توبہ کی آیت (۹/۱۱۱) میں کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ (خدا نے کہا ہے کہ) دین کے اصول شروع سے آخر تک ایک ہی رہے ہیں (۴۲/۱۳)۔ غنیمت ہے کہ محرّف انجیل میں بھی اس قسم کے آثار باقی ہیں۔

لیکن قرآن کے ان نصوصِ صریحہ اور انجیل کے ان آثار کے باقی رہنے کا فائدہ کیا ہے، جبکہ ان کی ماننے والی قوموں (مسلمان اور عیسائی) دونوں کا نظام سرمایہ داری ہے، جسے ختم کرنے کے لئے دین آیا تھا۔ عیسائیوں نے مذہب کو سیاست سے الگ کر کے گرجا کی چار دیواری میں محبوس کر لیا۔ ہمارے ہاں قرآن کی جگہ، وضعی روایات اور دورِ ملوکیت میں مرتب شدہ فقہ نے لے لی اور اس طرح نظامِ سرمایہ داری عین مطابق اسلام قرار پاگیا۔ ع "ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں۔" (اقبالؒ، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ، "ارمغانِ حجاز")



مومنین کی اس بنیادی خصوصیت (خدا کے ساتھ معاہدہ) کے بعد، قرآن نے ان کی چیدہ چیدہ خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

(۹/۱۱۲) اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝

ان افرادِ معاشرہ کی خصوصیات یہ ہوتی ہیں:۔

۱۔ سفرِ حیات میں وہ جہاں محسوس کریں کہ ان کا قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گیا ہے، وہ وہیں رُک جاتے ہیں اور جہاں سے قدم غلط اٹھایا تھا، وہاں واپس آکر صحیح راستے پر ہو لیتے ہیں۔

۲۔ وہ قانونِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں اور اپنی جملہ صلاحیتوں کو خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صرف کرتے ہیں (۱/۴)۔

۳۔ وہ انفس و آفاق کی ہر شے پر غور و فکر کرنے کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کارگہِ کائنات کی ایک ایک چیز اپنے خالق کی حمد و ستائش کی منہ بولتی تصویر ہے (۱/۱؛ ۳/۱۹۰؛ ۴۱/۵۳)۔

۴۔ اس مقصد کے لئے وہ دنیا بھر کا سفر کرتے ہیں۔

۵۔ ہمیشہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھکے رہتے ہیں، اور

۶۔ دل کے پورے جھکاؤ سے اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

۷۔ وہ اُن باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں قانونِ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان باتوں سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔

۸۔ وہ اُن تمام حدود کی نگہداشت کرتے ہیں جو قوانینِ خداوندی نے متعین کی ہیں اور ان کے اندر رہتے ہوئے صحیح آزادی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مومنین جن کے لئے دنیا اور آخرت کی زندگی کی خوشگواریوں کی بشارتیں ہیں (ان میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں۔ ۳۳/۳۵؛ ۶۶/۵؛ ۲۳/۱-۹؛ ۲۲-۲۴/۶۰)۔

مومن کی خصوصیات

مومن کی دیگر خصوصیات کے لئے انڈکس میں عنوان "مومنین" دیکھئے، نیز وہ آیات جن کا حوالہ اوپر مفہوم میں دیا گیا ہے۔ یہ تو وہ الفاظ ہیں جن میں ان کی خصوصیات نمایاں کی گئی ہیں۔ جہاں تک مومن کے جامع تصور کا تعلق ہے وہ قرآنِ کریم پر غور و فکر سے ہی سامنے آ سکتا ہے۔ اس سے ایک ایسا پیکر وجہ فروغِ دیدہ اور باعثِ شادابیٔ قلب و دماغ ہوتا ہے جسے الفاظ میں محصور نہیں کیا جا سکتا ہے ؏ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست۔ اس کے متعلق جو کچھ زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے وہ ہی ہے جسے اقبالؒ قرآن کا مقصود و منتہیٰ قرار دیتا ہے۔ ان کے الفاظ میں قرآن کرتا یہ ہے کہ

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

مشیّتِ خداوندی جو چاہتی ہے کہ انسان کو ایسا ہونا چاہیئے' قرآن' انسان کو ویسا بنا دیتا ہے۔ اسے مومن کہتے ہیں۔ اقبالؒ نے قرآن کے متعلق کہا تھا کہ —— ایں کتابے نیست چیزے دیگر است —— یہی کچھ ہم مومن کے متعلق کہہ سکتے ہیں —— آں چیزے دیگر است۔ اتنا تو بہرحال واضح ہے کہ قرآن مومن کی جو صفات بتاتا ہے کم از کم ہم تو ان پر پورے نہیں اُترتے۔

سیاحت کرنے والے

مومن کی ایک صفت "سَآئِحُوْن" بھی بتائی گئی ہے جس کے معنی ہیں "سیاحت کرنے والے"۔ آپ سابقہ جلدوں میں دیکھیں گے ـ قرآنِ کریم نے تباہ شدہ اقوامِ سابقہ کے احوال و ظروف پر غور کرنے کی بار بار تاکید کی ہے۔ اس ضمن میں کہا ہے کہ تم ان کی بستیوں کے کھنڈرات کا نگہ بصیرت سے جائزہ لو۔ ان پر ان کی بربادی کی داستانیں کھلے الفاظ میں لکھی ملیں گی۔ اس کے لئے کہا کہ "سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ" دنیا کے مختلف علاقوں کی سیاحت کرو اور اقوامِ گذشتہ کے ان باقیات کا مطالعہ کرو۔ اس "سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ" کے لئے یہاں "سَآئِحُوْن" آیا ہے۔ لیکن یہ لفظ جامع ہے۔ اس سے مراد زندہ اقوام کے ممالک میں سیر و سیاحت سے ان کے حالات و کوائف کا مطالعہ کرنا بھی ہیں، نیز خود فطرت کے گوناگوں مظاہر کا بھی۔ گذشتہ زمانوں میں کہیں صدیوں میں جا کر ایک نامور سیّاح پیدا ہوتا تھا (مثلاً ابنِ بطوطہ وغیرہ) اور تاریخ اس کی سیاحت کے ماحصل کو بڑے فخر سے محفوظ کر لیتی تھی۔ لیکن آجکل یہ سیاحت عام ہو گئی ہے۔ قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس کی اہمیت پر زور دیا اور مومنین کی خصوصیات میں اس کا شمار کیا۔ اس

سے آپ قرآن کی دُور نگہی کا اندازہ لگائیے. سوچئے کہ اگر یہ قوم قرآن کو اپنا چراغِ راہ قرار دیتی تو آج اس کا مقام کیا ہوتا۔



یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے دنیا میں قومیں، جماعتیں، پارٹیاں دو ہی ہیں۔ ایک وہ جو قرآن پر ایمان رکھتی ہیں، دوسری وہ جو اس پر ایمان نہیں رکھتیں. اوّل الذکر کو جماعتِ مومنین، امّتِ مسلمہ، ملّتِ اسلامیہ کہہ کر پکارا جاتا ہے اور دوسرے گروہ کو غیر مسلم. اس میں امّتِ مسلمہ کے سوا دنیا کے تمام انسان شامل ہیں. قرآن نے بتا دیا ہے کہ چونکہ باہمی تعلّقات کی بنیاد ایمان کے اشتراک پر ہے اس لئے جماعتِ مومنین، غیر مسلموں کے ساتھ دوستداری کے تعلقات وابستہ نہیں کر سکتی. جیسا کہ (اس جلد میں) آیات (۸۰؛ ۸۴؛ ۹/۸۴) کے تحت بتایا جا چکا ہے، ان لوگوں سے معاشرتی تعلقات کے انقطاع کی اس حد تک تاکید کی گئی ہے کہ ان کے مرنے کے بعد میّت کی تجہیز و تدفین کی رسوم میں بھی شرکت نہیں کی جا سکتی. یہاں پر اسے دہرایا گیا ہے. فرمایا؛

(۹/۱۱۳) مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ۝

جماعتِ مومنین اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو صرف خدائے واحد کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں. جو لوگ اس میں، خدا کے علاوہ اوروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں (یعنی قوانینِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین ملا لیتے ہیں) ان سے اس جماعت کا کوئی تعلق نہیں. ان کے معاملہ میں تو، خود نبی، یا مومنین کے لئے اتنا بھی جائز نہیں کہ جب وہ (مشرکین) معاشرتی عدل کی رُو سے قانونِ خداوندی کے مطابق سزا کے لئے ماخوذ ہوں تو ان کے لئے اس سزا سے محفوظ رہنے کی آرزو کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، درآنحالیکہ ان پر واضح ہو چکا ہو (جیسا کہ ہر مشرک کے بارے میں

واضح ہے) کہ وہ لوگ جہنم کی سزا کے مستحق قرار پا چکے ہیں. یہ مؤاخذہ اُخروی زندگی میں ہوگا.
اس کے بعد ایک شک کا ازالہ کیا گیا:۔

(۱۱۴/۹) وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ۝

اس پر تمہارے دل میں شاید یہ خیال پیدا ہو کہ ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی مغفرت کی آرزو کیوں کی تھی، حالانکہ وہ بھی مشرک تھا. اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس (ابراہیمؑ) نے (اس توقع پر کہ اُس کا باپ خدا پر ایمان لے آئے گا) اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُس کے لئے خدا سے مغفرت چاہے گا. لیکن جب ابراہیمؑ پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ وہ خدا پر ایمان نہیں لائے گا، بلکہ وہ اس کا دشمن ہے، تو وہ اس سے بیزار ہو گیا. اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابراہیمؑ بڑا ہی غم خوار اور بُردبار تھا (جو اتنا عرصہ اس توقع میں رہا کہ اس کا باپ اللہ پر ایمان لا کر اپنے آپ کو اس کی حفاظت میں لے آئے گا. (۱۴/۴۱ ؛ ۱۹/۴۷ ؛ ۶۰/۴).

حضرت ابراہیمؑ کا باپ کے لئے استغفار

داستانِ حضرت ابراہیمؑ میں دیکھئے (جسے سابقہ جلدوں میں پیش کیا گیا ہے) وہ اُس باپ کے گھر میں پیدا ہوئے تھے جو مملکت کا سب سے بڑا پروہت تھا. خود بھی بُت پرست تھا اور بُت پرستی میں قوم کی قیادت بھی کرتا تھا. حضرت ابراہیمؑ نے (منصبِ نبوت پر فائز ہونے کے بعد) توحید کی تبلیغ کا آغاز خود اپنے گھر سے کیا اور اپنے والد کے غلط عقائد اور باطل مسلک کی شدت سے مخالفت کی. نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ باپ نے ان سے کہہ دیا: لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا (۱۹/۴۶).

"اگر تُو ان باتوں سے باز نہ آیا تو یاد رکھ! میں تجھے دھتکار دوں گا. اگر تُو اپنی خیر چاہتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے سے دُور ہو جا"

اس کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے کہا:

"قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ○

(۱۹/۴۷)" ابراہیمؑ نے (اس سخت کلامی کا جواب نہایت نرمی سے دیا اور) کہا کہ خدا آپ کو (صحیح راستے کی طرف ہدایت کرے) امن و سلامتی میں رکھے میں اپنے پروردگار سے دعا کرتا رہوں گا کہ وہ آپ کو (ایمان عطا کرکے کفر کی تباہیوں سے) محفوظ رکھے۔ وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میرے حال پر اس کی عنایات بے پایاں ہیں۔"

اس کے یہ معنی ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ کہا تھا کہ میں آپ کے لئے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا۔ [مغفرت کا مفہوم مطالب الفرقان جلد دوم صـ۲۸۶ پر آچکا ہے۔] حضرت ابراہیمؑ نے باپ سے کہا یہ تھا کہ آپ کی موجودہ روش آپ کو تباہی کی طرف لئے جا رہی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ اس غلط روش کو چھوڑ کر حق پرستی کا مسلک اختیار کریں اور اس طرح اس تباہی سے بچ جائیں جو آپ کی موجودہ روش کا لازمی نتیجہ ہے۔ آیۂ زیرِ نظر میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ باپ کو برابر تبلیغ کرتے رہے، لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ اپنی غلط روش سے باز نہیں آنے کا، تو اس سے قطع تعلق کر لیا۔ [آیت (۶۰/۴) میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔]

یہ ہے حضرت ابراہیمؑ کے اپنے والد کے لئے استغفار کا مطلب۔ اگر مغفرت یا استغفار کا قرآنی مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو اس قسم کے شکوک پیدا ہی نہیں ہوتے۔ مغفرت (یعنی غلط کاموں کے نقصان رساں نتائج سے حفاظت) تو انسان نے (صحیح اعمال کے ذریعے) خود ہی حاصل کرنی ہوتی ہے۔ دوسرے اس کی رہنمائی صحیح راستے کی طرف کر سکتے ہیں۔

مُردوں کی مغفرت

یہ ظاہر ہے کہ جب یہ مغفرت (فردِ متعلقہ نے) صحیح اعمال کے ذریعے خود ہی حاصل کرنی ہوتی ہے تو اس کے مرنے کے بعد اس کی مغفرت کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے؟ مرنے کے بعد تو خود بھی اپنی مغفرت کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ وہاں تو اس دنیا میں کئے گئے اعمال کے نتائج ہی سامنے آئیں گے۔ وہاں "یہاں کے" بوئے ہوئے کو کاٹنا ہوگا۔ نئے سرے سے کچھ بویا نہیں جائے گا۔ حصولِ مغفرت کا قدمِ اوّل توبہ ہے، یعنی غلط راستے سے باز آ کر صحیح راستے پر گامزنی۔ اس لئے کہا ہے کہ جب موت سامنے آکھڑی ہو تو پھر توبہ کچھ فائدہ نہیں دے سکتی (۴/۱۸)۔ اس لئے اُس وقت کام

کرنے کا موقع ہی باقی نہیں رہتا۔ سو جب مرنے والا موت کے سامنے آجانے اور مر جانے کے بعد اپنی "مغفرت" کے لئے خود بھی کچھ نہیں کر سکتا تو دوسرے اس کی مغفرت کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟ مرنے والے کے لئے دعائے مغفرت صرف نیک آرزوں کا اظہار ہوتا ہے جس سے اس کے پسماندگان کو کچھ سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ معاشرتی تعلقات کا زیادہ تر مقصد یہی ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مخالفین سے معاشرتی تعلقات کے مقاطع کے یہ معنی نہیں کہ انہیں حسن سلوک اور حقوقِ انسانیت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ بالکل نہیں۔ اس سے مراد انہیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ وہ ہمارے اپنوں میں سے نہیں اور کسی کے ساتھ منافقانہ تعلقات وابستہ رکھنا ہمارے مشرب کے خلاف ہے۔ باقی رہے حقوقِ انسانیت، سو ان میں وہ دوسرے انسانوں کے برابر شریک ہوں گے۔



اس کے بعد جزا اور سزا کے سلسلہ میں ایک اصول بیان فرمایا:

(۹/۱۱۵) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

یہ بات خدا کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی قوم کو صحیح راستہ دکھا کر، پھر یونہی اس پر کامیابی کی راہ بند کر دے۔ وہ پہلے اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ انہیں کن باتوں کی پابندی کرنی چاہیئے اور کن امور سے بچنا چاہیئے۔ اس وضاحت کے بعد جو لوگ اُس کے قوانین کی خلاف ورزی کریں، اُن پر کامیابی کی راہ بند ہو جاتی ہے (اس سے ظاہر ہے کہ معاشرتی عدل میں بھی نظامِ خداوندی میں مؤاخذہ اُسی عمل پر ہوگا جسے جرم قرار دے کر اس کا اعلان کر دیا گیا ہو)۔ یقیناً اللہ ہر بات کا علم رکھتا ہے۔

یہ حقیقت متعدد بار واضح کی جا چکی ہے کہ خدا نہ کسی قوم کو خود سیدھے راستے پر چلاتا ہے اور نہ ہی کسی کو (معاذ اللہ) گمراہ کرتا ہے۔ وہ غلط اور صحیح راستے (وحی کے ذریعے) متمیز کر دیتا ہے اور اس کے بعد اسے انسان کے اختیار اور مرضی پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرے۔ غلط اور صحیح راستے کے متمیز کرنے کی اہمیت اس قدر ہے کہ قرآنِ کریم نے واضح کر دیا ہے کہ کسی قوم کو تباہ

نہیں کیا جاتا۔

۱۔ تاوقتیکہ اسے پہلے متنبہ نہ کر دیا جائے کہ وہ جس روش پر چل رہی ہے وہ اسے تباہی کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے، وہ اسے چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لے۔ اور

جُرم و سزا کا اصُول

۲۔ اس قوم میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ سمجھ سکے کہ اسے کیا کہا جا رہا ہے۔

تفصیل ان نکات کی مطالب الفرقان جلد چہارم صفحات ۴۸۴ ۔ ۴۸۵، ۴۹۱ پر ملے گی (انڈکس میں "قوموں کے عروج و زوال" اور "اقوام کے استبدال و استخلاف کا قانون" دیکھئے)۔

اقوام سے نیچے اُتریے تو یہی اصول افراد کے لئے جرم و سزا کا قانون طے پائے گا، یعنی سزا اُس جرم کے ارتکاب کی ہو گی جس سے متعلق قانون کی پہلے ہی وضاحت کر دی گئی ہو اور مجرم میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔

قوموں کے اس عروج و زوال کو ان کی "موت و حیات" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ سابقہ آیت کے تسلسل میں ہے۔

(۹/۱۱۶) اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

یہ اس کی وسعتِ علمی ہے جس کی بنا پر کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اس کا اقتدار اور کنٹرول ہے اور اسی کے قانون کے مطابق، قوموں کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یاد رکھو! قانونِ خداوندی کے سوا، تمہارا کارساز اور مددگار اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

یہ فیصلے میدانِ جنگ میں بھی ہوتے ہیں جن کا ذکر زیرِ نظر سورہ میں بہ صراحت چلا آ رہا ہے۔ جنگ میں بعض اجتہادی غلطیوں اور بعض سہواً لغزشوں کی وجہ سے عارضی شکست بھی ہو جاتی ہے لیکن اگر قوم میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے تو وہ شکست کے بعد جی نہیں ہار دیتی بلکہ سنبھلتی ہے اور کامیابی حاصل کر لیتی ہے۔ غلط اقدام یا لغزش کے بعد سنبھل جانا توبہ کہلاتا ہے۔ توبہ درحقیقت بازآفرینی کا

موقع بہم پہنچاتی ہے اور یہ خدا کی رحمت ہے۔

(۹/۱۱۷) لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ

یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے اپنے نبیؐ کو اپنی رحمت سے نوازا اور مہاجرین وانصار کی اس جماعت کو بھی جس نے بڑی عُسرت اور بے سروسامانی کے عالم میں اس کے پیچھے قدم اٹھایا۔ ایسے نامساعد حالات میں، جب کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ قریب تھا کہ (مشکلات اور صعوبات کے ہجوم کی وجہ سے) ان میں سے ایک گروہ کا دل ڈول جاتا اور قدم ڈگمگا جاتے۔ لیکن اللہ نے ایسے ناسازگار حالات میں انہیں اپنی رحمت سے بہرہ یاب کیا (جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ ان کا دل ڈولا نہ ان کے قدموں میں لغزش پیدا ہوئی)۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے قانون میں راحت و رحمت کی بڑی گنجائشیں ہیں۔

آیت (۹/۱۰۶) میں بتایا جا چکا ہے کہ کچھ لوگ جو جنگ میں پیچھے رہ گئے تھے اُن کا معاملہ فیصلہ طلب تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں دوسروں کا معاملہ تو طے پا گیا، صرف تین باقی رہ گئے تھے۔ ان کے متعلق فرمایا:

(۹/۱۱۸) وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۠

اور اسی طرح اس نے تین شخصوں کو بھی اپنی رحمت سے نوازا جو (جنگ میں) پیچھے رہ گئے تھے (اور جن کا معاملہ التوا میں رکھا گیا تھا ۹/۱۰۶)۔ ان کا معاملہ معلق رہنے کی وجہ سے ان کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ "زمین" اپنی تمام وسعتوں کے باوجود، ان پر تنگ ہو گئی اور وہ خود اپنے آپ سے تنگ آ گئے اور انہیں معلوم ہو گیا کہ نظامِ خداوندی کے حکم کی خلاف ورزی کے بعد انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی، بجز اسی نظام کے دامنِ عافیت کے۔ اس کے بعد اللہ، ان کی طرف اپنی رحمت سے مُلتفت ہوا اور ان کی معذرت قبول کر لی، تاکہ وہ، اپنے معاشرہ کی طرف واپس آ جائیں (جہاں سے انہیں الگ کر دیا گیا تھا)۔ اللہ کے قانون میں دل سے معذرت کرنے والوں کے لئے سامانِ رحمت کی گنجائش ہے۔

حضرت کعبؓ بن مالک کا معاملہ

تاریخ میں ہے کہ یہ واقعہ جنگِ تبوک کا ہے اور جن تین حضرات کا معاملہ فیصلہ طلب تھا ان میں ایک حضرت کعبؓ بن مالک بھی تھے۔ یہ واقعہ اس قدر اہم اور اس کے تضمنات اس قدر عبرت آمیز اور حقیقت کشا ہیں کہ میں نے اسے اپنی کتاب "معراجِ انسانیت" (سیرتِ نبی اکرمؐ) میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اسے یہاں دہرا دینا مناسب ہو گا۔ میں نے اس میں لکھا ہے:

حضورؐ مدینہ واپس تشریف لائے تو متخلفین (پیچھے رہ جانے والوں) کا معاملہ پیش ہوا۔ یہ قریب اسی آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی معذرت پیش کی اور حضورؐ نے اسے قبول کر لیا۔ لیکن تین صحابہؓ ایسے تھے، جن کے لئے وحی کے حکم کا انتظار کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک کعبؓ بن مالک تھے (باقی دو بلال بن امیۃؓ اور مرارہ بن ربیعؓ تھے)۔

یہ واقعہ خلوص و صداقت اور ضبط و انضباط کا ایک مرقع ہے جس کا ہر گوشہ نگہِ بصیرت کے سامنے لانے کے قابل ہے۔ بہتر ہو کہ آپ یہ ماجرا خود حضرت کعبؓ کی زبان ہی سے سنیں! ان کا بیان ہے کہ اس سفر میں میرا گھر پر رہ جانا محض ابتلا تھا۔ نہ ہی ایسا کرنے کا میرا ارادہ تھا اور نہ ہی کوئی عذر تھا، بلکہ میں نے اس کے لئے خاص تیاری کر رکھی تھی۔ جس روز لشکرِ اسلام روانہ ہوا، مجھے کچھ کام تھا۔ میں نے کہا خیر کل چلا جاؤں گا۔ دو تین دن اسی طرح سُستی میں گزر گئے۔ اب لشکر اتنی دور نکل چکا تھا کہ جا کر اس سے ملنا بہت دشوار تھا۔ مجھے نہایت صدمہ تھا کہ یہ کیا ہوا؟ میں اسی تذبذب میں رہا کہ اتنے میں

رسول اللہ واپس بھی تشریف لے آتے۔ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ جس طرح اور لوگوں نے حیلے بہانے بنا کر معذرت قبول کرالی ہے تم بھی ایسا ہی کرو! لیکن میری روح اس تصور سے کانپتی تھی کہ جھوٹ اور وہ بھی رسول اللہ کے سامنے! میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "تم اپنے گھر میں ٹھہرو اور حکم خداوندی کا انتظار کرو!

بلاکسی عذر کے ملت کے اجتماعی امور میں عدم شرکت اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کا فیصلہ رسول اللہ خود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حضورؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ کوئی شخص ان تینوں سے بات چیت نہ کرے اور نہ ان کے پاس بیٹھے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ اب زندگی اور اس کی تمام جاذبیتیں ہمارے لئے وبال جان بن گئیں۔ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ہم پر تنگ ہو گئی۔ میرے دو ساتھی تو گھروں میں بیٹھ کر روتے رہے۔ لیکن میں باہر نکلتا تھا، نماز میں بھی شریک ہوتا تھا، لیکن کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ میں حضورؐ کے قریب ہی نماز پڑھتا اور کنکھیوں سے حضورؐ کی طرف دیکھتا رہتا۔ لیکن نگہ کرم کا میری طرف التفات نہ ہوتا۔ ایک شام میں اپنے چچازاد بھائی کے باغ میں گیا۔ انہیں مجھ سے بڑی محبت تھی۔ میں نے جا کر سلام کیا تو انہوں نے میرے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی! میں تم سے قسمیہ پوچھتا ہوں کہ بتاؤ، کیا میں خدا اور رسولؐ کو دوست نہیں رکھتا؟ انہوں نے اس پر بھی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر پوچھا تو پھر بھی ساکت رہے۔ میں نے تیسری مرتبہ قسم دے کر پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہی جانتا ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں واپس چلا آیا۔ ایک دن میں بازار میں چکر لگا رہا تھا کہ ایک شامی سوداگر میرے پاس آیا اور ملک غسان کا خط مجھے دیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تمہارے آقا تم سے خفا ہو گئے ہیں اور باقی لوگ بھی تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے۔ حالانکہ تمہارا مرتبہ بہت بڑا ہے۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ اس طرح چھوڑ دیئے جاؤ۔ تم یہ خط پڑھتے ہی ہمارے پاس چلے آؤ۔ یہاں آکر تم دیکھ لو گے کہ تمہاری قدر و منزلت کس طرح پہچانی جاتی ہے۔

ملت سے وفاشعاری

غور فرمایئے! یہ کتنی بڑی آزمائش تھی۔ لیکن جس دل میں ایمان کی حرارت موجود ہو اس کے لئے یہ آزمائش کیا حیثیت رکھتی ہے؟ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ اس خط سے میرے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے وہ خط اسی قاصد کے سامنے جلا دیا اور کہا کہ اپنے آقا سے جا کر کہنا کہ تمہاری عنایات و

التفات سے مجھے میرے آقا کی بے التفاتی لاکھ درجہ خوشتر ہے! میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ حضورؐ کی طرف سے ایک اور حکم موجود ہے کہ تم اپنی بیوی سے علیحدہ رہو۔ میں نے پوچھا کہ کیا طلاق کا حکم ہے؟ کہا، نہیں، صرف علیحدہ رہنے کا۔ یہ سن کر میں نے بیوی کو میکے بھیج دیا۔ پچاس دن اسی کرب والم میں گذر گئے۔ پچاسویں دن میں اسی غم میں اپنی چھت پر بیٹھا تھا کہ میں نے آواز سنی کہ کوئی شخص جبل سلع سے بلند آواز میں پکار رہا تھا کہ اے کعبؓ! مبارک ہو۔ میں سجدہ میں گر گیا کہ اللہ نے میری توبہ قبول کر لی۔ اس کے بعد لوگ بشارت لے کر یکے بعد دیگرے میری طرف آنے لگے۔ لوگ گھوڑوں پر چڑھ کر اس تیزی سے آ رہے تھے کہ ہر طرف سے بشارت کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ جس نے سب سے پہلے آ کر مجھے یہ مژدۂ جانفزا سنایا، میرے پاس دو کپڑے تھے، میں نے دونوں اتار کر اسے دے دیئے۔ اس کے بعد میں جلدی جلدی خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوا، تو راستہ بھر لوگ جماعت در جماعت، مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ مسجد میں پہنچا تو احباب دوڑ دوڑ کر آئے اور مجھ سے مصافحہ کرنے لگے۔ میں نے رسولؐ اللہ کو سلام کیا، تو حضورؐ نے فرمایا، اے کعبؓ! مبارک ہو! آج کا دن تیرے لئے سب سے مبارک ہے۔ میں نے کہا یا رسولؐ اللہ! یہ آپ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے؟ فرمایا، خدا کی جانب سے! میں نے فرطِ مسرت میں عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں خدا کے اس احسان کے شکریہ میں اپنا سب کچھ صدقہ کر دوں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کچھ اپنے لئے بھی رکھ لو۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ میرے اللہ نے میری صداقت کو اپنے بذل و احسان سے نوازا!

عبرت و موعظت

ہم نے اس واقعہ کو شرح و بسط کے ساتھ اس لئے بھی درج کیا ہے کہ اس میں آج، ہمارے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں پوشیدہ ہیں۔ وہاں تو یونہی تکاسل اور سہل انگاری سے ایسا ہو گیا تھا۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ کھلے بندوں ملت کے اجتماعی مفاد کے خلاف غداری کی جاتی ہے اور اس کے بعد یہ غدارانِ ملت اس طمطراق کے ساتھ اکڑتے پھرتے رہتے ہیں: نہ ان کے دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے اور نہ ہی قوم میں یہ احساس کہ ایسے غداروں کا کم از کم معاشرتی بائیکاٹ ہی کیا جائے، اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ معاندین کس طرح اس تاک میں بیٹھے رہتے ہیں کہ ایسے ملت فروشوں کو فوراً خرید لیا جائے۔ اس قسم کے سوداگروں کی پیشکش کا جواب وہ تنور ہے جس میں حضرت کعبؓ نے والیٔ غسان کا خط چاک کر کے ڈالا تھا لیکن

"جعفرانِ ایں زماں" تو خود ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یاد رکھئے:

جعفر اندر ہر بدن ملّت کُش است
ایں مسلمانے کہن ملّت کُش است

ان کا ایک ہی علاج ہے کہ قوم ان کے ساتھ ایسا سلوک کرے کہ قرآن کے الفاظ میں:

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ (۹/۱۱۸)

ان پر زمین اپنی کشادگیوں کے باوجود تنگ ہو جائے، حتّٰی کہ وہ خود اپنی جان سے تنگ آجائیں اور انہیں یقین ہو جائے کہ

أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ (۹/۱۱۸)

خدا کے بھاگے ہوئے کو سوائے خدا کے در کے، اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

اور وہ اس حقیقت کو محسوس طور پر اپنے سامنے رکھ لیں کہ

ایں جہاں بے ابتدا بے انتہا است
بندۂ غدار را مولا کجا است

جب تک وہ قانونِ خداوندی کے سامنے آکر جھک نہ جائیں، انہیں دنیا میں کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملے۔

اس تفصیل میں اور نکات غور طلب ہیں،

۱۔ ہمارے ہاں عام عقیدہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے تمام عمر جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا، وہ سب وحی تھا جو قرآن سے باہر ہے۔ ہم اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کرنے کے بعد واضح کر چکے ہیں کہ یہ نظریہ غلط ہے۔ وحی کی ایک ہی قسم تھی جو قرآن کے اندر مندرج ہے۔ اس کے علاوہ حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اور کہا، وہ آپؐ کی بشری حیثیت سے تھا۔ زیرِ نظر واقعہ میں حضورؐ نے حضرت کعبؓ کا بیان سُن کر فرمایا کہ "تم اپنے گھر میں ٹھہرو اور حکمِ خداوندی کا انتظار کرو۔" اور جب انہیں معافی مل گئی، تو انہوں نے آپؐ سے دریافت کیا کہ یہ آپؐ کی طرف سے ہے کہ خدا کی طرف سے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ "خدا کی جانب سے۔" اس سے وحیٔ خداوندی اور حضورؐ کی بشری حیثیت متمیز ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

۲۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ امت کے فرد کا (مسلمان ہونے کے باوجود) ملّت کے اجتماعی پروگرام سے (بلا قابلِ قبول عُذر) الگ رہ جانا، بڑا سنگین جُرم ہے۔ اسلام اجتماعی نظامِ زندگی ہے اور اجتماعیت

کا یہی تقاضا ہے۔ اس کی وضاحت مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۲۱۱ - ۲۱۲) میں کی جا چکی ہے۔ کتبِ روایات میں بہت سی روایات ہیں جن میں حضورؐ (اور خلفائے راشدینؓ) نے جماعت کے ساتھ رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

تمسک بالجماعت کی روایات

قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلّم) انی امرکم بخمس اللہ امرنی بھن الجماعۃ، والسمع، والطاعۃ، والھجرۃ، والجھاد فی سبیل اللہ۔ فانہٗ من خرج من الجماعۃ حین شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام عن عنقہ الا ان یرجع۔ ومن دعا بدعوی جاھلیۃ فھو عن اھل جھنم۔ قالوا یا رسول اللہ! وان صام وصلی۔ قال وان صلی وصام وزعم انہٗ مسلم۔

حضورؐ نے فرمایا: میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں، جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے: جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین جانو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اتار پھینکا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی زندگی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوںؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ! (کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا!) خواہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو؟ فرمایا، ہاں، اگرچہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور بزعمِ خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو۔"

ایک اور روایت میں حضورؐ نے فرمایا:

من فارق الجماعۃ فمات میتۃ الجاھلیۃ

جو جماعت سے الگ ہوا، وہ جاہلیت کی غیر اسلامی موت مرا۔

دوسری جگہ ہے: ید اللہ علی الجماعۃ۔ من شذّہ۔ شذّ فی النار۔ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اللہ خود اس کا محافظ ہوتا ہے۔ جو جماعت سے الگ ہوا، سیدھا جہنم میں گیا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا:

لا اسلام الا بالجماعۃ: جماعت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ایک روایت کو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ فرمایا:

ایاکم والتفرقہ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب الا! من دعا الی ھذا الشعا فاقتلوہ ولو کان تحت عمامتی ھذا۔

تفرقے سے ہمیشہ بچنا۔ کیونکہ جو انسانوں سے الگ رہتا ہے' اسے شیطان دبوچ لیتا ہے' جیسے اس بھیڑ کو بھیڑیا دبوچ لے' جو گلہ سے الگ ہو جائے۔ یاد رکھو! جو شخص جماعت سے الگ ہو جانے کی زندگی کی طرف بلائے' اسے قتل کر ڈالو' خواہ وہ سر میرے اس عمامہ کے نیچے ہی کیوں نہ ہو (معاذ اللہ)

تمسک بالجماعت کی تاکید اگلی آیت میں کر دی، جہاں فرمایا:

(۹/۱۱۹) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ○

(اس واقعہ کا ذکر' خصوصیت کے ساتھ' اس لئے کیا گیا ہے کہ جماعتِ مومنین پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ان کا شعارِ زندگی یہ ہے کہ) وہ قوانینِ خداوندی کی پوری پوری نگہداشت کریں۔ (لیکن یہ چیز انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے انہیں) صادقین کی جماعت کے ساتھ رہنا ہو گا (۲/۴۳)، یعنی سفرِ زندگی' دیگر افرادِ کارواں کی معیّت میں طے کرنا ہو گا۔ جماعت کے ساتھ رہ کر' قوانینِ خداوندی کی اطاعت' یہ ہے جنّت میں جانے کا راستہ (۸۹/۲۹-۳۰)۔

(یاد رکھو! مذہب انفرادی مسلک کا نام ہے' لیکن دین اجتماعی نام ہے۔ اس نظام سے الگ ہو جانے سے خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔)

---

[1] ان روایات میں "جماعت" سے مراد خود امّت یا اُمّت کا اجتماعی نظام ہے۔

اس کے بعد پھر روئے سخن اُن کی طرف منعطف ہوا جنہوں نے جنگ میں شرکت سے گریز کیا تھا۔

(۹/۱۲۰) مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّ لَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَ لَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۙ

اہلِ مدینہ اور اس کے ارد گرد بسنے والے بدوؤں کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ جہاد کے وقت رسولؐ اللہ کا ساتھ چھوڑ دیتے اور اپنے آپ کو اس کے مقابلہ میں زیادہ عزیز رکھتے (۳۳/۶) ۔ (یہ انہوں نے اس لئے کیا کہ وہ اس راستے کی مشکلات اور مصائب سے ڈرتے تھے ۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں) بھوک اور پیاس کی جس مصیبت کو وہ جھیلتے ، جو تکان اور مشقت وہ اٹھاتے ' ان کا ہر وہ مقام جو اس مقام پر پڑتا ، جہاں اس کا پڑنا فریقِ مخالف کے لئے غیظ و غضب کا موجب ہوتا ، حتٰی کہ ہر وہ نقصان جو انہیں دشمن کی طرف سے پہنچتا ، ان میں سے ایک ایک چیز ان کے لئے عملِ صالح بنتی چلی جاتی ۔ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات کسی کا حسن کارانہ عمل ضائع نہیں ہونے دیتا ۔

اس سے آپ جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کی اہمیت اور اس کے صلہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ یہ دعویٰ ایمان کی صداقت پیش کرنے کا آخری مقام اور خدا کے ساتھ بیع و شریٰ (۹/۱۱۱) کے معاملہ کے عملی

مظاہرہ کا وقت تھا۔ وہ معاملہ جان اور مال دونوں کی فروخت کا تھا۔ مخلص مومنین مال کا ایثار بھی کر رہے تھے اور جان کا نذرانہ بھی پیش کر رہے تھے۔

(۹/۱۲۱) وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

یاد رکھو! اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے جماعتِ مومنین کے افراد جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں — خواہ تھوڑا ہو یا بہت — یا جو منزل بھی وہ قطع کرتے ہیں' ان سب کے نتائج مرتّب ہوتے چلے جاتے ہیں تاکہ خدا کا قانونِ مکافات' انہیں' ان کے اعمال کا حسین ترین صلہ دے۔

صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین کے سامنے کس قدر مصروف پروگرام تھا' اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جماعت کی تشکیل' منافقین کی سازشوں کی روک تھام' نظامِ ربوبیّت کا قیام اور ان سب سے بالاتر' مخالفین کے ساتھ تصادمات۔ اس آخری شق کی کیفیت یہ تھی کہ ۲ھ سے لے کر ۱۰ھ تک بڑی بڑی جنگوں اور چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کو ملا کر (۸۲) کے قریب نبرد آزمائیاں ہوئیں۔ ان ہوش رُبا' صبر آزما اور استقامت طلب مصروفیات میں کچھ اور سوچنے کے لئے کیا ایک لمحہ بھی مل سکتا تھا؟ لیکن دین کا بنیادی مقصد سیرت سازی اور اس کے لئے حضورؐ کا اوّلین فریضہ تعلیم کتاب و حکمت تھا (۲/۶۲)۔ جب تک جماعت مدینہ تک محدود تھی تعلیم و تعلّم کا یہ سلسلہ بآسانی سرانجام پا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ تحریک بیرونِ مدینہ (دیگر قبائل تک) بھی پھیل گئی تو اس کے لئے جداگانہ پروگرام مرتّب کرنا پڑا۔

تَفَقُّہ فی الدّین

اور وہ پروگرام یہ تھا کہ ہر قبیلہ کے کچھ لوگ' باری باری' تحریک کے مرکز (مدینہ) میں آ کر ضروری معلومات حاصل کریں اور واپس جا کر' انہیں باقی افرادِ قبیلہ تک پہنچائیں۔ اس سے تَفَقُّہ فی الدّین کا اہم فریضہ ادا ہوتا رہے گا۔

(۹/۱۲۲) وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ؏

اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جنگ اور قتال میں مصروف رہنے کے یہ معنی نہیں کہ تم دین کے دوسرے شعبوں کو نظر انداز کر دو۔ یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ تعلیم و تعلّم کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ لہٰذا' جماعتِ مومنین کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ سب کے سب ایک ہی کام کے لئے نکل کھڑے ہوں۔ چاہیئے یہ کہ ہر گروہ میں سے کچھ لوگ (مرکزِ نظامِ خداوندی میں آکر) اس نظام کے متعلق پوری پوری سمجھ بوجھ حاصل کریں اور پھر اپنے لوگوں کی طرف واپس جاکر انہیں اس سے آگاہ کریں۔ اس طرح پوری کی پوری قوم' اپنے آپ کو غلط باتوں سے محفوظ رکھ سکے گی (اور صحیح نظام کے مطابق چلنے کے قابل ہو جائے گی)۔

یہ تھا اسلامی نظام میں تعلیم و تعلّم کا پروگرام۔ جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو مذہبی پیشوائیت وجود میں آگئی۔ انہوں نے آکر یہ دعویٰ کیا کہ دین کا علم حاصل کرنا اور اس کی تبلیغ کرنا علماء کا فریضہ ہے اور انہی تک محدود۔ ہم اس خلافِ اسلام' نظریہ کی تردید وضاحت سے کر چکے ہیں (دیکھئے مطالب الفرقان' جلد سوم' صفحہ ۹۰' جلد چہارم' صفحہ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ دیکھئے انڈکس میں امر بالمعروف اور امت کے عنوانات)۔

ہمارے علماء حضرات اپنی پیشوائیت کے جواز میں' زیرِ نظر آیت بھی پیش کیا کرتے ہیں' لیکن اس کا جو مفہوم اوپر بیان کیا گیا ہے' اس سے واضح ہے کہ یہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری نہیں۔ اس میں ساری امت شریک ہوگی۔ اس کے لئے یہ پروگرام تھا' جو تحصیل و تبلیغِ علم کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔

تحصیلِ علم کے ساتھ پھر جنگ کی اہمیت کو سامنے لایا گیا۔

(۹/۱۲۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ

وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ○

دوسری طرف، دین کی حفاظت کے لئے جنگ کی ضرورت اور اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے. تم ان مخالفین سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس پھیلے ہوئے ہیں تاکہ وہ تمہاری قوّت اور شدت کو محسوس کر لیں (اور سمجھ لیں کہ تم یونہی نگلے نہیں جا سکتے). اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا کی تائید اُن لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، جو اُس کے قوانین کی نگہداشت کرتے ہیں.

آپ مومنین کی خصوصیات ملاحظہ فرمایئے. وہ ایک طرف تَفَقُّہ فی الدّین کے پروگرام میں بھی حصّہ لے رہے ہیں اور دوسری طرف شمشیر بکف میدانِ جنگ میں بھی نبرد آزما ہیں. یہی مومن کی حقیقی زندگی ہے.

مومناں راتیغ با قرآں بس است

تلوار اور قرآن

لیکن ہمارے علماء کرام تَفَقُّہ فی الدّین کو اپنی اجارہ داری سمجھتے ہیں، اور تلوار کی انہوں نے کبھی شکل تک نہیں دیکھی. دوسری طرف ہمارے مجاہدین (یعنی فوج سے متعلقین) ہیں جن کا دین کا علم (بالعموم) اُس خطبہ تک محدود ہوتا ہے جسے فوج کا امام، جمعہ کے اجتماع یا دیگر تقاریب میں دہرا دیتا ہے. مذہب کی دنیا میں یہی ثنویت کارفرما رہتی ہے.

(۹ / ۱۲۴-۱۲۵) وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ○ وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ○

جب ایسا ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے (جنگ و قتال کے سلسلے میں) کوئی سورۃ نازل

ہوتی ہے تو (منافقین میں سے) بعض لوگ، ازراہِ تمسخر، کہتے ہیں کہ تم میں سے وہ کون ہیں جن کا ایمان ان نئے احکام نے بڑھا دیا ہے؟ سو جو لوگ فی الواقع صاحبِ ایمان ہیں اُن کا ایمان اِن احکام سے یقیناً بڑھ جاتا ہے اور وہ اس پر خوشیاں مناتے ہیں (۱۲۴)

لیکن جن لوگوں کے دلوں میں منافقت کا روگ ہے تو اس قسم کے احکام سے ان کے شکوک اور اضطرابات اور زیادہ ہو جاتے ہیں (۹/۹۵) اور وہ حالتِ کفر ہی میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں (۱۲۵)۔

حالانکہ اگر وہ اس بات پر غور کر لیتے کہ اخلاص پر مبنی ایمان سے جماعتِ مومنین کی قوت میں کس قدر اضافہ ہوتا جا رہا ہے، تو انہیں منافقت کے انجام کے سمجھ لینے میں چنداں دقت نہ ہوتی۔

(۹/۱۲۶) اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○

کیا یہ لوگ اس پر بھی غور نہیں کرتے کہ کوئی سال ایسا نہیں گزرتا کہ وہ ایک یا دو مرتبہ (تمہارے ہاتھوں ۹/۱۴) کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے ہوں۔ اس پر بھی یہ اپنی غلط روش سے باز نہیں آتے اور اتنا نہیں سمجھتے (کہ منافقت ہمیشہ مصیبتوں کا موجب ہوا کرتی ہے)۔

منافقت میں ان کا یہ عالم ہے کہ:

(۹/۱۲۷) وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○

حالت ان کی یہ ہے کہ جب کبھی (جنگ وغیرہ کے سلسلہ میں) کوئی احکام نازل ہوتے ہیں، تو یہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں (یہ پوچھتے ہوئے) کہ تمہیں کوئی دیکھ تو

نہیں رہا (کیونکہ تمہارے چہرے کا تغیر تمہاری قلبی کیفیت کی غمازی کر رہا ہے)۔ پھر وہ مُنہ پھیر کر چل دیتے ہیں (مُنہ پھیرنا کیسا؟) قانونِ خداوندی کی رُو سے ان کے تو دل ہی پھر چکے ہیں' کیونکہ یہ لوگ عقل و فکر سے کام لینے کے بجائے (اپنے جذباتِ نفرت و عداوت میں بہکے چلے جاتے ہیں)۔

دلوں کا پھر جانا

آیت کے آخری الفاظ پر غور کیجئے۔ کہا: صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ جس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے"۔ لیکن اگلے الفاظ اس کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ "اس لئے کہ انہوں نے غور و فکر سے کام لینا چھوڑ دیا"۔ یہ خدا کا قانون ہے کہ جو قوم غور و فکر سے کام لینا چھوڑ دے اس کے دل حقائق کی طرف سے پھر جاتے ہیں۔

فکر و تدبّر سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے کہ یہ لوگ اپنا نفع نقصان بھی نہیں پہچانتے۔ اگر کوئی شخص کسی گاؤں میں ہسپتال تعمیر کرنے کا ارادہ کرے اور گاؤں والے اس کی مخالفت کریں' تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی کہ وہ پاگل ہو گئے ہیں' جو اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ شخص اپنی گرہ سے روپیہ خرچ کر کے' ان کے لئے ہسپتال تعمیر کر رہا ہے اس کا ان پر کس قدر احسان ہے۔

ہسپتال تو چند مریضوں کے طبیعی امراض کے علاج کے لئے ہوتا ہے۔ کسی قوم میں رسولؐ جیسے ناصح مُشفق' طبیبِ غمگسار اور حکیمِ جانسوز کی بعثت پوری کی پوری قوم پر احسان تھا۔ جو لوگ اس کی مخالفت کرتے تھے' ان کے متعلق اس کے سوا کیا کہا جا سکے گا کہ وہ عقل و ہوش سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔

(۹/۱۲۸) لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۝

(اگر یہ ذرا بھی عقل و فکر سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ خدا کا کتنا بڑا احسان ہے کہ) ان کی طرف' انہی میں سے ایک رسولؐ آیا ہے جس کی دردمندی اور غم گساری کا یہ عالم ہے کہ اگر انہیں کوئی ذرا سی تکلیف بھی پہنچتی ہے تو اُسے اس سے بے حد رنج ہوتا ہے اور اس کی انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کی

بھلائی کا سامان پیدا ہو جائے (۳/۱۹۲ ؛ ۱۷/۴۹)۔ پھر ان میں سے جو لوگ (اس کی مخالفت اور سرکشی چھوڑ کر) نظامِ خداوندی پر ایمان لے آئے ہیں، وہ ان کی حفاظت اور نشوونما کا پورا پورا انتظام کرتا ہے۔

سورت کی آخری آیت میں کہا کہ ان لوگوں کو سمجھانے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا گیا۔ اگر اس پر بھی وہ نہ سمجھیں اور اس نظام سے رُوگردانی اختیار کریں، تو ان کا خدا حافظ!

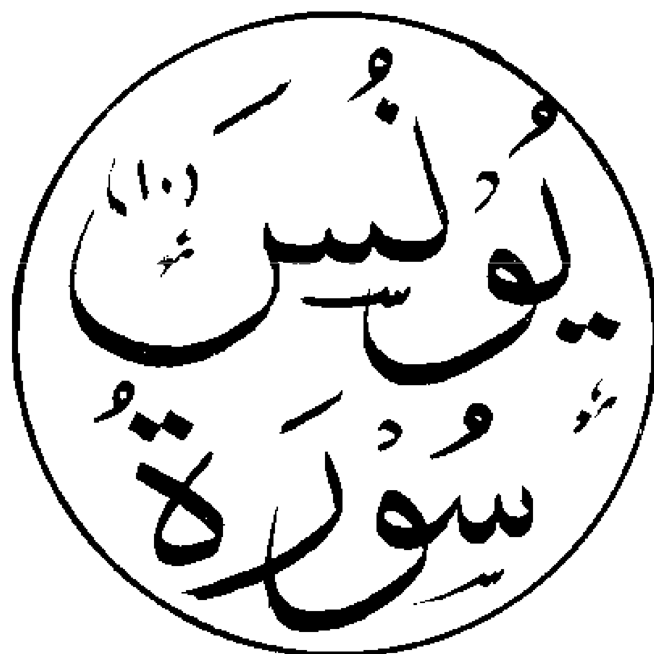
(۹/۱۲۹) فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِیَ اللّٰہُ ۫ۖ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ؕ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَ ہُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ۝

اگر یہ لوگ، اس قسم کے نظام اور ایسے مُشفق میرِ کارواں سے رُوگردانی کریں، تو اے رسولؐ! (تم ان سے کہہ دو کہ (مجھے تمہارے جیسے ساتھیوں کی ضرورت نہیں) میرے لئے خدا کی تائید و نصرت (اور مخلص مومنین کی رفاقت (۸/۶۴) کافی ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کسی کا اقتدار اور اختیار نہیں۔ مجھے اس کے قانون کی محکمیت پر پورا پورا بھروسا ہے۔ اس لئے کہ وہ قانون اُس خدا کا ہے جو کائنات کی مرکزی اور بنیادی قوتوں کو اپنے کنٹرول میں رکھے ہے اور تمام دنیا کی ربوبیّت کا ضامن ہے۔



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گیارہواں پارہ ——————— دسویں سورت



چوتھا باب

سُوْرَةُ يُوْنُسَ

جن کے رُتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے

۱. حضرت یونسؑ کے کوائفِ حیات۔
۲. تسخیرِ فطرت کے سلسلہ میں تین گروہ
۳. مومنین کی خصوصیات۔
۴. تباہی سے پیشتر تنذیر اور قوم میں سمجھنے کی صلاحیت۔
۵. اقتدار تمہیں دیا گیا تاکہ دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔
۶. مخالفین کی مفاہمت کی کوششیں اور انکار
۷. رسول اللہؐ سے بھی (بالفرضِ محال) معصیت سرزد ہو تو مؤاخذہ ہوگا۔
۸. دعویٰ نبوت کی صداقت کا ثبوت۔ زمانۂ قبل از نبوت کی زندگی۔
۹. وحدتِ انسانیت۔
۱۰. سزا بمطابق جُرم۔
۱۱. روزِ جزا کو تمام سربستہ رازوں کا انکشاف۔
۱۲. ذالکم اللہ۔
۱۳. اس جدوجہد کے نتائج حضورؐ کی زندگی میں مرتب ہوں گے یا بعد میں؟
۱۴. اگر (بالفرضِ محال) خدا کا وعدہ پورا نہ ہو، تو اس کی بابت پوچھا جا سکتا ہے۔
۱۵. جشنِ نزولِ قرآن۔
۱۶. قبلہ اور اقامتِ صلوٰۃ کے معنی۔
۱۷. دُعا اور عمل کا باہمی رشتہ۔
۱۸. دین میں جبر نہیں۔
۱۹. احادیث پرکھنے کا معیار۔





بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوۡرَۃُ یُوۡنُسُ

اس سورۃ میں حضرت یونسؑ کا ذکر صرف ایک آیت (۱۰/۹۸) میں آیا ہے۔ بقایا سورت دیگر موضوعات پر مشتمل ہے۔ حضرت یونسؑ کا تذکرہ دوسری سورتوں میں بھی آیا ہے لیکن ہم اسے اس مقام پر پیش کئے دیتے ہیں۔

حضرت یونسؑ بھی انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ ان کا عبرانی نام "یوناہ" تھا جو عربی میں آکر یونسؑ ہو گیا۔ تورات میں ان کا صحیفہ "کتابِ یوناہ" کے نام سے موجود ہے۔ ۸۶۰ ق م کے قریب اُن کا زمانہ قیاس کیا جاتا ہے۔

اس سے پہلے جن اقوام و ملل کے حالات ہمارے سامنے آئے ہیں، ان کا انداز یہ تھا کہ خدا کا رسول انہیں ان کے غلط اعمال کے انجام سے متنبہ کرتا، لیکن وہ صحیح راستہ اختیار کرنے کے بجائے مخالفت اور سرکشی پر اُتر آتے اور خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق تباہ ہو جاتے۔ لیکن حضرت یونسؑ کے تذکرہ میں معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے، یعنی انہوں نے جب قوم کو ان کی غلط روش کے عواقب سے متنبہ کیا، تو انہوں نے کچھ سوچ بچار کے بعد اپنی روش کو بدل لیا اور ہدایت کا راستہ اختیار کر لیا لیکن حضرت یونسؑ نے اس کا انتظار نہ کیا اور اس خیال سے کہ قوم پر عذاب آنے والا ہے، وہاں سے چل نکلے۔ اس کے بعد کیا ہوا، وہ آگے چل کر سامنے آجائے گا۔ لیکن پہلے یہ دیکھئے کہ مُحرّف تورات جس حالت میں بھی وہ اب ہے، وہ اس باب میں کیا کہتی ہے۔ اس ضمن میں "کتابِ یوناہ" میں جو کچھ موجود ہے اس کا ملخص حسبِ ذیل ہے:

آپ کو بارگاہِ خداوندی سے حکم ملا کہ نینوا جا کر وہاں کے باشندوں کو عذابِ خداوندی سے ڈرائیں

لیکن وہ نینوا جانے کے بجائے ایک کشتی میں سوار ہوکر ترسیس کی طرف چل دیے۔ راستے میں وہ کشتی طوفان میں گھر گئی۔ اُس زمانے میں ملاحوں کا عقیدہ تھا کہ کشتی میں کوئی گنہگار ہوتا ہے جس کی وجہ سے ایسا طوفان آتا ہے۔ جب تک اُسے کشتی سے نکال نہ دیا جائے، طوفان تھمتا نہیں چنانچہ مسافروں نے قرعہ اندازی شروع کی کہ کسے حوالۂ دریا کیا جائے۔ حضرت یونسؑ نے سُنا تو اپنے جی میں خیال کیا کہ مجھ سے زیادہ گنہگار کون ہوگا جو خدا سے بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ آپؑ نے اپنے آپ کو پیش کر دیا، اور ملاحوں نے انہیں سمندر میں پھینک دیا جہاں آپ کو ایک مچھلی نے نگل لیا۔ وہ تین

مچھلی کے مُنہ میں

دن تک اس مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ اس کے بعد اس نے آپؑ کو ساحل پر اُگل دیا۔ اس حادثہ کے بعد آپؑ کو پھر نینوا جانے کا حکم ہوا کہ وہاں کے باشندوں کو خدا کے عذاب سے ڈرائیں، تو انہوں نے معصیت کے بجائے خدا کے حضور تذلل و تعبد کا اظہار شروع کر دیا جس سے عذاب ٹل گیا۔ لیکن (حضرت) یونسؑ پر یہ بات گراں گزری کہ خدا نے وعدہ خلافی کیوں کی۔ وہ شہر سے باہر ایک چھپر بنا کر بیٹھ گئے جس پر رینڈی کے درخت کی شاخیں پھیل گئیں۔ لیکن ایک دفعہ اس کی جڑوں میں کیڑا لگ گیا جس سے درخت سُوکھ گیا۔ اس سے آپؑ کو سخت صدمہ ہوا۔

> تب خداوند نے فرمایا کہ تجھے اس رینڈی کے درخت پر تو رحم آیا جس کے لئے تُو نے کچھ محنت نہیں کی تھی، نہ ہی اُسے اُگایا تھا۔ وہ ایک ہی رات میں اگا اور ایک ہی رات میں سوکھ گیا تو کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینوا پر جس میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں سے زیادہ ہیں، جو اپنے دائیں بائیں میں امتیاز نہیں کر سکتے اور مویشی بھی بہت ہیں، شفقت کروں؟
>
> (یوناہ نبی، باب ۴، آیات ۱۰-۱۱)

یہ تورات کا بیان تھا۔ اب دیکھئے قرآنِ کریم میں داستانِ حضرت یونسؑ کو کس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ صٰفٰت میں ہے:۔

وَ اِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ (۳۷/۱۳۹-۱۴۰)

یونسؑ بھی ہمارے مرسلین میں سے تھا (بات ہم اُس وقت کی کر رہے ہیں جب) وہ بھاگ

کہ ایک ایسی کشتی میں سوار ہو گیا جو سواریوں سے بھری ہوئی تھی۔

قرآنِ کریم نے نہ تو اس واقعہ کی پہلی کڑیاں بیان کی ہیں اور نہ ہی یہ بتایا گیا ہے جو ان تمام کڑیوں کی غمازی کر رہا ہے۔ اَلْاٰبِقُ کے معنی ہوتے ہیں، اپنے فرائضِ منصبی کو چھوڑ کر بھاگ جانے والا یا چھپ جانے والا۔

ہم دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ رسول پہلے اپنی قوم کو حق کی دعوت دیتا۔ لیکن جب مسلسل دعوت و تبلیغ کے بعد دیکھا جاتا کہ وہ قوم صحیح راستے کی طرف آنا نہیں چاہتی، تو وہ خدا کے حکم کے مطابق، اس قوم کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف چلا جاتا جہاں کے متعلق اندازہ ہوتا کہ وہاں اس دعوت کے لئے فضا سازگار ہے۔ اسے ہجرت کہتے ہیں، جس کی تفصیل سابقہ جلدوں میں گزر چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

ہجرت قبل از وقت

جب حضرت یونسؑ نے دیکھا کہ قوم اپنی سرکشی سے باز نہیں آتی تو وہ قوم سے ناراض ہو کر کسی دوسری طرف جانے کے لئے چل نکلے، حالانکہ ابھی خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم نہیں ہوا تھا۔ یہ اقدام انہوں نے اپنے اندازہ کے مطابق کیا۔ یہ خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں تھی۔ یوں کہیئے کہ یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ قرآنِ مجید میں دو الفاظ ایسے آئے ہیں جن سے ہمارے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے: وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا .... (۲۱/۸۷) یعنی وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر غصے میں آ کر چلا گیا۔ ان کے اس اقدام کے متعلق کہا: فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (۳۷/۱۴۱)۔ دحض کے معنی ہوتے ہیں پاؤں کا پھسل جانا، ذرا سی لغزش ہو جانا۔ عام لوگوں سے اس قسم کی لغزش کوئی بڑا جرم قرار نہیں پاتی، لیکن ـــــ جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے ـــ ایک نبی سے اس قسم کی لغزش بھی قابلِ مؤاخذہ قرار پا جاتی ہے۔ لیکن انہیں اس کا خیال تک نہیں تھا کہ یہ کوئی قابلِ گرفت جرم ہے۔ چنانچہ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا کے بعد ہے: فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ (۲۱/۸۷)۔ "اس نے خیال کیا کہ اس کی وجہ سے اس پر کوئی تنگی نہیں ہوگی" ـــ اس کا یہ اقدام کسی مؤاخذہ کا مستوجب تصور نہیں کیا جائے گا۔

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (۳۷/۱۴۱) کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ دوسری سواریوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گیا، لیکن اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ دریا میں جا گرا[1]۔ قرآن نے

(۱ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

یہ نہیں بتایا کہ وہ کشتی ڈگمگا گئی تھی یا ڈوب گئی تھی۔ اس نے اتنا ہی کہا ہے کہ فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَ هُوَ مُلِيمٌ (۳۷/۱۴۲) ـــــ اسے ایک بہت بڑی مچھلی نے مُنہ میں دبوچ لیا۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا (کہ اس نے عجلت میں کیا کیا)۔

یہاں الفاظ "فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ" آئے ہیں۔ لَقِمَ اور اِلْتَقَمَ منہ میں دبوچ لینے کو کہتے ہیں، خواہ اس کے بعد نگل لیا جائے یا نہ۔ لُقْمَہ یہاں سے ہی ہے جس کے معنے مُنہ میں ڈالے ہوئے نوالے کے ہیں۔ اس اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس مچھلی نے (حضرت) یونسؑ کو مُنہ میں دبوچ لیا۔ اس کی تائید اگلی آیات سے بھی ہوتی ہے جہاں کہا ہے۔ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ۙ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۚ (۱۴۳-۱۴۴/۳۷)۔ مُسَبِّحِيْنَ کے عام معنی کئے جاتے ہیں "تسبیح کرنے والے" اور کہا جاتا ہے کہ حضرت یونسؑ نے مچھلی کے پیٹ میں یہ تسبیح پڑھی تھی۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ڰ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ (۲۱/۸۷)۔ یہ "تسبیح" بڑی مشہور ہے اور ہمارے ہاں ہر مصیبت کے وقت اس کا ورد کیا جاتا ہے۔ "تسبیح" کے معنی مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۳۰ پر گزر چکے ہیں۔ اس مادہ (س۔ ب۔ ح) کے بنیادی معنی تیرنے کے ہوتے ہیں۔ اَلسَّبَّاحُ ایسے تیراک کو کہتے ہیں جو پورے ہاتھ پھیلا کر تیرے اور "اَلسَّوَابِحُ" اُن گھوڑوں کو کہتے ہیں جو پورے قدم اٹھا کر انتہائی تیزی سے دوڑیں۔

مُسَبِّحِیْنَ کا مفہوم

ان بنیادی معانی کی رُو سے سَبَحَ کے معنی ہوتے ہیں کسی مقصد کے حصول کے لئے انتہائی جدوجہد کرنا، پوری پوری تگ و تاز کرنا، ہاتھ پاؤں مارنا۔ لہٰذا آیت زیرِ نظر کا مطلب یہ ہے کہ مچھلی نے حضرت یونسؑ

(گزشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) سَاهَمَ کے معنی ہیں (i) دوسروں کے ساتھ شریک و سہیم ہونا۔ (ii) دوسروں کے ساتھ مل کر قرعہ اندازی کرنا۔ (iii) کمزور اور لاغر ہو جانا۔ ان میں سے کوئی سے معنی بھی لے لیجئے، مطلب دریا میں گر جانے یا گرائے جانے کے ہوں گے اور اگر ان کے اس اقدام کی نوعیت کو لیجئے تو مطلب "لغزشِ پا" ہوگا، یعنی خفیف سی اجتہادی غلطی۔ لفظ "لغزش" کا مفہوم سمجھ لینا چاہیئے۔ ایک لغزش وہ ہوتی ہے جو معصیت نہیں ہوتی۔ اسے قرآن نے لَمَمَ کہہ کر پکارا ہے (۵۳/۳۲) یعنی یونہی قابلِ ملامت اجتہادی غلطی۔ دوسرا مفہوم معصیت ہوگا، یعنی احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی۔ انبیاء کرام سے اس قسم کی لغزش سرزد نہیں ہوتی تھی۔

کو اپنے مُنہ میں دبوچ لیا۔ انہوں نے اس کی گرفت سے چھوٹنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے، انتہائی جدوجہد کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور اچھے تیراک نہ ہوتے تو مچھلی انہیں نگل لیتی اور پھر وہ کبھی بھی اس کے پیٹ سے باہر نہ نکل سکتے۔

اس غم والم کے عالم میں انہیں اپنے غلط فیصلے کا شدت سے احساس ہوا اور انہوں نے خدا کو پکارا۔

اب سورۃ انبیاء کی دونوں متعلقہ آیات کو سامنے لایئے۔ فرمایا:

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُــْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(۲۱/۸۷ ـ ۸۸)

اور اسی طرح ذوالنونؑ کا معاملہ بھی ہے۔ وہ اپنی قوم کے لوگوں سے تنگ آ کر غصہ میں وہاں سے چلا گیا۔ (حالانکہ اُسے ابھی ہجرت کا حکم نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس نے یہ فیصلہ کسی سرکشی کے ارادے سے نہیں کیا تھا) اس نے یہ خیال کیا تھا کہ چونکہ یہ فیصلہ خدا کے کسی حکم کے خلاف نہیں، اس لئے خدا اس پر مواخذہ نہیں کرے گا اور مجھے کسی سختی میں نہیں ڈالے گا۔ پھر جب وہ (اپنے غلط پروگرام کی وجہ سے) مشکلات میں گھر گیا تو اُس نے ہمیں پکارا اور کہا کہ بارِ الٰہا! تیرے سوا کسی کو اس کا اقتدار واختیار نہیں (کہ وہ مجھے ان مشکلات سے نجات دلا سکے) میں نے اس فیصلے میں جو عُجلت کی اور تیرے حکم کا انتظار نہ کیا تو یہ میری زیادتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا فیصلہ ہی ایسا ہوتا ہے جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہوتا ہے۔ (۱۴۱/۳۷؛ ۴۸/۶۸)۔

غم سے نجات

سو ہم نے اس کی پُکار کو سُن لیا اور اسے غم سے نجات دی۔ اسی طرح ہم، ان لوگوں کو غم و حزن سے نجات دیتے ہیں جو ہمارے قوانین کی صداقت و محکمیت پر یقین رکھتے ہیں۔"

وہ نجات یہ تھی:۔

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۝ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً

مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ۚ (۱۴۵ – ۱۴۶/۳۷)

ہم نے اسے، دریا کے کنارے، کھلے میدان میں ڈال دیا (۴۹/۶۸) لیکن اس کشمکش اور دہشت کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بڑے بڑے پتّوں والے پودے کے سائے میں جا کر آرام کیا تو اس کی حالت سنبھلی۔ نیز (۵۰-۴۸/۶۸)۔

اور اس کے بعد انہیں پھر ان کی قوم کی طرف بھیج دیا اور وہ ایمان لے آئی:۔

وَ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ۚ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۚ (۱۴۷ – ۱۴۸/۳۷)

اور ہم نے پھر اسے اس کی قوم کی طرف بھیج دیا (اور وہ بہت بڑی قوم تھی) جس کی تعداد ایک لاکھ، بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی۔ وہ لوگ ہمارے قانون پر ایمان لے آئے تو ہم نے انہیں ایک مدتِ معیّنہ تک، زندگی کے سازوسامان سے نوازا۔ (اس قوم نے ایمان لے آنا تھا۔ یونسؑ نے جلد بازی سے کام لیا جو ان سے مایوس ہو کر، وہاں سے چلا گیا۔ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم اُس وقت ملا کرتا ہے جب اُس قوم میں حق و صداقت کی قبولیت کا امکان باقی نہ رہے۔ اس سے پہلے، وہاں سے چلے جانا، گویا اپنے فرضِ منصبی کو چھوڑ دینا ہے۔ یہی حضرت یونسؑ کی اجتہادی غلطی تھی)۔

یہ تھی وہ قوم جس کا ذکر سورۂ یونس کی آیت (۱۰/۹۸) میں آیا ہے:۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ اِيْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝ (۱۰/۹۸)

ہمارے اس دعوے کی شہادت خود تاریخ سے ملتی ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں گزری جو تباہی سے پیشتر (حالاتِ امن میں) ایمان لے آئی ہو، اور اس طرح اپنے ایمان کی نفع بخشیوں سے فیضیاب ہو کر تباہی سے بچ گئی ہو۔ اس میں اگر کوئی استثناء ہوئی ہے تو قومِ یونسؑ کی جو (عذاب آنے سے پہلے) ایمان لے آئی تو ہم نے اُن سے اُس عذاب کو دُور کر دیا جو انہیں دنیا میں ذلیل کر دیتا۔ اور انہیں ایک مدت تک زندگی کی

خوشگواریوں سے متمتع کیا۔ (۱۴۸-۱۴۷/۳۷) ؛ (۸۷/۲۱) ؛ (۴۸/۶۸)۔



ہم نے دیکھا ہے کہ آیت (۸۷/۲۱) میں آپ کو ذوالنّون کہا گیا اور آیت (۴۸/۶۸) میں صاحب الحوت۔ اس آیت میں رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ آپ احکامِ خداوندی کی فرماں پذیری میں مستقل مزاج رہیئے اور صاحب الحوت کی طرح (جلدبازی سے کام نہ لیجیے)۔ اس کے بعد کہا ہے کہ خدا نے انہیں بھی صالحین کے زمرے میں شمار کر لیا تھا (۵۰/۶۸)۔ آیات (۱۶۳/۴) اور (۸۷/۶) میں ان کا نام زمرۂ مرسلین کرام میں آیا ہے۔

اس کے بعد آیئے (مسلسل) سورۂ یونسؑ کی طرف۔ اس کی پہلی دو آیتیں یوں ہیں:۔

(۱۰/۱) الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝

خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ یہ اُس ضابطۂ قوانین کی آیات ہیں جو سرتاسر حکمت پر مبنی ہے۔

اس کے بعد ہے:

(۱۰/۲) اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝

کیا ان لوگوں کو اس بات پر تعجب ہو رہا ہے کہ ہم نے انہی میں سے ایک آدمی کی طرف اپنی وحی کیوں بھیجی ہے، تاکہ وہ، اس کے ذریعے انہیں ان کی غلط روشِ زندگی کے نتائج سے آگاہ کرے اور جو لوگ اس ضابطۂ حیات پر ایمان لائیں، انہیں خوشخبری دے کہ اُن کے نشو و نما دینے والے کے نزدیک اُن کا مقام بہت بلند اور حقیقی شرف کا موجب ہے۔

(وہ لوگ، بجائے اس کے کہ اس کتاب کی تعلیم پر غور و فکر سے اس نتیجہ پر پہنچیں
کہ یہ کس قدر صداقت پر مبنی ہے، مطالبہ یہ کرتے ہیں کہ رسول کو فوق البشر ہونا چاہیئے
جو انہیں کچھ عجوبے دکھائے۔ اور جب یہ رسول اس کے جواب میں کہتا ہے کہ وہ انہی جیسا
ایک انسان ہے تو یہ) مخالفین اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ یہ شخص بالکل جھوٹا ہے۔

رسُولوں کی بشریّت

سابقہ جلدوں میں مختلف مقامات پر یہ حقیقت بیان کی جاچکی ہے کہ رسولؑ اس امر کا واضح اعلان کرتے تھے کہ وہ انہی جیسے بشر ہیں اور عجوبہ پسند انسان اس پر اعتراض کرتے تھے کہ عام انسان پر وحی کیسے آسکتی ہے۔ رسول کو فوق الفطرت ہونا چاہیئے۔ اگر اس کے باوجود وہ (رسول) اپنے دعوئے بشریت پر اصرار کرتا تو یہ لوگ کہتے کہ اگر یہ عام انسان ہے تو اس کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ اس کی طرف من جانب اللہ وحی آتی ہے۔
ان کا یہی قول یہاں درج کیا گیا ہے کہ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝

سحر کے متعلق تفصیلی گفتگو مطالب الفرقان جلد دوم (صفحات ۴۴ تا آخر) میں کی جاچکی ہے وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اس مادّہ کے بنیادی معنے ایسے جھوٹ یا فریب کے ہیں جس کا بظاہر پتا نہ چلے۔ اس جہت سے یہ لفظ جادو کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے گا وہاں یہ دیکھا جائے گا کہ اُس مقام پر ان میں سے کون سے معنے موزوں اور مناسب ہیں۔ داستانِ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں یہ لفظ بکثرت آیا ہے۔ نیز جیسا کہ جلد دوم میں بتایا گیا ہے کہ کفار نبی اکرمؐ کو رَجُلٌ مَّسْحُوْرٌ بھی کہتے تھے، یعنی جس پر کسی نے جادُو کر دیا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کی سختی سے تردید کی۔

یہاں کہا گیا ہے کہ یہ شخص (یعنی نبیؐ اکرمؐ) ساحر ہے۔ اس کے معنے جھوٹا یا فریب کار ہوں گے۔ دوسرے مقام پر "ساحرٌ کذّاب" کہا ہے (۳۸/۴)۔ ہوسکتا ہے کہ وہ حضورؐ کو جادوگر ہی کہتے ہوں۔ کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ جو شخص آپؐ کے قریب جاتا ہے، وہ (بالعموم) آپؐ کے کلام، بیان اور وجاہت سے اس قدر متاثر ہوجاتا ہے کہ اسے "سحر" (جادو) کے سوا کچھ اور سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔

اس کے جواب میں کہا کہ تم اس شخص کی بشریّت کی طرف نہ دیکھو۔ دیکھو یہ کہ جس خدا کی طرف سے نزولِ وحی کا یہ مدّعی ہے، اس خدا کا نظام کس قدر محیّر العقول ہے! اگر اس کے حیرت انگیز ہونے پر تمہیں اعتراض نہیں، تو اس کا کلام کیوں موجبِ اعتراض ہے؟ جس طرح کائناتی نظام پر غور کرنے سے تم کسی

نتیجہ پر پہنچ گئے ہو۔ اسی طرح اس کے کلام کو بھی ON MERIT پرکھ کر کسی نتیجے پر پہنچو۔ یہ انداز تو کسی طرح بھی معقول نہیں قرار دیا جا سکتا کہ تم اس کلام کو (بلا دیکھے بھالے) اس لئے جھٹک دو کہ اس کا پیش کرنے والا فوق البشر کارنامے (معجزے) کیوں نہیں دکھاتا ـــــ وہ خدا وہ ہے:۔

(۱۰/۳) إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○

تمہارا پروردگار جس کی طرف سے یہ کتاب نازل ہوئی ہے: وہ ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو چھ مختلف ادوار میں پیدا کیا اور اس کے پورے کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ تمام کائنات کا نظم و نسق اسی کے قوانین کے مطابق اس حُسن و خوبی سے سرانجام پا رہا ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ ایک شے کسی دوسری شے کے ساتھ مل کر ایک نیا نتیجہ پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ چیزیں اس کے قانون کے مطابق آپس میں نہ ملیں تو پھر وہ نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔

(اسی طرح اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی تائید و حمایت کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے، تو اس کی یہ تائید و حمایت بھی اُسی صورت میں مفید نتائج پیدا کر سکتی ہے جب وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہو)۔

یہ ہے وہ اللہ جو (کائناتی اشیاء کی طرح) تمہاری نشوونما دینے والا بھی ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ تم اُسی کے قوانین کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرو ـــــ کیا تم اس حقیقت کو اپنے سامنے نہیں رکھتے؟ (جس خدا کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں یہ رسول اُس خدا کے قوانین تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔ لہٰذا اس کا انسان ہونا ان قوانین کے جھوٹا ہونے کی دلیل کس طرح ہو سکتی ہے؟)

شفاعت اور اذن کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکا ہے (دیکھئے انڈکس) عرش اور تدبیر امور کی وضاحت مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۶۷ پر کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد یہ بتایا کہ جس طرح خارجی کائنات میں قوانین خداوندی کی کارفرمائی ہے' اسی طرح انسانوں کے اعمال بھی خدا کے قانون مکافات کے مطابق نتیجہ خیز ہوتے ہیں اور کوئی شخص اس کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتا۔ وہ قانون تمام انسانوں کو محیط ہے۔

(۱۰/۴) اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ○

شفاعت اور رجعت الی اللہ

یاد رکھو! تم جو روش بھی چاہو اختیار کر لو، تمہارا ہر قدم اُسی کے قانون کی طرف اٹھے گا۔ تمہارے ہر عمل کا نتیجہ اُس کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب ہوگا۔ تم اس کے احاطہ سے باہر جا نہیں سکتے۔ یہ ایک حقیقت ہے جو تم سے بیان کی گئی ہے۔ اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ اس کا کائناتی قانون یہ ہے کہ وہ مختلف اشیاء کو' ان کے نقطۂ آغاز سے پیدا کرتا ہے' اور پھر ان کے مختلف پہلو بدل کر' طرح طرح کی گردشیں دے کر' متعدد ارتقائی منازل کے بعد' انہیں تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اُس کے اسی قانون کے مطابق انسانی اعمال بھی نتیجہ خیز ہوتے ہیں' یعنی وہ لوگ جو اس قانون پر ایمان لے آتے ہیں اور پھر اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش (کائنات' انسانی معاشرہ اور خود انسانی ذات کو سنوارنے والے) پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں' انہیں

حق و انصاف کے مطابق ان کے اعمال کا بدلہ مل جاتا ہے۔ اور جو لوگ اس قانون سے انکار کر کے، دوسری راہیں اختیار کر لیتے ہیں، ان کے اعمال ایسے نتائج پیدا کرتے ہیں جن سے، ان کی انسانی صلاحیتیں نشوونما پانے کے بجائے، جُھلس کر رہ جاتی ہیں اور اس طرح انہیں بڑی دردانگیز سزا ملتی ہے۔ (۲۴/۳۳)، (۳۲/۳-۴)، (۲۲/۴۵)، (۳۱/۵۳)۔

"رجعت الی اللہ" کا مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان ہو چکا ہے۔ اس سے مراد خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی ہمہ گیری ہے (انڈکس میں "رَاجِعُوْنَ" کا عنوان دیکھئے)۔

یہاں کہا گیا ہے کہ خدا کا تخلیقی پروگرام اس لئے جاری و ساری ہے کہ انسانی اعمال صحیح صحیح نتیجہ پیدا کر سکیں۔ تخلیقِ کائنات اور قانونِ مکافاتِ عمل میں باہمی تعلق کیا ہے، اس کی بابت مطالب الفرقان، جلد دوم صفحہ ۹۲ پر گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جس کی طرف یہاں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ سعدی نے یہ کہہ کر شاید اسی طرف اشارہ کیا تھا کہ:

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ در کار اند کہ تُو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

اس کے بعد پھر سلسلۂ کائنات کی طرف رُخ کیا گیا۔ فرمایا:۔

(۱۰/۵) هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

یہ اُس خدا کا قانون ہے جس نے سورج کو ایسا درخشندہ اور چاند کو ایسا تابناک بنا دیا اور چاند کی منازل متعین کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو (اسی طرح سورج کی رُو سے بھی حساب رکھا جا سکتا ہے)، (۶/۹۷؛ ۱۷/۱۲)۔ اللہ نے یہ سب کچھ مبنی برحقیقت اور تعمیری نتائج پیدا کرنے کے لئے بنایا ہے (نہ یہ محض

"حلقۂ دامِ خیال" ہے اور نہ ہی اس کا انجام تخریب ہے)۔ اس نے اپنے قوانین و حقائق کو ان لوگوں کے لئے جو علم و بصیرت سے کام لیں' کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔

شمسی اور قمری کیلنڈر

شمسی اور قمری کیلنڈر کے سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد سوم صفحہ ۲۳ پر بحث ہو چکی ہے۔ زیر نظر آیت بھی وہاں درج کی گئی ہے۔ اس لئے اس پر یہاں مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد ہے:۔

(۱۰/۶) اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ○

یقیناً رات اور دن کی گردش میں' اور خدا نے جو کچھ کائنات میں پیدا کیا ہے' اس میں' اُن قوموں کے لئے جو غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے بچنا چاہیں' بڑے بڑے حقائق پوشیدہ ہیں۔

قرآنِ مجید میں نظامِ کائنات اور مظاہرِ فطرت کے متعلق اس شدّ و مد اور اصرار و تکرار سے آیا ہے کہ (بنظرِ بظاہر) ایسا دکھائی دیتا ہے گویا یہ سائنس کی کتاب ہے۔ ہم نے علومِ سائنس کی اس اہمیت کے پیشِ نظر' اس جلد میں (سورۂ اعراف کی آیت ۷/۹ کے تحت) اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد' ہمارے خیال میں' کائنات سے متعلق آیات کی الگ الگ تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی' بجز اس کے کہ کوئی ایسا خاص نکتہ آجائے جو مزید وضاحت طلب ہو۔ قرآن کے ان تمام مقامات میں ایک اہم بات نمایاں دکھائی دے گی اور وہ یہ کہ اس کے نزدیک کارگہِ کائنات پر غور و فکر سے مقصود صرف نظری تحقیق یا دنیا کے طبیعی مفاد کا حصول نہیں۔ ان کے علاوہ اس سے مقصد' انسانی ذات کی نشو و نما' ارتقاء اور تزکیہ بھی ہے جس کا سلسلہ موت کے بعد آگے بھی چلتا ہے' یعنی وہ امورِ کائنات کی عقدہ کشائی سے انسانی ذات کی بالیدگی اور اُخروی زندگی کی شادابی کی راہیں استوار کرتا ہے۔ یہی فرق ایک سیکولر سائنسدان اور مومن محقق میں ہے۔ اس فرق کو قرآنِ کریم نے اگلی آیت میں بلیغ انداز سے واضح کیا ہے۔ فرمایا:۔

(۱۰/۷-۸) اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ

الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

تسخیر فطرت

ان کے برعکس

(۱) جو لوگ قوانینِ فطرت کا علم تو حاصل کر لیں، لیکن زندگی فقط اِس دنیا کی زندگی سمجھیں اور حیاتِ اُخروی (یعنی خدا کے قانونِ مکافات) کے منکر ہوں اور طبیعی مفاد پر مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں ــــ یا

(۲) جو اِن قوانین سے یکسر بے خبر ہوں۔

یہ دونوں ناکام و نامراد رہیں گے۔ ان کا دنیوی معاشرہ بھی جہنّم جیسا ہوگا اور اُخروی زندگی بھی جہنمی۔

اس لئے کہ دنیا اور آخرت کی کامرانیاں اُنہی قوموں کے حصہ میں آئیں گی جو فطرت کی قوّتوں کو مسخر کر کے انہیں قوانین واقدارِ خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے صرف میں لائیں (۱۷/۱۳)۔

تسخیر فطرت کے سلسلہ میں' مطالب الفرقان' جلد دوم صفحہ ۹۲ پر تین گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ زیر نظر اور اس سے اگلی آیت میں اِنہی تینوں گروہوں کی طرف اشارہ ہے۔ سکولر تصورِ حیات کے حامل مغربی سائنسدان فطرت کی قوّتوں کا احاطہ کر کے انہیں اپنی اپنی قوموں کے مفاد اور دیگر اقوام کی تخریب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے جس جہنّم کے شعلے اٹھتے ہیں وہ کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں اور تو اور خود وہ قومیں بھی چیخ پکار کر رہی ہیں' لیکن اس سے کہیں زیادہ ابتر حالت ہم مسلمانوں کی ہے جو اس میدان میں تمام اقوام عالم سے پیچھے ہیں۔ ان قوموں کو تو پھر بھی دنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں۔ ہم ان سے بھی محروم ہیں۔ جن قوموں میں مذہبی پیشوائیت کا غلبہ حاصل ہوگا' ان کی یہی حالت ہوگی۔ اس لئے کہ یہ حضرات عقل وفکر کو شجر ممنوعہ اور سائنسی علوم کی تحصیل کو حرام قرار دیتے ہیں۔ یاد رکھئے!

جب تک ہماری قوم ان کے پنگل سے آزاد نہیں ہوتی، مقامِ آدم یعنی انسانی سطح پر نہیں آسکتی۔ مقامِ مومن تو اس کے بعد کی بات ہے۔ یہی اصل جنت ہیں۔

(۱۰/۹) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○

ان کے برعکس، جو لوگ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر یقین رکھنے کے بعد، تسخیرِ فطرت کریں گے اور، ان قوتوں کو کائنات کے سنوارنے میں صرف کریں گے تو اللہ، ان کے اِس ایمان کی بنا پر ان کی راہنمائی زندگی کے صحیح راستہ کی طرف کر دے گا۔ اُس راستے کی طرف جو انہیں اُس معاشرہ کی سمت لے جائے گا جس کی شادابیوں پر خزاں نہیں آسکتی اور جس کی آسائشوں میں کبھی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔

اس دنیا کے جنتی معاشرہ اور اُخروی جنت کی خصوصیات قرآن کے صفحات پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ یہاں بھی ان میں سے چند ایک باعثِ فروغِ دیدہ ہیں۔ فرمایا:۔

(۱۰/۱۰) دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ع

مومنین کی خصوصیات

وہ معاشرہ جو ان کے اس دعوے کی زندہ شہادت ہوگا کہ یہ چیز خدا کے قانون سے بہت بعید ہے کہ وہ صحیح کوششوں کے تخریبی نتائج پیدا کر دے، اس معاشرہ میں ہر فرد، دوسرے افراد کے لئے حیات بخش آرزوئیں اور سلامتی بیز تمنائیں لئے ہوگا اور ان کی اس دعوت کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ

اس نظامِ ربوبیت کے عالمگیر نتائج کو دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے گا کہ خدا کا یہ نظام کس قدر مستحقِ حمد و ستائش ہے (۱/۱)۔

ان خصوصیات میں سے ہر ایک ایسی جامع ہے کہ اس کی تشریح کے لئے مستقل تصنیف درکار ہے۔ لیکن چونکہ ان کے تذکرے مطالب الفرقان کے مختلف مقامات پر آچکے ہیں، اس لئے ہم ان کے مفہوم پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ قرآن کی تو کیفیت یہ ہے کہ اس کے ہر ذرے میں آفتاب اور ہر قطرے میں سمندر مضمر ہے۔ ان کے متعلق سب کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی یہی کہنا پڑتا ہے کہ

دفتر تمام گشت بہ پایاں رسید عمر　　　ما ہم چناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

قانونِ مکافاتِ عمل کا ذکر آیا تو اسی ضمن میں قانونِ مہلت کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ فرمایا:۔

(۱۰/۱۱) وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُم بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ○

قانونِ مُہلت

اور دیکھو! جس طرح انسان اپنا فائدہ حاصل کرنے کے لئے جلد بازی سے کام لیتا ہے، اگر اللہ کا قانونِ مکافات، اسی طرح نقصان پہنچانے (مؤاخذہ کرنے) میں جلدی کرتا، تو ان لوگوں کا (جو غلط راستے پر چلتے ہیں) کبھی کا وقت پورا ہو چکا ہوتا! (لیکن اس نے تخم ریزی اور ثمر باری کے درمیان ایک وقفہ مقرر کر رکھا ہے۔ لہٰذا اس قانونِ مہلت کی رُو سے ہوتا یہ ہے کہ) جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات سے انکار کرتے ہیں، ان کی گرفت فوری نہیں ہو جاتی، انہیں ان کی سرکشی میں چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس میں حیران و سرگرداں پھرتے رہیں۔ (اگر غلط اقدام پر فوری گرفت ہو جائے، تو ہم نے جو یہ اصول مقرر کر رکھا ہے کہ انسان بلا جبر و اکراہ، کامل غور و فکر کے بعد اپنی مرضی سے صحیح راستہ اختیار کرے، اس کا مقصد ہی فوت ہو جائے)۔۔۔ مثلاً کسی ظالم کا جو ہاتھ

مظلوم کے خلاف اُٹھے وہ اگر دہس پتھر بن کر رہ جائے تو اسے دیکھ کر ساری دنیا ایمان لے آئے. لیکن یہ ایمان غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوگا. اور جو ایمان عقل و فکر کے ماؤف ہونے سے لایا جائے، اُسے ایمان کہا ہی نہیں جا سکتا. وہ تو فکری اکراہ کا نتیجہ ہوگا۔ ۳/۲۵).

قانونِ مہلت کے متعلق سابقہ جلدوں میں ذکر آچکا ہے (مثلاً جلد اوّل، صفحہ ۱۹۷، جلد چہارم، صفحہ ۲۳۶، جلد پنجم، صفحہ ۴۷، ۳۷). اس قانون کے ان مصالح کے علاوہ، جن کا ذکر اوپر مفہوم میں کیا گیا ہے، ایک اور اہم نکتہ بھی ہے. قرآن کریم نے اعمال کے نتائج کے سلسلہ میں میزان کے پلڑوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے، یعنی تعمیری اعمال کا پلڑا اور تخریبی اعمال کا پلڑا. قوموں کی موت اور حیات کا مدار ان پلڑوں پر ہے کہ کون سا جھکتا ہے اور کس حد تک جھکتا ہے. اس ثقل اور خفت میں بہرحال، وقت لگتا ہے. ہو سکتا ہے کہ ایک قوم کے اعمال کے تخریبی پلڑا میں ذرا سا جھکاؤ پیدا ہو (یعنی اس کے تعمیری اعمال تخریبی اعمال کے مقابلہ میں کم ہو جائیں) اس کی وجہ سے اسے کچھ خفیف سے جھٹکے لگیں تو وہ سنبھل جائے اور اپنے حسنِ عمل میں اضافہ کرلے تو تباہی رُک جاتی ہے. یہ جو ہم اقوامِ عالم کی تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ ایک قوم میں خرابیاں عام ہونے کے باوجود وہ زوال آمادہ ہوتی ہے تباہ نہیں ہوتی، تو اس کی یہی وجہ ہے. اسے اصلاحِ خویش کا موقع دیا جاتا ہے.

حضرت یونسؑ کے تذکارِ جلیلہ کے ضمن میں قانونِ مہلت کی طرف اشارہ کرنے کی یہ اہمیت بھی ہے کہ یہ قانون اُن کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اُن سے اپنے فیصلہ میں اجتہادی سہو ہو گیا. اُس قوم نے اِس وقفہ میں اپنی اصلاح کرلی اور اُس وقت تباہی سے بچ گئی.



اس کے بعد جذباتی انسانوں کی اس نفسیاتی کمزوری کو سامنے لایا گیا جس کا ذکر کئی ایک دیگر مقامات پر بھی آیا ہے، یعنی یہ کہ:-

(۱۲/۱۰) وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن

لَمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

انسان کی عُجلت پسندی

(انسان (جب اپنے جذبات کے تابع چلتا ہے اور ہمارے قانون کا اتباع نہیں کرتا تو اس) کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کھڑا، بیٹھا، لیٹا ہمیں پکارتا ہے۔ لیکن جب اس سے وہ مصیبت ٹل جاتی ہے، تو وہ اس طرح مُنہ موڑ کر چل دیتا ہے گویا اس نے ہمیں اپنی مصیبت میں کبھی پکارا ہی نہیں تھا۔ (اور اس کے بعد وہ پھر اسی غلط روش پر چلنے لگتا ہے۔ سو دیکھو کہ) جو لوگ ہمارے قوانین کی حد سے باہر نکل جاتے ہیں، انہیں ان کے اعمال کس قدر حسین اور خوشنما دکھائی دیتے ہیں، (لیکن آخر الامر ان کی تباہی آجاتی ہے۔ عقل و فکر کی رُو سے ایمان لانے سے یہ کیفیت نہیں پیدا ہوتی)۔

قرآنِ کریم اُس شخص کے ایمان کو ایمان قرار دیتا ہے جو جملہ (متعلقہ) حقائق کو خالی الذہن ہو کر علم و عقل کی رُو سے پرکھتا ہے اور کامل غور و فکر کے بعد، قلب و دماغ کی رضامندی سے، ان کی صداقت کا معترف ہوتا ہے۔ یہ وہ ایمان ہے جس میں خارجی حالات کی تبدیلی سے نہ لغزش پیدا ہوتی ہے، نہ تبدیلی آتی ہے۔ اس مردِ مومن کا ایمان بحرِ ذخار میں چٹان کی طرح محکم ہوتا ہے کہ حوادثِ ارضی و سماوی کی طغیانیاں آئیں اور اپنا سر ٹکرا کر خاسر و ناکام لوٹ جائیں۔ جماعتِ مومنین کے ایمان کا یہی وہ ثبات ہے جس کا ذکر، اس کے شایانِ شان زیبائی و رعنائی اور درخشندگی و تابندگی کے ساتھ، مطالب الفرقان جلد سوم کے چوتھے باب (صفحہ ۱۰۸) کے ابتداء میں کیا جا چکا ہے اور آئندہ بھی اپنے اپنے موقع پر کیا جائے گا کہ ان کے اس ایمان کی تابندگی ہے جو ہر متلاشیٔ حقیقت کے لئے بحرِ ظلمات میں روشنی کے مینار کا کام دیتی ہے۔ (علیہم الصّلوٰۃ و السّلام)۔

خدا کے مذکورہ بالا قانونِ مکافات کے مطابق قوموں کی تباہی واقع ہوتی ہے:-

(۱۰/۱۳) وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ

وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۚ

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ○

(اسی قانونِ مہلت اور مکافات کے مطابق) ہم نے اس سے پہلے بہت سی قوموں کو تباہ کر دیا جب انہوں نے ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کر کے، لوگوں پر ظلم اور زیادتی شروع کر دی۔ ان کی طرف ہمارے پیغامبر، واضح قوانین اور کھلے کھلے دلائل لیکر آئے لیکن انہوں نے ان کی صداقت کو تسلیم نہ کیا (اور وہ تباہ ہو گئے)۔ اسی طرح ہم ہر دور کے مجرمین کو ان کے کئے کا بدلہ دیتے ہیں۔

قوموں کے عروج و زوال کے قوانین، جنہیں قوانینِ استبدال و استخلافِ قومی کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے، سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے بیان کئے جا چکے ہیں (انڈکس سے تمام مقامات سامنے آ جائیں گے)۔ ان میں سے ایک اصول بڑا اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی قوم پر تباہی وارد نہیں ہوتی جب تک

تباہی سے پہلے دو شرطیں

دو شرائط پوری نہ ہوں ۔۔۔ انہیں ان کی غلط روش کے انجام سے پہلے آگاہ کر دیا جائے اور ان میں اس تنذیر کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ اس ضمن میں مطالب الفرقان، جلد اوّل (صفحہ ۱۹۶)، جلد دوم (صفحہ ۱۵۳)، جلد چہارم (صفحہ ۴۸۴، ۱۴۱، ۴۴)، جلد پنجم (صفحہ ۱۲۵، ۴۸) بالخصوص قابلِ غور ہیں۔ یہاں بھی ایک شرط کو اجاگر کیا جب کہا کہ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ، اور آخر میں یہ کہہ کر کہ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ○ اس کی وضاحت کر دی کہ یہ کوئی وقتی یا ہنگامی بات نہیں۔ یہ خدا کا ابدی قانون ہے جس کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔

جب کسی سابقہ قوم کی جگہ نئی قوم لیتی ہے تو اسے بتا دیا جاتا ہے کہ وہی قانون جس کی رُو سے سابقہ قوم سے حکومت و سطوت چھنی ہے اس کا اطلاق تم پر بھی اسی طرح ہوگا۔ تاریخی تناظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ وارننگ خود جماعتِ مومنین کو بھی دی گئی تھی جب کہا کہ:۔

(۱۰/۱۴) ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ

لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ○

تم کیسے کام کرتے ہو؟ ان اقوامِ سابقہ کے بعد، ہم نے، اے جماعتِ مومنین، تمہیں ان کا جانشین بنایا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ (جس قسم کے تمہارے اعمال ہوں گے، اسی کے مطابق تمہارے متعلق بھی فیصلہ ہوگا۔ ہمارا قانونِ مکافات سب پر یکساں نافذ ہوتا ہے)۔ ۹/۳۹ ؛ ۴۷/۳۸)۔

صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین کے لئے اس وارننگ کو غیر متبدل سنت اللہ کی یاددہانی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ہماری (یعنی اہلِ پاکستان کی) صورت میں یہ وارننگ ایک بدیہی حقیقت ہے جس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں۔ ہمیں یہ مملکت (بنی اسرائیل کی طرح۔ ۲۸/۵) ملی ہی اس لئے تھی یہ دیکھنے کے لئے کہ ہم کس قسم کے کام کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے کام معیارِ خداوندی پر پورے نہ اترے تو ان سے وہ مملکت اور حکومت چھن گئی۔ ہمارے اعمال بھی اسی قسم کے ہوئے تو یہ مملکت ہم سے بھی چھن جائے گی۔ قرآنی بارگاہ میں کوئی قوم خدا کی چہیتی نہیں ہوتی۔

○

سابقہ جلدوں میں بتایا جاچکا ہے کہ سرکش طبقہ، رسول کی دعوت کی شدت سے مخالفت کرتا۔ لیکن جب اس طرح اسے کامیابی کی صورت نظر نہ آتی تو وہ مفاہمت کی کوشش کرتا۔ لیکن غیر متبدل اصولوں میں (جسے الحق سے تعبیر کیا جاتا ہے) مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے رسول ان کی اس دعوت کو سختی سے جھٹک دیتا۔ تفصیل اس اجمال کی مطالب الفرقان جلد اوّل (صفحہ ۱۷۹) اور جلد دوم (صفحہ ۳۶۶) پر گزر چکی ہے۔ ان میں مفصل آیت وہ ہے جو اب سامنے آتی ہے:-

(۱۰/۱۵) وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ

نَفۡسِیۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیۡۤ اَخَافُ

اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۵﴾

جب ان لوگوں کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کئے جاتے ہیں، تو جو لوگ ہمارے قانونِ مکافات کا سامنا نہیں کرنا چاہتے، وہ چاہتے ہیں کہ رسول کے ساتھ کچھ مفاہمت Compromise کی صورت نکل آئے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ یا تو تم اس

مفاہمت کی کوششیں

قرآن کی جگہ دوسرا قرآن لاؤ اور یا پھر اس (کے مطالب) میں کچھ ردّ و بدل کردو (یعنی وہ خدا کے اٹل اور غیر متبدل قوانین کو اپنی منشاء اور مفاد کے مطابق تبدیل کرانا چاہتے ہیں)۔ ان سے کہہ دو کہ یہ چیز میرے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ میں اپنی طرف سے کسی قسم کا ردّ و بدل کرسکوں میرا مقصد اس وحی کی پیروی کرنا اور کرانا ہے جو میری طرف نازل ہوتی ہے۔ اگر (بفرضِ محال) میں بھی اپنے نشوونما دینے والے کے احکام سے سرتابی کروں تو اس کا قانونِ مکافات مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے میں اُس کی گرفت سے بہت ڈرتا ہوں۔ اس کی سزا بڑی سخت ہوا کرتی ہے۔ (۱۱/۱۱۳؛ ۱۷/۷۵؛ ۶۸/۹؛ ۲۹/۵۱)۔

اگرچہ یہ آیت پہلے لکھی جا چکی ہے، لیکن اس میں دو نکات اس قدر اہم ہیں کہ ان کا دہرانا ضروری نظر آتا ہے ــــ

(۱) ان مخالفین کا جھگڑا رسولؐ کی ذات سے نہیں تھا، اس کی تعلیم اور دعوت سے تھا جسے رسول پیش کرتا تھا ــــ یعنی قرآنی دعوت سے۔ اس لئے وہ اس میں ترمیم و تغیّر کی تجویز پیش کرتے تھے۔

(۲) رسولؐ اللہ کا جواب تھا کہ میں اس میں اپنی طرف سے تغیّر و تبدّل نہیں کرسکتا۔ یہ وحی کے من جانب اللہ ہونے کی بیّن دلیل ہے۔ نیز قرآن کے سوا حضورؐ نے اپنے کسی ارشاد کے متعلق نہیں کہا کہ میں اس میں تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ بلکہ روایات بتاتی ہیں کہ آپؐ نے اپنے کئی فیصلوں میں تبدیلی کی۔ اس سے واضح ہے کہ وحی صرف قرآن کے اندر تھی۔

(۳) حضورؐ صرف وحی کا اتباع کرتے تھے۔ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ اتباعِ رسالت سے مراد اتباعِ قرآن

ہے۔ سنتِ رسولؐ اتباعِ قرآن کا دوسرا نام ہے۔

(۴) اور آخر میں، خدا کا قانونِ مکافات جس سے رسولؐ بھی نہیں بچ سکتے۔ غور فرمائیے کہ جب رسول خود معصیت کی سزا سے نہیں بچ سکتا تھا، تو وہ معصیت کاروں کو کس طرح بخشوا سکتا ہے؟

معصیتِ رسولؐ واضح رہے کہ رسولؐ اللہ نے جو فرمایا ہے، "اِنْ عَصَيْتُ" (اگر میں بھی معصیت کا مرتکب ہو جاؤں) تو اس کے یہ معنی نہیں کہ حضورؐ (معاذ اللہ) اپنی معصیت کا اقرار کر رہے تھے۔ آیت کے اس ٹکڑے کا مقصد، قانونِ مکافاتِ عمل کی ہمہ گیری کی وضاحت تھی۔ اس کا ترجمہ یوں کیجئے کہ ـــــ "اگر (بفرضِ محال) مجھ سے بھی معصیت کا ارتکاب ہو جائے تو اس کی سزا سے میں بھی نہیں بچ سکوں گا"۔ معصیت کے معنے ہوتے ہیں "دیدہ دانستہ خدا کے کسی حکم سے سرتابی برتنا"۔ رسولوں سے اس قسم کے جرائم کا ارتکاب نہیں ہوتا تھا۔

اگلی آیت اس دعوے کی دلیل ہے ـــــ اور بڑی محکم دلیل۔ فرمایا:۔

(۱۰/۱۶) قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(یہ لوگ اس قسم کی باتیں اس لئے کرتے ہیں کہ یہ سمجھتے ہیں کہ تم ان احکام کو اپنی طرف سے وضع کر کے ان کے سامنے پیش کرتے رہتے ہو، اور کہتے یہ ہو کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں) ان سے کہو کہ میں، تم میں کوئی اجنبی نہیں کہ تمہیں معلوم نہ ہو سکے کہ میرا کردار کیسا ہے۔ میں نے اس دعوئ نبوت سے پہلے، تم میں، ایک عمر بسر کی ہے۔ میری یہ زندگی تمہیں کس بات کی شہادت دیتی ہے؟ کیا اس کی کہ میں جھوٹا اور فریبی ہوں یا یہ کہ میں سچا اور پاکباز انسان ہوں؟ تم اس حقیقت پر غور کرو اور عقل و فکر سے کام لے کر سوچو کہ اگر یہ چیز مشیتِ خداوندی کے مطابق نہ ہوتی اور خدا تمہاری طرف وحی کا یہ علم نہ بھیجنا چاہتا، تو میں یہ باتیں (اپنے جی سے گھڑ کر) کبھی تمہارے سامنے پیش نہ کرتا۔ کذب و

انترا تو میری روشش زندگی کے خلاف ہے۔

وحی کے مدعی کے لیے ایک مسئلہ بڑا مشکل بھی ہوتا تھا اور نہایت نازک بھی۔ وحیٔ خداوندی کا ایک ایسے واسطہ سے جو نہ صرف غیر مرئی اور غیر محسوس تھا، بلکہ ان کے فکر اور قیاس سے بھی بالا، قلبِ نبویؐ پر الفا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے کسی کو دکھانا تو ایک طرف سمجھایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ نبیؐ کے مخالفین اس سے اس کا ثبوت طلب کرتے تھے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ اس کی اپنی فکر کی تخلیق نہیں، منزل من اللہ ہے۔ وہ اس کے جواب میں دلائل و براہین پیش کرتا، لیکن وہ (مخالفین) انہیں سننے تک کے لیے بھی تیار نہ ہوتے۔ وہ معجزات طلب کرتے تو رسول یہ کہہ کر

اپنی ماضی کی زندگی

ان کے مطالبہ کو مسترد کر دیتا کہ میں تمہارے جیسا انسان ہوں، فوق الفطرت قوتوں کا حامل نہیں ہوں (اس کی تفصیل مطالب الفرقان، جلد اوّل، صفحہ ۳۰۹ پر گزر چکی ہے) سوچئے کہ اس کے بعد وہ کونسی ممکن العمل صورت ہوسکتی تھی جس سے وہ انہیں مطمئن کرا سکتا کہ وہ (معاذ اللہ) جھوٹ نہیں بول رہا، فریب کاری سے کام نہیں لے رہا! اس کے لیے حضورؐ نے ایک ثبوت پیش فرمایا جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ آپؐ نے ان سے کہا کہ میں تم میں اجنبی نہیں ہوں، کہیں باہر سے نہیں آگیا۔ میں نے اس دعویٰ سے پہلے (چالیس سال) کی زندگی تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں نے اتنے طویل عرصہ میں کبھی جھوٹ بولا ہو، کبھی فریب کاری سے کام لیا ہو؟ کہو! تم کیا کہتے ہو؟ کسی نے اس کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا۔

تو آپؐ نے فرمایا کہ ذرا سوچو کہ جس شخص نے چالیس سال کی عمر تک نہ کبھی جھوٹ بولا، نہ دھوکا دیا، نہ فریب کیا، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ راتوں رات اس طرح بدل گیا ہو کہ وہ اتنا بڑا جھوٹ بولے، ایسا سنگین افترا کرے، اس طرح دھڑلے سے فریب دے!!! کہو، تم کیا کہتے ہو؟

اس پر بھی کسی نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ اگر وہ کچھ کہتے تو اس کا ذکر بھی قرآن میں آجاتا۔

آپؐ نے اپنے دعوے کی صداقت کے حق میں ایسا ثبوت پیش فرمایا جس کا کسی کے پاس جواب نہیں تھا۔

عام معمول ہے کہ جب کوئی شخص شہرت اور عزت، بلکہ عوام کی عقیدت حاصل کر لیتا ہے تو احتیاط برتتا ہے کہ اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس کی شہرت کو نقصان پہنچے اور عقیدت داغدار ہو جائے۔ لیکن اسے کیریکٹر نہیں کہا جائے گا۔ یہ بزنس (کاروبار) کہلائے گا۔ یہ وہی دیانت اور امانت

ہے جس کے متعلق کاروباری دنیا میں کہا جاتا ہے کہ Honesty is the best Policy
اس قسم کا "کیریکٹر" بطور پالیسی اختیار کیا جاتا ہے. اس کے برعکس جس زمانے میں ایک شخص عام انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہو اور ان عیوب و ذمائم سے بچا رہے جو اس کے معاشرہ کا معمول بن چکے ہوں، تو اسے حقیقی کیریکٹر کہا جائے گا. حضورؐ نے اپنے اس کیریکٹر کو اپنے دعوی کی صداقت کے ثبوت میں پیش فرمایا اور یہی تھا حضورؐ کا وہ سب سے بڑا معجزہ جس نے تمام مخالفین کو لاجواب کر دیا (معجزہ کہتے ہی اسے ہیں جسے دیکھ کر سب لاجواب ہو جائیں)۔

نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں اور لاکھوں اوراق منقوش ہوئے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کا اپنے مخاطبین کے سامنے اپنے زمانۂ قبل از نبوت کی زندگی کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کرنا اور ان کا خاموشی سے اُسے تسلیم کر لینا، ان ہزاروں کتابوں اور لاکھوں صفحات پر بھاری ہے۔ اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ خود خدا نے اسے پیش کرنے کا حکم دیا (قرآن کریم میں جو کچھ حضورؐ کی لسانِ مبارک سے فرمایا گیا ہے وہ وحی پر مبنی تھا، لہٰذا ارشادِ باری تعالیٰ)۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد اول صــ ۳۲۳ بھی دیکھئے۔

اور اس سے حضورؐ نے انسانوں کے کیریکٹر کے پرکھنے کا محکم معیار تجویز فرما دیا. اس سے ہمیں یہ ہدایت دی گئی کہ جب کوئی شخص کسی ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے سامنے آئے تو تم اس کے ماضی کو دیکھو کہ وہ کس قسم کا تھا اور اس سے اس کی دیانت و امانت کے متعلق فیصلہ کرو. اوّل تو یہ دیکھو کہ اس کے ماضی کی زندگی بے داغ تھی. اگر اس میں کوئی داغ ہوں تو وہ اس کا کھلے بندوں اقرار کرے اور آئندہ ان سے مجتنب رہنے کا وعدہ کرے۔

ہم (بصد آداب) پوچھتے ہیں، سنتِ نبویؐ کا اتباع اور اُسوۂ رسول اللہ کی پیروی کے مدعیوں سے کہ کیا وہ (سنتِ رسول اللہ کی اتباع میں) اپنی زندگی کے متعلق اس قسم کا دعویٰ اور اعلان کرنے کے لئے تیار ہیں؟

اسی کا نام کیریکٹر ہے

ہمارے ہاں سیاسی نظام کے سلسلہ میں اس قسم کی بحثیں چلتی رہتی ہیں. امیدواروں کی شرائط کیا ہونی چاہئیں اور ووٹ دینے والوں کی خصوصیات کیا؟ اس کے لئے سب سے اہم شرط اور بنیادی خصوصیت یہی ہونی چاہیئے کہ ان کی ماضی کی زندگی کیسی

تھی۔ اُس وقت تو وہ قرآن اٹھا اٹھا کر دعوی کریں گے کہ وہ نہایت امین اور صداقت شعار رہیں گے۔ لیکن معیارِ ردّ و قبول اُن کے اُس وقت کے دعوے نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ اُن کا وہ ماضی ہونا چاہئیے جس میں انہوں نے کسی مصلحت یا مفاد پرستی کے خیال کے بغیر حسنِ کردار کا مظاہرہ کیا ہو۔

اس کے بعد اس کا دوسرا رُخ سامنے لایا گیا۔

(۱۰/۱۷) فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

اس کے بعد تم اس حقیقت پر غور کرو کہ جو شخص اپنے جی سے باتیں گھڑے اور ان کے متعلق کہے کہ وہ خدا کی وحی ہیں، وہ کتنا بڑا مجرم ہوگا! دوسری طرف، وہ شخص بھی کچھ کم مجرم نہیں ہوگا جس کے سامنے خدا کی سچی وحی آئے اور وہ اُسے جھٹلا دے۔

یہ دونوں یکساں مجرم ہیں۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ مجرموں کو اُن کے پروگرام میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دیتا۔

(لہٰذا، تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو۔ مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ اس کے بعد نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ ہم میں سے کون جھوٹا اور مجرم ہے۔ جو ناکام رہا وہ جھوٹا ہوگا)۔ ۶/۱۳۶ (نیز ۶/۱۴۵)۔

تکذیب تکذیب کا مفہوم مطالب الفرقان، جلد دوم، صفحہ ۱۳۶؛ جلد سوم، صفحہ ۳۴۴ پر بیان کیا جا چکا ہے۔ خدا کے احکام کی صداقتوں سے انکار کرنے والا (کفر) اور زبان سے اقرار کر کے عملاً ان کے خلاف جانے والا (تکذیب) دونوں برابر کے مجرم ہیں اور کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ ظالم ہی نہیں، اظلم ہیں (ظلم کی تشریح سابقہ جلدوں میں ہو چکی ہے)۔

خدا اور اس کی وحی کی عظمت کا ذکر کرنے کے بعد تصویر کا دوسرا رُخ سامنے لایا گیا۔

(۱۰/۱۸) وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَیَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ

اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

یہ لوگ، خدا کو چھوڑ کر، ایسی چیزوں کو اپنا معبود بناتے ہیں جو نہ انہیں نفع پہنچا سکتی ہیں، نہ نقصان اور کہتے ہیں کہ یہ معبود خدا کے ہاں ہماری سفارش کریں گے (گویا ان کے معبود ان کے متعلق خدا کو ایسی باتیں بتائیں گے جن کی بنا پر وہ قابلِ معافی قرار پا جائیں گے)۔ ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کو، اپنے متعلق، ان کے ذریعے مطلع کرنا چاہتے ہو جن کی اپنی حالت یہ ہے کہ وہ زمین و آسمان میں کسی بات کا علم نہیں رکھتے! خدا اس سے بہت دُور ہے کہ وہ ان چیزوں کے ذریعہ حقیقتِ حال معلوم کرنے کا محتاج ہو ـــــ وہ ان سے بہت بلند ہے جنہیں تم اس کا شریک قرار دیتے ہو۔

نفع نقصان نفع اور نقصان کے حقیقی مفہوم اور معیار کے متعلق مطالب الفرقان، جلد اوّل صفحہ ۲۵۰ پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ ان مشرکین کے معبود، بُت تھے اور بتوں کے متعلق یہ ظاہر ہے کہ وہ کسی کو کسی قسم کا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ان کے متعلق ان کے پرستاروں کا اپنا عقیدہ ہے جس کی رُو سے وہ انہیں نفع نقصان پہنچانے پر قادر سمجھ لیتے ہیں (پیر پرستی میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے)، ویسے بھی نفع یا نقصان خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

اس مقام پر ایک بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کی رُو سے خدا کی "عبادت" سے مراد اس کے احکام و قوانین کی محکومیت یا اطاعت ہے، پرستش نہیں۔ اسی اعتبار سے خدا کے معبود ہونے سے مراد اس کا حاکم ہونا ہے، پرستیدہ نہیں۔ قرآن میں خدا کی پرستش کا تصوّر ہی نہیں۔ اس لئے جب عبد اور اس کے مشتقات کے جو الفاظ خدا کے متعلق آئیں گے، ان کا مفہوم خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہوں گے۔

لیکن جب یہ الفاظ غیر مسلموں کے سلسلہ میں آئیں گے، تو چونکہ وہ خدا (یا اپنے دیگر معبودوں) کی پرستش کرتے ہیں، اس لئے ان الفاظ کے معنی "پرستش" ہوں گے۔ قرآنی الفاظ یا اصطلاحات کے مفہوم میں اس بنیادی فرق کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ (مثلاً زیرِ نظر آیت میں "يَعْبُدُوْنَ" کے معنی ـــــ

"پرستش کرتے ہیں"۔۔۔ ہوں گے اور معبود کے معنی جن کی پرستش کی جاتی ہے۔ اُس زمانے کی مخاطب قوم کے ہاں تو یہ حیثیت بتوں کی ہوتی تھی، لیکن ہمارے ہاں انسانوں کی بھی پرستش ہوتی ہے۔ انہیں نفع نقصان پہنچانے پر قادر سمجھا جاتا ہے۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا کے ہاں سفارش کرکے انہیں بخشوا دیں گے۔ یعنی ان کے ہاں جو عقائد بتوں کے متعلق ہیں، ہمارے ہاں انسانوں کے متعلق رائج ہیں۔ اسے ہم میں سے ہر ایک شرک قرار دیتا ہے، لیکن اپنے ہاں کے شرک کو عین اسلام ٹھہرایا جاتا ہے اور اسے شرک قرار دینے والے کے خلاف کفر کے فتوے عائد کر دیئے جاتے ہیں۔ جب دین، مذہب بن جائے تو اس میں ہر چیز معکوس ہو جاتی ہے۔ اس میں خرد کا نام جنوں رکھ دیا جاتا ہے اور جنوں کا نام خرد!

اس کے بعد بتایا کہ شرک کو اس قدر سنگین جرم کیوں قرار دیا گیا ہے اور توحید کا مفہوم کیا ہے اور اس سے مقصود کیا ہے۔۔۔ فرمایا:

(۱۰/۱۹) وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَ لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ فِیْمَا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝

نوعِ انسان کی عالمگیر برادری

(اے رسولؐ! تمہاری دعوت، جس کی یہ مخالفت کرتے ہیں، اس کے سوا کیا ہے کہ تم نوعِ انسان کے اختلافات مٹا کر انہیں ایک عالمگیر برادری بنانا چاہتے ہو۔ اور یہ چیز اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمام انسان ایک ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اسی کا نام توحید ہے، جو شرک کی نقیض ہے۔ تمہاری یہ دعوت نہ کوئی نئی دعوت ہے، نہ انہونی بات)۔ نوعِ انسان کی تمدنی زندگی کی تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے دَور میں (جب ان کے مفاد میں باہمی تصادم نہیں ہوا تھا) سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے (۲/۲۱۳)۔ اس کے بعد انفرادی مفاد پرستیوں نے ان میں اختلاف پیدا کرنے شروع کر دیئے اور ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے (۲/۳۶)۔ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم انہیں پیدا ہی اس طرح کرتے کہ یہ اختلاف

نہ کر سکتے. یا اگر یہ اختلاف کرتے تو ہم اپنی قدرت سے ان اختلافات کو زبردستی مٹا دیتے۔
لیکن ہم نے اس کے لئے ایک اور قاعدہ مقرر کیا جس سے انسانوں کی آزادی سلب
نہیں ہوتی تھی. ہم نے وحی کے ذریعے ایسی تعلیم عطا کی جس سے یہ اختلافات مٹ سکتے تھے
(۲/۲۱۳ ؛ ۲/۳۸). مفاد پرست لوگ اس تصور کی مخالفت کرتے ہیں، لیکن اس سے ہمارا
پروگرام رُک نہیں سکتا. نوعِ انسان کو آخر الامر ایک عالمگیر برادری بن کر رہنا ہے)۔

شرک (اور توحید) کے متعلق سابقہ جلدوں میں وضاحت سے لکھا جا چکا ہے (دیکھئے انڈکس) یہاں
توحید کی غایت بتائی گئی کہ اس سے مقصد نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کے ذریعے، بکھری ہوئی نوعِ انسانی کو امّتِ واحدہ بنانا چاہتا ہے اور یہاں قرآن پر
ایمان رکھنے کی مدعی امت کا یہ حال ہے کہ یہ سینکڑوں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے — نسلوں، قوموں، قومیتوں،
مملکتوں، سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقوں کے ٹکڑوں میں — اس سے بڑی تکذیب کی مثال کیا ہو گی؟ قرآن
نے اسی لئے اسے شرک کہا ہے (۳۰/۳۱)۔

اس کے بعد قرآن کریم پھر اس تقابل کو سامنے لایا ہے کہ وحیٔ خداوندی کا مقصود کس قدر عظیم اور بلند و
بالاتر ہے. لیکن ان لوگوں کی تو ہم پرستیوں کا یہ عالم ہے کہ یہ رسولؐ سے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں ———

(۱۰/۲۰) وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَةٌ مِّن رَّبِّهِۦ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا ٱلْغَيْبُ لِلَّهِ فَٱنتَظِرُوٓا۟ إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ ۝

معجزات طلبی

اور یہ لوگ (یہ بھی) کہتے ہیں کہ اس رسول کو اس کے رب کی طرف سے کوئی ایسا آسمانی
نشان کیوں نہیں ملتا جسے دیکھ کر ہم سمجھ لیں کہ یہ واقعی خدا کا رسولؐ ہے۔
اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں ایک نظامِ زندگی کی طرف دعوت
دیتا ہوں، جس کے وہ نتائج جو ابھی تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہیں، خدا کے قانون
کے مطابق مرتب ہو کر رہیں گے. لیکن اس کے لئے کچھ وقت درکار ہو گا. لہٰذا تم اُس

وقت کا انتظار کرو جب اس کے محسوس نتائج تمہارے سامنے آجائیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ وہی نتائج میری صداقت کے "آسمانی نشان" ہوں گے۔

لیکن یہ اوہام پرستی اور اعجوبہ پسندی جاہلیتِ عرب تک ہی محدود نہ تھی۔ ہم اس باب میں اُن سے بھی دس قدم آگے ہیں۔ ہم "کرامات" میں جس قدر کشش محسوس کرتے ہیں، قرآنی حقائق کے حصے میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آتا۔ کرامات تو پھر بھی نظر آجانے والے مظاہر ہوتے ہیں، ہم تو قبروں تک کی بھی پرستش کرتے ہیں۔ عرب جاہلیت کی تاریخ میں قبرپرستی کا کہیں سراغ نہیں ملتا (معجزات اور کرامات کے متعلق انڈکس دیکھئے اور ان کی حقیقت کے لئے میری کتاب "تصوف کی حقیقت"۔ سابقہ صفحات میں آیت (۱۰/۱۶) کے تحت بھی اس موضوع پر گفتگو ہو چکی ہے)۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ "تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں"، تو یہ بات قرآن میں مختلف مقامات پر آئی ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل اور قانونِ مہلت کا بنیادی نکتہ ہے۔ (انڈکس میں "مکافاتِ عمل"، "قانونِ مکافات" اور "قانونِ مہلت" دیکھئے)۔

لیکن ان کی عجلت پسندی انہیں اس قدر انتظار کہاں کرنے دے گی ——

(۱۰/۲۱) وَإِذَآ أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِىٓ آيَاتِنَا ۚ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ۝

(لیکن یہ لوگ اتنا انتظار کہاں کریں گے)۔ انسان کی عجلت پسندی کا یہ عالم ہے کہ جب اسے ذرا سی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں چلا چلا کر پکارنے لگتا ہے (۱۰/۱۲)۔ لیکن جب اس کے بعد اسے راحت نصیب ہوتی ہے تو ہمارے قوانین سے اعراض برتنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔

تم ان سے کہہ دو کہ اللہ کا قانون تدبیر سازی میں تم سے کہیں تیز واقع ہوا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس کی مقرر کردہ قوتیں، تمہاری ہر ایک تدبیر کو ریکارڈ کرتی رہتی ہیں (اس

لئے تمہاری تدابیر خدا کے سامنے ہیں اور اس کی گرفت سے باہر نہیں جاسکتیں (۴۲/۸۰))۔
اس کی تشریح کرتے ہوئے کہا:۔

(۱۰/۲۲-۲۳) هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَھُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اَنْجٰىھُمْ اِذَا ھُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

تلون مزاجی

لوگوں کی اس عجلت پسندی اور تلون مزاجی کا تماشا دیکھنا ہو تو حالتِ سفر میں دیکھو۔ ان کا سفر خشکی اور تری دونوں میں ہوتا ہے۔ جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور ہوا موافق ہوتی ہے تو یہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن جب بادِ مخالف کا تند و تیز جھکڑ انہیں آلیتا ہے اور سمندر کی موجیں چاروں طرف سے تلاطم خیز ہو کر چڑھ آتی ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم ہلاکت میں گھر گئے' تو یہ اللہ کو اس طرح پکارنے لگتے ہیں گویا اس کے احکام و قوانین کے مخلص اطاعت گزار یہی ہیں۔ اور اس کے حضور گڑگڑا

کر دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو ہمیں اس ہجوم بلا سے نجات دلا دے تو ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
تیرے شکرگزار رہیں گے (۲۲)۔
لیکن جب انہیں اس مصیبت سے نجات مل جاتی ہے' تو خدا اور اس کے احکام
سب نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں اور یہ ملک میں ناحق سرکشی اور فساد پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔
اے رسولؐ! تم نوعِ انسان سے پکار کر کہہ دو کہ اگر تم قوانینِ خداوندی سے سرکشی
اور بغاوت اختیار کرو گے تو یہ' درحقیقت' خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف بغاوت ہوگی۔
اس سے تمہیں' اس طبیعی زندگی کے کچھ مفاد حاصل ہو جائیں گے۔ لیکن زندگی تمہارے
جسم کی طبیعی زندگی ہی تو نہیں۔ اصل حیات' انسانیت (انسانی ذات) کی زندگی ہے'
جس کے لئے ہماری طرف سے الگ قوانین مقرر ہیں۔ تمہارے ہر عمل کا نتیجہ ان قوانین کے
مطابق مرتب ہوتا ہے۔ ان سب کا مجموعی نتیجہ بالآخر تمہارے سامنے آ کر رہے گا۔ (۲۳)

اس میں پھر اس حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے کہ بے لوث اطاعتِ خداوندی سے کیا مفہوم ہے
اور مفاد پرستانہ اطاعت کا مطلب کیا۔

بغاوت بغیر الحق اس کے بعد دو مزید نکات غور طلب ہیں۔ اوّل یہ کہ بغاوت بغیر الحق جرم
ہے۔ الحق' قرآن ہے' لہٰذا' الحق کے خلاف بغاوت کے معنی ہیں اس
نظام یا قانون کے خلاف سرکشی۔ یہ جائز ہی نہیں' بلکہ (حالات کے مطابق) ایسی بغاوت فرو کرنا جماعتِ
مومنین کا فریضہ ہے۔ کیونکہ اس قسم کا نظام ظلم و استبداد پر مبنی ہوگا' اور ظلم و استبداد کا مٹانا اس جماعت
کے فرائض میں داخل ہے۔ واضح رہے کہ ان امور کا فیصلہ اسلامی مملکت کرے گی' افراد نہیں۔
دوسری بات یہ کہی کہ جو شخص الحق کے خلاف سرکشی برتے گا وہ درحقیقت اپنی ذات کے خلاف
سرکشی اختیار کرے گا۔ قرآنِ حکیم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ جرم کرنے والا اپنی ذات کے خلاف جرم کرتا
ہے۔ ظالم خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔
بات واضح ہے۔ حق کی اطاعت سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اس لئے ہر وہ عمل جو حق
کے خلاف ہوگا' اس سے انسانی ذات کی نشو و نما رک جائے گی۔ جو شخص ڈاکٹر کی ہدایت کی خلاف ورزی
کرتا ہے' وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ اس مقام پر مجھے ہمیشہ نیٹشے کا وہ بصیرت افروز مقولہ یاد آ جاتا ہے جسے

میں نے (شاید اس سے پہلے بھی درج کیا ہے۔ اس نے کہا ہے:

"جو زیادتی تم نے میرے خلاف کی ہے' اسے تو میں معاف کردوں گا۔ لیکن اس سے جو زیادتی تم نے اپنے خلاف کی ہے' اُسے کون معاف کرے گا؟"

ان امور کی تفصیل قانونِ مکافاتِ عمل کے تحت ملے گی جسے مطالب الفرقان[1] میں شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ دین کی اساس ہے۔ اسی طرح "دنیا اور دین" اور "دنیا اور آخرت" کے تقابل پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے (انڈکس کی مدد سے یہ تمام مقامات سامنے آجائیں گے)۔

اس کے بعد' اس دنیاوی زندگی کا تذکرہ ہے جو اقدارِ خداوندی (وحی) کو نظر انداز کر کے بسر کی جائے:۔

(۱۰/۲۴) اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○

اس دنیاوی (طبیعی) زندگی کی مثال یوں سمجھو جیسے ہم نے بادلوں سے مینہ برسایا اور زمین کی روئیدگی' جو انسانوں کے لئے خوراک اور مویشیوں کے لئے چارا کا کام دیتی ہے (۲۰/۵۴؛ ۳۲/۲۷)' اس سے مل کر (بڑھی' پھولی اور) اس کی شگفتگی اور شادابی کا یہ عالم ہو گیا گویا) زمین نے رنگا رنگ پھولوں کے گہنے پہن رکھے ہیں اور تزئین و آرائش سے دلہن بن گئی ہے اور

صرف دُنیاوی زندگی

[1] جلد اوّل صفحہ ۴۶ تا ۵۲' جلد دوم' صفحہ ۱۵۵' ۲۳۰' جلد سوم' صفحہ ۲۹۲۔

کھیتی والوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب تمام فصلیں ہمارے قبضے میں آچکی ہیں کہ اتنے میں رات یا دن کے کسی حصے میں، ہمارے قانون کی ایک گردش آئی تو اس سے وہ لہلہاتی فصلیں، یوں کٹے ہوئے کھیت کی طرح ہوگئیں، گویا کل ان کا یہاں نام و نشان تک بھی نہ تھا۔ ہم (اس قسم کی مثالوں سے) اپنے قوانین کی وضاحت کر دیتے ہیں۔ لیکن اس سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو غور و فکر سے کام لیں (۱۰/۲۴)۔

یہاں پھر اس نکتہ پر غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے بات نہایت مفصّل بیان کی ہے۔ لیکن اس سے وہی لوگ مستفید ہو سکیں گے جو غور و فکر سے کام لیں گے۔ قرآن نے جو کتاب کے ساتھ حکمت کو چسپاں کیا ہے تو اس سے مراد ہی یہ ہے کہ قرآنی احکام و قوانین کو غور و فکر کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مذہب اور دین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ دین اپنے مخاطب کو دلیل و برہان Reason کی رُو سے مطمئن کر کے، اسے تسلیم کرنے یا اس کی اطاعت کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مذہب میں فکری اطمینان کا مطالبہ کرنا، جرم قرار پاجاتا ہے۔ اس اعتبار سے تھیاکریسی اور ملوکیت یا آمریت، ایک ہی سطح پر ہوتی ہیں۔ دونوں میں عقل و فکر کی صلاحیتوں کو مسلوب کر کے، اطاعت ڈنڈے کے زور سے کرائی جاتی ہے۔

اس کے بعد دونوں راستوں کا تقابل سامنے لایا گیا:۔

(۲۵-۲۶/۱۰) وَاللّٰهُ يَدْعُوٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۚ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۚ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۚ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

(لہٰذا) جو لوگ صرف دنیوی مفاد کو اپنا نصب العین بنالیں اور مستقبل کی کوئی فکر نہ کریں، ان کی روش وقتی خوشنمائیوں لیکن آخر الامر تباہیوں کی موجب ہوتی ہے۔ اس

کے برعکس، وہ روش ہے جس کی طرف خدا دعوت دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہر قسم کی تباہی سے سلامتی اور بربادی سے عافیت ہوتا ہے۔ یہ ہے کامیابیوں کی وہ توازن بدوش راہ جس کی طرف خدا کا قانون ہر اُس شخص کی راہنمائی کرتا ہے جو اس سے راہنمائی حاصل کرنا چاہے (۲۵)۔ جو لوگ اس روش کو اختیار کرکے حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں، اس کا نتیجہ اتنا ہی نہیں ہوتا کہ ان کی اپنی زندگی حسین ہو جاتی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ ان کا معاشرہ ذلّت و رسوائی کے کرب انگیز عذاب سے محفوظ رہتا ہے اور ایک ایسی جنت میں تبدیل ہو جاتا ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی۔ (۱۰/۳۰؛ ۱۴/۶۰؛ ۵۵/۶۰؛ ۹/۷۲؛ ۸۹/۲۷؛ ۳۵/۵۰)؛ (۱۰/۲۶)۔

اس کے برعکس؛

(۱۰/۲۷) وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۗ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

سزا مطابق جرم

اس کے برعکس، جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرنے والی روش اختیار کرتے ہیں تو اس قسم کی ناہمواریاں خود ان کی اپنی ذات میں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس طرح ان کا توازن بگڑ جاتا ہے اور ان کا معاشرہ بھی ذلیل اور رُوسیاہ ہو جاتا ہے۔ انہیں، اس رُسوا کن عذاب سے جو قانونِ خداوندی کی رو سے واقع ہوتا ہے، کوئی نہیں بچا سکتا۔ ان کی رُوسیاہی کا یہ عالم ہوتا ہے گویا کسی نے رات کی تاریکی کا ایک ٹکڑا لے کر اس کا نقاب ان کے چہرے پر اوڑھا دیا ہو۔ ان کا معاشرہ جہنمی ہوتا ہے جس میں یہ ہمیشہ رہتے ہیں۔

اس آیت میں عدالتی انصاف کے ایک اہم اصول کو سامنے لایا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ جرم کی سزا جُرم

کے مطابق ہونی چاہیئے اس سے زیادہ نہیں (اس سورت میں سَیِّـاٰتِ اور سَیِّئَۃٍ کو جرم کے معنوں میں لیا جائے گا)۔ جرم اور سزا کے فلسفہ کے متعلق مطالب الفرقان جلد سوم ص۱۷۱ پر تفصیلی بحث کی جا چکی ہے (نیز دیگر مقامات پر جن سے انڈکس کی مدد سے مستفید ہوا جا سکتا ہے)۔

لیکن اس کا ایک مفہوم فقہ کی رُو سے بھی لیا جاتا ہے۔ اسے ہم نے مطالب الفرقان جلد پنجم ص۱۴۸ پر بیان کیا ہے۔ وہاں تو ہم نے اُسے بصد دلِ نخواستہ لکھ دیا ہے، لیکن وہ اس قدر شرمناک ہے کہ اسے دہرانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ قارئین وہیں دیکھ لیں۔

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر، جہنم میں عوام اور ان کے لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کے مابین مکالمات کا ذکر کیا ہے۔ (مطالب الفرقان جلد چہارم ص۵۴۹ (۲۸/۶۳) نیز (۳۳/۶۸))، نیز مختلف قوموں کے درمیان مکالمات (۷/۳۸) (جلد پنجم صفحہ ۱۹۳)۔

اگلی آیت میں اس قسم کا ایک منظر سامنے لایا گیا ہے:

(۱۰/ ۲۸-۲۹) وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ○ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ○

جہنم میں مکالمہ

جب ہم ان سب کو یکجا اکٹھا کریں گے تو جو لوگ شرک کرتے تھے ان سے کہیں گے کہ تم اور جنہیں تم ہمارے شریک ٹھہراتے تھے، اپنی اپنی جگہ ٹھہرے رہو۔ پھر انہیں الگ الگ کر دیا جائے گا۔ اس پر جن ہستیوں کو وہ خدا کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے ان سے کہیں گے کہ یہ غلط ہے کہ تم ہمارے کہنے پر ہماری پرستش کیا کرتے تھے۔ (۲۸)

اس حقیقت پر خدا شاہد ہے ——— اور اس کی شہادت، ہمارے اور تمہارے
دعوے کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہے ——— کہ ہمیں اس کا قطعاً علم نہیں تھا کہ
تم ہماری پرستش کرتے تھے (چہ جائیکہ ہم نے تم سے کہا ہو کہ تم ہماری پرستش کرو) (۲۹)۔

اس سلسلہ میں (انڈکس میں) عنوانات "مکافاتِ عمل"، "تقلید" بھی دیکھئے۔ اس کی وضاحت اگلی آیت میں کر دی گئی جب کہا:۔

(۱۰/۳۰) هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ع

غرضیکہ جو کچھ کسی انسان نے پہلے کیا ہوگا، وہ اُس وقت نکھر کر سامنے آجائے گا اور تمام اعمال، خدا کے قانونِ مکافات کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ وہی اس حقیقی میزان کا مالک اور سرپرست ہے۔ اور جو کچھ لوگ اپنے خود ساختہ تصورات کے مطابق کیا کرتے تھے، وہ سب رائیگاں جائے گا (یعنی اس کا وہ نتیجہ نہیں نکلے گا جو ان کے ذہن میں تھا۔ عمل وہی نتیجہ خیز ہوتا ہے جو خدا کے قانون کے مطابق کیا جائے)۔

آیت میں تَبْلُوْا کا لفظ قانونِ مکافاتِ عمل کے اساسی گوشے کی وضاحت کرتا ہے۔ اس مادہ (ب۔ل۔د) کے معنی ہوتے ہیں، پوشیدہ بات کا ظاہر ہو جانا (دیکھئے لغات القرآن)۔ قرآن کی رُو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ عمل کے اندر مضمر ہوتا ہے، لیکن وہ نمودار ہوتا ہے کچھ وقت کے بعد (اسے مہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے جس کے متعلق پہلے گفتگو کی جا چکی ہے)۔ قیامت اس مرحلہ Stage کا نام ہے جب انسان کے اعمال کے نتائج نکھر کر سامنے آجائیں، خواہ وہ اس دنیا میں ہو اور خواہ اُخروی زندگی میں۔ اسی کو دوسری

سب راز بے نقاب

جگہ "رازوں کا بے نقاب ہونا" بھی کہا گیا ہے۔ سورۃ الطارق میں ہے: يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (۸۶/۹)۔ ہمارے نزدیک اس سے شدید عذاب کچھ اور ہو نہیں سکتا کہ انسان کی وہ (حقیقی) سیرت و کردار جسے اس نے لوگوں سے

چھپا کر رکھا تھا انہی لوگوں کے سامنے بے نقاب ہو جائے۔ یہ ہے جہنم کی وہ آگ جس کے شعلے (قرآن کے الفاظ میں) دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ (۱۰۴/۷)۔ آیت کے آخر میں، مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ نے ان رازوں کی نوعیت کا افشا کر دیا جنہیں انہوں نے لوگوں سے چھپا رکھا تھا۔ اِفْتِرَآءٌ کہتے ہیں کسی بات کو خود وضع کرنا (تراشنا) اور اسے دوسروں کے سر تھوپ دینا، لوگوں کی طرف عجیب عجیب (خود وضع کردہ) باتیں منسوب کر دینا، یعنی یہ مشہور کرنا کہ وہ احکامات خداوندی ہیں۔ مذہبی پیشوا یہی کچھ کرتے ہیں۔ اِفْتِرَآءٌ میں یہ سب کچھ آجاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ جس دن اُن کے اِن اعمال پر پڑے ہوئے پردے اٹھ جائیں گے تو کیسے کیسے "مقدس چہرے" بے نقاب ہو کر سامنے آئیں گے!

خدا کے قانون کی بات چلی تو اس کی ہمہ گیری اور محکمیت کی طرف توجہ دلائی گئی:-

(۱۰/۳۱) قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○

اے رسولؐ! ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو زمین و آسمان کی بخشائشوں کے ذریعے تمہارے لئے سامانِ زیست عطا کرتا ہے؟ وہ کون ہے جس کے قبضے میں تمہارے ذرائع علم مثلِ سماعت و بصارت ہیں؟ وہ کون ہے جو غیر ذی حیات اشیاء سے زندگی کی نمود کرتا ہے اور زندہ چیزوں سے مردہ اشیاء نکالتا رہتا ہے؟ (مختصراً) وہ کون ہے جو اس تمام کائنات کے نظم و نسق کو چلا رہا ہے؟ (تم دیکھو گے کہ اس کے جواب میں) وہ کہہ دیں گے کہ وہ اللہ ہے۔ تم ان سے کہو کہ (جب تمہیں اس کا اعتراف ہے کہ ساری کائنات میں خدا کا قانون جاری و ساری ہے تو) اپنے معاشرے میں اس کے قوانین کی نگہداشت

کیوں نہیں کرتے؟ (تم ایسا کیوں سمجھتے ہو کہ خارجی کائنات میں تو خدا کا قانون کارفرما ہے لیکن تمہاری معاشرتی زندگی اس کے حدودِ مملکت سے باہر ہے۔ اس میں اس کا قانون نہیں چلتا۔ یہ تصور یکسر باطل ہے۔ یہ ذات

اِلٰہُ الْاَرْضِ وَ اِلٰہُ السَّمَآءِ

جو اِلٰہُ السَّمَآء ہے (یعنی خارجی کائنات میں جس کا اقتدار واختیار ہے) وہی اِلٰہُ الْاَرْض ہے (یعنی انسانوں کی معاشرتی و معاشی زندگی بھی اسی کے قانون کے تابع رہنی چاہیئے)۔ (۶/۳) ؛ ۱۶/۵۰ ـ ۵۱ ؛ ۲۱/۲۱ ـ ۲۲ ؛ ۴۳/۸۴ ـ ۸۷ ؛ ۴۳/۹ ؛ ۲۳/۸۴ ـ ۸۹ ؛ ۳۹/۳۸)۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ کائنات کو کس نے بنایا اور کون اس کے نظم و نسق کو اپنے کنٹرول میں رکھے ہوئے ہے، تو یہ کہیں گے کہ اللہ ہی نے ایسا ہی کیا ہے اور وہی ایسا کر رہا ہے (حوالہ کے لئے خصوصیت سے ان آیات کو دیکھئے؛ (۲۹/۶۱ ـ ۶۳ ؛ ۳۱/۲۵ ؛ ۴۳/۹)۔ عرب میں اس زمانے میں یہود و نصاریٰ بستے تھے۔ وہ تو خدا کو مانتے بھی تھے، لیکن ایامِ جاہلیت (زمانہ قبل از اسلام) میں خود عرب بھی اللہ کو مانتے تھے۔ علاوہ دیگر شہادات کے، خود ان کے نام اس پر شاہد ہیں (حضورؐ کے والدِ ماجد کا نام عبداللہ تھا)۔

لیکن وہ کائنات کی تخلیق اور تنظیم کی حد تک خدا کا اقتدار تسلیم کرتے۔ انسانی دنیا میں اس کے اقتدار کو نہیں مانتے تھے، یعنی وہ خدا کی اُس وحی کو نہیں مانتے تھے جو انسانی معاملات کو نظم و ضبط میں رکھتی ہے۔ خدا کو ماننے کا اصلی مقصد تو یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے ایمان باللہ کو ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ جب تک تم قرآن کو ضابطۂ حیات نہ مانو خدا پر ایمان کا دعویٰ بے معنی ہے۔

سیکولرازم میں خدا پرستی

اس قسم کا خدا پر ایمان دورِ حاضر کے مغربی سائنسدانوں کا ہے۔ ان میں سے بیشتر خدا کو مانتے ہیں لیکن صرف کائناتی خدا کو انسانی دنیا میں وہ سیکولرازم کے قائل ہیں۔ وہ پھر بھی کائناتی خدا کو علی وجہ البصیرت مانتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ کائناتی خدا کو محض عقیدۃً مانتے ہیں اور انسانی معاملات میں کتاب اللہ کی حکمرانی کے عملاً منکر ہیں۔ معلوم نہیں خدا پر اس قسم کے ایمان کا کیا نام رکھا جائے گا؟

اگلی آیت میں بات واضح کر دی کہ:۔

(۱۰/۳۲) فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلٰلُ ۖ فَأَنّٰى تُصْرَفُونَ ○

یہ ہے تمہارا حقیقی نشوونما دینے والا (جو خارجی کائنات کی نشوونما کا بھی ذمہ دار ہے اور انسانی دنیا کی نشوونما کا بھی۔ خدا ہونا اسی کو زیب دیتا ہے)۔ اب سوچو کہ اس قسم کے خدا کے قوانین سے انکار کرنے کا نتیجہ گمراہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ان سے پوچھو کہ اس خدا کو چھوڑ کر تم اپنا رُخ کس طرف کرنا چاہتے ہو؟

ذاتِ خداوندی کی کُنہ و حقیقت، انسانی علم و ادراک تو ایک طرف، اس کے وہم و قیاس میں بھی نہیں آسکتی۔ سوال یہ ہے کہ جس خدا کی یہ کیفیت ہو، اس پر ایمان کی دعوت اور مطالبہ کے کیا معنی ہیں؟ یعنی انسان کس خدا پر ایمان لائے؟ اگر خدا کو اسی طرح "غیر متعین" چھوڑ دیا جائے تو ہر شخص اپنے اپنے ذہن اور تصور کے تراشیدہ خدا پر ایمان لائے گا۔ اس سے نہ وحدتِ فکر پیدا ہو سکے گی، نہ وحدتِ عمل، نہ وحدتِ نظام نہ وحدتِ انسانیت۔ اس کا نتیجہ تشتت و انتشار کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

قرآن کریم نے ذاتِ خداوندی کے متعلق تو یہی کہا ہے کہ جو کچھ تم اپنے ذہن سے اس کے متعلق کہو، وہ اس سے بلند و بالا ہے (۲۳/۹۱)۔ لیکن اس نے اپنی صفات اس تفصیل اور جامعیت سے بیان کر دیں کہ ان کی رُو سے خدائے واحد پر ایمان لانا، ناممکن تو ایک طرف، مشکل بھی نہ رہا۔ اب خدا پر ایمان کے معنی ہوں گے اُن صفات کی حامل **ذٰلِكُمُ اللّٰهُ** ذات پر ایمان جس کی وہ صفات ہیں۔ اس موضوع پر مطالب الفرقان جلد سوم (صـ۲۲۳) میں بھی گفتگو کی جا چکی ہے۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر، صفاتِ خداوندی بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ "ذٰلِكُمُ اللّٰهُ" یہ ہے تمہارا اللہ (حوالوں کے لئے ۶/۱۰۳؛ ۳۵/۱۳؛ ۳۹/۶؛ ۴۲/۱۰)۔

میں نے اپنی کتاب "من و یزداں" میں قرآن میں بیان کردہ تمام صفاتِ خداوندی کے تذکرہ کے بعد آخری باب کا عنوان دیا ہے:۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ

یہ ہے تمہارا اللہ

جہاں تک میری نگاہ میری یاوری کرتی ہے، دنیا کی کسی مذہبی کتاب میں متعیّن طور پر یہ نہیں کہا گیا کہ — ذٰلِكُمُ اللّٰهُ. جب خود خدا نے اپنے متعلق متعیّن طور پر یہ کہہ دیا تو پھر اسی ایمان کو خدا پر ایمان کہا جا سکے گا جو قرآن میں بیان کردہ صفات کا حامل ہے. ان صفات میں کسی قسم کا تغیّر و تبدل یا کمی بیشی، الحاد (خدا کا انکار) کہلائے گا. اگلی آیت میں یہی کہا گیا ہے:

(۱۰/۳۳) كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

(اگر یہ لوگ اس قدر واضح دلائل کے بعد بھی، قانونِ خداوندی پر ایمان نہیں لاتے، تو سمجھ لو کہ) ان کے بارے میں تمہارے خدا کا یہ قانون صادق آگیا کہ جو لوگ صحیح راستہ چھوڑ کر اس طرح اِدھر اُدھر نکل جاتے ہیں، وہ خدا کے قانون پر ایمان نہیں لایا کرتے۔

ان صفاتِ خداوندی میں حکّ و اضافہ یا تغیّر و تبدل تو ایک طرف، ان میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا.

صفاتِ خداوندی کے اقسام

واضح رہے کہ خدا کی کچھ صفات تو ایسی ہیں جو کاملۃً اس کے لئے مختص ہیں (مثلاً) وہ اوّل ہے، وہ آخر ہے یا — وہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے. وقس علیٰ ذٰلک. ظاہر ہے کہ ان صفات میں کسی اور کے شریک ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا. لیکن بعض صفات ایسی ہیں جو انسان کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں — (مثلاً) خدا علیم ہے، تو انسان بھی علم حاصل کر سکتا ہے. ان صفات میں صورت یہ ہے کہ جب ایسی صفت خدا کے لئے ہوگی تو وہ لا انتہٰی بھی ہوگی اور بغیر کسی ذریعے یا واسطہ کے ہوگی. لیکن انسان میں وہ صفت حدِ بشریت کے اندر ہوگی. لا انتہا ہوگی نہ ذرائع اور وساطت سے بے نیاز. خدا کا علم لا انتہا ہے اور کسی کے ذریعے سے حاصل کردہ نہیں. انسان کا علم محدود ہوتا ہے اور مختلف ذرائع سے حاصل کردہ.

جو صفات خدا کے لئے مختص ہیں، ان میں کسی اور کو شریک سمجھنا یا دیگر صفات کو انسانوں میں (خدا کی طرح) لا انتہا سمجھنا شرک ہے. اگلی آیت میں اس شرک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:-

(۱۰/۳۴) قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ

يُعِيدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○

ان سے پوچھو کہ جن ہستیوں کو تم خدا کا شریک سمجھتے ہو' ان میں کوئی ایسی ہستی بھی ہے جو کسی شئے کی تخلیق کی ابتدا کر سکے اور اس کے بعد' اسے' مختلف مراحل میں سے گردشیں دیتے ہوئے ارتقائی منازل طے کرانی چلی جائے؟ ان سے کہو کہ ایسا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ یہ صرف قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوتا ہے۔ وہ تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور مخلوق اشیاء کو' مختلف ادوار میں گردشیں دیتا ہوا' ان کے نقطۂ تکمیل تک لئے جاتا ہے۔ سو جب حقیقت یہ ہے تو پھر تمہارے الٹے خیالات تمہیں کس طرف لئے جا رہے ہیں؟

یہاں تک کائناتی خدا کا ذکر تھا۔ اس کے بعد اس خدا کا ذکر آیا جس کا تعلق عالمِ انسانیت سے ہے اور یہ تعلق اُن قوانین کی رُو سے قائم ہوتا ہے جو اُس نے بذریعہ وحی عطا فرمائے ہیں۔ جس طرح کائناتی قوانین (قوانینِ فطرت) خدا اور صرف خدا کے متعین کردہ ہیں' اسی طرح انسانی راہنمائی کے لئے قوانین بھی اسی کے عطا فرمودہ ہیں۔ اس راہنمائی میں بھی کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔

(۱۰/۳۵) قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○

ان سے پوچھو کہ کیا ان غیر خدائی قوتوں میں سے' جنہیں تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو' کوئی قوت بھی ایسی ہے جو تمہاری راہنمائی کسی ایسے پروگرام کی طرف کر دے جو مبنی بر حقیقت ہو اور ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرنے کی ذمہ دار! ان سے کہو کہ اس قسم کی راہنمائی

صرف قانونِ خداوندی کی رُو سے مل سکتی ہے۔

ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو پھر بتاؤ کہ کیا وہ قانون جو اس قسم کی راہ نمائی عطا کرے، اس کا مستحق ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے یا وہ ہستیاں جو خود اپنی راہنمائی کے لئے بھی دوسروں کی محتاج ہوں؟

ان سے کہو کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایسے واضح حقائق کے بعد بھی، تم غلط فیصلے کرتے ہو!

اس کے بعد ہدایتِ خداوندی اور انسانی فکر کی تراشیدہ راہنمائی کے تقابل سے بتایا کہ مبنی بر حق صرف ہدایتِ خداوندی ہے۔ انسانی علم اور اس پر مبنی ہدایت، حق نہیں ظن ہے اور ظن حق کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

(۱۰/۳۶) وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ۝

اصل یہ ہے کہ ان میں اکثر وہ لوگ ہیں جن کے پاس حقیقت کا یقینی علم کچھ نہیں، اور وہ محض ظن و قیاس کے پیچھے چلتے رہتے ہیں، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ظن و قیاس، حق و یقین کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ کام دے سکتا ہے جو یقینی علم دیتا ہے۔ جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں وہ خدا کے علم میں ہے (وہ جانتا ہے کہ یہ کس طرح محض قیاسات کے پیچھے چلتے ہیں)۔

اس آیت میں قرآنِ کریم نے دین کی اصل و اساس چند لفظوں میں بیان کر دی ہے۔ اس نے

حق اور ظن کا تقابل

کہا ہے کہ حق کا اتباع دین ہے اور ظن و قیاس کا اتباع دین کی ضد۔ ظن حق کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ حق کے معانی اور مفہوم، سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں (انڈکس دیکھئے)۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ حق

کے معنی ہیں، یقینی بات، یعنی جس بات کے یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہو۔ اس کے مقابلہ میں ظن ہے، یعنی جس کے متعلق یقین نہ ہو۔

دنیا کے کسی مذہب کے پیرو اس کا دعویٰ ہی نہیں کرتے کہ جس کتاب کو وہ اپنے مذہب کی بنیاد قرار دیتے ہیں، وہ یقینی طور پر، حرفاً حرفاً وہی ہے جسے ان کے نبی نے انہیں دیا تھا۔ اگر (بفرضِ محال) کوئی ایسا دعوےٰ کرے بھی تو خود ان کی تاریخ اس دعوے کی تردید کر دیتی ہے (تفصیل ان امور کی میری کتاب "مذاہبِ عالم کی مبیّنہ آسمانی کتابیں" میں ملے گی)۔ لہٰذا، وہ سب ظن کی پیروی کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی رو سے الحق خود قرآن ہے اور قرآن کے متعلق قرآن نازل کرنے والے کا یہ دعویٰ ہے کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (۱۵/۹) "یہ یقینی بات ہے کہ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔ مسلمان ہونے کے لئے اس دعویٰ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ لہٰذا، مسلمان کا دعوےٰ یہ ہے کہ وہ جس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ یقینی طور پر مُنَزَّلٌ مِنَ اللہ اور محفوظ ہے۔

لیکن یہ ان کا زبانی دعویٰ ہی ہے۔ عملاً وہ بھی جن امور کی پیروی کرتے ہیں، وہ ظن ہیں۔ وہ حدیث کی پیروی کرتے ہیں یا فقہ کی اور یہ دونوں ظن ہیں۔

احادیث کس طرح جمع اور مدوّن ہوئی تھیں، اسے تفصیلی طور پر مطالب الفرقان، جلد چہارم صفحات ۳۴۳ (الآخر) میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث کے دیگر گوشوں کے متعلق انڈکس دیکھا جا سکتا ہے۔ حدیث کے متعلق اس طول طویل بحث کا ماحصل یہ ہے کہ حدیث کو دین ماننے والوں میں سے کوئی کسی ایک حدیث کے متعلق بھی یہ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ لفظاً لفظاً قولِ رسولؐ ہے۔ ان کی صورت یہ ہے کہ جب وہ کوئی حدیث بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں قال رسولُ اللہ (رسولُ اللہ نے فرمایا) اس کے بعد اس حدیث کو نقل کرتے ہیں اور آخر میں کہتے ہیں ____ اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللہ (یوں یا جس طرح رسولُ اللہ نے فرمایا ہو)۔ اس سے واضح ہے کہ وہ کسی حدیث کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہتے کہ وہ قولِ رسولؐ ہی ہے۔ لہٰذا، احادیث تمام کی تمام ظنّی ہیں۔

احادیث

احادیث کی اصل و حقیقت تو یہ ہے، لیکن ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل ہیں۔ بلکہ حدیث قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے[1]۔ قرآن کا

(۱؎ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

دعویٰ یہ ہے کہ حق کے مقابلہ میں ظن کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ظن، حق کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔ چنانچہ آج مسلمانوں کا عمل بھی اس پر ہے۔

حدیث کے بعد فقہ کی باری آتی ہے۔ صدرِ اوّل میں جب تک اسلامی مملکت قائم رہی، اتباع صرف حق (قرآن کریم) کا تھا۔ مملکت، جس کے سربراہِ اوّل، نبی اکرمؐ تھے، قرآنی احکام نافذ کرنے کا ذریعہ تھی۔ قرآن نے جن احکام کی تفصیل خود نہیں دی تھی، ان کی تفاصیل، امت کے باہمی مشورے سے طے پاتی تھیں اور مملکت کی طرف سے نافذ ہوتی تھیں۔ لہٰذا، اُس دور میں نہ حدیث کے اتباع کا سوال پیدا ہوا تھا، نہ فقہ وجود میں آئی تھی۔

فقہ جب قرآنی نظامِ حکومت کی جگہ ملوکیت آگئی تو دین باقی نہ رہا۔ اس کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اس کی تاریخ کے اس پورے دور میں (یعنی اُس زمانے سے لے کر آج تک) مسلمانوں کی حکومتیں تو قائم ہوتی رہیں، لیکن اسلامی حکومت کہیں بھی قائم نہ ہوئی۔ ملوکیت نے سب سے پہلے ثنویت کی طرح ڈالی، یعنی امورِ مملکت (جنہیں موجودہ دور میں اصطلاح میں پبلک لاز کہا جاتا ہے) حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی قوانین اربابِ مذہب کی تحویل میں دے دیئے۔ مسلمان بادشاہ امورِ مملکت کے متعلق جو فیصلے کرتے انہیں وہ اسلام کا نام دے دیتے تاکہ عوام مطمئن رہیں کہ اسلامی حکومت قائم ہے۔ اس تاثر کو علمائے کرام کی تائید اور بھی تقویت پہنچاتی تھی۔ وہ ان بادشاہوں کے حق میں محراب و منبر سے اَیَّدَ اللّٰهُ بِنَصْرِهٖ اور خَلَّدَ اللّٰهُ مُلْكَهٗ کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ انہیں ظِلُّ اللّٰهِ عَلَى الْاَرْضِ "زمین پر خدا کا سایہ" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ملوکیت کے اس ماحول میں امورِ مملکت کے متعلق جس قسم کے فتاویٰ صادر ہوا کرتے تھے اس کا اندازہ اس ایک فتوے سے لگایئے جو فقہ حنفی کی مستند کتاب ہدایہ اولین مجیدی، صفحہ ۴۹۳ میں ان الفاظ میں درج ہے:

كل شیء صنعه الامام الذی لیس فوقهٗ امام فلاحد علیه الا قصاص

یعنی جن جرائم کی سزا حد ہے، سربراہِ مملکت سے ان میں سے کسی کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا بجز قصاص

(گذشتہ صفحہ کا فٹ نوٹ) تفصیل کے لئے دیکھئے، طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث"۔

کے۔ یعنی سربراہِ مملکت پر قصاص کے سوا کسی جرم پر حد نہیں لگ سکتی۔ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے،

ائمۂ فقہاء چونکہ ان کی تدوین و تنفیذ کے لئے کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی اس لئے مختلف فقہاء نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لئے اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امتِ واحدہ فرقوں میں بٹ گئی۔ ان ائمۂ فقہاء کی تعداد تو بہت زیادہ تھی، لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی۔ یعنی

(۱) امامِ اعظمؒ (کوفی) .... پیدائش سنہ ۸۰ھ ، وفات سنہ ۱۵۰ھ
(۲) امام مالکؒ (یمنی، مدنی) .... پیدائش سنہ ۹۳ھ ، وفات سنہ ۱۷۹ھ
(۳) امام شافعیؒ (عسقلانی، مکی) .... پیدائش سنہ ۱۵۰ھ ، وفات سنہ ۲۰۴ھ
(۴) امام احمد بن حنبلؒ (بغدادی) .... پیدائش سنہ ۱۶۴ھ ، وفات سنہ ۲۴۱ھ

(اہلِ تشیع کی فقۂ جعفری ان سے الگ ہے)۔

شروع شروع میں تو ان ائمۂ فقہاء کے متبعین اپنے اجتہاد سے ایسے مسائل بھی وضع کرتے تھے جو ان کے پیشرووں کے خلاف ہوں۔ نیز ان کے مرتب کردہ مسائل کی فہرست میں حک و اضافہ بھی کرتے رہتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور عقیدہ یہ پیدا ہو گیا کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ میں ایسی بات کہے جو اس قول کے مخالف ہو جس کا فتویٰ اس کے امام نے دیا ہے۔ چنانچہ فقہاء حنفیہ کے پیشوا اور مسلّم امام، ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہر وہ آیت جو اس طریقہ کی مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو مؤوّل ہے یا منسوخ۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ مؤوّل ہے یا منسوخ۔[1]

یہی نہیں کہ فقہ کو قرآن کا ناسخ قرار دے دیا گیا۔ اس کے بعد اس کے متعلق ایسا عقیدہ وضع کیا گیا جس سے اسے الوہیت کا مقام دے دیا۔

قوانینِ خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ حیثیت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو دے دی جائے تو یہ انہیں خدائی حیثیت دینے کے مترادف ہوگا۔ قرآن کریم نے سابقہ اہلِ کتاب کے خلاف جو اعتراض کیا ہے کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ

---

[1] "تاریخ التشریع الاسلامی" مؤلفہ علامہ محمد الخضری کا اردو ترجمہ "تاریخ فقہ اسلامی"۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ص ۴۲۱۔

دُوْنِ اللّٰہِ (۹/۳۱) کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدائی درجہ دیتے تھے' تو اس سے یہی مراد ہے کہ وہ ان کے وضع کردہ قوانین کو خدائی قوانین جیسا درجہ دیتے تھے اور یہ کھلا ہوا شرک تھا۔ قرآنِ کریم نے امت میں

فقہ غیر متبدّل

فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے (۳۰/۳۱)۔ فرقے کا وجود اس عقیدے پر قائم ہوتا ہے کہ اس کے متبعین اپنے فرقے کے بانیوں کے عقائد و احکام کو منفرداً ابدی اور غیر متبدّل سمجھتے ہیں۔ کچھ عرصہ اُدھر کی بات ہے کہ ہمارے ہاں یہ خیال اُبھرا کہ مروّجہ اسلامی احکام کے متعلق کچھ تحقیقی کام کیا جائے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے ایک حنفی مفتی صاحب نے ارشاد فرمایا:

> "یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی' دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اس کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ ہدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے........ لہٰذا اگر تحقیقات اسلامی سے ایسے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دَور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر وہ تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردُود ہے۔ اس پر امّتِ محمدیہ کا اجماع ہے۔"
>
> (بحوالہ ایشیا' ۱۴ اگست ۱۹۶۸ء)

یہ ہے فقہی قوانین کے متعلق وہ عقیدہ جو مسلسل چلا آرہا ہے' حالانکہ جن ائمہ نے فقہ مدوّن کی تھی' نہ ان کا یہ عقیدہ تھا نہ ان کا یہ منشاء۔ فقہ میں امامِ اعظمؒ (ابو حنیفہؒ) کو جو مقام حاصل ہے' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے متعلق خطیب بغدادی نے لکھا ہے:

> "نضر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابو حنیفہؒ کے پاس آیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ ایک شام کا آدمی بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی (فراغت کے بعد) وطن کو واپس جانے لگا تو امام ابو حنیفہ سے رخصت ہونے کے لئے آیا۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس سے پوچھا "اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ شام کی طرف لے جاؤ گے؟" شامی نے جواب دیا' "ہاں"! اس پر امامؒ نے فرمایا' "خیال رکھنا! تم بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جارہے ہو۔" (خطیب ج ۱۳' ص۳۵۲)۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابو حنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں' کیا یہ سب حق ہے جس

امام اعظمؒ کا مسلک

میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا۔ بخدا مجھے معلوم نہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام ابوحنیفہؒ فیصلے فرماتے، ہم ان کو لکھ لیا کرتے تھے۔ امام زفر کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابوحنیفہؒ نے ابویوسفؒ سے فرمایا، یعقوب! تیرا ناس ہو۔ جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے، اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابونعیم کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابویوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو۔ کیونکہ بخدا مجھے کوئی خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطا کار ہوں یا مصیب (ایضاً)۔ سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابوحنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا: فَبَشِّرْ عِبَادِ ۙ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ (۳۹/۱۸) یعنی اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو بشارت دے دو، جو باتوں کو سنتے ہیں اور پھر ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں (ایضاً۔ ج ۱۴، ص ۳۵۲)۔ حسن بن زیاد لولوی کہتے ہیں کہ "ہمارا یہ قول (فقہ) ایک رائے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کرسکتے ہیں۔ جو ہمارے قول سے بہتر رائے لاسکے تو وہی صحت سے زیادہ قریب ہوگی۔ (ایضاً)۔

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ خود رسول اللہ کے زمانے میں جزئی قوانین باہمی مشاورت سے طے پایا کرتے تھے۔ اور جو معاملات مشورے سے طے پائیں وہ ناقابلِ تغیر و تبدل قرار پا نہیں سکتے۔ اس ضمن میں بغدادی نے لکھا ہے:

> محمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظم فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپؐ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابواسحاق کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوحنیفہ کے سامنے اکثر نبیؐ کی حدیثیں آتیں اور وہ ان سے اختلاف کرتے۔
>
> (البغدادی، جلد ۱۳، ص ۳۸۷)

آپ کے اس مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے:

"ابو عوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابو حنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو[1]۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچئے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابو حنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔"

(ایضاً صفحہ ۲۹)

یہ ہے فقہ کی حقیقت! ظاہر ہے کہ یہ سراسر ظنّی ہے۔ جس طرح ہم نے حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ وہ (خود حدیث کو دین ماننے والوں کے نزدیک بھی) یقینی نہیں، ظنّی ہے۔ اسی طرح فقہ کا اصول یہ ہے کہ قانون کے ماخذ چار ہیں — قرآن، حدیث، اجماع، قیاس۔ قرآن اور حدیث کے متعلق تو ہم ان حضرات کا عقیدہ نقل کر چکے ہیں کہ فقہ کا فیصلہ ان دونوں پر غالب رہے گا۔ اجماع کے متعلق آج تک ہی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اس سے مراد کیا ہے۔ یہ بہرحال واقعہ ہے کہ ہماری پوری تاریخ میں کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں جس کے متعلق تمام امت نے متفقہ طور پر کوئی قانون مرتب کیا ہو، یا جس پر تمام امت کا اتفاق ہو۔ بنا بریں، فقہ میں قانون سازی کی بنیاد قیاس ہی رہ جاتا ہے اور قیاس، ظن ہی کا دوسرا نام ہے۔

اجماع

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حقّ، امت کی زندگی سے خارج ہے اور اس کے مذہب اور شریعت کا سارا مدار ظن پر ہے۔ اور ظن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا جو ارشاد ہے وہ ہمارے سامنے آ چکا ہے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں جو کہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (خدا جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں)، تو اس سے روح میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔

اتباعِ ظن کے خلاف، قرآنِ کریم کے دیگر کئی ایک مقام میں بھی آیا ہے۔ مثلاً۔ (۶/۱۱۷؛ ۶/۱۴۹)؛ (۱۰/۶۶)؛ (۵۳/۲۳)؛ (۵۳/۲۸)۔

[1] یہ اس زمانے کے قوانین تھے جن کی ہم پر پابندی لازم نہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ الحق صرف قرآن ہے۔ اس کے بعد قرآن کی خصوصیات سامنے لائی گئی ہیں۔ فرمایا:۔

(۱۰/۳۷-۳۸) وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

واقعہ یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ 'خدا کے سوا' کوئی اور ہستی قرآن جیسا ضابطۂ قوانین مرتب کر سکے۔ اس لئے جھوٹا قرآن بنایا ہی نہیں جا سکتا۔ (ذرا غور کرو کہ اس قرآن کی

تحدّی۔ قرآن کی مثل بنا کر دکھاؤ

خصوصیات کیا ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ (ایک علمی نظام کے ذریعے) یہ اُن تمام اصول و قوانین کو سچ کر دکھانے والا ہے جو اس سے پہلے بذریعہ وحی دیئے جاتے رہے تھے۔ پھر یہ اپنے قوانین کو اس طرح نکھار اور اُبھار کر بیان کرتا ہے کہ ان میں نہ شک و شبہ کی گنجائش رہتی ہے اور نہ ہی کوئی اضطراب اور ذہنی کشمکش! اور یہ قوانین اُس خدا کی طرف سے دیئے گئے ہیں جو تمام کائنات اور عالمگیر انسانیت کی نشو و نما کا ضامن ہے۔ (لہٰذا اس میں نہ کسی خاص قوم سے رعایت برتی گئی ہے اور نہ ہی کسی کی خواہ مخواہ مخالفت کی گئی۔ یہ ضابطۂ انسان اور انسان میں فرق نہیں کرتا) (۳۷)۔

غور کرو کہ یہ لوگ اس قسم کے ضابطۂ حیات کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں' اس رسولؐ کا خود ساختہ ہے۔ ان سے کہو کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ

اس قسم کا ضابطۂ حیات انسان بنا سکتا ہے' تو اس دعوے کو ثابت کرنے کا آسان طریق یہ ہے کہ تم (سارا قرآن نہیں' صرف) اس کی ایک سورت کی مانند بنا کر دکھاؤ' اور اس مقصد کے لئے تم' خدا کو چھوڑ کر' جس جس کو اپنی مدد کے لئے بلا سکتے ہو' بلا لو۔ (اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو اس چیلنج کو قبول کرو۔ ۲/۲۳؛ ۱۱/۱۳؛ ۱۷/۸۸)۔ (۳۸)

قرآن کریم کا یہ چیلنج کہ' تم اس کی مثال بنا کر دکھاؤ' پہلے بھی گزر چکا ہے ــــ اور اس کے متعلق تفصیلی بحث' مطالب الفرقان' جلد اول (صفحات ۳۱۴ ـ الآخر) میں آچکی ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ قرآن کریم سمجھنے کا طریق کیا ہے؟

(۱۰/۳۹) بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ○

(بات یہ نہیں کہ یہ لوگ' علم و بصیرت کے بعد' اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآن منجانب اللہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ قرآن کی صداقت کو سمجھنے اور پرکھنے کا جو صحیح طریقہ ہے' یہ اُسے اختیار ہی نہیں کرتے۔ قرآن کے سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ:

(i) انسان کی علمی سطح اتنی بلند ہو کہ اس کے حقائق کا احاطہ کر سکے۔ یا

(ii) قرآن ایک عملی نظام پیش کرتا ہے جس کے محسوس نتائج اس کے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بنتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان اس کا انتظار کرے کہ وہ نظام متشکل ہو اور اس کے نتائج سامنے آجائیں۔

(iii) اور اگر کوئی یہ بھی نہیں کرنا چاہتا تو کم از کم تاریخی شواہد کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس سے پہلے جن قوموں نے ان اصولوں کو جھٹلایا تھا اور ان سے سرکشی اختیار کی تھی' ان کا انجام کیا ہوا۔ اب ان لوگوں کی نہ تو علمی سطح اتنی بلند ہے' نہ ہی یہ اسے بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں' نہ ہی انتظار کرتے ہیں کہ اس نظام کے نتائج سامنے آجائیں

تو اُن سے اندازہ لگایا جاسکے۔ بس یونہی اسے جھٹلائے جاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں دیکھتے
کہ جن لوگوں نے ان سے پہلے ایسی روش اختیار کی تھی ان کا انجام کیا ہوا تھا۔ (۲۷/۸۴؛
۱۰/۴۱؛ ۷/۵۳؛ ۴۱/۵۳؛ ۱۰/۱۰۲)۔

یہ موضوع اس سے پہلے بھی زیرِ نظر آچکا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے مطالب الفرقان جلد دوم صفحہ ۱۴۸۔
قرآن پر صحیح معنوں میں ایمان بھی وہی لوگ لا سکتے ہیں جو اسے اس طریق سے سمجھیں۔ اس وقت دنیا میں
قرآنی نظام تو کہیں بھی نافذ نہیں کہ اس کے زندگی بخش نتائج سے قرآنی دعاوی کی صداقت کو پرکھا جا سکے۔
یہ ہماری حرماں نصیبی ہے۔ بنابریں ہمارے لئے دوسرے دو طریق ہی قابلِ غور ہو سکتے ہیں (میں نے اپنی بصیرت
اور استعداد کے مطابق انہی طریقوں سے افہام و تفہیمِ قرآن کی کوشش کی ہے)۔ اس طریق سے قرآن
سمجھا بھی جاسکتا ہے اور سمجھایا بھی جاسکتا۔

(۱۰/۴۰) وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝

اگر انہوں نے قرآنی حقائق کے پرکھنے کا یہ طریق اختیار کر لیا، تو ان میں سے کچھ لوگ ضرور
اس پر ایمان لے آئیں گے۔ لیکن جن لوگوں کی نیت میں فتور ہے اور ان کا منشا ہی فساد
برپا کرنا ہے، تو ایسے لوگ کبھی ایمان نہیں لانے کے۔ خدا خوب جانتا ہے کہ ایسے لوگ
کون سے ہیں۔

(۱۰/۴۱) وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْۗـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

اس کے بعد اگر یہ لوگ تجھے جھٹلاتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ تم یونہی دھمکیاں دیتے ہو
کہ ہماری روش کا نتیجہ تباہ کن ہوگا اور تمہارا نظام کامیاب ہو کر رہے گا) تو ان سے

کہہ دو کہ (میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا) تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ اور مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ تمہارے پروگرام کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ میں اس سے بری الذمہ ہوں گا۔ میرے پروگرام کا نتیجہ میرے سامنے آجائے گا۔ اس کی کچھ ذمہ داری تمہارے سر نہیں ہوگی۔ بات صاف ہو جاتے گی (۱۰/۱-۶۰۹)۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، الدین ایک عملی پروگرام کا نام ہے۔ اس کی رُو سے ایک نظام قائم کیا جاتا ہے جس کے درخشندہ نتائج اس کی صداقت کا ثبوت بنتے ہیں۔ حضورؐ اس نظام کے لئے کوشاں تھے اور مخالفین اس کی مزاحمت کرتے تھے۔ آپؐ نے ان سے کہا کہ اگر تم نظری دلائل و براہین کی رُو سے بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرنا چاہتے تو پھر فیصلہ کن حقیقت تک پہنچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ میں جس پروگرام پر عمل پیرا ہوں تم اس میں دخل نہ دو۔ میں تمہارے پروگرام میں مداخلت نہیں کروں گا۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کس کا دعویٰ حق و صداقت پر مبنی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے دعویٰ کی صداقت کے پرکھنے کا یہی حتمی اور مؤثر طریق ہے۔ آج اسلام کی

دعویٰ کی صداقت کا ثبوت۔ نتائج

تبلیغ کے لئے جس قدر کوششیں کی جاتی ہیں ان کے ناکام رہنے کی ایک ہی وجہ ہے۔

جب آپ غیر مسلم اقوام سے کہتے ہیں کہ اسلام میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل پیش کر سکے، تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اگر اسلام میں واقعی یہ صلاحیت ہے تو پھر تمہاری اپنی حالت اس قدر زبوں و خوار کیوں ہے؟ پہلے تم اپنی حالت کو سنوار دو۔ اس کے بعد اسلام کی حقانیت کی بات کرلینا۔

ان کا اعتراض بالکل بجا ہے۔ ڈاکٹر خود جس مرض میں مبتلا ہو، وہ اس مرض کے بیماروں سے کس طرح کہہ سکتا ہے کہ میں تمہارا حتمی علاج کر سکتا ہوں یعنی وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اگر ایسا ہی ہے تو پہلے اپنا علاج کیجئے، پھر ہم سے کہیئے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ جب تم اپنا علاج کرکے اچھے ہو جاؤ گے، تو پھر تمہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی کہ میں تمہارا علاج کر سکتا ہوں۔ مریض جُوق در جُوق آپ کی طرف کشاں کشاں آئیں گے۔ صدرِ اوّل میں اسلام پھیلا ہی اس طرح تھا۔ امتِ مسلمہ نے اسلامی نظام قائم کیا، دنیا نے اس کے انسانیت ساز نتائج دیکھے اور لوگ (قرآن کے الفاظ میں) فوج در فوج اس کی طرف کھچے چلے آئے (۱۱۰/۲)۔ گداگری کا کشکول ہاتھ میں لیکر لوگوں سے کہنا کہ ہمارے پاس ایسا نسخہ کیمیا ہے جو پتھر کو سونا بنا دیتا ہے،

اپنا مذاق اڑاتا نہیں تو اور کیا ہے؟ فطری دلائل تو ایک طرف، لوگ جنت کے وعدوں پر بھی اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

اسی دنیا میں نتائج

جب حضورؐ نے اپنی دعوت پیش کی تو ایک دن قبیلہ بنی عامر کا ایک بوڑھا معزز سردار اپنا عصا ٹیکتے، حضورؐ کی خدمت میں آیا اور آپ کی دعوت کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ اسی سلسلہ میں اس نے کہا کہ لکل قول حقیقۃ وما حقیقۃ لك — ہر دعوے کا کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے۔ آپ کے دعوے کی صداقت کا ثبوت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ اور اپنے بھائی عیسٰیؑ کی ذمہ داریوں، بشارتوں اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں۔ عامری نے یہ سن کر کہا کہ اگر میں ان ذمہ داریوں کو پورا کردوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا جنت کے باغات۔ اس نے کہا کہ یہ تو آخرت کی بات ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے مجھے اس دنیا میں کیا حاصل ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: نعم النصر والتمکین فی البلاد — "خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت۔" (شاہکارِ رسالت صـ۱۴۷ ایڈیشن چہارم (بلاترمیم) ۱۹۸۷ء)

یہ تھا اس نظام کا دعوے جسے اس نے عملاً پورا کر کے دکھلا دیا، اور یہی چیز اسلام کے فروغ کا باعث بنی۔ اسی کی طرف حضورؐ نے اشارہ کیا تھا جب مخالفین سے کہا تھا کہ مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اس نظام کو قائم کر سکوں۔ اس کے بعد تمہارے اس سوال کا جواب خود بخود مل جائے گا کہ میرے دعوے کی صداقت کا ثبوت کیا ہے۔ اس حقیقت کو دیگر متعدد مقامات پر بھی دہرایا گیا ہے۔ مثلاً (۱۱/۹۳؛ ۱۱/۱۲۱؛ ۳۹/۳۹)۔ مطالب الفرقان، جلد پنجم (صـ۱۲۷) میں اس پر گفتگو بھی کی گئی ہے۔ پاکستان کا خطۂ زمین، اسلام کے اس دعوے کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن ہماری سوختہ سامانی کہ ہم نے یہاں جو روش اختیار کی، اس سے اسلام کا رہا سہا بھرم بھی مٹ گیا۔ ہم نے دین کے نظام کی جگہ تھیاکریسی کا اقتدار بڑھایا اور نام اس کا رکھا، اسلام کا احیاء۔ اس سے اسلام دنیا میں اضحوکہ بن گیا۔ وائے من! وائے من!!

ان سے کہا گیا کہ تم اسلامی نظام کے قیام اور اس کی خوشگوار ثمرباری تک کا انتظار نہیں کرنا چاہتے تو دلائل و براہین کی رو سے قرآن کریم کے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس کے لئے وہ حضورؐ کی مجلس میں آکر بیٹھ

تو جاتے، لیکن بایں نمط کہ :

۱۰/۴۲ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ تمہارے پاس آکر بیٹھتے ہیں تو اس طرح، گویا تمہاری باتیں بہت غور سے سُن رہے ہیں، حالانکہ وہ محض سُن ہی رہے ہوتے ہیں (ان کا خیال کہیں اور ہوتا ہے . ۴۷/۱۶). تم سوچو کہ تم ایسے بہروں کو کس طرح سنا سکتے ہو جو عقل اور فکر سے کام ہی نہ لیں ؟ لہٰذا قرآنی الفاظ کا بلا سمجھے دہراتے رہنا یا سنتے رہنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا).

یہ نکتہ بڑا اہم ہے اور ہمارے لئے نہایت عبرت آموز. کہا یہ گیا ہے کہ وہ قرآن کو سنتے تھے، لیکن اسے عقل و فکر کی رُو سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے.

سوچئے کہ کیا ہمارے ہاں بھی قرآنِ کریم کے ساتھ یہی کچھ نہیں ہو رہا؟ جس قدر ہم قرآن کو سنتے ہیں، وہ تو اس قدر سنتے ہی نہیں ہوں گے. علاوہ روزمرّہ کی زندگی کے، ہم روزوں میں، ایک ماہ میں پورا قرآن سنتے ہیں. ایک ماہ میں ایک نہیں، ایک ایک رات میں سیکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں سنانے والے اور لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں سننے والے، لیکن دونوں ـــ لَا يَعْقِلُوْنَ کے مجسمے. نہ سنانے والے کو علم کہ جو کچھ میں سُنا رہا ہوں، اس کا مطلب کیا ہے، نہ سننے والوں کو معلوم کہ جو کچھ ہم سن رہے ہیں، اس کے معنی کیا ہیں؟

بلا سمجھے قرآن سُننا

جب ہمارا قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات پر سے گذر ہوتا ہے تو ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے ہیں کہ ان کا تعلق زمانۂ رسالت کے کفار سے ہے، ہم سے نہیں. ہم نہ کبھی سوچتے ہیں نہ مذہبی پیشوایانِ قوم کو یہ سوچنے دیتی ہے کہ ان کا اطلاق ہم پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح زمانۂ رسالتمآبؐ کے کفار پر ہوتا ہے. ہماری تو بلکہ ان سے بھی ابتر حالت ہے. اُن کی زبان عربی تھی، اس لئے وہ کچھ نہ کچھ تو سمجھ ہی لیتے ہوں گے. ہم تو اتنا بھی نہیں کر سکتے ـــ یہ تو رہی سننے والوں کی حالت. دیکھنے والوں کی کیفیت اس سے بھی زیادہ تاسف انگیز تھی.

(۱۰/۴۳) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۚ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ○

اور وہ بھی ہیں جو تمہاری مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں اور تمہاری طرف تکتے رہتے ہیں گویا وہ ہمہ تن توجہ ہیں؛ لیکن وہ صرف تک ہی رہے ہوتے ہیں، دھیان اُن کا کبھی کہیں اور ہوتا ہے (۱۹۸/ ۷)۔ سوچو کہ تم ایسے اندھوں کو کس طرح راستہ دکھا سکتے ہو جو عقل بصیرت سے کام نہ لیں؟

نظر اور بصر | نظر اور بصر کا فرق مطالب الفرقان، جلد اوّل صفحہ ۱۶۸ پر بتایا جا چکا ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے تاکہ اس سے بصیرت حاصل ہو۔ علاوہ ازیں اس جلد میں آیت (۱۹۸/ ۷) کے تحت بھی یہ موضوع آچکا ہے۔

یہ لوگ اس فریبِ نفس میں مبتلا ہیں کہ وہ اس دلیل کی بنا پر قانونِ مکافات کی گرفت سے بچ جائیں گے کہ وہ جماعتِ مومنین کے ساتھ رسول اللہ کی مجالس میں بیٹھا کرتے اور قرآن "سنا کرتے تھے"۔ قرآن نے اس خود فریبی کو "اپنے آپ پر ظلم" کہہ کر پکارا ہے۔

(۱۰/۴۴) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○

(حالت ان کی یہ ہے، لیکن جب یہ تباہی اور بربادی کے عذاب میں گرفتار ہوں گے تو کہیں گے کہ ہم پر یہ ظلم کیوں؟ ہم تو اس جماعت کے ساتھ تھے؛ ان کی محفلوں میں بیٹھتے تھے اور ان کی باتیں سنا کرتے تھے) یقین رکھو! خدا کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا۔ لوگ خود، اپنے آپ پر زیادتی کرتے ہیں (اور اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں)۔

ہم اس حقیقت کو واضح کرتے چلے آرہے ہیں کہ قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے اعمال کے نتائج کی نمود (در ظہور) آخرت کی زندگی میں تو ہوگا ہی، لیکن اس دنیا میں بھی ان کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم نے قیامت، حشر اور میزان وغیرہ کے متعلق بیشتر مقامات پر لکھا ہے کہ ان کا تعلق اُخروی زندگی اور

اس زندگی، دونوں سے ہے۔ حیاتِ اُخروی (قیامت وغیرہ) سے متعلق تفصیلی گفتگو تو قرآنِ کریم کے آخری پاروں میں کی جائے گی۔ لیکن اس سے پہلے بھی جن آیات میں ان کا تعلق اس دنیا کی زندگی سے مُتبادر ہوتا ہے، وہاں ہم نے اسی نہج سے مفہوم متعین کیا ہے۔ مثلاً اگلی آیت کا تعلق حیاتِ اُخروی سے بھی ہو سکتا ہے اور دنیاوی زندگی سے بھی۔ اس سیاق و سباق سے مترشح ہوتا ہے کہ اگر اس کا مفہوم اس دنیا سے متعلق سمجھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ، بہرحال، ترجیحات کا سوال ہے۔ آپ چاہیں تو اسے اُخروی زندگی سے بھی متعلق سمجھ سکتے ہیں۔ سابقہ آیات میں مخالفین کی سازشوں، ریشہ دوانیوں اور فریب کاریوں کا ذکر تھا۔ آیت (۱۰/۴۶) میں ان کے تخریبی اعمال کے نتائج کو اسی دنیا سے متعلق بتایا گیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان آیت (۱۰/۴۵) آتی ہے:

(۱۰/۴۵) وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوٓا۟ إِلَّا سَاعَةً مِّنَ ٱلنَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ خَسِرَ ٱلَّذِينَ كَذَّبُوا۟ بِلِقَآءِ ٱللَّهِ وَمَا كَانُوا۟ مُهْتَدِينَ ○

جس وقت اللہ انہیں (میدانِ جنگ میں) اکٹھا کرے گا (تاکہ یہ اپنی غلط روش کا نتیجہ اپنے سامنے دیکھ لیں تو) اس وقت انہیں احساس ہوگا کہ یہ تمام مدت، جس میں وہ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں بدمست رہے، اتنی سی تھی جیسے دن میں ایک گھڑی۔ اُس دن، آمنے سامنے کے لشکر ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ اور جو لوگ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ انہیں کبھی قانونِ خداوندی کا سامنا کرنا ہوگا، اُس وقت سخت نقصان میں رہیں گے۔ اس لئے کہ انہوں نے صحیح راستہ اختیار نہیں کیا تھا[1] (۲۰/۱۰۳)

حضور نبیِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کو ایک داعیٔ انقلاب کی زندگی کی جہت سے سامنے لائیے۔ دعویٰ

---

[1] اس کیفیت کا تعلق مرنے کے بعد کی زندگی سے بھی ہو سکتا ہے، لیکن ہم نے، اس کے بعد کی آیات کے پیشِ نظر، اس مفہوم کو ترجیح دی ہے۔

نبوّت سے پہلے، آپ نہایت امن وسکون اور عزت واکرام کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ دعویٰ کیا تو وہی معاشرہ اس طرح مخالف ہوگیا کہ حضورؐ پہ جینا محال کر دیا۔ چاروں طرف سے مخالفتوں کا ہجوم۔ ہر طرح کے تصادمات، تزاحمات، مصائب ونوائب، پریشانیاں اور دشواریاں۔ نہ دن کا چین، نہ رات کا آرام۔ اِدھر ذمہ داریوں کا بارِ گراں اُدھر بے سروسامانی۔ اس انداز کی چند دنوں کی زندگی ہی کچھ کم ہمت شکن اور حوصلہ فرسا نہیں ہوتی، چہ جائیکہ حضورؐ کو مکہ میں تیرہ سال اسی کشمکش میں گزارنے پڑے۔ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو پیہم لڑائیوں اور جنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ الدّین (نظامِ خداوندی) کی اقامت گاہ کا جو وعدہ خدا نے کیا تھا، اس کے پورا ہونے کے آثار تک دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ان حالات میں حضورؐ کے دل میں اس قسم کے احساس کا پیدا ہونا عین فطری تھا کہ بارِ الٰہا! جس نظام کے قیام کے لئے میں یہ جدّوجہد کر رہا ہوں،

کیا میں بھی دیکھ سکوں گا؟

کیا اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ سکوں گا یا میری تمام زندگی مخالفتوں کے اس ہجوم میں گزر جائے گی؟ انسانی سطح پر سوچا جائے تو خدا کی طرف سے اس استدعا کا اس قسم کا تسلی بخش جواب ہونا چاہیئے تھا کہ گھبرائیے نہیں، یہ سب کچھ آپ کے سامنے ہو جائے گا۔ لیکن وہاں واسطہ اُس خدا کے ساتھ تھا جس نے قانون کی پابندیاں خود اپنے اوپر بھی عائد کر رکھی ہیں۔ اس کی طرف سے اس قسم کے "جذباتی" جواب کی توقع کس طرح کی جا سکتی تھی؟ ارشاد ہوا؛

(۱۰/۴۶) وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ۝

(تمہارے دل میں، اے رسول! یہ خیال پیدا ہوگا کہ فریقین میں یہ فیصلہ کن گھڑی کب آئے گی، تو) ہو سکتا ہے کہ جن تباہیوں کی بابت ہم انہیں متنبہ کر رہے ہیں، ان میں سے کچھ تمہاری زندگی میں سامنے آجائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے ظہور سے پہلے ہی تمہارا وقت پورا ہو جائے (اس لئے کہ اس کا تعلق ہمارے قانونِ مکافات اور

قانونِ مہلت سے ہے، کسی فرد کی عمر سے اس کا تعلق نہیں) لیکن اس کا یقین رکھو
کہ زُود یا بدیر ان سب کو لوٹ کر ہمارے قانونِ مکافات کے سامنے ضرور آنا ہے
— اُس قانون کے سامنے جو ان کے ہر عمل کو اپنی نگاہ میں رکھے ہوتے ہے —
یہ اس سے بچ نہیں سکتے۔ (۱۳/۴۰؛ ۲۳/۹۵؛ ۴۳/۴۲)۔

دوسری جگہ اس کا اضافہ کر دیا کہ: فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰)
—"تمہارا کام اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ کار رہنا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قوانینِ مکافات کے مطابق اس کا نتیجہ کب سامنے آئے گا۔

آپ غور فرمائیے کہ ایک انقلابی کی زندگی کس قدر جہدِ مسلسل کی زندگی ہوتی ہے جس میں یہ بھی یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ اس جدوجہد کا آخری نتیجہ کب مرتب ہوگا۔ اپنے مشن کی صداقت پر یقین کامل ہوتا ہے جو اُسے اس خارا شگافی اور کوہ کنی میں ہمت ہارنے نہیں دیتا۔ اگر اس یقین میں ذرا سا بھی تزلزل آجائے تو وہیں تیشہ رکھ کر بیٹھ جاتے۔ ویسے اس والہانہ سعیٔ پیہم میں بھی جس میں یہ معلوم نہ ہو کہ

انقلابی کی زندگی

منزل کب سامنے آئے گی (اقبالؒ کے الفاظ میں) — ایسا کیف و سرور ہوتا ہے جو جادہ و منزل کی تمیز اٹھا دیتا ہے؛

تپیدن و نہ رسیدن چہ عالمے دارد　　　خوشا کسے کہ بہ دُنبالِ محمل است ہنوز

ویسے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اے محمدؐ! آپ کا کام مصروفِ عمل رہنا ہے، یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مہلت کی رُو سے اس کا نتیجہ کب نکلے گا، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم میں اس کی قدرت نہیں کہ اس کا نتیجہ آپ کی زندگی ہی میں نمودار ہو جائے۔ وَاِنَّا عَلٰۤى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ۝ (۲۳/۹۵) اس قدرت کے باوجود، ہم اپنے قانون میں استثناء یا لچک پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ سورۂ زخرف میں اس حقیقت کو دہرانے کے بعد کہا؛ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۴۳/۴۳)" تم وحیٔ خداوندی کے ساتھ متمسک رہو۔ اس کے مطابق جادہ پیما رہو۔ یہ حقیقت ہے کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو، یہ سیدھا منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔ لہٰذا، تم اس سے اِدھر اُدھر نہ ہو۔"

اور مخالفین کا یہ انجام خود حضورؐ کی زندگی ہی میں سامنے آگیا۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے ایک انقلابی کی زندگی!

اگلی آیت میں اسی مسئلہ کی تشریح کردی۔ سب سے پہلے یہ کہا کہ یہ کوئی نیا قاعدہ نہیں جسے اِس قوم یا اِس رسولؐ کے ضمن میں اختیار کیا گیا ہے۔ شروع سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے ـــــ

(۱۰/۴۷) وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○

ہمارے قانونِ مکافات کا یہ انداز شروع سے چلا آرہا ہے کہ ہر قوم کی طرف ہمارا پیغامبر آتا ہے اور اس کے آنے پر تمام معاملات کا فیصلہ، عدل و انصاف کی رُو سے کردیا جاتا ہے اور اُن پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوتی۔

پہلے یہ بتایا کہ رسول کی وساطت سے احکامِ خداوندی کا ابلاغ، کوئی نیا پروگرام نہیں۔ دنیا کی ہر قوم کی طرف رسول آتے رہے ہیں۔

قرآنِ کریم میں جن رسولوں کا ذکر آتا ہے وہ وہی ہیں جو ان اقوام کی طرف مبعوث ہوتے تھے جو بابل نینوا یا شام و فلسطین کے علاقوں میں آباد تھیں۔ اُن اقوام اور اُن کی طرف مبعوث انبیاء کرامؑ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ قرآن کی اوّلین مخاطب قوم (عرب) ان اقوام سے بھی واقف تھی اور ان کی طرف بھیجے گئے رسولوں سے بھی متعارف۔ اس لئے جب ان کے سامنے ان اقوام اور رسولوں کا ذکر آیا تو انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ یہ کون لوگ تھے، کہاں کے رہنے والے تھے ہم کیسے مان لیں کہ ان کا وہی حشر ہوا تھا جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔ انہوں نے ان سوالات کو موضوعِ بحث نہیں بنایا۔ اگر ان سے کہا جاتا کہ چین میں جس قوم میں کنفیوشس پیدا ہوا تھا، تم جانتے ہو انہوں نے کیا کیا اور ان کا انجام کیا ہوا۔ تو بحث اس محور کے گرد گردش کرتی رہتی کہ چین کونسا ملک ہے۔ کنفیوشس کون تھا۔ اس کی قوم نے کیا کیا تھا۔ ان کا حشر کیا ہوا تھا۔ حضورؐ کا سارا وقت انہی سوالات کے جواب میں صرف ہوجاتا۔ اور پھر بھی کوئی مانتا اور کوئی نہ مانتا اور تبلیغ و رسالت کا موقع ہی نہ آتا۔ اس کے لئے بہت تھوڑا وقت بچتا۔ قرآن نے متعیّن طور پر ذکر انہی اقوام اور انہی انبیاء کا کیا جن سے وہ لوگ پہلے واقف تھے۔ اور اس کے ساتھ اس کی وضاحت

سامی النسل اقوام ہی کا ذکر

کردی کہ اس قسم کے رسولؐ دنیا کی ہر قوم کی طرف آتے رہے ہیں (۱۳/۷)۔ ان میں سے بعض کا ذکر قرآن میں آگیا ہے۔ باقیوں کا ذکر نہیں کیا گیا (۴۰/۷۸)۔ (اس سلسلہ میں) مطالب الفرقان جلد چہارم (ص ۴۴۴-۴۴۰) کی تشریحات بھی دیکھئے جن سے اس امر کی مزید وضاحت ہو جائے گی کہ کسی قوم پر تباہی نہیں آتی جب تک اسے پہلے وارننگ نہ دے دی جاتے اور اس میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو۔

یہ تھا خدا کا قانون، لیکن مخالفین رسولؐ سے بار بار پوچھتے تھے کہ ہماری جس تباہی کی تم اس شد و مد سے وارننگ دیتے ہو، وہ کب آئے گی؟

(۱۰/۴۸) وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

خود یہ لوگ بھی تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر تم اپنی باتوں میں سچے ہو تو بتاؤ کہ وہ تباہی جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے رہتے ہو، کب آئے گی؟

ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ کے دل میں جو خیال اُبھرا تھا (کہ اس مہم کا نتیجہ آپ کی زندگی میں بر آور ہوگا یا نہیں) تو اس کے محرک، مخالفین کے اس قسم کے استفسارات بھی ہوں۔ ان سوالات کا جواب وہی تھا کہ یہ میرے اختیار کی بات نہیں۔ یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے:

(۱۰/۴۹) قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○

ان سے کہو کہ (اس تباہی کا لے آنا میرے اختیار کی بات نہیں۔ وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق واقع ہوگی۔ میری حالت تو یہ ہے کہ) میں خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہ بھی خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس قانون کے مطابق ہر قوم کے اعمال کے ظہورِ نتائج کی ایک میعاد ہوتی ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر وہ نہ ایک ثانیہ پیچھے

رہ سکتی ہے نہ آگے بڑھ سکتی ہے (۴۰ - ۳۸/۱۳ ; ۴۳/۲۳)۔

نفع نقصان کی قدرت

اس میں دو اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں — ایک یہ کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اپنی ذات کے لئے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں۔ نفع اور نقصان کی اصولی بحث مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۴۶ پر آچکی ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ جلد میں آیت (۷/۱۸۸) کے تحت بھی وضاحت کی گئی ہے جہاں یہی الفاظ آتے ہیں۔ آیت (۱۰/۱۸) میں بتایا جا چکا ہے کہ نفع یا نقصان کا تعلق قوانینِ خداوندی سے ہے۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ قوموں کی موت وحیات کے لئے قوانین مقرر ہیں۔ اور جب کسی قوم کی تباہی کا وقت آتا ہے تو اس میں تاخیر و تقدیم نہیں ہوسکتی۔ قوموں کے عروج و زوال اور موت و

قوموں کی موت وحیات

حیات کے متعلق سابقہ جلدوں میں بڑی کثرت سے لکھا جا چکا ہے (انڈکس کی مدد سے ان تمام مقامات کو دیکھا جا سکتا ہے)۔ قوموں کی اجل کے متعلق بالخصوص مطالب الفرقان جلد چہارم (صفحہ ۲۵۲) میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے اور جلد پنجم (صفحہ ۱۸۹) میں بھی جہاں یہ آیت بھی درج ہے۔

اس کے بعد اس تباہی کا ذکر ہے جسے عذاب کہہ کر پکارا گیا ہے؛

(۱۰ / ۵۰-۵۲) قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ○ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ○

ان سے کہو کہ (اس بات کو چھوڑو کہ تمہاری تباہی کا وقت کب آئے گا۔ مجھے یہ بتاؤ

کہ) اگر اس کا عذاب تم پر رات کے وقت آجائے یا دن کے وقت تمہیں گھیر لے (تو تمہارے پاس اس سے بچنے کی کیا صورت ہے؟ جب حالت یہ ہے کہ ان کے پاس اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تو پھر) وہ کیا بات ہے جس کے لئے 'یہ مجرمین' اس قدر جلدی مچا رہے ہیں؟

(کیا اس وقت انہوں نے، اس سے حفاظت کی کوئی تدبیر سوچ رکھی ہے جو بعد میں بے کار ہو جائے گی؟) (۵۰)۔

یا تم اس کا انتظار کر رہے ہو کہ وہ تباہی تمہارے سامنے آجائے تو اسے دیکھ کر تم ایمان لاؤ! (لیکن اُس وقت ایمان لانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اُس وقت تو تم سے صرف اتنا کہا جائے گا کہ) یہی وہ تباہی ہے جس کے لئے تم اتنی جلدی مچایا کرتے تھے۔ (اُس وقت تمہارے ایمان لانے سے وہ تباہی ٹل نہیں جائے گی۔ اس لئے کہ جب اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آجاتا ہے تو پھر وہ نتائج پیچھے نہیں لوٹا کرتے)۔ (۵۱)۔

اُس وقت ان لوگوں سے، جو ظلم و زیادتی کیا کرتے تھے، کہا جائے گا کہ اب اس ہمیشہ رہنے والے عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ سب تمہارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے (۵۲)۔

دُنیا میں تباہی

آیت (۱۰/۴۴) کے تحت لکھا جا چکا ہے کہ اعمالِ انسانی کے ظہورِ نتائج کا تعلق بیشک اُخروی زندگی سے ہے، لیکن یہ تباہی اِس دنیا میں بھی آجاتی ہے، بالخصوص قوموں کی ہلاکت اور تباہی۔ زیرِ نظر آیات ہی دیکھئے۔ کہا گیا ہے کہ تم پر یہ عذاب "دن کے وقت بھی آسکتا ہے اور رات کے وقت بھی"۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس سے دنیاوی زندگی میں عذاب (تباہی) ہی مقصود ہے۔ پھر آیت نمبر ۵۱ میں ان کے ایمان لانے کا ذکر ہے۔ یہ اِس زندگی سے متعلق ہے۔ اگلی آیت (۱۰/۵۲) میں اسے "عذاب الخلد" کہا گیا ہے، یعنی ابدی تباہی۔ اس سے قوم کی وہ تباہی مراد ہے جس کے بعد وہ زندہ نہیں ہو سکتی، یعنی ایسا زوال جس کے بعد عروج نہیں۔

اگلی آیت میں کہا گیا ہے کہ جو کچھ ان سے کہا جا رہا ہے، وہ مبنی بر حقیقت ہے، یونہی ڈراوا نہیں۔

۱۰/۵۳ وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ۝

یہ لوگ، تجھ سے (بار بار) پوچھتے ہیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، کیا یہ واقعی سچ ہے؟ ان سے کہو کہ ہاں! میرا خدا اس پر شاہد ہے کہ یہ بالکل سچ ہے۔ یہ واقع ہو کر رہے گا۔ تم قانونِ خداوندی کو بے بس نہیں کر سکتے کہ جو کچھ اس کی رُو سے ہونا ہے، وہ نہ ہو سکے۔

اس تباہی کی ہمہ گیری کی یہ کیفیت ہوگی،

۱۰/۵۴ وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهِ ۗ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوُا الْعَذَابَ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ ۚ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝

پھر یہی نہیں کہ اس تباہی کا آنا یقینی ہے۔ وہ محکم گیر ایسی ہے کہ جس ظالم اور سرکش پر وہ آئے اگر وہ چاہے کہ تمام دنیا کی دولت دے کر بھی اس سے چھٹکارا حاصل کر لے، تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ایسے لوگ جب اس تباہی کو دیکھیں گے تو اپنی ندامت کو چھپانے کی کوشش کریں گے۔ بہرحال، ان کے معاملہ کا فیصلہ بالکل حق و انصاف سے کیا جائے گا اور ان پر ذرا بھی زیادتی نہیں ہوگی۔

یہ اس لئے کہ یہ سب خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوگا جو اٹل ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کے راستے میں روک بن کر کھڑی نہیں ہو سکتی۔

۱۰/۵۵ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

(یہ لوگ خدا کے قانونِ مکافات کو بے بس کس طرح کر سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ،)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب پر اقتدار و اختیار خدا ہی کا ہے۔
اس لئے جس بات کے متعلق خدا نے کہہ دیا کہ وہ ایسے ہوگی' وہ ایسے ہو کر رہے گی (۲۵/۱۶)
لیکن اکثر لوگ علم و بصیرت سے کام نہیں لیتے (اور اس خیال میں مگن رہتے ہیں کہ انہیں
کوئی پوچھنے والا ہی نہیں)۔

آیت میں کہا گیا ہے: اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (خدا کا وعدہ حق ہے)۔ وَعْدَ کے معنی خدا کا قانون ہے جو محکم اور اٹل ہے جس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا۔ اس مضمون کی آیات مختلف مقامات پر آئی ہیں۔ یہ بتانے کے لئے کہ خدا کے وعدے اٹل ہیں، سورۃ فرقان میں ایک ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے کہ جوں جوں نگاہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے' روح وجد میں آجاتی ہے۔۔ فرمایا: كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا (۲۵/۱۶)

خدا کے وعدے

خدا کا وعدہ پکا اور محکم ہے، جو ہر حال میں پورا ہو کر رہے گا۔ (اگر بفرضِ محال یہ پورا نہ ہوا تو تمہیں حق حاصل ہوگا کہ پوچھ سکو کہ ایسا کیوں نہیں ہوا!

تم خدا سے پوچھ سکتے ہو کہ جیسا تم نے کہا تھا، ویسا کیوں نہیں ہوا!۔

اللہ اکبر! کیا عدیم النظیر تصور ہے خدا کا اور کتنا بلند مقام ہے انسان کا جسے خدا نے عطا کیا ہے۔
اس کا وعدہ ـــ یعنی وہ قانون کہ زندگی اور موت کی ڈور جس کے ساتھ بندھی ہوتی ہے؛

(۱۰/۵۶) هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

وہ قانونِ مکافات کہ (افراد تو ایک طرف' اقوام تک کی) زندگی اور موت جیسا انقلابِ عظیم بھی اس کے مطابق واقع ہوتا ہے اور تمہارے اعمال بھی اسی کی طرف لوٹ کر آتے ہیں ـــ اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر جا ہی نہیں سکتے (سوچو کہ وہ قانونِ خداوندی کس قدر لا انتہا قوتوں کا مالک ہے)۔

خدا کا وہ قانون آخری مرتبہ اپنی مکمل' غیر متبدل شکل میں قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا؛
وہ قرآن جس کی کیفیت یہ ہے:

(۱۰/۵۷) يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○

وہی قانون ہے جو آب، اے نوعِ انسان! تمہارے نشو و نما دینے والے کی طرف سے، اس ضابطۂ ہدایت کی شکل میں تمہارے پاس آگیا ہے۔ اِس میں ہر اُس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دل کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ جو ہر اس قوم کی جو اسے اپنا ضابطۂ حیات تسلیم کرلیتی ہے، کامیابی کی راہ کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے اور انہیں سامانِ نشو و نما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

قرآنِ کریم تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ زندگی ہے۔ ان میں سے جو لوگ اس کی صداقتوں پر ایمان لے آئیں وہ ان کی راہنمائی، انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف کر دیتا ہے اور انہیں سامانِ نشو و نما مرحمت فرما دیتا ہے۔ اس ضابطہ کی رفعت و عظمت کا یہ عالم ہے کہ اسے دیکھ کر خود اس کا عطا کرنے والا "جھوم جھوم کر" کہتا ہے:

(۱۰/۵۸) قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○

ان سے کہو کہ اس قسم کے ضابطۂ ہدایت کا مل جانا خدا کے فضل و رحمت سے ہے۔ تم کسی قیمت پر بھی اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا، تمہیں چاہیئے کہ تم اس کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ ہر اُس شے سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے رہتے ہو یعنی زندگی کی ہر متاع سے زیادہ گراں بہا اور عزیز تر۔ (۱۳/۳۶)۔

دنیا کی ہر قوم نے سال میں کچھ دن ایسے مقرر کر رکھے ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے قومی تہواروں کے طور پر مناتی ہے۔ اُمتِ مسلمہ دنیا میں آئی تو اس کے ذمے عالمگیر آسمانی انقلاب برپا کرنے کا پروگرام

جشنِ نزولِ قرآن

تھا جس میں اسے تہوار منانے کی فرصت ہی نہیں مل سکتی تھی۔ بایں ہمہ ایک تقریب ایسی تھی جسے بطور تہوار منانے کے لئے خود ان کے خدا نے حکم دیا اور وہ ہے نزولِ قرآن کی تقریب۔ نزولِ قرآن کا آغاز رمضان کے مہینے میں ہوا تھا (۲/۱۸۵)۔ اس عظیم القدر واقعہ کی یاد میں اس تہوار کے منانے کا حکم دیا گیا۔ اسے عید الفطر کہا جاتا ہے جو درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے۔

ہر چند قرآنی حقائق اور وقائع کے سلسلے میں، میں اپنی ذات کو درمیان میں نہیں لایا کرتا۔ لیکن بعض مقامات ایسے بھی آجاتے ہیں جہاں یہ (خود عائد کردہ پابندی) بلا ساختہ ٹوٹ جاتی ہے۔ عید الفطر کا تہوار شروع ہی سے منایا جاتا چلا آرہا ہے، لیکن اس کی وجہ متعین طور پر بتائی نہیں جاتی۔ یہ سعادت اس ہیچمدان کے حصے میں آئی جس نے اسے "جشنِ نزولِ قرآن" کہہ کر پکارا اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ تعارف اب عام ہو گیا ہے۔

اس امت کے لئے یہ ایک ہی جشن ہے جسے منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے، اور جسے صدرِ اوّل میں جماعتِ مومنین مناتی تھی (۱۲/۳۶)۔ ابھی دنیا قومیتوں کی تنگ ناؤں میں گھری ہوئی ہے۔ جب یہ قرآن کی راہنمائی میں امتِ واحدہ کی صورت میں متشکل ہوئی تو، یہ جشن ساری دنیا میں منایا جائے گا کیونکہ اس کا خطاب النّاس سے ہے۔

زندگی کی ہر متاع سے گراں بہا اور عزیز تر!

خدا نے ایسا ضابطۂ قوانین دیا جو مکمل اور غیر متبدل ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے کہا کہ نہیں، یہ ناتمام ہے۔ اس کی تکمیل ہم کریں گے!

(۱۰/۵۹) قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ○

ان سے پوچھو کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے جو سامان رزق پیدا کیا ہے، تم اس میں سے خود ہی، (اپنے معتقدات کے مطابق) کسی کو حلال

قرار دیتے ہو، کسی کو حرام۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے (کہ تم خود ہی حلال و حرام کے فیصلے کرنے لگ جاؤ؟) حقیقت یہ ہے کہ تم اپنے آپ کچھ فیصلے کر لیتے ہو اور پھر انہیں شریعت کا نام دے کر خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہو۔ یہ بہت بڑا افترا ہے۔ (۶/۱۱۶ ؛ ۵/۱ ؛ ۶۶/۱ ؛ ۷/۳۲ ؛ ۶/۱۴۶)

حرام وحلال حرام وحلال کی تفصیلی بحث کے لئے انڈکس دیکھئے۔
ان لوگوں کے حوصلے کتنے دراز اور جرأتیں کس قدر بیباک ہیں جو خدا کے خلاف کذب وافترا سے بھی نہیں چوکتے!

(۱۰/۶۰) وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

جن لوگوں کی جرأت وبیباکی کا یہ عالم ہے کہ خود ہی کچھ فیصلے کر لیتے ہیں اور پھر انہیں خدا کی طرف منسوب کرکے (دین کے نام سے نافذ کر دیتے ہیں)۔ ان سے پوچھو کہ انہوں نے بالآخر قیامت کے متعلق کیا سمجھ رکھا ہے؟ (کیا ان کا یہ خیال ہے کہ یہ جو جی میں آئے کرتے رہیں، انہیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں؟ کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اُن کی یہ ڈگر ہمیشہ کے لئے قائم رہے گی اور کوئی ایسا انقلاب نہیں آئے گا جس سے ان کی زندگی کا نقشہ بدل جائے؟ اصل یہ ہے کہ ان کی یہ خود فریبی خدا کے قانونِ مہلت کی وجہ سے ہے جس کی رُو سے اعمال کے نتائج ایک وقت کے بعد جا کر برآمد ہوتے ہیں، اس لئے یہ لوگ خیال کر لیتے ہیں کہ مکافاتِ عمل کا کوئی قانون ہی نہیں۔ حالانکہ اگر یہ غور کرتے تو ان پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ مہلت کا قانون) خدا کی طرف سے نوعِ انسان پر خاص فضل ہے (کیونکہ اس سے تباہی آنے سے پہلے، اُس سے بچ جانے کا امکان ہوتا ہے) لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر لوگ اس کی صحیح قدر

نہیں پہچانتے۔

یہ قانونِ مہلت ہے جس کی وجہ سے ان کی جلد گرفت نہیں ہوتی، ورنہ خدا کے قانونِ مکافات کا تو یہ عالم ہے کہ اس کے مواخذہ سے کوئی بھی محفوظ و مامون نہیں رہ سکتا۔

(۱۰/۶۱) وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ○

ہمارے قانونِ مکافات کا تو یہ عالم ہے کہ (اے رسول!) تم جس حال میں بھی ہو، اور قرآن کا کوئی حصہ بھی ان کے سامنے پیش کر رہے ہو، (اے لوگو!) تم جو بھی کام کرو — خواہ تم اس میں اس قدر منہمک ہو کہ تمہیں اس کا احساس تک بھی نہ رہے کہ تم پر کسی کی نگاہ ہے، لیکن ہماری نگاہ تم پر برابر ہوتی ہے۔ زمین و آسمان میں ایک ذرّہ برابر بھی کوئی شے نہیں جو تیرے نشوونما دینے والے کی نگاہوں سے چھپی رہے — ذرّہ کے برابر، یا اس سے چھوٹی یا بڑی، کوئی چیز ہو، سب خدا کے قانونِ مکافات اور لوحِ علم کے واضح نوشتوں میں محفوظ رہتی ہے۔

اسی قانون کے مطابق معصیت کاروں کو سزا ملتی ہے اور قوانینِ خداوندی کا اتباع کرنے والوں کو جزا —

(۱۰/۶۲) أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○

اولیاء اللہ یاد رکھو! جو لوگ، قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے، نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے اللہ کے رفیق (اولیاء اللہ) بن جاتے ہیں، انہیں نہ کسی خارجی قوت کا خوف رہتا ہے، نہ داخلی کشمکش سے اندوہناکی (۲/۳۸)۔

"اولیاء اللہ" کے متعلق تفصیلی گفتگو، مطالب الفرقان، جلد سوم (صفحات ۴۴۲-الآخر) میں کی جاچکی ہے اور ایک اضافہ جلد پنجم صـ۹۱ پر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ "اولیاء اللہ" کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ مومنین ہی کی ایک صفت ہے جس طرح متقی ہونا ان کی صفت ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت خود اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں یہ کہہ کر کردی کہ:

(۱۰/۶۳) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝

ان لوگوں (اولیاء اللہ) کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو قوانینِ خداوندی پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں (یعنی مومنین اور متقین ہی کو اولیاء اللہ کہا جاتا ہے)۔

ان کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں ہیں:

(۱۰/۶۴) لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِى الْاٰخِرَةِ ۗ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی شادابیاں اور کامرانیاں (یعنی یہ نہیں کہ یہ لوگ، دنیا میں محتاجی اور فقیری کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مادی اشیاء سے نفرت اور قطعِ تعلق سے "روحانی ترقی" اور عاقبت سنوارنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یہ خانقاہیت کا مسلک ہے جسے قرآنی نظام سے کوئی تعلق نہیں (۵۷/۲۷))۔ یہ خدا کا قانون ہے (کہ ان کی دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی، نہایت کامیاب اور تابناک ہوگی)۔ اور خدا کا قانون کبھی بدلا نہیں کرتا۔

یہ بہت بڑی کامیابی ہے جو ان کے حصے میں آئی ہے (یعنی حال اور مستقبل دونوں

کی خوشگواریاں) دنیا کی خوشگواریوں سے مفہوم یہ ہے کہ انہیں استخلاف فی الارض (مملکت) حاصل ہوگا (۲۴/۵۵)، اقوامِ عالم میں ان کا مقام سب سے بلند ہوگا (۳/۱۳۸) اور کفاران پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے (۴/۱۴۱)۔ یہ سب کچھ قرآن کی اتباع سے حاصل ہوگا، کیونکہ مومنین کے لئے وہی حقیقی بشریٰ ہے۔ ۱۶/۸۹؛ ۱۶/۱۰۲)۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے "اولیاء اللہ" کا تفصیلی بیان جلد سوم میں گزر چکا ہے۔ لیکن اس میں سے ایک نکتہ کا اعادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اولیاء اللہ (اللہ والوں یا مقربین بارگاہِ خداوندی) کا نقشہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ پھٹے پرانے کپڑے (بلکہ بعض اوقات ننگ دھڑنگ)، ایک گدڑی تنگ و تاریک سا حجرہ یا جھونپڑی، مٹی کا ایک مٹکا اور پیالہ، بھوک، پیاس، غربت و افلاس، مسکینی و محتاجی، دنیا سے الگ تھلگ، گوشہ نشینی کی زندگی یہ سب تصوف کے "اولیاء اللہ" کی نشانیاں ہیں۔ قرآنی اولیاء اللہ (جماعتِ مومنین) کی دنیا کی زندگی بھی حسین ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی۔ جس جماعت کو اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (بالائے ہر بالاترے) کہہ کر پکارا گیا ہے، کیا اس کی زندگی محتاجی و مسکینی مفلسی و بیکسی و بے بسی کی ہوگی؟ محتاجی اور مفلسی کو تو خدا نے عذاب سے تعبیر کیا ہے (۱۶/۱۱۲)۔

دین کی اتباع سے اس قسم کی حیات بخش اور انسانیت ساز، کامرانیوں اور شادمانیوں کی زندگی کے حصول کے بعد، رسول اللہ سے کہا کہ تمہارے مخالفین جو ہمت شکن اور حوصلہ فرسا باتیں کرتے ہیں ان کا قطعاً اثر نہ لیں۔ یہ صرف باتیں ہی باتیں ہیں جن کی حقیقت کچھ نہیں۔ قرآن کی اتباع کا لازمی نتیجہ عزت و عظمت اور اقتدار و اختیار ہے۔

(۱۰/۶۵) وَلَا يَحۡزُنۡكَ قَوۡلُهُمۡ ۘ اِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ؕ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝

لہٰذا اے رسولؐ! تم ان مخالفین کی باتوں سے دل گرفتہ مت ہو۔ (یہ کون سی قوتوں کے مالک ہیں جو تم پر غالب آجائیں گے اور تمہارے نظام کو شکست دے دیں گے؟)۔ حقیقت یہ ہے کہ قوت و اقتدار، تمام کا تمام خدا ہی کو حاصل ہے اور اس کے قوانین کی متابعت سے ملتا ہے؛ وہ خدا جو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

اس کا ثبوت یہ بیان فرمایا:

(۱۰/۶۶) اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ○

کیا تم نہیں دیکھتے کہ کائنات کا یہ عظیم القدر اور محیّر العقول سلسلہ، کس طرح اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے (تم خدا کے اقتدار کا اندازہ اس ایک بات سے لگاؤ۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کی شہادت علم و بصیرت کی بارگاہ سے مل سکتی ہے) لیکن جو لوگ، اس اقتدار میں خدا کے ساتھ، اوروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں، کیا وہ علم و بصیرت کا اتباع کرتے ہیں؟
بالکل نہیں۔ وہ صرف وہم و گمان کے پیچھے چلتے ہیں اور محض قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے جہاں مشرکین کے متعلق کہا ہے کہ وہ غیر اللہ کو پکارتے ہیں تو اس سے لازمی طور پر وہ بُت ہی مراد نہیں جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ ان میں ان کے احبار و رہبان (مذہبی مقتدی اور پیرانِ طریقت) بھی شامل ہوتے ہیں جن کے احکام کی وہ اطاعت کرتے تھے۔
اِدھر ان کے ضعف و ناتوانی کا ذکر کیا اور دوسری طرف خدا کے جلال و اقتدار کا تذکرہ:

(۱۰/۶۷) هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ○

(یہ لوگ) اگر علم و بصیرت کی رُو سے نظامِ کائنات کے صرف ایک گوشے پر ہی غور کرتے

تو قانونِ خداوندی کی عظمت ان کے سامنے آجاتی۔ یہ دیکھتے کہ اس نے چاند سورج
جیسے عظیم الجثہ اجرامِ سماوی کو یوں اپنے اقتدار کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے کہ وہ
برابر مصروفِ گردش ہیں۔ ان کی گردش سے (کبھی رات آجاتی ہے جس میں تم آرام
کرتے ہو، پھر دن نکل آتا ہے جس کی روشنی میں تم اپنا کاروبار کرتے ہو۔ اس میں
ان لوگوں کے لئے جو فی الحقیقت بات کو سنتے (اور سمجھتے) ہیں، قانونِ خداوندی کی
ہمہ گیری اور محکمیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

مشرکین ہی میں ایک اہلِ کتاب (عیسائی) بھی تھے جن کے عقائد بُت پرستوں سے بھی زیادہ جہالت
پر مبنی تھے؛

(۱۰/۶۸) قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

اِبنُ اللہ کا باطل عقیدہ

انہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کا
ایک بیٹا بھی ہے (جو اس کے کاروبار میں اس کی مدد کرتا
ہے)۔ ان سے کہو کہ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ اسے اپنی مدد کے لئے اولاد کی احتیاج
ہو۔ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب
اس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ عمل ہے (جو خدا ایسی عظیم قوتوں
کا مالک ہو، اسے کسی کی مدد کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟)۔ ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے
پاس اس عقیدہ کی تائید میں کوئی سند اور دلیل بھی ہے یا تم خدا کی طرف یونہی ایسی
باتیں منسوب کرتے رہتے ہو جن کا تمہیں کچھ علم نہیں!

حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے کے باطل عقیدہ کی تردید، سابقہ جلدوں میں (عنوانِ عیسیٰؑ کے تحت)

کی جا چکی ہے. بالخصوص دیکھئے جلد دوم (صفحہ ۳۴۳) اور جلد چہارم (صفحہ ۸۹). اس تردید کے بعد کامل حتم ویقین کے ساتھ کہہ دیا کہ اس قسم کے عقائد کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے. جوں جوں علم وعقل کی روشنی پھیلے گی، یہ عقائد محو ہوتے چلے جائیں گے. چنانچہ اب عیسائی قوموں کے اربابِ فکر ونظر خود ہی انہیں چھوڑتے چلے جارہے ہیں.

(۱۰/۶۹) قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝

ان سے کہہ دو کہ جو لوگ اپنے ذہن کے تراشیدہ عقائد کو، ناحق خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے (جوں جوں دنیا میں علم کی روشنی پھیلتی جائیگی اس قسم کے توہم پرستانہ معتقدات باطل قرار پاتے جائیں گے).

مذہبی پیشوا اس قسم کے عقائد کو اس لئے قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ ان کا ذریعۂ معاش ہے. حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب ہو، مذہبی پیشوائیت کا ذریعہ معاش بن جاتا ہے، اس لئے وہ اس کے تحفظ کی انتہائی کوشش کرتے ہیں.

(۱۰/۷۰) مَتَاعٌ فِى الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝

اس قسم کی خانہ ساز باطل پرستی سے (مذہبی پیشوائیت کو) کچھ دنیاوی مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن آخرِکار، ان تمام امور کا فیصلہ ہمارے قانون کی رُو سے ہوگا. اُس وقت ان لوگوں کو، اپنی منکرانہ جدوجہد اور توہم پرستانہ عقائد کے سخت تباہ کن نتائج بھگتنے پڑیں گے.

اس کے بعد قرآن، اپنے معمول کے مطابق، تاریخی شواہد سے اپنے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتا

ہے اور آغازِ سخن حضرت نوحؑ سے کرتا ہے جو، قرآن میں بیان کردہ، سلسلۂ رشد و ہدایت کی اوّلین کڑی ہیں۔

(۱۰/۷۱-۷۳) وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنَ ۝ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝

(منکرانہ جدّ و جہد اور توہم پرستانہ عقائد کس قسم کے نتائج مرتب کیا کرتے ہیں، اس کے لئے ان کے سامنے اقوامِ گذشتہ کی سرگزشت لاؤ۔ سب سے پہلے) انہیں قومِ نوحؑ کی داستان سناؤ۔ جب نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا — اگر میرا یہاں ٹھہرنا اور تمہیں قوانینِ خداوندی سے آگاہ کرنا، تم پر ایسا ہی شاق گزرتا ہے (تو گزرے) میں تمہاری خاطر اپنے اس اہم فریضہ سے باز نہیں رہ سکتا۔ میں تمہاری مخالفت کی کچھ پرواہ نہیں کرتا، تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اس میں اپنا پورا زور لگالو اور اس کے لئے اپنے حمایتیوں کو بھی بلالو اور اسے اچھی طرح دیکھ بھال لو کہ میری مخالفت کا کوئی پہلو تمہاری نظروں سے

ادھل نہ رہ جائے۔ اور تم نے جو کچھ کرنا ہے کر گزرو اور مجھے قطعاً مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ خدا پر ہے۔ (اگر میں اس کے قوانین کے مطابق چلوں گا تو وہ مجھے کبھی ناکام نہیں رہنے دے گا)۔ (۷۱)

اور اگر تم مخالفت سے باز آجاؤ (اور حق کی راہ اختیار کرلو تو اس میں تمہارا ہی بھلا ہے) میں اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا معاوضہ میرا خدا مجھے عطا کردے گا۔ وہ خدا جس کا مجھ سے ارشاد یہ ہے کہ میں اُن لوگوں میں سے ہو جاؤں جو اس کے قوانین و احکام کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کرتے ہیں (اور دوسروں سے بھی کہوں کہ وہ بھی ایسا ہی کریں)۔ (۷۲)

(اس نے یہ کچھ اپنی قوم سے واضح طور پر کہہ دیا) لیکن انہوں نے اسے جھٹلایا (اور اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے) تو ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو جو کشتی میں سوار تھے، طوفان سے بچا لیا اور انہیں ان کے مخالفین کا جانشین بنا دیا۔ اور جن لوگوں نے ہمارے قوانین کی تکذیب کی تھی، انہیں غرق کر دیا۔

ان سے کہو کہ ذرا اس پر غور کرو کہ جن لوگوں کو اُن کی غلط روش کے نتائج سے آگاہ کیا گیا تھا، جب انہوں نے اس تنذیر پر کان نہ دھرا، تو ان کا انجام کیا ہوا؟ (۷۳)

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، قرآنِ کریم میں اقوامِ سابقہ اور انبیاء گذشتہ کی داستانیں متعدد مقامات پر دہرائی گئی ہیں۔ ان میں اکثر کوائف کا تو اعادہ ہی کیا گیا ہے اور بعض نئے نکات بھی سامنے لائے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے اسلوب یہ اختیار کر رکھا ہے کہ جن واقعات کا محض اعادہ کیا گیا ہے، ان آیات کا صرف مفہوم درج کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جو جدید نکات سامنے لائے گئے ہوں ان کی تشریح کر دی جاتی ہے۔ حضرت نوحؑ کی پوری داستان مطالب الفرقان جلد پنجم صفحات ۲۲۰ سے آخر تک میں شرح و بسط سے بیان کی گئی ہے۔ زیرِ نظر آیات میں کسی نکتہ کا اضافہ نہیں کیا گیا، اس لئے ان کے مفہوم پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اگلی آیت میں حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی بعثت کے درمیانی عرصہ میں آنے والی اقوام کے متعلق

صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کا تفصیلی تذکرہ دیگر مقامات پر آیا ہے ــــ

(۱۰/۷۴) ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ ۝

نوحؑ کے بعد بھی ہم نے اسی طرح، مختلف اقوام کی طرف رسول بھیجے۔ وہ ان کے پاس واضح قوانین اور روشن دلائل لے کر آئے۔ لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ وہ ان کے پیغام کو سننے سمجھنے سے پہلے ہی اسے جھٹلا دیتے۔ اور جس بات کو یوں جھٹلا دیتے، پھر اپنی بات کی پچ میں، اسے قبول نہ کرتے، خواہ ان کے سامنے کتنی دلیلیں کیوں نہ لائی جاتیں۔ جو لوگ اپنی ضد اور ہٹ میں اس قدر حدود فراموش ہو جائیں، ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہا کرتی (۲/۷)۔

اس کے بعد حضرت موسٰیؑ کی داستانِ حیات کے منتخب اوراق چند آیات میں سامنے لائے گئے ہیں۔ سابقہ جلدوں میں اس داستان کی تفاصیل شرح و بسط سے پیش کی جا چکی ہیں۔ انڈکس کی مدد سے آپ ان مقامات کو بارِ دیگر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں، بنی اسرائیل، حضرت موسٰیؑ، فرعون، ساحرین وغیرہ عنوانات زیادہ اہم ہیں۔ جلد پنجم کا چوتھا باب (ص ۳۲۳) پورے کا پورا اس داستان کو اپنے آغوش میں لئے ہے۔ بنا بریں، آئندہ آیات میں، ان مقامات کے سوا جن میں کوئی اضافہ کیا گیا ہے، صرف مفہوم پر اکتفا کیا جائے گا۔

(۱۰/۷۵-۷۸) ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰی وَ هٰرُوْنَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ بِاٰیٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا

قَالُوٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ○ قَالُوٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ○

موسیٰؑ و ہارونؑ

ان اقوام کے بعد ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اپنے قوانین دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ انہوں نے بھی ان قوانین سے سرکشی اختیار کی، اس لئے کہ وہ ایک ایسی پارٹی بن چکے تھے جس کا شیوہ یہ تھا کہ وہ کمزوروں پر ظلم و زیادتی کریں اور ان کی محنت کے ماحصل کو لوٹ کھسوٹ کر لے جائیں (وہ حق و انصاف کی بات پر کس طرح کان دھرتے (۷۵/۱۰)۔

چنانچہ ان کے سامنے ہمارا وہ نظام پیش کیا گیا جو سرتاسر حق و صداقت پر مبنی تھا، تو انہوں نے یہ کہہ کر اس سے انکار کر دیا کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ اور باطل ہے (۷۶)۔

موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ کیا تم اس حق کے متعلق جو تمہارے سامنے اس طرح پیش کیا جا رہا ہے، یہ کہتے ہو کہ وہ جھوٹ اور باطل ہے۔ یاد رکھو! جن لوگوں کے دعوے جھوٹ اور باطل پر مبنی ہوتے ہیں، وہ کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھا کرتے (اور تم دیکھ لوگے کہ میں اپنے مشن میں کس طرح کامیاب ہوتا ہوں)۔ (۷۷)۔

(جو قانونِ خداوندی موسیٰؑ نے پیش کیا تھا، وہ لوگ، علم و براہین کی بنا پر تو اس کی تردید نہیں کر سکتے تھے! اس لئے انہوں نے وہی روش اختیار کی جو باطل پرستوں کے ہاں شروع سے چلی آ رہی ہے! انہوں نے کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہمیں اس مسلک سے برگشتہ کر دو جو ہمارے آباء و اجداد سے متوارث چلا

آ رہا ہے؟ اور اس طرح ہمارے اقتدار کو ختم کر کے، مملکت کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لو! (ہم تمہاری چالوں کو خوب سمجھتے ہیں اس لئے) ہم تمہاری کوئی بات ماننے کے نہیں۔ (۷۸)۔

آیت (۱۰/۷۶) میں کہا گیا ہے کہ ان لوگوں نے (حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے) کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ تم یہاں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ محض وعظ و نصیحت کرنے کے لئے نہیں آتے تھے۔ ان کا منصب نظامِ خداوندی کا قیام ہوتا تھا، اور یہ بعد کا خیال Atter thoughts نہیں ہوتا تھا۔ یہ مقصد شروع ہی سے ان کے پیشِ نظر ہوتا تھا۔ اس کے بعد ہے:

(۱۰ / ۷۹-۸۱) وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيمٍ ○ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوسٰى اَلْقُوا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُونَ ○ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ○

فرعون نے حکم دیا کہ مملکت میں جس قدر سحر کار، مذہبی پیشوا، ہیں انہیں ہمارے حضور پیش کرو۔[1] (۷۹)

چنانچہ وہ باطل پرست مذہبی پیشوا آ گئے تو موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ تم جو کچھ پیش کرنا چاہتے ہو، پیش کرو۔ (۸۰)

جب انہوں نے اپنے دعاوی اور دلائل کو پیش کر دیا تو موسیٰؑ نے کہا کہ جو کچھ تم نے

---

[1] ان امور کی تفصیل (۷/۱۱۳ - ۱۱۴) جلد پنجم (ص ۳۸۴) میں گزر چکی ہے۔

پیش کیا ہے، وہ یکسر باطل اور فریب پر مبنی ہے (اس کی حقیقت کچھ نہیں)۔ اسے اللہ عنقریب ملیامیٹ کر دے گا، اس لئے کہ تمہارے اس باطل مذہب اور نظام کا منشا انسانیت میں فساد برپا کرنا ہے۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ فسادِ آدمیت پیدا کرنے والوں کے کام کبھی سنورا نہیں کرتے ــــ (۸۱)

حضرت موسیٰؑ کے ساحرین کے ساتھ مقابلہ کے سلسلہ میں (سابقہ جلدوں میں) بتایا جا چکا ہے کہ یہ جادوگری کا مقابلہ نہیں تھا۔ یہ حق پر مبنی دعوت کا مقابلہ باطل کی دعوت کے ساتھ تھا اور اس میں موسیٰؑ کی طرف سے دلائل و براہین پیش کئے گئے تھے۔ اگلی آیت میں کہا گیا ہے کہ "خدا نے حق کو اپنے کلمات کے ذریعے ثابت کر دیا"ــــ کلمات اللہ قوانینِ خداوندی ہی کو کہا جاتا ہے۔ لہٰذا، حضرت موسیٰؑ کا یہ غلبہ دلائل و براہینِ خداوندی کی رُو سے تھا، جادوگری کی رُو سے نہیں تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے تو (ارشادِ خداوندی کی رُو سے) خود ہی کہہ دیا تھا: وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ (۱۰/۷۷) (ساحرین کامیاب نہیں ہو سکتے)۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت موسیٰؑ نے "جادو کے زور" سے یہ مقابلہ جیتا تھا، تو یہ چیز خود موسیٰؑ کے اعلان (ارشادِ خداوندی) کے خلاف جاتی ہے۔ لہٰذا، یہ کامیابی سحر (جادو) کے زور سے نہیں تھی۔ کلمات اللہ کی رُو سے تھی، یعنی ان دلائل و براہین کی رُو سے جن کی بنا پر قوانینِ خداوندی کو برحق ثابت کیا جاتا ہے۔

(۱۰/۸۲) وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ۝ع

حق کا غلبہ قوانین کی رُو سے

لہٰذا، تم دیکھ لو گے کہ اللہ اپنے قانونِ محکم کے ذریعے کس طرح (تمہارے فساد برپا کرنے والے نظام کے مقابلہ میں) تعمیری نتائج پیدا کرنے والے نظامِ حق و انصاف کو محکم طور پر قائم کرتا ہے، خواہ اس کا ثبات و قیام اس پارٹی پر کتنا ہی گراں گزرے جس نے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے۔ (نظامِ خداوندی کا غلبہ کلمات اللہ ــــ قوانینِ خداوندی ــــ کے مطابق ہوتا ہے خواہ وہ دلائل و براہین کی رُو سے ہو اور خواہ سرکش قوتوں کے مقابلہ میں میدانِ جنگ میں۔

(۸ ــ ۱۰/۷)

اس سے اگلی آیت میں قوموں کی نفسیات کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ محکوم قوموں

ہیں بڑے بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور نوجوان بھی. بڑے بوڑھوں میں (بالعموم) انقلابی آواز پر لبیک کہنے کی ہمّت نہیں ہوتی. ان کے حوصلے پست، ہمتیں فرسودہ اور جرأتیں پژمردہ ہو چکی ہوتی ہیں. لیکن قوم کے اُبھرنے والے (نئی نسل کے) نوجوانوں میں انقلاب کے لئے تڑپ ہوتی ہے' اس لئے وہ اس دعوت پر لبیک کہتے ہیں. یہی تھے وہ نوجوان جنہوں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر لبیک کہا تھا اور انہی کے "ذبح کرنے" کا حکم فرعون نے دیا تھا (۴۰/۲۵). "ذبحِ ابناء" کے سلسلہ میں مطالب الفرقانؒ جلد دوم (ص۱۷۳) دیکھئے. فرمایا:

(۱۰/۸۳) فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰىٓ اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۚ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ○

نوجوان ایمان لائے

(موسیٰؑ نے دلائل و براہین سے قومِ فرعون کو قائل کر دیا کہ وہ حق پر نہیں) لیکن اس پر سوائے اس کی اپنی قوم کے چند نوجوانوں کے' کوئی ایمان نہ لایا. اس لئے کہ وہ لوگ ڈرتے تھے کہ فرعون اور اس کی قوم کے اکابرین' انہیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دیں. فرعون اپنی مملکت میں بڑا ہی سرکش اور مستبد تھا (اور جو لوگ اس کے مخالفین کے ساتھ جا ملیں ان سے انتقام لینے میں) کسی حد پر رُکنے والا نہیں تھا.

اسی بنا پر اقبالؒ نے خدا سے دعا مانگی تھی:

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

بلکہ یہاں تک کہ

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن — دارم از روزے کہ مے آید سخن

برجوانان سہل کن حرفِ مرا بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا[1]

یہی وہ نوجوانانِ ملت تھے جنہیں حضرت موسیٰؑ تلقین کرتے تھے کہ:

(۱۰/۸۴-۸۶) وَ قَالَ مُوسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ○ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَ نَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ جب تم قوانینِ خداوندی پر ایمان لا چکے ہو تو پھر کسی سے نہ ڈرو۔ تم ان قوانین کی محکمیت پر پورا پورا بھروسا رکھو۔ یہی ایک طریق ہے جس سے تم تمام غیر خداوندی قوانین سے مُنہ موڑ کر ان قوانین کی اطاعت کر سکو گے (۸۴)۔

انہوں نے کہا کہ (آپ مطمئن رہیئے) ہم ان قوانین پر پورا پورا بھروسا رکھیں گے پھر انہوں نے اپنے نشوونما دینے والے (خدا) کے حضور اپنی یہ آرزو پیش کی کہ تو ہمیں اس سے محفوظ رکھ کہ ہم فریقِ مخالف کے جور و ستم کا تختۂ مشق بن جائیں (۸۵)۔

تُو ہمیں اپنی رحمت سے ان لوگوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلا جو قانونِ حق و انصاف سے سرکشی برت رہے ہیں (۸۶)۔

فرعون کے ساتھ کشمکش میں اب وہ مقام آ گیا تھا جہاں نظر آتا تھا کہ باہمی تصادم ہوگا۔ اس کے لئے قوم (بنی اسرائیل) کو تیار کرنا ضروری تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قومِ فرعون نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کشمکش میں حضرت موسیٰؑ کا مقصد بنی اسرائیل کی حکومت قائم کرنا ہے۔ اس لئے وہ کھلے بندوں اس قسم کی سرگرمیوں کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ ان حالات میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ وہ افرادِ قوم کے گھروں

---

[1] اس موضوع پر دلچسپی رکھنے والے قارئین، میری کتاب "اقبال اور قرآن" میں اقبال کا پیغام نوجوانانِ ملت کے نام ملاحظہ فرمادیں۔

کو اجتماعات کا مرکز بنالیں اور وہاں ان کی تربیت کا انتظام کریں۔

(۱۰/۸۷) وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

(اس کے بعد اس نظام کے لئے عملی اقدام کا آغاز کر دیا گیا) اس کے لئے ہم نے موسیٰ اور ہارونؑ سے کہا کہ سردست، مصر میں جس جگہ تمہاری قوم ہے، وہیں ان کی ذہنی اور قلبی تربیت شروع کر دو۔ (فرعون اس کی اجازت نہیں دے گا کہ جماعت کے افراد کے لئے کوئی تربیتی مرکز بناؤ جہاں ان کے اجتماعات ہوا کریں۔ اس لئے تم فی الحال اپنی جماعت کے اراکین کے گھروں کے اندر ہی یہ سلسلہ شروع کر دو اور اس طرح اس نظامِ صلوٰۃ کی ابتدا کر دو (جسے آخرالامر تمام معاشرہ کو محیط ہو جانا ہے) اور اپنی جماعت کو اس نظام کے نتائج و ثمرات کی خوشخبری دیتے رہو (تاکہ ان کی ہمتیں تازہ اور حوصلے بلند رہیں)۔

قبلہ اور اقامتِ صلوٰۃ

آیت میں کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے گھروں کو "قبلہ" بنالیا جائے تاکہ وہاں "اقامتِ صلوٰۃ" کا مقصد پورا کیا جاسکے۔ "قبلہ" اور "اقامتِ صلوٰۃ" کے مفہوم کے لئے انڈکس دیکھئے (بالخصوص مطالب الفرقان جلد دوم، صفحہ ۲۱۶، جہاں قرآن کی ان ہر دو اصطلاحات کا مفہوم واضح کیا گیا ہے)۔ اس اجتماعی تربیت کے بعد اس قوم کو مصر سے نکال کر سینا کی وادیوں میں متمکن کیا گیا تھا جہاں انہوں نے اپنی حکومت قائم کی تھی۔

یہ تھا دین میں قبلہ اور اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم۔ لیکن ہمارے ہاں چونکہ دین کا تصور نہیں، اسلام کی حیثیت ایک مذہب کی رہ گئی ہے، اس لئے قرآنِ مجید کے تراجم اور تفاسیر میں اس آیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ قومِ بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں "قبلہ رُو جگہ (بطورِ مصلّے) مخصوص کر لیں اور وہاں نماز پڑھ لیا کریں۔

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے قوم کے ان خیالات کو بحضور رب العزت پیش کیا جو ان کے دلوں میں ابھرتے تھے (اور آج بھی ہم میں سے مفلسوں اور محتاجوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں)۔

(۱۰/۸۸) وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝

موسیٰؑ نے کہا کہ میں یہ سب کچھ کردوں گا لیکن، میری قوم کے لوگوں کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب خدا کا قانون یہ ہے کہ ظلم و استبداد پر مبنی نظام کبھی ثمر بار نہیں ہوسکتا تو یہ کیوں ہے کہ فرعون اور اس کے سرداروں کو زینت اور آرائش کا سامان اور متاعِ زیست اس قدر فراوانی سے مل رہا ہے کہ اس کے بل بوتے پر وہ لوگوں کو خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ اس لئے اے نظامِ ربوبیت کے مالک! تو ان کے مال و دولت کو تباہ کردے اور جس عقلِ فریب کار اور حیلہ جُو سے یہ اس قسم کی انسانیت سوز تدابیر سوچتے رہتے ہیں اسے سلب کرلے۔ اس لئے کہ یہ لوگ تیرے قوانین کی صداقت پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک یہ اس قسم کے الم انگیز عذاب کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیں گے۔

یعنی (اس قوم کے دل میں جس کی ایک عرصہ کی محکومی کی وجہ سے عمل کی قوتیں مسلوب ہوچکی تھیں) خیالات یہ ابھرتے تھے کہ خدا ان مستبد حکام کو تباہ و برباد کردے اور ان سرمایہ داروں کے مال و دولت کو جلا کر راکھ کردے۔ خدا خود ہی یہ سب کچھ کردے، ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے!

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ نے بحضور رب العزت یہ درخواست گزاری تو جواب ملا:

(۱۰/۸۹) قَالَ قَدْ أُجِيبَت دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَآنِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝

اس پر اللہ نے کہا کہ ہم نے تم دونوں بھائیوں کی دعا کو سُن لیا ہے اور یہ قابلِ قبولیت بھی ہے لیکن اس کا پورا ہونا خود تمہاری جدّوجُہد پر موقوف ہے۔ لہذا تم اپنے پروگرام میں پوری ثابت قدمی دکھاؤ اور (جلد بازی میں) ان لوگوں کا طریق نہ اختیار کرو جو (ہمارے قوانین اور ان کے نتیجہ خیز ہونے کے اندازے) واقف نہیں ہوتے (اس لئے وہ جلدی نتائج پیدا کرنے کے لئے غلط تدبیریں اختیار کر لیتے ہیں) (۲۰/۳۶ ؛ ۲۰/۴۲)۔

دُعا اور عمل کا باہمی تعلق

انہوں نے درخواست پیش کی (یا دُعا مانگی) اور خدا نے کہا "ہم نے تمہاری دُعا قبول کر لی ہے۔

آپ سوچئے کہ جب خدا کی طرف سے براہِ راست یہ یقین دہانی ہو جائے کہ ان کی دُعا قابلِ قبول ہے تو اس کے بعد انہیں کچھ کرنے کی ضرورت کیا رہے گی؟

لیکن نہیں! وہاں دُعا اور اس کی اجابت کا مفہوم کچھ اور تھا۔ خدا نے کہا کہ "تمہاری دعا قبول کر لی گئی ہے — فَاسْتَقِيمَا — سو اب تم اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے جم کر کھڑے ہو جاؤ اور اس ثبات و استقامت کے ساتھ اسے بھی پیشِ نظر رکھو کہ تمہارا قدم صحیح راستے کی طرف اٹھے۔ غلط راستے پر چلنے والے جو تدابیر چاہے اختیار کریں، تم قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے رہو۔ جو کچھ تم چاہتے ہو، وہ اس طرح پورا ہو جائے گا۔ جو کچھ تم نے مانگا ہے، وہ اس طرح مل جائے گا۔

سورۃ طٰہٰ میں یہ کہنے کے بعد کہ ہم نے تمہاری درخواست کو قبول کر لیا ہے (۲۰/۳۶) یہ کہا کہ لَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي (۲۰/۴۲) — دیکھنا! ہمارے قوانین کی تعمیل میں غفلت اور سُستی نہ ہونے پائے۔ یہ کہنے سے (کہ تمہاری دُعا قبول ہو گئی ہے) مراد یہ ہے کہ تمہاری دُعا ہمارے (خدا کے) قانون کے مطابق ہے اس لئے اگر تم اسی انداز سے کام کرو گے تو یہ ضرور بارآور ہو گی۔

دُعا کا مفہوم سابقہ جلد (۱) میں واضح کیا جا چکا ہے۔ مندرجہ بالا آیات سے دُعا اور عمل کے باہمی رشتہ

کی اور بھی وضاحت ہوگئی۔ ذرا سوچئے کہ یہ (دو نبیوں کی) وہ دعائیں تھیں جن کے متعلق خدا نے براہِ راست کہہ دیا تھا کہ وہ قبول کر لی گئی ہیں، لیکن اس کے بعد ان کے پورا ہونے کے لئے عمل کی اس قدر سخت تاکید کر دی۔ ہماری آپ کی دعاؤں کا جواب تو اس طرح سے نہیں ملتا۔ لیکن ہم دعا مانگنے کے بعد اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں کہ اب ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ خدا کر دے گا۔

یاد رکھئے! انسانوں کی دنیا میں، خدا نے جو کچھ کرنا ہوتا ہے، وہ اسے انسانوں کے ہاتھوں ہی سے کراتا ہے۔ دعا ہماری آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن وہ آرزوئیں پوری ہوتی ہیں خدا کی راہنمائی میں خود ہمارے کام کرنے سے، بشرطیکہ وہ خدا کے قوانین کے مطابق ہوں۔ اُسی دعا کو قابلِ قبول کہا جائے گا جو قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو اور اس کی قبولیت مشروط ہو گی دعا مانگنے والے کی جدّوجہد سے۔

اس کے بعد قرآنِ کریم (درمیانی کڑیوں کو چھوڑ کر) بنی اسرائیل کے مصر چھوڑنے کے مقام پر آجاتا ہے:

(۱۰/۹۰) وَجَاوَزْنَا بِبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○

(آخر الامر ہوا یہ کہ) ہم نے بنی اسرائیل کو (فرعون کی غلامی سے نجات دلائی اور انہیں) صحیح و سلامت دریا (سمندر) کے پار اتار دیا۔ فرعون اور اس کے لشکروں نے ان کا پیچھا کیا تاکہ انہیں پکڑ کر ان پر ظلم اور زیادتی کی جائے۔ (وہ قوت اور سرکشی کے نشے میں اس قدر بدمست ہو گئے کہ اس کا بھی اندازہ نہ لگایا کہ وہ غرق ہو جائیں گے۔ چنانچہ

فرعون کا ایمان

جب فرعون اپنے لشکر کے ساتھ خود) غرق ہونے لگا اور اس نے موت کو اپنے سامنے دیکھ لیا تو اس سے بچنے کے لئے) پکار اٹھا کہ میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ اُس خدا کے سوا کسی کا اقتدار نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ بس وہی ایک ہے۔ میں بھی ان میں سے ہو جانا چاہتا ہوں جو اس کے

قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

اس کا جواب ملا:

(۱۰/۹۱) آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝

اس کا جواب

(اس پر وحیٔ خداوندی نے، بزبانِ موسیٰؑ کہا کہ) تو ساری عمر، حق و انصاف کی راہ سے سرکشی اختیار کئے رہا اور ملک میں فساد انگیزیاں کرتا رہا۔ (تجھ سے بار بار کہا جاتا رہا کہ اس روش کو چھوڑ دو، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ لیکن اُس وقت تُو نے ایک نہ مانی۔ اب جب موت سامنے کھڑی دکھائی دی تو) ایمان یاد آ گیا۔ اب اس ایمان کا کوئی فائدہ نہیں۔ (اس لئے کہ جو ایمان، ڈر اور خوف کی بنا پر لایا جائے، وہ ایمان کہلا ہی نہیں سکتا)۔

نیز توبہ کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ انسان اپنے اعمالِ حسنہ سے، سابقہ لغزشوں کے نقصانات کا ازالہ کر لے۔ لیکن جب موت سر پر کھڑی ہو تو عملِ صالح (اچھے کام) کے لئے وقت ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اُس وقت کی توبہ بے معنی ہوتی ہے (۴/۱۷-۱۸)۔

فرعون غرق ہو گیا، لیکن اس کی لاش کو محفوظ کر لیا گیا:

(۱۰/۹۲) فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝

اب تجھے غرق ہونا ہے۔ البتہ ہم ایسا کریں گے کہ تیری لاش کو سمندری موجوں سے محفوظ رکھ لیں تا کہ وہ، ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، موجبِ عبرت ہو۔ اس لئے کہ اکثر لوگ ایسے ہیں جو ہمارے قانونِ مکافات کی غیر محسوس نشانیوں سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ (ان لوگوں کے لئے اس قسم کی محسوس نشانیاں ہی موجبِ

عبرت د موعظت ہو سکتی ہیں)۔

بنی اسرائیل کا عبور دریا، فرعون کی توبہ، اس کی محفوظیت وغیرہ واقعات پہلے تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں، بالخصوص جلد دوم (صفحات ۲۴۵ - الآخر) میں۔ زیرِ نظر آیات بھی وہاں درج کی جا چکی ہیں۔ اس کے بعد کے واقعات کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تفصیل ان کی دیگر مقامات پر آ چکی ہے:

(۱۰/۹۳) وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

(یہ تو تھا اس پروگرام کا منفیانہ پہلو، یعنی فرعون اور اُس کے لشکر کی تباہی اور بنی اسرائیل کی، اُن کے پنجۂ استبداد سے رُستگاری۔ اس کا مثبت اور تعمیری پہلو یہ تھا کہ) ہم نے بنی اسرائیل کو ایسی جگہ متمکن کر دیا جہاں سامانِ زیست کی فراوانیاں تھیں اور اس طرح انہیں خوشگوار اور باعزت رزق سے بہرہ یاب کر دیا۔ (ہم نے تو انہیں ان نعمتوں سے نوازا، لیکن ان کی حالت یہ رہی کہ ان کی طرف مختلف انبیاء کی وساطت سے وحی آتی رہی لیکن وہ ہمیشہ اس میں اختلافات پیدا کرتے رہے۔ اسی روش کے مطابق یہ اب، اس وحی (قرآن) سے بھی اختلاف رکھتے ہیں) سو جن امور میں یہ اختلاف کرتے ہیں ان کا فیصلہ (دلائل و براہین سے نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ یہ لوگ دلائل و براہین پر کان دھرنے کے لئے تیار ہی نہیں)۔ اُس انقلابِ عظیم کے وقت ہو گا جب ان کی تباہی تمہارے ہاتھوں سے آئے گی (۲/۵۹)۔ (اُس وقت تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی اور جس طرح فرعون اور اس کے لشکروں کی تباہی اُن کے سامنے ہوئی تھی، ان کی تباہی تمہارے سامنے ہو گی۔ اس لئے کہ غلط

روش کا نتیجہ ہمیشہ تباہی و بربادی ہوتا ہے، خواہ اس پر فرعون گامزن ہو خواہ بنی اسرائیل۔
غور فرمائیے! بنی اسرائیل کے تمکن کے بعد جس سب سے بڑی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے "رزقِ طیب" ہے، خوشگوار اور باعزت رزق۔ دنیا میں روٹی تو سب کو ملتی ہے، لیکن ایک روٹی وہ ہے جو عزت و تکریم بیچ کر ملتی ہے۔ اور دوسری روٹی وہ ہے جس میں عزت و تکریم بھی ہوتی ہے۔ یہ (دوسری قسم کی) روٹی ہے جو قوانینِ خداوندی کے اتباع سے (اسلامی نظامِ معیشت میں) ہر فرد کو میسر ہوتی ہے۔

باعزت رزق

قرآن نے اس کو رزقِ طیب اور رزقِ کریم کہہ کر پکارا ہے۔ ان امور کی تفصیل سابقہ جلدوں میں "معاشی نظام" کے عنوان کے تحت ملے گی۔

یہاں کہا گیا ہے کہ "جن امور میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کا فیصلہ قیامت کے دن کر دیا جائے گا۔" اگر یہاں قیامت سے مراد اُخروی زندگی کی قیامت لیا جائے تو بات صاف نہیں ہوتی۔ اُخروی زندگی میں اگر لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کیا گیا اور اس طرح اختلافات مٹ گئے، تو اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ وہاں تو اختلافات کے نتائج سامنے آئیں گے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہاں قیامت سے مراد وہ قرآنی انقلاب ہے جس نے حق و باطل میں امتیاز کر کے دکھا دیا اور اس طرح اختلافات کا فیصلہ کر دیا۔ (قیامت کے مفہوم کے متعلق سابقہ جلدوں میں گفتگو کی جا چکی ہے)۔



ان واقعات کو بیان کرنے کے بعد، قومِ مخاطب (یعنی مخالفین عرب) سے کہا کہ ـــ

(۱۰/۹۴) فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝

اے قومِ مخاطب! اگر تمہیں اس حقیقت میں کسی قسم کا شک و شبہ ہو جو اس قرآن میں تمہاری طرف نازل کی گئی ہے (اور جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارا قانونِ مکافات کس طرح اقوامِ سابقہ میں کارفرما رہا ہے) تو جو لوگ اس سے پہلے کتابِ خداوندی کے حامل رہے ہیں

(یعنی یہود و نصاریٰ) ان سے پوچھ لو (کہ یہ واقعات جو بیان کئے گئے ہیں درست ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد تمہیں یقین ہو جائے گا کہ جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے بیان ہوا ہے وہ حقیقت ثابتہ ہے۔ پس جب واقعہ یہ ہے تو تم اُن لوگوں میں سے کیوں ہوتے ہو جو خواہ مخواہ جھگڑے کی صورت نکالتے رہتے ہیں نہ ہی تکذیب کرنے والوں میں سے۔

۱۰/۹۵ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○

یا ان لوگوں میں سے جو قوانینِ خداوندی کو جھٹلاتے رہتے ہیں۔ اگر تم ویسے ہی ہو گئے تو انہی کی طرح تم بھی نقصان اٹھاؤ گے۔

اس کے بعد ہدایت اور گمراہی کے متعلق قانونِ خداوندی کو سامنے لایا گیا۔

۱۰/۹۶-۹۷ إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ ○ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ○

(ہم نے یہ حقائق اس طرح واضح طور پر بیان کر دیے ہیں اور ان کی تائید میں دلائل و براہین اور تاریخی شہادتیں بھی پیش کر دی ہیں۔ اس سے ہر صاحبِ عقل و فراست اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان حقائق کے تسلیم کرنے میں اب کسی کو تامل و توقف نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن) جن لوگوں نے اپنے آپ کو ایسا بنا لیا ہے کہ ان پر دلائل و براہین کا کوئی اثر ہی نہیں ہو سکتا ـــ یعنی جو ضد پر اڑے رہتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں

عقل اور ایمان لیتے (۱۰/۱۰۰ : ۱۰/۷۴) وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے، خواہ ان کے سامنے کیسی ہی کھلی کھلی نشانیاں کیوں نہ آ جائیں۔ تا آنکہ وہ اپنے اعمال کی

پاداش میں تباہی کے عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھ لیں (۱۰/۸۸)۔ (یہ اُس وقت، فرعون کی طرح ایمان لائیں گے (۱۰/۹۰) لیکن یہ اُس وقت کا ایمان انہیں کیا فائدہ دے گا) یہ سب کچھ ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے (۹۷-۱۰/۹۶)۔

خدا کا قانونِ مکافات (یا قانونِ مہلت) یہ بھی ہے کہ اگر کوئی قوم تباہی آنے سے پہلے، اپنی غلط روش کو چھوڑ دے اور صحیح راستہ اختیار کر لے، تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہے۔ اس لئے قومِ یونسؑ کی مثال سامنے لائی گئی ہے۔

(۱۰/۹۸) فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝

ہمارے اس دعوے کی شہادت خود تاریخ سے ملتی ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں گزری جو تباہی سے پیشتر (حالتِ امن میں) ایمان لے آئی ہو اور اس طرح اپنے ایمان کی نفع بخشیوں سے فیضیاب ہو کر تباہی سے بچ گئی ہو۔ اس میں اگر کوئی استثناء ہوئی ہے تو قومِ یونسؑ کی جو (عذاب آنے سے پہلے) ایمان لے آئی تو ہم نے ان سے اس عذاب کو دُور کر دیا جو انہیں دنیا میں ذلیل کر دیتا۔ اور انہیں ایک مدت تک زندگی کی خوشگواریوں سے متمتع کیا۔ (۱۴۸-۳۷/۱۴۷؛ ۲۱/۸۷؛ ۶۸/۴۸)۔

قومِ یونسؑ کا تذکرہ، اِس سُورہ کے ابتداء میں کیا جا چکا ہے۔ وہاں یہ آیت بھی درج ہے۔

اس کے بعد اس ابدی قانون کو سامنے لایا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو مجبور نہیں بلکہ صاحبِ اختیار پیدا کیا ہے کہ وہ (غلط اور صحیح راستوں میں سے جونسا راستہ چاہے) اپنی مرضی سے اختیار کر سکتا ہے۔ اس سے وہ اپنے اعمال کے نتائج کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔

(۱۰/۹۹) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ

جَمِیۡعًا ؕ اَفَاَنۡتَ تُکۡرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوۡنُوۡا

مُؤۡمِنِیۡنَ ○

یہ سب اس لئے ہے کہ ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ کفر یا ایمان کی راہ اختیار کرنا انسان کے اپنے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا ہے (اس میں ہم بالکل دخل نہیں دیتے۔ اگر ہم نے دخل دینا ہوتا) تو ہم انسان کو بھی اسی طرح مجبور پیدا کر دیتے جس طرح کائنات کی دوسری چیزیں مجبور پیدا کی گئی ہیں اور وہ سب ہمارے مقرر کردہ قانون کے مطابق سرگرمِ عمل رہتیں)۔ اس صورت میں تمام روئے زمین کے انسان 'مومن ہی ہوتے۔ لہٰذا (جب ہمارا قانون یہ ہے کہ کفر اور ایمان کے معاملہ میں انسانی اختیار و ارادہ کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے تو اے رسولؐ!) تو لوگوں کو کس طرح مجبور کر سکتا ہے کہ وہ سب کے سب ایمان لے آئیں؟

جبر کا ایمان، ایمان نہیں

آیت کے آخر میں خود رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ وہ بھی لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ ان کا فریضہ لوگوں کو صحیح راستہ دکھانا ہے' اس راستے پر انہیں زبردستی چلانا نہیں۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد اوّل صفحہ ۴۳ پر آ چکی ہے۔

اس کے بعد کہا کہ ایمان خدا کے قانون کے مطابق لایا جاتا ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ جو لوگ وحیِ خداوندی کو عقل و فکر کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں' ان پر بات واضح ہو جاتی ہے۔ جو عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے' اُن پر معاملہ مشتبہ رہتا ہے۔

(۱۰/۱۰) وَمَا کَانَ لِنَفۡسٍ اَنۡ تُؤۡمِنَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَیَجۡعَلُ

الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ○

ایمان عقل و فکر کی رو سے

یاد رکھو! کوئی شخص ایمان نہیں لا سکتا جب تک وہ' ہمارے قانون کے مطابق' عقل و فکر سے کام لے کر صحیح نتیجے پر نہ پہنچے۔ اس لئے ہمارا قانون یہ ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے' ان پر بات

واضح نہیں ہو سکتی۔ وہ الجھاؤ میں رہتے ہیں (۲/۱۲۶ ; ۱۰/۳۹)۔

مطالب الفرقان، جلد سوم (ص ۴۲۵) پر یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ "اِذْنِ اللہِ" کے معنی قانونِ خداوندی ہیں اور جلد اوّل ص ۴۵ پر یہ بحث آ چکی ہے کہ ایمان، عقل و بصیرت اور علم و فکر کی رُو سے لایا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات دو ٹوک بیان کر دی کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے، ان پر معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے۔

رِجْس کے معنی ہوتے ہیں، التباس، شک، تردّد، اضطراب، آلائش، معاملہ کا صاف اور یکسو نہ ہونا۔ اس اعتبار سے ناپسندیدہ بات کو بھی رجس کہتے ہیں۔ (دیکھئے مطالب الفرقان جلد پنجم ص ۱۲۳)۔

ان آیات سے یہ واضح ہو گیا کہ (۱) ایمان کے معاملہ میں جبر اور اکراہ کا کوئی کام نہیں، خواہ وہ جبر ارباب اقتدار کا استبداد ہو اور خواہ مذہبی پیشوائیت کا استبداد جس میں عقل و فکر ماؤف کر کے تقلیداً عقائد منوائے جاتے ہیں اور جو نہیں مانتا اس پر کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں۔ اور (۲) ایمان وہی قابلِ تسلیم ہے جو دل و دماغ کی کامل رضامندی سے علم و عقل کی رُو سے لایا جائے۔ عقل سے کام نہ لیا جائے تو معاملہ مشتبہ رہتا ہے اور عقل و فکر کا اوّلین تقاضا ہے کہ نظامِ کائنات پر غور و فکر کیا جائے۔

(۱۰/۱۰۱) قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝

(عقل و فکر سے کام لینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انسان جذبات سے الگ ہٹ کر خارجی کائنات کا گہری نظر سے مطالعہ کرے اور دیکھے کہ اس میں کونسا قانون کارفرما ہے۔ لہٰذا اے رسولؐ! ان سے کہو کہ) تم خارجی کائنات اور خود انسان کی تمدنی زندگی پر غور و فکر کرو۔ (ان میں تمہیں حقیقت کی بڑی نشانیاں ملیں گی (۴۱/۵۳)۔

لیکن یہ نشاناتِ راہ اور تباہیوں کا احساس پیدا کرنے والی تنذیرات اُس قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں جنہوں نے پہلے ہی فیصلہ کر رکھا ہو کہ ہمیں اس قانون کو ماننا ہی نہیں (۲/۶ — ۷)۔

جو لوگ اس طرح حقائق کو تسلیم نہیں کرتے، وہ غلط روش پر گامزن رہنے پر مُصر رہتے ہیں۔ ان کی تباہی یقینی ہوتی ہے جو مہلت کا وقفہ گزر جانے کے بعد آ جاتی ہے — فرمایا:

۱۰/۱۰۲ فَهَلْ يَنْتَظِرُونَ إِلَّا مِثْلَ أَيَّامِ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ۝

جو لوگ اس قسم کی روش اختیار کریں، ان کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے اور جو کچھ اقوامِ سابقہ کے ساتھ ہو چکا ہے، وہی کچھ ان کے ساتھ ہو۔ اے رسولؐ! تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ (اگر یہی بات ہے تو) تم انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ (تاکہ نتائج مرتب ہو کر سامنے آ جائیں اور اس طرح تم یقین کے آخری نقطہ تک پہنچ جاؤ) (۱۱/۹۳)۔

انتظار کرو قانونِ مہلت کی تفاصیل متعدد مقامات پر گذر چکی ہیں اور رسول اللہ کا یہ ارشاد بھی کہ "تم بھی نتائج کا انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں"۔ اس کے بعد نتائج خود فیصلہ کر دیں گے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ اس آیت میں بھی دیکھئے کہ تاریخ کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں انڈکس دیکھئے۔

قوانینِ خداوندی سے سرتابی برتنے والوں کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ ان کی متابعت کرنے والوں کو اس تباہی سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ یہ کس طرح سے ہوتا تھا، اس کے متعلق مختلف اقوامِ سابقہ اور انبیاء گذشتہ کے احوال و کوائف کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔

۱۰/۱۰۳ ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

(ان سے کہہ دو کہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آ جاتا ہے تو اس تباہی سے، خدا کے پیغامبر اور ان کے ساتھیوں کی جماعت ہی محفوظ رہا کرتی ہے۔ اس لئے کہ اس جماعت کا محفوظ رکھا جانا ہمارے قانون کی رُو سے واجب ہوتا ہے۔ (۴۷/۳۰؛ ۲۱/۸۵؛ ۹—۴۷/۷)۔

نجات کے متعلق سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل

خدا نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے کرنا ہی نہیں۔ اس کے معنی اس مصیبت سے (سرے سے) محفوظ رہنے کے

بھی ہیں۔ اس آیت میں بھی اس کے معنی تباہی سے محفوظ رہنے کے ہیں۔

سابقہ جلدوں میں بتایا جا چکا ہے کہ خدا نے (اپنے لامنتہا اقتدارِ مطلق کے باوجود) خود اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں جنہیں وہ کبھی نہیں توڑتا (دیکھئے جلد اوّل ۲۷۲ و جلد پنجم ۱)۔ یہاں بھی کہا گیا ہے ـــ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ "مومنین کو تباہی سے محفوظ رکھنا ہم نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے"۔ اس سے جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے وہ غور طلب ہے۔ اگر مومن (نام رکھنے والی) قوم، مصائب و آلام کی شکار رہے (جیسی ہماری حالت ہے) تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ:

(i) اگر ہم واقعی مومن ہیں اور مصائب میں مبتلا، تو پھر (معاذ اللہ) خدا کا وعدہ غلط ہے۔

(ii) لیکن خدا کا وعدہ غلط ہو نہیں سکتا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ

(iii) ہم ہی مومن نہیں۔

دعوائے ایمان پرکھنے کا معیار اپنے دعوائے ایمان کے پرکھنے کا یہ اٹل معیار ہے۔ قومِ مومن کا ہنگامی اور وقتی طور پر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جانا اور بات ہے، اور اس کا مستقلاً بے کس و بے بس، بلکہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنا اور بات۔ اگر قوم مومن ہے تو اس کی حالت ثانی الذکر کی سی ہو نہیں ہو سکتی۔ (انڈکس میں "رسول" اور "مومنین" کے عنوانات دیکھئے) اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ ہم (یعنی دنیا بھر کے مسلمان) صدیوں سے جس نکبت اور زبوں حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس کی رُو سے ہم اپنے آپ کو مومن کہہ سکنے کے قابل ہیں؟

ان تصریحات کے بعد، عالمگیر انسانیت کو مخاطب کر کے اعلان فرمایا:

(۱۰ / ۱۰۴-۱۰۵) قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ

لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ ۚۖ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ۚ وَ لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○

ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم میرے پیش کردہ نظامِ زندگی کی صداقت کے بارے میں اب بھی شک میں ہو تو تمہارے اس شک سے میرے یقین پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ان قوتوں کی اطاعت اور محکومیت اختیار کروں جنہیں تم خدا کے سوا، صاحبِ اقتدار و اختیار مانتے ہو۔ میں تو صرف اُس خدا کی محکومیت اختیار کروں گا جس کے اقتدار کا یہ عالم ہے کہ اور تو اور خود تمہاری موت و حیات بھی، اُس کے قانون کے ساتھ وابستہ ہے۔ مجھے اس کا یہی ارشاد ہے کہ میں اس جماعت میں رہوں جو اُس کے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتی ہے (۱۰۴)۔

اور اپنی توجہات کو ہر طرف سے ہٹا کر اس کے متعین کردہ نظامِ زندگی پر مرکوز کر لوں اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤں جو زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لئے مختلف قوتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور قوانینِ خداوندی کے ساتھ، غیر خداوندی قوانین کو بھی شامل کر لیتے ہیں (۱۰۵)۔

اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ رسولؐ خود اپنی وحی پر ایمان لاتا تھا اور جماعتِ مسلمین کا اوّلین فرد ہوتا تھا۔ یہاں کہا گیا ہے کہ رسولؐ اللہ کا شمار جماعتِ مومنین کے زمرہ میں ہوتا تھا۔ جماعتِ مومنین کے سربراہ کا شمار اپنی جماعت کے افراد میں ہوتا ہے اور ان سے الگ نہیں ہوتا۔

یہ اعلان کرنے کے بعد اس اندازِ زیست کی مخالفت کرنے والوں سے کہا:

(۱۰۶،۱۰۷) وَ لَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَ لَا یَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ○

وَاِنۡ یَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنۡ یُّرِدۡكَ بِخَیۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِهٖ ؕ یُصِیۡبُ بِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ۝

(میرا تم سے بھی یہی پیغام ہے کہ) تم خدا کو چھوڑ کر ان قوتوں کی اطاعت مت اختیار کرو۔ (جنہیں تم محض اندھے عقیدے کی بنا پر اختیار و اقتدار کی مالک سمجھتے ہو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں اس کی قدرت ہی نہیں کہ وہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچا سکیں. اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی انہیں میں سے ہو جاؤ گے جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کرتے ہیں (اور ان کا انجام تمہیں معلوم ہی ہے) (۱۰۶)۔

یاد رکھو! اگر تمہیں قانونِ خداوندی کی رُو سے کوئی تکلیف پہنچے تو کائنات میں کسی کو اس کی قدرت حاصل نہیں کہ (اس کے قانون کے علی الرغم) اس تکلیف کو رفع کر سکے۔ وہ اس کے قانون کے مطابق ہی رفع ہوگی. اور اس کے قانون کے مطابق تمہیں کوئی نفع پہنچنے والا ہو تو کوئی قوت ایسی نہیں جو اسے روک سکے۔ اس میں کسی کی تخصیص نہیں. جو شخص بھی، اس کے قانون کے مطابق، اس نفع بخش صورت کو حاصل کرنا چاہے، حاصل کر سکتا ہے. وہ نفع اسے ضرور مل جائے گا. یاد رکھو! نقصانات سے بچنے کا سامان ہو یا نشوونما حاصل ہونے کے اسباب، یہ سب اس کے قانون سے وابستہ ہیں (۱۰۷)۔

اس کے بعد دہرایا کہ غیر خدائی قوتوں کے دروازوں پر دستک دینے کا جذبہ محرکہ جلبِ منفعت اور رفعِ مضرت ہوتا ہے. لیکن منفعت اور مضرت خدا کے قوانین کے ساتھ مستلزم ہے. تشریح ان نکات کی پہلے آ چکی ہے.

پھر تمام نوعِ انسان سے کہا؛

(۱۰/۱۰۸) قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝

(اے رسولؐ! تم) تمام نوعِ انسان سے پکار کر کہہ دو کہ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے وہ ضابطہ حیات آگیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔ اگر تم اس کی راہنمائی میں سفرِ زندگی اختیار کرو گے تو اس سے تمہاری ہی ذات کو فائدہ پہنچے گا۔ (اب یہ تمہارے اپنے فیصلے پر منحصر ہے کہ تم کونسی راہ اختیار کرنا چاہتے ہو) میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ تمہیں زبردستی سیدھی راہ پر چلاؤں۔

عقیدۂ جبر کی تردید

کس قدر عظیم اصول بیان فرمادیا کہ "جو شخص صحیح راستہ اختیار کرے گا اُس کا فائدہ اُسی کو ہوگا جو غلط راستہ اختیار کرے گا اُس کا نقصان اُسی کو ہوگا"۔ اس ابدی اور غیر متبدل قانونِ مکافات نے مسئلۂ تقدیر کی تمام گتھیوں کو سلجھا دیا۔ صحیح اور غلط راستوں کی نشاندہی خدا نے کردی ہے لیکن انسان انہیں اختیار خود کرتا ہے۔ اور جس قسم کی روش اختیار کرتا ہے، اس قسم کے نتائج اس کے سامنے آجاتے ہیں۔

اس پیغام رسانی کے بعد (اے رسول!)

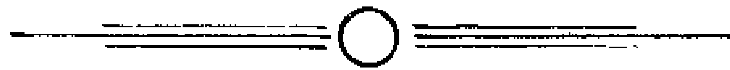
(۱۰/۱۰۹) وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

(تم اس پیغام کو لوگوں تک پہنچا دو) اور خود اس ضابطہ (قرآن) کا اتباع کرتے رہو جو تمہیں وحی کے ذریعے دیا گیا ہے اور اس پر ثابت قدمی سے جمے رہو تاآنکہ خدا کا قانونِ مکافات تم میں اور ان مخالفین میں آخری فیصلہ کردے۔ وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے

اس سے واضح ہے کہ رسول اللہ خود وحی (قرآن کریم) کا اتباع کرتے تھے۔ اس سے یہ مسلّمہ اصول ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ کوئی قول یا عمل جسے رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جائے' اگر وہ قرآن کے خلاف ہے' ــــ تو اس کے متعلق بلا تامّل کہا جا سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ کا نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ کی طرف اس کی نسبت غلط ہے۔ احادیث کے پرکھنے کا یہی معیار ہے (میں اسی کا پابند ہوں)۔

لیکن ہمارا قدامت پرست طبقہ اسے "انکارِ حدیث" کہہ کر پکارتا ہے اور الحاد اور بے دینی قرار دیتا ہے' اس کے خلاف میری روش وہی ہے جسے اختیار کرنے کا حضورؐ کو حکم دیا گیا تھا ــــ یعنی وَاصْبِرْ ــــ اپنی روش پر استقامت سے قائم رہو ــــ حَتّٰی یَحْکُمَ اللّٰہُ ــــ تا آنکہ خدا کا قانون فیصلہ کر دے کہ کس کی روش صحیح ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے فیصلہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میری تیس چالیس سال کی مسلسل جدّوجہد کے بعد' اب یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ احادیث کے پرکھنے کا صحیح معیار یہی ہے۔ اس سے جہاں حضورؐ کی سیرتِ طیّبہ سے وہ داغ دُھل رہے ہیں جو وضعی (خلافِ قرآن) روایات نے لگا رکھے تھے' وہاں قانون سازی کے سلسلے میں اکثر پیچیدگیوں کے دُور ہو جانے کا بھی امکان ہے ــــ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ۔

(نوشتہ ۱۹۸۴ء)



بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گیارہواں پارہ ـــــــــــــــ گیارہویں سورت



پانچواں باب

سُوْرَۃُ ھُوْدٍ

کاروانِ پیامبرانِ انقلاب

۱. رزق کی ذمہ داری نظامِ خداوندی (اسلامی مملکت) کے سر پر ہے۔
۲. مقصودِ حیات — سلسلہ ارتقاء کی منازل طے کرنا۔
۳. اُخروی زندگی اور قرآن پر ایمان لانا لازم وملزوم ہیں۔
۴. مذہبی پیشوائیت خدا کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔
۵. مغرب کے عقل پرستوں کی ناکامی۔
۶. دین تک آنے کے لئے مذہب چھوڑنا ضروری ہے۔ یہی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔
۷. طبقاتی تفریق خلافِ شرفِ انسانیت ہے۔
۸. اپنوں اور بیگانوں کا معیار — نسبی رشتے نہیں، ایمان کا اشتراک۔
۹. مستبد حکام کی اطاعت بھی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔
۱۰. اللہ کی زمین، اللہ کی مخلوق کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔
۱۱. صلوٰۃ کا دائرہ معاشیات کو بھی محیط ہے۔
۱۲. قوموں کے جرائم اور اُن کے نتیجہ میں تباہی۔
۱۳. جرائم اور طبیعی حوادث میں ربط کیا ہے۔
۱۴. تباہی کی مدت کا مفہوم۔
۱۵. سیّئات کا ازالہ حسنات سے ہو سکتا ہے۔

سُوْرَۃُ ھُوْدٍ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(۱۱/۱) الٓرٰ تقف کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۙ

خدائے علیم و رحیم کا ارشاد ہے کہ.... یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جس کے قوانین محکم بنیادوں (مستقل اقدار) پر استوار کئے گئے ہیں اور ایسے واضح اور نکھرے ہوئے انداز سے بیان کئے گئے ہیں (کہ ان میں کسی قسم کا اشتباہ و ابہام نہیں)۔ اس لئے کہ یہ اُس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو حکیم بھی اور خبیر بھی — جو کائنات کے تمام حالات اور انسانی مقتضیات سے واقف ہے اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے۔

آیاتِ قرآنی کے محکم اور متشابہ ہونے کے متعلق مطالب الفرقان جلد چہارم (ص۱۸ تا آخر) میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ وہیں زیرِ نظر آیت کے سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ آیات کے محکم اور متشابہ ہونے کی الگ الگ خصوصیات کے باوجود، قرآن کی جملہ آیات محکم ہیں (۳/۶) یعنی اپنے مقام پر اٹل، غیر متبدل تغیر نا آشنا۔ اسی کو الحق کہتے ہیں جو قرآن کی اساس و بنیاد ہے۔ یہ آیات رسول اللہ کی وساطت سے نوعِ انسان تک پہنچی ہیں۔ وحی کا اوّلین پیام یہ تھا:

(۱۱/۲) اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ

وَ بَشِیۡرٌ ۙ

اس ضابطۂ حیات کی تعلیم کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اطاعت صرف خدائے واحد کے قوانین کی کرو۔ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ (اس باب میں' اور تو اور' خود اس رسولؐ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ بھی تم سے اپنی اطاعت نہیں کراتا۔ وہ خدا ہی کے قوانین کی اطاعت کراتا ہے اور) تمہیں بتاتا ہے کہ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہوں گے اور ان کی خلاف ورزی کرنے کا انجام کیسا تباہ کن ہوگا۔

محکومیت صرف خدا کی

آپ آگے چل کر اس سورۃ میں بھی دیکھیں گے اور قرآن کریم کے دیگر بے شمار مقامات میں بھی وحی کا اوّلین پیغام یہ ہے کہ اطاعت اور محکومیت خدا کے سوا کسی کی جائز نہیں۔ حتیٰ کہ رسول کی بھی حیثیت یہ ہوتی تھی کہ وہ خود اس وحی کی اطاعت کرتا تھا اور دوسروں کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا تھا کہ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے تمہیں کس قدر خوشگواریاں میسر آئیں گی' اور ان کی خلاف ورزی کرنے سے زندگی کتنی شقتوں میں گزرے گی (۲۰/۱۲۳)۔

(۱۱/۳) وَّاَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّکُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَیۡہِ یُمَتِّعۡکُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی وَّ یُؤۡتِ کُلَّ ذِیۡ فَضۡلٍ فَضۡلَہٗ ؕ وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ کَبِیۡرٍ ﴿۳﴾

(اس سلسلہ میں وہ تم تک خدا کا یہ پیغام بھی پہنچاتا ہے کہ) تم خدا کے قانونِ ربوبیت سے اپنی حفاظت کا سامان طلب کرو اور تمام گوشوں سے ہٹ کر صرف اسی کے قانون کی طرف رجوع کرو۔ وہ تمہیں ایک مدتِ معینہ تک (جس کا تعین خود تمہارے اعمال و کردار کے

مطابق ہوگا) نہایت خوشگوار اور پسندیدہ سامانِ زیست سے بہرہ یاب کرے گا اور
تم جس قدر حصولِ معاش کی استعداد بڑھاتے جاؤ گے، وہ اسی قدر معاشی آسائشیں
بہم پہنچاتا جائے گا. لیکن اگر تم اس اصول سے انحراف کرو گے، تو مجھے اندیشہ ہے کہ
تم پر سخت تباہی آجائے گی۔

پہلی بات یہ کہی کہ قرآن کی اطاعت سے (اُخروی زندگی کی سعادتیں تو الگ رہیں) اسی زندگی میں خوشگواریاں میسر آجائیں گی. "متاع" قرآن کے معاشی نظام کی اہم اصطلاح ہے جس کا مفہوم مطالب الفرقان جلد پنجم (ص۱۷۴) میں بتایا جا چکا ہے۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ رزق کی یہ فراوانیاں تمہاری محنت اور استعداد کی نسبت سے بڑھیں گی (اس کی تفصیل سابقہ جلدوں میں "معاشی نظام" کے زیرِ عنوان دیکھیے. یہ حصولِ رزق کا بنیادی اصول ہے جس سے اعراض برت کر کہیں پناہ نہیں مل سکتی)۔

(۱۱/۴) اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

یاد رکھو! اس کے قانون سے روگردانی کر کے، تم کہیں پناہ نہیں لے سکتے. تمہاری زندگی
کی ہر گردش کا رُخ اسی کی طرف ہے اور تمہارے ہر عمل کا نتیجہ اسی کے مطابق مرتب
ہوتا ہے. اس نے عمل اور اس کے نتیجے کے لئے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں اور ان پر
اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے (اس لئے انسان کا کوئی عمل، خدا کے قانونِ مکافات
کی زد سے بچ نہیں سکتا)۔

لیکن اس قانون کی پابندی خلوصِ دل سے کرنی ہوگی، منافقت سے نہیں کہ سود لو اور اسے "منافع" کہہ کر لوگوں کو دھوکا دو. یا اس خود فریبی میں مبتلا ہو جاؤ کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے جائز ہے. یہ قطعاً جائز نہیں. انہی منافقین کے متعلق کہا کہ وہ ہوتے دراصل کچھ اور ہیں اور اپنے آپ کو ظاہر کچھ اور کرتے ہیں۔

(۱۱/۵) اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ۭ
اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ

وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

منافقت لہذا، ان کی کوشش کہ یہ دُہری شخصیت کی زندگی بسر کریں ——— سینے کے اندر چھپا کر کچھ اور رکھیں اور باہر کچھ اور ظاہر کریں ——— اور اس طرح سمجھ لیں کہ ہم اس کے قانون کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں یا اپنی شخصیت کو یکسر چھپانے کی کوشش کریں (۴/۴۲) تو یہ اس کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے)۔ اس لئے کہ جو کچھ یہ چھپائیں اور جو کچھ یہ ظاہر کریں، خدا کے قانونِ مکافات پر سب کچھ عیاں ہے۔ وہ تو دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے (۷/۱)۔

آیت میں يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ آیا ہے۔ ثَوْب کے معنے کپڑا ہیں جس کی جمع ثِيَاب ہے۔ لیکن عرب اس سے مراد کسی کی شخصیت لیتے ہیں ـــ یعنی خود کپڑے پہننے والا۔ چنانچہ سورہ المدثر میں جہاں نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۷۴/۴)، تو اس کے معنے یہ نہیں کہ تم اپنے کپڑوں کو پاک اور صاف رکھو، اس کے معنے یہ ہیں کہ آپ اپنی شخصیت، اپنی ذات کو پاکیزہ رکھیں۔ زیرِ نظر آیت میں يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ کے معنے یہ ہیں کہ یہ لوگ اپنے آپ کو کپڑوں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ یہ اپنی حقیقی شخصیت یا سیرت و کردار کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔ ہوتے کچھ ہیں، اور اپنے آپ کو دکھاتے کچھ اور ہیں۔

اِسی سے لفظ ثواب ہے جس کا مفہوم جلد چہارم میں بیان ہو چکا ہے۔ (دیکھئے انڈکس)۔

شروع بارھواں پارہ

آیت (۱۱/۳) میں حصولِ معاش کا ذکر آیا تھا۔ جیسا کہ آپ سابقہ جلدوں میں، قرآن کے معاشی نظام کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں، اس نظام کی اساس اس مسلّمہ پر ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری، اسلامی مملکت پر عائد ہوتی ہے۔ معاشی نظام کی تمام جزئیات اسی محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔ اس اساس اور بنیاد کو اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے:

(۱۱/۶) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِينٍ ○

(پہلے بتایا جاچکا ہے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے رزق کی فراوانیاں حاصل ہوتی ہیں (۱۱/۳) لیکن یہ فراوانیاں کسی خاص گروہ کے اندر محدود ہو کر نہیں رہ جانی چاہئیں۔ رزق زندگی کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اسے ہر ذی حیات تک حسبِ ضرورت پہنچنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے

رزق کی ذمہ داری

کہ از روئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے نہ لے رکھی ہو۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ ایک ذی حیات کو کسی ایک منزل میں ٹھہرنے پھر قانونِ ارتقاء کی رو سے اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے کس قدر اور کون سے سامانِ نشوونما کی ضرورت ہوگی (۶/۹۹)۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کی کتاب میں واضح طور پر درج ہے (۲۹/۵۵)۔ لہٰذا منشائے خداوندی کو پورا کرنے والا نظام وہی ہوسکتا ہے جس میں کوئی ذی حیات رزق سے محروم نہ رہنے پائے۔ جو نظام خدا کی ان ذمہ داریوں کو پورا کرے گا، وہی نظامِ خداوندی کہلا سکے گا۔ ۶/۱۵۲؛ ۲۹/۶۰؛ ۴۱/۱۰؛ ۳۶/۴۷)۔

تمام افرادِ معاشرہ (بلکہ اس معاشرہ کے زیرِ تحویل تمام ذی حیات) کی ضروریاتِ زندگی کا فراہم کر دینا اسلامی نظام کا فریضہ ہے۔ یہ آیت قرآن کے معاشی نظام کی اساس و بنیاد ہے۔

قرآنِ کریم میں **دَآبَّةٍ** کا لفظ رینگنے والے جان داروں اور دو پاؤں پر اور چار پاؤں پر چلنے والے جانوروں سب کے لئے آیا ہے (۲۴/۴۵)۔ اسی لئے اس میں مجموعی طور پر انسانوں سمیت تمام ذی حیات آجاتے ہیں (۱۶/۶۱؛ ۲۲/۱۸؛ ۳۵-۲۸/۳۵)۔ اس کی اسی جامعیت کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ انسان تو ایک طرف، اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا، تو عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہوگی۔

زیرِنظر آیت میں مستقر اور مستودع کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ان کا مفہوم مطالب الفرقان، جلد پنجم صفحہ ۸۶ پر پیش کیا جا چکا ہے[1]۔ اس میں سلسلۂ ارتقاء کی تمام کڑیاں آجاتی ہیں۔ اس کے بعد تخلیقِ ارض و سماء اور ذی حیات نفوس کے ضمن میں ارتقاء کا اصول سامنے لایا گیا ہے۔

(۱۱/۷) وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

اس کا نظام یہ ہے کہ اس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو گوناگوں عناصر سے ترکیب دے کر مختلف ادوار اور منازل سے گزارا (تاآنکہ وہ اس قابل ہو گئے کہ ان میں ذی حیات اشیاء کی نشوونما ہو سکے۔ اس نے زندگی کی بنیاد پانی پر رکھی ۲۱/۳۰) اور اس پر مرکزی کنٹرول اپنا رکھا پھر ذی حیات اشیاء میں موت اور زندگی کی کشمکش رکھی تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ تم میں سے کون توازن بدوش زندگی بسر کر کے حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے (۶۷/۲)۔ (توازن بدوش زندگی وہ بسر کرتا ہے جو زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے ۵ — ۹۲/۷؛ ۹۲/۱۸)۔ اس سے وہ نظام قائم ہو جاتا ہے جس میں رزق ہر ذی حیات تک پہنچتا چلا جاتا ہے (یاد رکھئے! اعمالِ حسنہ وہ ہیں جن سے خوشگوار زندگی حاصل ہوتی ہے، اس دنیا میں عزت و وقار کی زندگی اور آخرت میں حیاتِ جاوید ۸/۲۴؛ ۷۰/۳۶)۔

پانی۔ مدارِ زندگی

جو لوگ ان بنیادی حقائق کو تسلیم نہیں کرتے، اگر ان سے کہا جائے کہ زندگی کا سلسلہ

[1] مزید دیکھئے اگلا صفحہ (۴۳۳)۔

موت کے بعد بھی آگے چلتا ہے، تو وہ کہہ دیں گے کہ یہ ایک کُھلا ہوا جھوٹ ہے. زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے (۴۵/۲۴).

مطالب الفرقان، جلد دوم، باب اوّل میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رُو سے نظریۂ ارتقا کا کیا مفہوم ہے. کس طرح زندگی کی ابتدا. پانی سے ہوئی اور خدا کے عرش کے پانی پر ہونے سے مراد کیا ہے (مطالب الفرقان، جلد دوم ص۶۷، ۶) ضمناً ۔ مطالب الفرقان، جلد چہارم ص۱۳۰ پر بتایا گیا ہے کہ (عرش کے قرآنی مفہوم کے برعکس) ہماری روایات اس کا کیا تصور پیش کرتی ہیں. اس سلسلہ میں ایک اور روایت بھی ملاحظہ فرمایئے. مشکوٰۃ میں ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ ایک دیہاتی کو منجملہ دیگر امورِ خدا کے متعلق سمجھا رہے تھے. آپؐ نے فرمایا:

عرش کا روایاتی مفہوم

"تو جانتا ہے خدا کی عظمت کیا ہے؟ اس کا عرش اس کے آسمانوں پر محیط ہے...... عرش کے اس قدر بڑا ہونے کے باوجود، اس کی کیفیت یہ ہے کہ (جب خدا اس پر بیٹھتا ہے تو) وہ اس طرح چرچراتا ہے جس طرح اونٹ کا کجاوا چرچراتا ہے، جب کوئی اس پر سوار ہوتا ہے"

(بحوالہ ابوداؤد، مشکوٰۃ، جلد دوم، اردو ترجمہ ص۳۴۸)

قانونِ ارتقا یہ ہے کہ جو نوع جس مرحلہ میں ہے، اگر وہ اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے تو وہ زندہ رہتی ہے. اس طرح وہ مرحلہ اس کا مستقر بن جاتا ہے. لیکن ارتقا کسی مقام پر رُک جانے کا نام نہیں. اس سے مقصود آگے بڑھنا ہے. لہٰذا، جو نوع اتنی صلاحیت پیدا کر لے جس سے وہ اپنے اس مقام (مستقر) سے آگے بڑھ جائے تو اس طرح زندگی کی اگلی (اور بلند) منزل میں پہنچ جاتی ہے (یہ مقام اس کا مستودع ہوتا ہے). اگر وہ اپنی جدوجہد کو جاری رکھتی ہے تو یہی مستودع اس کا مستقر بن کر اسے اگلے مرحلہ میں جانے کے قابل بنا دیتا ہے.

قانونِ ارتقا

سورہ المدثر ہے: كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (۷۴/۳۸) ہر فرد اپنے اعمال کے دائرے میں محصور ہوتا ہے". اس سے پہلے ہے: لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ (۷۴/۳۷) جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے اور جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے. "مشروبِ جنت" کی خصوصیت کے متعلق کہا: وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ (۸۳/۲۶)" اس سے آگے

بڑھنے کے متمنی آگے بڑھ سکتے ہیں"۔

زیرِ نظر آیت (۱۱/۷) میں خدا کے تخلیقی نظام کے بعد کہا: لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ یہ نظامِ کائنات اس حسن و خوبی سے اس لئے مصروفِ گردش ہے کہ تمہیں مواقع بہم پہنچائے کہ تم ایسے کام کر سکو جن سے تم سلسلۂ ارتقا میں آگے بڑھنے کے قابل ہو سکو۔

حیوانات تک ارتقا صرف طبیعی (جسمانی) ہوتا ہے۔ لیکن انسانی سطح پر پہنچ کر، یہ ارتقا انسانی نفس (یا ذات) کا ہوتا ہے۔ جو اعمال نفسِ انسانی میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کریں، انہیں نیک کام، عملِ خیر یا اعمالِ حسنہ کہا جاتا ہے۔ جو اس کے آگے بڑھنے کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں، وہ بُرے کام، عملِ شر یا اعمالِ غیر صالح قرار پائیں گے (جہنم کو جحیم اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت کو سلب کر لیتی ہے)۔

ان تشریحات کے پیشِ نظر" لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا " کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔ جس ذات (نفس) میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، علم النفس کی اصطلاح میں اسے متوازن ذات کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے " اَحْسَنُ عَمَلًا " کہہ کر پکارا

ہے۔ حُسن نام ہی توازن کا ہوتا ہے۔

متوازن شخصیت میں مرنے کے بعد کی زندگی میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لئے آیت (۱۱/۷) کے آخری حصہ میں اُخروی زندگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو لوگ اُخروی زندگی کے امکان ہی سے انکار کرتے ہوں، وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے لئے اعمالِ حسنہ یا ابدی اقدار کی پابندی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جن اعمال سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے

ان میں انفاق (یعنی دوسروں کی نشو و نما کے لئے اپنی زائد از ضرورت دولت کو اسلامی نظام کی تحویل میں دے دینا تاکہ وہ تمام افراد کو فراہمیٔ رزق کی ذمہ داری کو پورا کر سکے) سرِ فہرست آتا ہے۔ اَلَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸)۔ "جو اپنا مال دے دیتا ہے تاکہ اس کی ذات کی نشو و نما ہو جائے"۔

حیاتِ اُخروی تو ایک طرف، ان لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ انہیں اس دنیا میں بھی قانونِ مکافات کی نتیجہ خیزی پر یقین نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ تاخیر ہو جاتی ہے تو یہ اس کا مذاق اڑانے لگ جاتے ہیں۔

(۱۱/۸) وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ

لَيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

(یہ ہے نہ ماننے والوں کی وہ جماعت جسے رسولؐ ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا ہے۔ ۱۱/۲ لیکن) خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ظہورِ نتائج — یعنی

قانونِ مُہلت

پاداشِ عمل — کا وقت، ایک معیّنہ میعاد کے بعد آتا ہے. اس وقفہ کے دوران، ان کی طرف سے طعن وتشنیع شروع ہو جاتی ہے کہ کہاں ہے وہ تباہی جس کی تم اس طرح دھمکیاں دے رہے تھے؟ وہ کونسی چیز ہے جس نے اسے، ہم تک آنے سے روک رکھا ہے؟ ان سے کہہ دو کہ اس حقیقت کو بگوشِ ہوش سُن رکھو کہ وہ تباہی آکر رہے گی اور جب وہ آئے گی تو دنیا کی کوئی قوّت اسے روک نہیں سکے گی. نہ وہ کسی کے ٹالے ٹل سکے گی، نہ ہی کوئی اس کا رُخ دوسری طرف پھیر سکے گا. اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ جس چیز کا تم مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے تمہیں کس طرح چاروں طرف سے گھیر لیا.

اس کے بعد انسان کی عجلت پسندی اور بے صبری کی کیفیت بیان کی گئی ہے. اس کا ذکر پہلے بھی متعدد مقامات پر آچکا ہے.

(۱۱ / ۹-۱۰) وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝

انسان (جب ہمارے ضابطۂ حیات پر ایمان نہیں رکھتا (۱۱/۱۱) تو اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ زندگی کی جو آسائش اسے میسّر ہو، اگر وہ اس سے چھن جائے تو اس

انسان کی عُجلت پسندی کے لئے تمام ممکناتِ حیات، تاریکی کے پردوں میں گم ہو جاتے ہیں اور یوں وہ اپنی ذات کے لامحدود ممکنات اور مضمر صلاحیتوں سے انکار کر کے زندگی سے یکسر مایوس ہو جاتا ہے۔ (اس لئے کہ اس کے نزدیک، زندگی نام ہی آسائشوں کا ہوتا ہے (۹)۔

اور اگر اسے اس تکلیف کے بعد پھر سامانِ آسائش مل جائے، تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ بس میری تمام مصیبتیں رفع ہو گئیں اور اس طرح وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور شیخیاں بگھارتا ہے اور ڈینگیں مارتا پھرتا ہے۔ (گویا اسے زندگی کا مقصود حاصل ہو گیا)۔

ان کے برعکس:

(۱۱/۱۱) اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ○

لیکن جو لوگ (حیوانی سطح سے بلند ہو کر، زندگی کی انسانی سطح پر یقین رکھتے ہیں، اُن کی حالت اِن کے برعکس ہوتی ہے۔ وہ عسر اور یُسر — تنگی اور آسائش — دونوں حالتوں میں ایک ہی روش پر چلتے ہیں اور) اس پروگرام پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں کو ابھارتا اور معاملات کو سنوارتا ہے، (وہ نہ مشکلات سے گھبرا کر مایوس ہوتے ہیں نہ آسائشوں پر اترا کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں)

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے، زندگی کی تباہیوں سے محفوظ رہنے کا سامان اور بلندیاں اور توانائیاں پیدا کرنے والا اجرِ عظیم ہے۔

سابقہ سورۃ کی آیت (۱۰/۱۵) کے تحت بتایا جا چکا ہے کہ مخالفین رسول اللہ کے ساتھ مفاہمت کی بھی کوشش کرتے تھے اور ان کی اس خواہش کو بڑی سختی سے مسترد کر دیا گیا تھا۔ وہ معجزات کی بھی فرمائش کرتے تھے۔ اس سے بھی انکار کیا گیا تھا۔ یہاں انہی حقائق کا اعادہ کیا گیا ہے۔

(۱۲/۱۲) فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَاۗىِٕقٌۢ

بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِيْلٌ ؕ○

(اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں سے جو کہا جاتا ہے کہ ان پر تباہی آنے والی ہے، تو یہ بات انہیں سخت ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن) یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تو ان کی دل جوئی کے لئے وحی کے ان مقامات کو ترک کر دے جن میں اس قسم کی تنذیرات آتی ہیں۔

معجزات طلبی یہ بھی ٹھیک ہے کہ یہ لوگ جب کہتے ہیں کہ اگر تو خدا کا رسولؐ ہے تو تجھ پر خزانے کیوں نہیں اتارے جاتے۔ یا فرشتے تیرے جلو میں کیوں نہیں چلتے تو ان کی ان طعن آمیز باتوں سے تُو افسردہ خاطر ہو جاتا ہے۔ لیکن تو جب فریضۂ رسالت وانذار کے لئے مامور کیا گیا ہے تو یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔ (یہ ذمہ داری بڑی سخت اور یہ فریضہ بڑا مشکل ہے۔ لیکن اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں) اللہ کا قانون ہر معاملہ کی کارسازی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ (اس لئے مآلِ کار سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۲ــ ۹۴/۱)۔

آپ غور کیجئے کہ ایک داعیٔ انقلاب کے مراحلِ کشمکش کس قدر صبر آزما اور استقامت طلب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اصولوں کے خلاف نہ کوئی تدبیر اختیار کر سکتا ہے نہ ہی مفاہمت اختیار کر سکتا۔ چنانچہ جب وہ (مخالفین) اُدھر سے مایوس ہو گئے تو پھر اس اعتراض پر اُتر آئے جسے وہ متعدد بار پیش کر چکے تھے یعنی یہ کہ وحی وغیرہ کا دعوٰے (معاذ اللہ) ڈھونگ ہے۔ قرآن اس مدعیٔ رسالت کے اپنے ذہن کی تخلیق ہے۔ ان کا اعتراض اور اس کا وہی جواب جو ہر بار دیا جاتا رہا، بارِ دیگر دہرایا گیا ہے۔

(۱۱/۱۳) اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ

دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ○

یا' یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن اپنی طرف سے بنالیا ہے اور اسے خدا کی طرف یونہی منسوب کر رہا ہے۔ ان سے کہو کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو (کہ یہ خدا کی کتاب نہیں' انسان کا کلام ہے) تو تم' اس قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور جسے بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہو کرلو۔ بات صاف ہو جائے گی (۲/۲۳؛ ۱۰/۳۸)۔

(۱۱/۱۴) فَاِلَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰہِ وَ اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ○

لیکن اگر (نہ تو تم خود ہی ایسا کر سکو اور نہ ہی) وہ لوگ تمہاری اس دعوت کو قبول کریں جنہیں تم اس مقصد کے لئے' اپنے ساتھ ملانا چاہو' تو اس کے بعد تمہیں جان لینا چاہیئے کہ یہ قرآن' علمِ خداوندی کی رُو سے نازل ہوا ہے (رسولؐ کا خود ساختہ نہیں) اور اس سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ کائنات کا تمام اقتدار صرف خدا کے لئے ہے' اس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم اس کے بعد بھی اس ضابطۂ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرو گے؟

یہاں پھر ان بنیادی حقائق کو دہرایا گیا جو پہلے بھی سامنے لائے جا چکے ہیں' یعنی

(۱) یہ لوگ' جو اتنی وضاحتوں کے باوجود قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زندگی' اس دنیا کی زندگی کو سمجھتے ہیں' حیاتِ اُخروی کے قائل نہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: وَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ جَعَلۡنَا بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا ۙ (۱۷/۴۵) "جب تو اُن کے سامنے قرآن پیش کرتا ہے' تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے' اُن کے اور قرآن کے درمیان ایک حجاب حائل ہو جاتا ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے"۔ لہٰذا قرآن پر ایمان لانے کی اوّلین شرط' اس حقیقت کا تسلیم کرنا ہے کہ زندگی صرف انسان کی طبیعی زندگی کا نام نہیں جس کا تعلق اس کے طبیعی جسم سے ہے اور جو موت کے

قرآن کا چیلنج

ساتھ ختم ہو جاتی ہے. طبیعی جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور شے بھی ہے جسے اس کا نفس یا ذات کہتے ہیں' جو طبیعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے. اسی کو حیاتِ آخرت کہتے ہیں. قرآنی تعلیم کا مقصد جہاں انسان کو اس دنیا کی خوشگواریوں کا حامل بنا دینا ہے' وہاں اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ اس کے نفس کی اس طرح تربیت کر دی جائے کہ اس میں زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے.

اُخروی زندگی پر ایمان

سو ظاہر ہے کہ جو شخص زندگی کے اس تصور ہی کا قائل نہیں' وہ قرآن پر کیسے ایمان لا سکتا ہے؟

(۲) اگلا نکتہ یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ طبیعی اسباب و ذرائع کی رُو سے حاصل ہو سکتا ہے' اس میں کافر و مومن میں کوئی تمیز نہیں ہوتی. جو شخص بھی' قوانینِ فطرت کے مطابق طبیعی اسباب و ذرائع سے کام لے کر کوشش کرے گا' وہ طبیعی مفاد حاصل کرے گا. تفصیل ان امور کی سابقہ جلدوں میں آ چکی ہے.

یہاں فرمایا:

(۱۵-۱۶ / ۱۱) مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

(لیکن اگر تم' اس کے باوجود' اپنی مفاد پرستیوں ہی کو زندگی کا مقصود بنائے رکھو' تو تمہیں یہ مفاد حاصل رہیں گے. اس لئے کہ) ہمارا قانون یہ ہے کہ جو شخص صرف طبیعی زندگی کے مفاد اور زیب و زینت چاہتا ہے' اس کی کوششوں کے پورے پورے نتائج اُسے اِسی دنیا میں مل جاتے ہیں. اس میں کسی قسم کی کمی نہیں جاتی (۱۸/ ۱۷).

لیکن ان لوگوں کا مستقبل (حیاتِ آخرت) کی خوشگواریوں میں کوئی حصہ نہیں

ہوتا (۴۶/۲۰) اُن کا اِس دنیا کا ساختہ پرداختہ (آخرت میں) سب اکارت چلا جاتا ہے اور اُن کا کیا کرایا سب غارت ہو جاتا ہے۔ ان کے لئے وہاں ایسی تباہی و بربادی ہو گی جو سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گی (۱۶)۔

اس کے برعکس:

(۱۱/۱۷) أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

پہلے کہا جا چکا ہے کہ قرآن کی صداقت کے سمجھنے کے تین طریقے ہیں: علم و بصیرت کی رُو سے یا اس کے عملی پروگرام کے نتائج کو دیکھ کر اور یا تاریخی شواہد کی رُو سے (۱۰/۳۹)۔

تم ذرا سوچو کہ کیا وہ شخص جو (۱) اس عقل و بصیرت سے کام لے جو اُسے اُس کے نشوونما دینے والے کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور (۲) وہ دیکھے کہ ایک شخص ضابطہ خداوندی کے مطابق کام کرتا ہے اور اس کے اعمال کے نتائج اس ضابطہ کی صداقت کی عملی شہادت بنتے جا رہے ہیں، اور (۳) تاریخ کے یہ نوشتے بھی اس کے سامنے ہوں کہ اس سے قبل (مثلاً) موسیٰؑ نے بھی اس قسم کے ضابطہ خداوندی کو اپنایا اور اپنی قوم کا راہ نما بنایا تھا تو اس سے انہیں کس قدر زندگی کی فراوانیاں مرحمت ہو گئی تھیں ————

(تو کیا ایسا شخص کبھی اس ضابطہ کی صداقت سے انکار کر سکے گا؟ کبھی نہیں) یہی وہ لوگ ہیں جو اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔

ان کے برعکس، جو لوگ، اس سے انکار کرتے ہیں، وہ پارٹی سے متعلق ہوں ان کا ٹھکانا تباہی و بربادی کا جہنم ہے۔ تم (ان لوگوں کے انجام و مآل کے بارے میں) ذرا بھی شک نہ کرو۔ یہ ایک حقیقت ہے جو خدا کے قانون کے مطابق واقع ہو کر رہے گی۔ لیکن اکثر لوگ (ایسے واضح دلائل و براہین کے باوجود) اس کا یقین نہیں کرتے۔

مندرجہ بالا مفہوم سے آیت کے معانی واضح ہو جاتے ہیں۔ مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد ہے:

(۱۱/ ۱۸-۱۹) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○

(یہود و نصاریٰ کے مذہبی پیشوا کہتے ہیں کہ چونکہ قرآن کے احکام ان کی شریعت کے خلاف ہیں، اس لئے یہ منجانب اللہ نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جسے یہ شریعتِ خداوندی کہتے ہیں وہ ان کی خود ساختہ شریعت ہے اور اسے یہ منسوب خدا کی طرف کرتے ہیں۔ سو ذرا غور کرو کہ) اُس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو اپنے ذہن سے باتیں وضع کرے اور انہیں دینِ خداوندی کہہ کر پیش کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو عدالتِ خداوندی میں پیش ہوں گے، اور گواہی دینے والے اس کی تصدیق کریں گے کہ انہوں نے فی الواقع اپنے رب کے خلاف بہتان باندھا تھا ـ یاد رکھو! اس قسم کے ظالم، زندگی کی شادابیوں اور سرفرازیوں سے محروم رہ جاتے ہیں (۱۸)۔

ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے خود ساختہ مسلک کو، شریعتِ خداوندی کا نام دے

مذہبی پیشواؤں کی فریب کاریاں کہ، لوگوں کو خدا کے سچے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس صاف اور سیدھے راستے میں خواہ مخواہ پیچ و خم پیدا کر دیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ مستقبل کی زندگی (حیاتِ اُخروی) پر ایمان ہی نہیں رکھتے (مذہب کو انہوں نے اپنا پیشہ بنا رکھا ہے)(۱۹)۔

مذہبی پیشواؤں کی دسیسہ کاریوں کا ذکر اس سے پہلے بھی کئی بار آ چکا ہے۔ یہاں پھر ان کی سازشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر دینِ خداوندی اپنی اصل شکل میں رہے تو عوام اسے کبھی نہ چھوڑیں۔ لیکن یہ اس میں پیچیدگیاں پیدا کر کے اسے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ یوں یہ اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں یہ حقائق بیان، تو اس طرح کئے جاتے ہیں جیسے یہ کسی اور مذہب (بالخصوص یہودیت) کی داستان ہو، لیکن یہ کسی خاص قوم یا خاص مذہب سے مختص نہیں۔ یہ ایسے حقائق ہیں جن کا تعلق ہر مذہب اور مذہب پرست قوم سے ہے۔ آپ خود اپنے ہاں مذہبی پیشوائیت کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالیے۔ انہوں نے خارج از قرآن اور غیر از قرآن عقائد، رسوم و عبادات کو اس شد و مد سے عام کر رکھا ہے کہ عوام

ہماری مذہبی پیشوائیت دینِ خالص کو خلافِ اسلام سمجھنے لگ گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن کی بات کرتا ہے تو (مذہبی پیشواؤں کے اکسانے پر) عوام اس طرح اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں گویا وہ انہیں دین سے بہکا رہا اور (اپنی طرح) ملحد و بے دین بنا رہا ہے۔ یہ ہوتی ہے مذہبی پیشوائیت کی تکنیک، خواہ وہ کسی مذہب سے متعلق ہوں۔ انہی مذاہب میں اب اسلام بھی شامل ہو چکا (یا کر دیا گیا) ہے۔ لہٰذا زیرِ تشریح آیت میں نظر بظاہر بات یہودیت یا عیسائیت کے مذہبی راہنماؤں کی ہو رہی ہے، لیکن درحقیقت یہ ابدی حقائق ہیں جن کا اطلاق ہر قوم اور ہر زمانے کے مذہبی پیشواؤں پر یکساں ہوتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود ان لوگوں کی دینِ خداوندی کو مٹانے کی مذموم مساعی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ حق اپنے زور دروں سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

(۱۱ / ۲۰-۲۲) أُولَٰئِكَ لَمْ يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ

لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ○

لیکن یہ خدا کے قانونِ مکافات سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے. نہ ہی قانونِ خداوندی کے سوا، ان کا کوئی کارساز ہو سکتا ہے. (جس قدر ان کی سرکشی بڑھتی جا رہی ہے، اسی نسبت سے) ان کی سزا میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے. ایک تو ان کی اپنی غلط روی کی وجہ سے اور دوسرے اس لئے کہ یہ اوروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں. یہ اس لئے کہ (انہوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ایسی حالت پیدا کر لی ہے کہ) نہ ان میں حق بات سننے کی تاب رہی ہے اور نہ ہی یہ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں (۲۰).

یہ لوگ، اپنی اس روش سے کسی اور کا کچھ نقصان نہیں کر رہے. ان کی افترا پردازیاں سب اکارت چلی جائیں گی (۲۱).

(انہیں اس سے کچھ دنیاوی فائدے ضرور حاصل ہو جاتے ہیں لیکن) یہ حقیقت ہے کہ آخرت میں یہ لوگ سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے. ان کا مستقبل بیحد خراب ہوگا (۲۲).

آپ غور کیجئے! دنیا میں جن اقوام نے علم و عقل سے کام لینا شروع کیا، ان میں مذہب یا تو سرے سے مٹ ہی گیا (جیسے روس یا چین) یا اُن کی پرستش گاہوں کی چار دیواری میں محبوس ہو کر رہ گیا (جیسے انگلینڈ وغیرہ) لیکن انہوں نے جب اس آکاس بیل کو اتار پھینکا تو ان کے شجرِ حیات میں برگ و بار آنے شروع ہو گئے اور وہ زمین کی پستیوں سے اُبھر کر آسمان کی بلندیوں تک پہنچ گئے. لیکن چونکہ (بدقسمتی سے) اُن

کے ہاں خدا کا دین موجود نہیں تھا' اس لئے ان کی یہ تمام کوششیں، طبیعی زندگی تک محدود ہو کر رہ

باہمی فساد انگیزیاں

گئیں اور بین الاقوامی رقابتوں کی وجہ سے باہمی فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کا موجب بن گئیں۔ لہٰذا' قرآن نے جو کہا تھا کہ..... لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝ (۱۱/۲۲)۔ "آخر کار یہ لوگ سخت خسارے ہی رہیں گے"۔ تو مذہبی پیشوائیت ان عقل پرستوں کے ہاتھوں لُٹ اور پِٹ گئی' اور عقل پرست' وحی کی روشنی سے محرومی کی وجہ سے تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ جب یہ اس قسم کی ہمت شکن صحرانوردیوں سے تھک جائیں گے تو انہیں وحی کی روشنی کی تلاش ہو گی۔ اُس وقت کاروانِ انسانیت' اپنی منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہوگا۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔ ان عقل پرستوں کا بہرحال انسانیت پر احسان ہے کہ انہوں نے اسے مذہبی پیشوائیت کے فالج سے نجات دلا دی۔ امید ہے کہ اس کے بعد وہ جس سرسام کا شکار ہو گئے ہیں اس سے بھی جلد نجات حاصل کریں گے۔ مغرب کے اربابِ فکر و دانش موجودہ حالات کے ہاتھوں بیحد مضطرب و بے قرار اور وحی کی روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

ان کے مقابلہ میں :—

(۱۱/۲۳) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

کامیاب لوگ

ان کے برعکس، جو لوگ' ضابطۂ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں جو ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرتا ہے اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے کام سنوارتا ہے۔ اور (اس طرح) اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کے سامنے عملاً سر جھکاتے ہیں' تو یہی لوگ ہیں جو زندگی کی سدا بہار شادابیوں سے بہرہ یاب ہوں گے۔

مذہبی پیشوائیت اور دین کے علمبرداروں کا تقابل ملاحظہ فرمائیے :

(۱۱/۲۴) مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ

وَ السَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۚ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

عقل کے اندھے

ان دونوں گروہوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرہ ہو اور ایک دیکھنے اور سننے والا۔ کیا ان دونوں کی حالت یکساں ہو سکتی ہے؟ (۱۹ — ۱۶/۱۳؛ ۱۹/۳۵)۔ کیا اس کے بعد بھی تم سمجھتے سوچتے نہیں (کہ زندگی کی صحیح راہ کونسی ہو سکتی ہے؟)۔

یہاں سے یونہی آگے نہ بڑھ جائیے۔ ایک ثانیہ کے لئے رُکئے اور غور کیجئے کہ مومن اور کفار، اہل جنت اور جہنم کی امتیازی خصوصیات، کیا بتائی گئی ہیں۔ مومن اور اہل جنت دیکھنے اور سننے والے۔ کفار اور اہل جہنم اندھے اور بہرے۔ تقابل عقل اور جہالت کا کیا گیا ہے۔ جب قوم مذہبی پیشوائیت کی پھیلائی ہوئی جہالت کی تاریکی سے نکلے گی تو دین کی روشن فضا میں پہنچے گی۔ لہٰذا، دین تک آنے کے لئے قدمِ اوّل، مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے آزادی

عقل اور جہالت

حاصل کرنا ہے۔ یہ وہ مرحلۂ لَآ ہے جسے طے کئے بغیر آپ منزلِ اِلَّا میں نہیں پہنچ سکتے اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ؟ کیا آپ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے؟ مذہب کو چھوڑے بغیر دین اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کعبہ سے "تین سو ساٹھ بت" نکال باہر نہیں کئے جاتے، وہ بیت اللہ (خدا کا گھر) نہیں بن سکتا۔ تاریخی کوائف اس کے شاہد ہیں۔ شروع سے یہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ (مثلاً)

(۱۱ / ۲۵-۲۶) وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۝

(اگر یہ لوگ، ان واضح دلائل کے بعد بھی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے، تو پھر ان کے سامنے وہ تیسرا طریق لاؤ (۱۰/۳۹) یعنی ان سے کہو کہ وہ تاریخ کی شہادت پر غور کریں اور دیکھیں کہ جب اقوامِ گذشتہ نے اس حقیقت سے انکار کیا تو ان کی روش کا

نتیجہ کیا برآمد ہوا) (مثلاً) ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور اس نے ان سے کہا کہ میں تمہیں واضح طور پر بتانے کے لئے آیا ہوں کہ تمہاری موجودہ روش کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں (۲۵)۔

تمہیں چاہیئے کہ اپنی روش کو چھوڑ کر صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور محکومیت اختیار کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تمہیں بہت بڑی تباہی گھیرے گی (۲۶)۔

قرآن کریم سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی ابتداء حضرت نوحؑ سے کرتا ہے۔ اس سورۃ میں حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ (قومِ عاد)، حضرت صالحؑ (قومِ ثمود)، حضرت لوطؑ (قومِ لوط)، حضرت شعیبؑ (قومِ مدین) اور حضرت موسیٰؑ (قومِ فرعون) کا ذکر آیا ہے۔ ہمارا انداز یہ چلا آرہا ہے کہ ان انبیاء یا اقوام کے متعلق جو کچھ پہلے بیان ہو چکا ہے، اس کی بارِ دیگر تشریح صرف ایسے نکات کی کی جاتی ہے جو پہلے نہ آچکے ہوں۔ یہی انداز زیرِ نظر سورۃ میں اختیار کیا جائے گا۔ داستانِ حضرت نوحؑ تفصیلی طور پر مطالب الفرقان جلد پنجم (صفحات ۲۴۷۔۲۱۷) پر بیان کی جا چکی ہے [اور اختصاراً اس جلد میں زیرِ آیات ۷۴-۱۰/۷۱ میں]۔ جلد پنجم میں ان آیات میں سے بھی بیشتر آچکی ہیں جن کا ذکر اس سورۃ میں کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر ان تمام حضرات کی دعوت کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ محکومیت، خدا کے سوا، کسی کی جائز نہیں۔ اور یہ کہ ہم اپنی دعوت و تبلیغ کے لئے کسی معاوضہ کے متمنی نہیں۔ اس تمہید کے بعد اگلی آیات اور ان کا مفہوم ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت نوحؑ کی دعوت کے جواب میں سردارانِ قوم نے کہا؛

(۱۱/۲۷) فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝

داستانِ قومِ نوحؑ | اس پر، اس کی قوم کے بڑے بڑے سرداروں نے، جن کے پاس سامانِ زیست کی فراوانی تھی — یعنی صاحبِ دولت و اقتدار

طبقہ جس نے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی ــــ کہا کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو (اس لئے یہ کیسے مان لیں کہ تم خدا کے رسول ہو)۔ باقی رہے یہ لوگ جو تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں، تو ان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ ہم میں ادنیٰ درجے کے (نیچ قوم کے) لوگ ہیں۔ اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انہوں نے تمہارا مسلک عقل و فکر کی رُو سے اختیار نہیں کیا۔ یونہی، بلا سوچے سمجھے، تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں۔ ہمیں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس میں تمہیں، ہمارے مقابلہ میں، کوئی برتری حاصل ہو۔ لہٰذا، ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم اپنے اس دعوے میں بالکل جھوٹے ہو۔

حضرت نوحؑ نے جواب دیا:

(۱۱ / ۲۸-۳۰) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝

اس پر نوحؑ نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے عطا کردہ علم و بصیرت سے کام لوں۔ اور اس نے مجھے اپنے ہاں سے، بطور موہبت، ایک ضابطۂ ہدایت دیا ہو جو سرتاسر رحمت ہے۔ لیکن تمہیں ان میں سے کوئی بات بھی نظر نہ آئے اور تم اسے بھی پسند نہ کرو کہ ان حقائق کو تمہیں سمجھا

دیا جائے (تو میں اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں، جو کر رہا ہوں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہم ان
باتوں کو زبردستی تمہارے گلے منڈھ دیں (اس لئے کہ ایمان، علم و بصیرت کی رُو سے،
بطیبِ خاطر دل کے فیصلے کا نام ہے۔ اسے یونہی کسی کے گلے منڈھا نہیں جاتا)۔ (۲۸)
پھر اس پر بھی غور کرو کہ میں جو کچھ تمہارے لئے کر رہا ہوں اس کے معاوضہ میں، تم

طبقاتی طریق خلافِ انسانیت ہے

سے کسی مال و دولت کا طالب نہیں (اس لئے
مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ تم سے جھوٹ
بولوں ؟)۔ میری محنتوں کا معاوضہ میرے خدا کے ذمے ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کر سکتا
کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں، انہیں اس لئے نکال باہر کر دوں
(کہ تم انہیں رذیل سمجھتے ہو اور ان کے ساتھ مل بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ اگر میں ایسا کروں
اور یاد رکھو! کوئی رسول بھی ایسا نہیں کرے گا (مثلاً ۲/۵۲) تو یہ جب اپنے رب سے
ملیں گے تو میرے متعلق کیا کہیں گے؟ (یعنی یہ بات، منشائے خداوندی کے سخت خلاف
ہوگی)۔ تم انہیں جاہل کہتے ہو، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے جیسی جاہل قوم کوئی ہے
ہی نہیں (۲۹)۔
میں اگر تمہاری خاطر، ان لوگوں کو ہنکا کر الگ کر دوں تو (تم اس سے بیشک خوش
ہو جاؤ گے، لیکن ذرا سوچو کہ) قانونِ خداوندی کی رُو سے، اس جرم کی جو سزا مجھ پر
وارد ہوگی، اس سے مجھے کون بچا سکے گا؟ وہ کون ہے جو قانونِ خداوندی کے مقابلہ
میں میری مدد کر سکے؟ (۳۰)
تم نے جو اعتراض کیا تھا کہ "تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو" تو اس کے جواب میں حضرت نوحؑ
نے کہا کہ میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں کوئی فوق البشر ہستی ہوں اور مجھے فوق الفطرت قوتیں حاصل
ہیں۔

(۱۱/۳۱) وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ
الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ

تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

(باقی رہا تمہارا یہ اعتراض کہ میں تمہارے جیسا ایک آدمی ہوں، تم پر کوئی معاشی برتری بھی حاصل نہیں. تو میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ) میرے پاس اللہ کے دیے ہوئے دولت کے خزانے ہیں اور میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور یہ کہ میں (انسان نہیں بلکہ) فرشتہ ہوں۔ میں نے یہ کچھ بھی نہیں کہا۔ البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ تم جو سمجھتے ہو کہ یہ لوگ جنہیں تم اپنے معیار کے مطابق ذلیل اور رذیل خیال کرتے ہو، خدا کی نظروں میں بھی ذلیل اور رذیل ہیں، اور انہیں اس کے ہاں سے خوشگواری اور بہتری کا سامان نہیں مل سکتا۔ یہ غلط ہے۔ قانونِ خداوندی کی رُو سے، معیارِ عزت و تکریم اور استحقاقِ خیر و برکت انسان کے ذاتی جوہر ہیں۔ اس کی نگاہ ظاہری پوزیشن پر نہیں، بلکہ انسان کے دل پر ہوتی ہے۔ اگر اس باب میں، میں تم سے متفق ہو جاؤں، تو میں بھی ان میں سے ہو جاؤں گا جو خدا کے قائم کردہ معیار سے سرکشی برتتے ہیں۔

مخالفین کے پاس اس کا کچھ جواب نہیں تھا۔ انہوں نے چڑ کر کہا:

(۱۱/۳۲) قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

اے نوحؑ! تم نے ہم سے مفت کا جھگڑا شروع کر دیا اور اس میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ اب اس قصہ کو ختم کرو۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو جس تباہی کی تم بار بار دھمکیاں دیتے ہو، اسے آؤ۔

وہی مطالبہ کہ تم سچے ہو تو جس تباہی سے تم ہمیں بار بار ڈراتے ہو، اسے وارد کرو!

(۱۱/۳۵-۳۳) قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ وَمَآ اَنْتُمْ

بِمُعۡجِزِیۡنَ ۝ وَلَا یَنۡفَعُکُمۡ نُصۡحِیۡۤ اِنۡ اَرَدۡتُّ اَنۡ اَنۡصَحَ لَکُمۡ اِنۡ کَانَ اللّٰہُ یُرِیۡدُ اَنۡ یُّغۡوِیَکُمۡ ؕ ہُوَ رَبُّکُمۡ ۟ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ۝ؕ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ اِنِ افۡتَرَیۡتُہٗ فَعَلَیَّ اِجۡرَامِیۡ وَ اَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُجۡرِمُوۡنَ ۝ؑ

نوحؑ نے کہا کہ اس تباہی کا لانا یا نہ لانا میرے اختیار میں نہیں. وہ تو خدا کے قانون کے مطابق آئے گی. لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ ضرور آکر رہے گی. تم قانونِ خداوندی کو عاجز اور بے بس نہیں کر سکتے کہ اس کی رُو سے جو کچھ ہونا ہے' وہ نہ ہو سکے.

یہ بھی یاد رکھو کہ اگر تم نے اپنے آپ کو اپنے اعمال کی وجہ سے' عذاب خداوندی کا مستوجب بنالیا' تو پھر اگر میں بھی ہزار چاہوں کہ تمہارے چاکِ داماں کی رفوگری کر لوں تو ایسا نہیں کر سکوں گا. اُس وقت میری غمخواری بھی تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکے گی. تمہارا آقا اور مالک خدا ہے' میں نہیں. اور تمہارا ہر قدم اُس کی طرف اٹھ رہا ہے. تمہارے تمام اعمال کے نتائج' اُس کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب ہوں گے (اِس میں' میں بھی کچھ نہیں کر سکوں گا).

(خدا نے کہا! اے نوحؑ! کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے یہ باتیں از خود وضع کر لی ہیں اور انہیں خدا کی طرف غلط منسوب کرتے ہو؟ ان سے کہہ دو کہ اگر میں نے ایسا کیا ہے تو میرا جرم مجھ پر ہے (تم سے اس کی باز پرس نہیں ہوگی) اور جرائم تم کر رہے ہو' ان کی پاداش تمہیں بھگتنی پڑے گی. میں اس سے بری الذمہ ہوں (تم یہ کہہ کر مطمئن نہ ہو جاؤ کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' وہ میرا خود ساختہ ہے تم یہ دیکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو' وہ کیسا ہے؟) (۳۵).

اس بحث و جدل کی آخری منزل قریب تر آگئی:

(۱۱ / ۳۶-۳۹) وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝

اس مقام پر نوحؑ کی طرف وحی کی گئی کہ جو لوگ اس وقت ایمان لاچکے ہیں ان کے سوا اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ لہٰذا جو کچھ یہ کررہے ہیں، اس پر تم (بیکار) غم نہ کھاؤ۔ تمہاری غم خواریاں اور جاں گدازیاں، ان کی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکیں گی۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم ان سے الگ ہوجاؤ (۳۶)۔

کشتی سازی

اب تم ہماری زیرِ نگرانی اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنانا شروع کردو اور دیکھو ان سرکشوں کے بارے میں ہم سے کچھ نہ کہنا۔ اس لئے کہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کی تباہی مسلّم ہوچکی ہے۔ یہ سب غرق کردیے جائیں گے (۲۳/۲۷) ——— (۳۷)

چنانچہ انہوں نے کشتی بنانی شروع کردی۔ اُس کی قوم کے سردار جب اُدھر سے گزرتے اور اسے کشتی بناتے دیکھتے، تو اس کا تمسخر اڑاتے۔ اس کے جواب میں نوحؑ ان سے کہتا کہ اگر تم ہماری ہنسی اڑانا چاہتے ہو تو اڑالو۔ جس طرح تم آج ہماری ہنسی

اڑاتے ہو، ایک وقت آئے گا کہ ہم اسی طرح تمہاری حماقتوں پر ہنسیں گے ۔ (۳۸)
اور اس میں زیادہ وقت بھی نہیں لگے گا۔ تم عنقریب دیکھ لوگے کہ وہ عذاب کس
پر آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا۔ اور وہ وقتی عذاب نہیں ہوگا، ہمیشہ کے لئے
نیست و نابود کر دینے والا ہوگا ۔ (۳۹)

جزائے اعمال اگرچہ یہ نکات جلد پنجم میں بھی آ چکے ہیں، لیکن ان کی اہمیت کے پیشِ نظر، مختصر الفاظ میں ان کا دہرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ حضرت نوحؑ اور ان کے متبعین کو تباہی سے محفوظ رکھنے کا جو وعدہ کیا گیا تو اس کے لئے طبیعی ذریعہ (کشتی) اختیار کیا گیا۔ کسی خرقِ الفطرت ذریعہ سے انہیں محفوظ نہیں رکھا گیا۔

دوسرے یہ کہ حضرت نوحؑ کو کشتی بناتے دیکھ کر مخالفین ان سے تمسخر کرتے تھے۔ اگر وہ اس پر غور و فکر کر کے انہی کی طرح کشتی بنا لیتے تو وہ بھی محفوظ رہ سکتے تھے۔ اس سے واضح ہے کہ جو تباہی طبیعی اسباب کے ذریعے آتی ہے (مثلاً سیلاب) اس سے حفاظت طبیعی اسباب (کشتی) کے ذریعہ ہی ہوتی ہے۔

تیسرے یہ کہ اُس زمانے میں انسان کی تمدنی حالت ایسی تھی کہ حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کی ترکیب بھی وحی کے ذریعے سکھائی گئی۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ عصرِ حاضر کی تحقیقات کی رُو سے زمانہ قبل از تاریخ کی اقوام کے ہاں سے جو بعض نادر اشیاء برآمد ہوتی ہیں، ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ انہیں ان کا علم اُن انبیاء کی وساطت سے ہوا ہوگا جو اُن کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ بعد میں اُن انبیاء کے تذکرے تو محو ہو گئے یا انہوں نے مسخ ہو کر افسانوی یا توہم پرستانہ حیثیت اختیار کر لی۔ لیکن وہ معلومات روایتی طور پر آگے منتقل ہوتی رہیں۔ عصرِ حاضر کی اثری تحقیقات اور حضریات کے دوران ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں پہنچ کر محققین انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ اُس دَور کے انسانوں نے یہ کچھ کیسے کر لیا! ایسے مقامات پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے نوادرات کا سرچشمہ علمِ وحی تھا۔

پھر تباہی کا وقت آ گیا؛

(۱۱ / ۴۰-۴۱) حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا
مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ

الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ وَ

قَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ

رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(چونکہ اُن لوگوں نے اپنا یہ شیوہ بنالیا تھا کہ نوحؑ کی ہر بات کی مخالفت کی جائے اور ہر معاملہ میں اُن کی ہنسی اڑائی جاتے، اس لئے انہوں نے نوحؑ کی کشتی سازی کے معاملہ پر بھی سنجیدگی سے غور نہ کیا۔ ورنہ اگر وہ عقل و فکر سے ذرا کام لیتے اور جس طرح نوحؑ انہیں آنے والے خطرہ سے آگاہ کر رہا تھا اُس کی بات پر کان دھرتے، تو وہ ایسا نہ کرتے۔ بہرحال، وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے تا آنکہ) جب قانونِ خداوندی کے مطابق وقت آگیا تو اردگرد کے پہاڑوں سے بارش کا پانی جوش مارتا ہوا، وادی میں آنا شروع ہوگیا (۱۱/۴۴) اور اس نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔ ہم نے نوحؑ سے کہا کہ ہر ضرورت کی شے کے دو دو جوڑے اپنے ساتھ کشتی میں رکھ لو اور اپنے" اہل و عیال" کو بھی اپنے ساتھ لے لو، بجز اُن کے جن کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے کہ وہ اپنی غلط روش کی بنا پر عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں (یعنی نوحؑ کا بیٹا (۱۱/۴۵) اور ان کی بیوی (۶۶/۱۰)۔ نیز اُن لوگوں کو بھی ساتھ لے لو جو ایمان لا چکے ہیں۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی۔ (۴۰)۔

اپنوں اور بیگانوں کا معیار

چنانچہ نوحؑ نے ان لوگوں سے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ (انہوں نے پوچھا کہ جانا کہاں ہے؟ اس پر نوحؑ نے کہا کہ اس کی بات مت پوچھو۔ تم سوار ہونے کی کرو)۔ اس کشتی کو اللہ کے نام پر چلنا ہے اور اُسی کے نام سے رُکنا ہے۔ (یہ سب کچھ اس کی وحی کے مطابق ہو رہا ہے۔ البتہ اس کا یقین رکھو کہ اس سے کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ اس لئے کہ) خدا کا قانونِ ربوبیت (جس کے مطابق یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے) اپنے اندر سامانِ حفاظت اور ذرائع پرورش، سب کچھ رکھتا ہے (۴۱)۔

اس مقام پر" اپنوں اور بیگانوں" کے ابدی معیار کو پھر دہرایا گیا، یعنی اپنے وہ جو ایمان کے رشتے کے ساتھ منسلک ہوں. بیگانے وہ جو ان اقدار میں شریک نہ ہوں، خواہ وہ اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۱ / ۴۲-۴۳) وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۟ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝

چنانچہ (وہ چل پڑے) ان کی کشتی انہیں ایسی تلاطم انگیز موجوں میں (بحفاظت) لئے جارہی تھی جو پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھیں.

پسرِ نوحؑ

(کشتی کے روانہ ہونے سے پہلے) نوحؑ نے اپنے بیٹے کو آواز دی، جو اس کی جماعت میں شامل نہیں ہوا تھا، کہ بیٹا! تم بھی ہمارے ساتھ سوار ہوجاؤ اور ان انکار کرنے والوں کا ساتھ چھوڑ دو (۴۲)۔

اس نے کہا کہ (تم جاؤ. میں تمہارے ساتھ جانا نہیں چاہتا. ایسا ہی ہوگا تو) میں کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا جو مجھے سیلاب سے بچالے گا. اس پر نوحؑ نے کہا کہ بیٹا! تم غلط فہمی میں مبتلا ہو. آج اس طوفان سے، جو خدا کے قانون کے مطابق آرہا ہے، کوئی بچانے والا نہیں. اِس سے وہی بچ سکے گا جو خدا پر ایمان لاکر اس کی رحمت کے دامن میں پناہ لے لے۔

اتنی بات ہوئی تھی کہ دونوں کے درمیان ایک بلند موج حائل ہوگئی اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ ڈوب گیا (۴۳)۔

پانی تھم گیا:

(۱۱/۴۴) وَقِيلَ يَٰٓأَرۡضُ ٱبۡلَعِي مَآءَكِ وَيَٰسَمَآءُ أَقۡلِعِي وَغِيضَ ٱلۡمَآءُ وَقُضِيَ ٱلۡأَمۡرُ وَٱسۡتَوَتۡ عَلَى ٱلۡجُودِيِّۖ وَقِيلَ بُعۡدٗا لِّلۡقَوۡمِ ٱلظَّٰلِمِينَ ۝

اور پھر (اللہ کا حکم ہوا کہ) اے زمین! تو اپنا پانی پی لے اور اے بادلو! تم تھم جاؤ۔ چنانچہ پانی کا چڑھاؤ اُتر گیا اور یوں وہ حادثہ ختم ہوگیا اور نوحؑ کی کشتی، صحیح و سلامت، جودی پر ٹھہر گئی۔ اور جماعتِ مومنین کو بتا دیا کہ وہ ظالم (جو تمہیں اس طرح تنگ کیا کرتے تھے) زندگی اور اس کی کامرانیوں سے محروم ہو چکے ہیں۔

حضرت نوحؑ کے بیٹے کی غرقابی کا واقعہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ لیکن حضرت نوحؑ یہ بات سمجھنا چاہتے تھے کہ جب خدا نے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ حضرت نوحؑ کے اہل بچا لئے جائیں گے تو ان کا بیٹا، جو ان کے اہل میں سے تھا، اسے کیوں نہ بچایا گیا؟ حضرت نوحؑ کا یہ سوال اسی طرح اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لئے تھا جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے یہ سوال کیا تھا کہ مجھے دکھا کہ تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے؟ (تفصیل مطالب الفرقان، جلد دوم، ص ۲۷۴ اور جلد سوم، ص ۴۵۵ پر گزر چکی ہے)۔

(۱۱/۴۵-۴۷) وَنَادَىٰ نُوحٞ رَّبَّهُۥ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ٱبۡنِي مِنۡ أَهۡلِي وَإِنَّ وَعۡدَكَ ٱلۡحَقُّ وَأَنتَ أَحۡكَمُ ٱلۡحَٰكِمِينَ ۝ قَالَ يَٰنُوحُ إِنَّهُۥ لَيۡسَ مِنۡ أَهۡلِكَۖ إِنَّهُۥ عَمَلٌ غَيۡرُ صَٰلِحٖۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهِۦ عِلۡمٌۖ إِنِّيٓ أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ ٱلۡجَٰهِلِينَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّيٓ أَعُوذُ بِكَ

اَنۡ اَسۡـَٔلَكَ مَا لَيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ؕ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَ

تَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ○

جب یوں اطمینان ہو گیا تو نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! میرا بیٹا میرے اہل سے تھا اور تیرا وعدہ تھا کہ میرے اہل کو بچالیا جائے گا اور تیرے وعدے ہمیشہ سچے ہوتے ہیں اور تیرے اوپر کوئی حاکم بھی نہیں جو تیرے فیصلوں کو بدل دے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر، میرے بیٹے کو تو محفوظ رہنا چاہیئے تھا۔ وہ کیوں غرق کردیا گیا! (۴۵)

"اَھۡلٌ" کا قرآنی مفہوم

اس پر خدا نے کہا کہ اے نوحؑ! تو نے "اہل" کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ وہ بیشک تیرا بیٹا تھا، لیکن وہ تیرے اہل میں سے نہیں تھا (تیرے اہل میں سے وہی ہو سکتے ہیں جن کے اعمال صالح ہوں) اور اس کے اعمال غیر صالح تھے۔ ("اپنے" اور "بیگانے" کا یہ وہ معیار ہے جس کا تجھے علم نہیں تھا) لہٰذا، تجھے اس چیز کا مجھ سے مطالبہ نہیں کرنا چاہیئے جس کا تجھے علم نہ ہو۔ میں تمہیں ان باتوں کی اس لئے نصیحت کرتا ہوں کہ تمہیں حقائق کا علم ہو جائے (۴۶)۔

نوحؑ نے کہا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! میں اگر تجھ سے کسی ایسی چیز کا مطالبہ کر بیٹھتا ہوں جس کا مجھے علم نہیں ہوتا (تو تُو جانتا ہے کہ محض ناواقفیت کی بنا پر ہوتا ہے، کسی اور خیال سے نہیں ہوتا)۔ اس لئے مجھے توقع ہے کہ ان امور میں تیری شفقت اور رافت میری پوری طرح دیکھ بھال کرتی رہے گی۔ اگر تیری طرف سے مجھے سامانِ حفاظت اور پرورش نہ ملا تو میں برباد ہو جاؤں گا (۴۷)۔

یوں حضرت نوحؑ اور اُن کے ساتھیوں کو امن و سلامتی کے ساتھ زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہو گئیں۔

(۱۱/۴۸) قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَ

عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ‌ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ

يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

ہم نے کہا کہ اے نوحؑ! اب کشتی سے اُتر پڑو کیونکہ اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ (شاید تمہارے ساتھیوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جو زمین اتنے دنوں تک غرقاب رہی ہے اس میں سامانِ زندگی کہاں سے ملے گا سو اس بات کی فکر نہ کرو۔ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو سامانِ زیست بڑی فراوانی سے ملے گا۔ باقی رہیں وہ جماعتیں جو تمہارا ساتھ نہیں دیں گی' سو ہمارے قانونِ طبیعی کے مطابق انہیں بھی دنیاوی زندگی میں سامانِ زیست ملے گا' لیکن ان کا مستقبل تاریک ہو گا اور وہ آخر الامر دردناک تباہی میں مبتلا ہوں گے۔ (۱۶- ۱۱/۱۵؛ ۱۶- ۱۷/۱۵؛ ۲۰/ ۴۲؛

رزق سب کے لئے

۲۰/ ۴۶؛ ۲/۱۲۶)۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ جماعتِ مومنین کو تو سامانِ رزق ملے گا ہی' لیکن اس نظام کے مخالفین بھی اس سے محروم نہیں رہیں گے' تو اس کے متعلق ان مقامات پر وضاحت کی گئی ہے جن کے حوالے مندرجہ بالا مفہوم کے آخر میں دیئے گئے ہیں۔ قریب ترین اس جلد کے سابقہ صفحات پر زیرِ آیات (۱۶- ۱۱/۱۵) دیکھئے۔

ان کوائف کو بیان کرنے کے بعد کہا:

(۱۱/۴۹) تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ ۖ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا ۖ فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ۝

اے رسولؐ! یہ غیب کی باتیں ہیں جو ہم تمہیں بذریعہ وحی بتا رہے ہیں۔ غیب اس لئے کہ اس سے پہلے تم یا تمہاری قوم' ان تفاصیل سے واقف نہیں تھی۔ اور بتا اس لئے رہے ہیں کہ تاریخ کے ان نوشتوں سے تمہارے دل کو تقویت حاصل ہو کہ ابتداً کتنی ہی مشکلات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے' آخر الامر کامیابی اسی جماعت کی ہوتی

ہے جو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرے۔ جب حقیقت یہ ہے تو تم نہایت استقامت سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو۔ تمہاری کامیابی یقینی ہے۔

انبیاء سابقہ کی سرگذشتیں اہلِ کتاب کے صحیفوں میں بھی تھیں اور عربؐ بھی ان سے آشنا تھے۔ لیکن وہ اس قدر مسخ شدہ حالت میں تھیں کہ ان سے نہ صرف یہ کہ تاریخی شواہد کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا' بلکہ وہ انبیاء کرامؑ کی ایسی گھناؤنی تصویر پیش کرتی تھیں جنہیں دیکھ کر حیا' شرم کے مارے گردن جھکا لے۔ وہ کوائف صحیح شکل میں وحی کی رو سے' قرآن میں مذکور ہوئے' تو بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

آیت کا آخری حصہ اس مقصد کو نمایاں طور پر سامنے لے آیا جس کے لئے انبیاءؑ سابقہ اور اقوامِ سابقہ کی داستانیں پیش کی گئی ہیں۔ رسولؐ اللہ سے کہا گیا کہ مخالفتوں کا یہ ہجوم جس کا مقابلہ آپؐ کو کرنا پڑ رہا ہے' کوئی نئی بات نہیں۔ ہر رسول کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے اس مخالفت کو نہایت استقامت سے برداشت کیا۔ اس لئے فَاصۡبِرۡ تم بھی ہمت اور استقامت سے ان کا مقابلہ کرو اور جماعتِ مومنین سے بھی کہو کہ وہ حوصلہ نہ ہاریں۔ یہ تاریخی شواہد بتا رہے ہیں کہ آخرالامر کامیابی اُنہی کے حصے میں آتی ہے جو قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اس راستے پر جم کر کھڑے رہیں۔ انجام کار وہی کامیاب و کامران ہوں گے۔

قومِ عاد (حضرت ہودؑ)

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ کی داستان سامنے آتی ہے جو قومِ عاد کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہ داستان تفصیلی طور پر' مطالب الفرقان' جلد پنجم (صفحات ص۲۴۷ تا ص۲۶۴) میں بیان ہو چکی ہے ہم اپنے معمول کے مطابق' سورۂ ہود کی متعلقہ آیات مع مفہوم درج ذیل کرتے ہیں:

(۱۱ / ۵۰ ـ ۵۱) وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمۡ هُوۡدًا ؕ قَالَ یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَیۡرُهٗ ؕ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا مُفۡتَرُوۡنَ ○

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى

الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

اِسی طرح، قومِ عاد کی طرف، ان کے بھائی بندوں میں سے، ہودؑ کو رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے ان سے کہا کہ اے میری قوم! تم صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیّت اختیار کرو۔ اس کے سوا کائنات میں کسی کا اقتدار نہیں۔ اس لئے تمہارا الٰہ بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر تم اس کے علاوہ کوئی اور عقیدہ رکھتے ہو، تو وہ تمہارا خود ساختہ، من گھڑت مذہب ہے۔ (۱۱/۵۹؛ ۲۶/۱۲۷؛ ۴۶/۲۱؛ ۴۱/۱۵)۔ (۵۰)

اے میری قوم! میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں اور تمہاری بہبود کے لئے جو کچھ کرنا چاہتا ہوں، اس کے لئے میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا اجر و معاوضہ اُس خدا کے ذمّے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اگر تم ذرا بھی عقل و فکر سے کام لو (تو یہ بات بآسانی تمہاری سمجھ میں آجائے کہ جس بات میں ایک شخص کا کوئی ذاتی فائدہ نہ ہو، وہ اخلاص ہی پر مبنی ہوگی)۔ (۵۱)۔

وہی پیغامِ ازلی یعنی محکومیّت صرف اللہ کی اختیار کرو اور تبلیغ کے صلہ میں میں تم سے کسی معاوضہ کا خواہاں نہیں، بے لوث بہی خواہی ــ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی امید۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ نے اس حقیقت کو بھی دہرا دیا کہ یہ تعلیم، علم و عقل کی بنا پر پیش کی جا رہی ہے۔

اس کا مقصد:

(۱۱/۵۲) يٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝

میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ "اپنی غلط روش کی وجہ سے آنے والی تباہی سے بچنے کے

لئے قوانینِ خداوندی سے حفاظت طلب کرو اور اپنے تمام باطل عقائد چھوڑ کر اس کی طرف لوٹ آؤ۔ تم اس کی شانِ ربوبیت کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح تمہاری خشک زمینوں کو بارش سے سیراب کرتا ہے جس سے تمہاری قوتیں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ تم اس کے قوانین کی اطاعت کر کے اپنی شکر گزاری کا ثبوت دو، نہ یہ کہ الٹا ظلم و ستم پر اُتر آؤ اور مجرمین کی طرح اس کے قوانین سے مُنہ موڑ لو۔

قوم کا جواب:

(۱۱/۵۳) قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ○

انہوں نے ہودؑ سے کہا کہ تم نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی ایسی دلیل پیش نہیں کی جسے ہم واقعی محکم دلیل سمجھیں۔ ہم اپنے معبودوں کو محض تمہارے کہنے کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لئے ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے۔

اگلی آیت کے پہلے حصہ میں ان کی طرف سے بڑا طنز آمیز نشتر چھوڑا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں حضرت ہودؑ کی طرف سے جواب تو ایک طرف اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا گیا۔

(۱۱/۵۴) اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○

ہمیں کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ (تم نے جو ہمارے معبودوں کی گستاخی کی ہے تو) تم پر ان میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے (جو تم اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔ ورنہ اس سے پہلے تم اچھے بھلے تھے)۔

اس کے جواب میں ہودؑ نے صرف اتنا کہا۔ اور اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں سے اور کہا بھی کیا جاتا! — کہ میں اس پر خدا کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا کہ تم غیر اللہ میں سے جس جس کو اس کا شریک قرار دیتے ہو میں ان سے یکسر بیزار ہوں۔

اس کے بعد چیلنج کہ تم جو بھی چاہو کر دیکھو مجھے خدا کے قوانین پر پورا پورا اعتماد ہے کہ آخر الامر کامیابی حق کی ہو گی جس کا میں علمبردار ہوں۔

(۱۱/۵۵-۵٦) مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ○ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

تم جو کچھ میرے خلاف کرنا چاہتے ہو سب کے سب مل کر کر لو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ (اس کے بعد دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے!) (۵۵)

میرا بھروسا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے جو بڑا ہی محکم گیر اور قابلِ اعتماد ہے — اُس خدا کا قانون جو میرا اور تمہارا سب کا نشو و نما دینے والا ہے۔ تم تو ایک طرف رہے، کائنات میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جو اُس کے قانونِ مکافات کی گرفت سے باہر ہو۔ میرا خدا (حق و عدل کی) سیدھی اور توازن بدوش راہ پر ہے۔ (لہٰذا تم بھی اسی راہ پر چلو۔ ۱/۵: ۱۲۷- ٦/۱۲٦؛ ٦/۱۵۳- ۱۵۲؛ ۴۲/۵۳)۔ (۵٦)۔

آیت کے آخر میں ہے: اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ اس کا مفہوم مطالب الفرقان جلد اوّل (ر) صفحات ۴۷، ۹۹-۹۸ پر بیان ہو چکا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

اور اس کے بعد ان کی غلط روش کے انجام کی نشاندہی؛

(۱۱/۵۷) فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ

اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ حَفِیۡظٌ ○

اگر تم اس راہ سے رُو گردانی کرو گے تو اس کے نتائج کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہوگی۔ میرے ذمے فقط اتنا تھا کہ میں تم تک خدا کا پیغام پہنچا دوں۔ سو اسے میں نے پہنچا دیا۔

اِستبدالِ قومی

اب تم دیکھ لوگے کہ خدا کا قانونِ مکافات (تمہیں کس طرح تباہ و برباد کرکے) تمہاری جگہ ایک ایسی قوم لے آتا ہے جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ (۳۹ـ ۳۸/ ۹ ؛ ۳۸/ ۴۷)۔ تم خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ وہ ہر چیز کا نگران حال ہے۔

خدا کے قانونِ استبدال و استخلافِ قومی کا ذکر سابقہ جلدوں میں آچکا ہے انڈکس سے حوالے مل جائیں گے۔ وہ اپنی غلط روی سے باز نہ آئے اور تباہ ہوگئے۔

(۱۱/۵۸) وَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا نَجَّیۡنَا هُوۡدًا وَّالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ بِرَحۡمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّیۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ غَلِیۡظٍ ○

چنانچہ جب اس قوم کی غلط روش کے نتائج برآمد ہونے کا وقت آگیا، تو ہم نے ہوؔد اور اس کے ساتھیوں کو جو خدا پر ایمان لاتے تھے، اپنی رحمت سے اس سخت عذاب سے محفوظ رکھا (جس میں وہ قوم مبتلا ہونے والی تھی)۔

یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کی تباہی کس طور پر واقع ہوئی۔ مطالب الفرقان، جلد پنجم، ص۲۶۱ پر بتایا گیا ہے کہ ایک تباہ کن جھکڑ نے ان کی بستیوں کو تہ و بالا کر دیا تھا۔

اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ اُن کا جُرم کیا تھا جس کی پاداش (یا نتیجہ) میں ان پر تباہی مسلط ہوگئی۔ فرمایا:

(۱۱/۵۹) وَتِلۡكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمۡ وَعَصَوۡا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیۡدٍ ○

یہ ہے سرگذشت قوم عاد کی، جس نے اپنے پروردگار کے قوانین سے انکار کیا اور اس

کے رسولوں (کی دعوت) سے سرکشی برتی اور اپنے ان سرکش اور مستبد حکام کی اطاعت کرتے رہے جو جان بوجھ کر حق کی مخالفت کرتے تھے۔

مستبد حکّام کی اطاعت ان کے حکام مستبد، جابر اور سرکش تھے۔ اُن کا یہ جرم تھا اور قوم کا جُرم یہ تھا کہ وہ اس قسم کے حکّام کی اطاعت کرتی تھی۔ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر بتایا ہے کہ جہنم میں، مستبد حکمران اور اُن کی اطاعت کرنے والے عوام، نیز مذہبی پیشوا اور اُن کے متبعین ایک دوسرے کو ملعون کریں گے کہ وہ اُن کی وجہ سے ہی اِس عذاب میں گرفتار ہوئے ہیں۔ وہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مستبد حکّام کی اطاعت کرنے والی قوم عذاب میں کیوں مبتلا ہوتی ہے تفصیل ان امور کی مطالب الفرقان، جلد چہارم صـ ۵۴۹ اور جلد پنجم (صـ ۱۹۲) پر ملے گی۔

اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو قومیں اِس دنیا میں تباہ ہوتی ہیں، وہ آخرت میں بھی مبتلائے عذاب ہوتی ہیں؛

(۱۱/۶۰) وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۠

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حال اور مستقبل، دونوں کی زندگی میں نوازشاتِ خداوندی سے محروم رہ گئے۔ یاد رکھو! یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین سے انکار کیا تھا ——— دیکھو! قومِ عاد کس طرح زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ گئی!

قومِ ثمود (حضرت صالحؑ)

قومِ عاد کے بعد قومِ ثمود کا تذکرہ سامنے آتا ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوتے تھے۔ اُن کی تفصیلی داستان مطالب الفرقان جلد پنجم صفحات ۲۶۵ لغایت ۲۸۹ پر آچکی ہے۔ اس جگہ ہم حسبِ

معمول، سورۃ ہود کی متعلقہ آیات سے مفہوم پیش کریں گے۔

(۱۱/۶۱) وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۝

اسی طرح قوم ثمود کی طرف' ان کے بھائی بندوں میں سے صالحؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ اُس نے بھی اُن سے یہی کہا کہ تم صرف قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس نے تمہیں اس ملک میں اٹھا کھڑا کیا اور اچھی طرح آباد کیا۔ تمہیں چاہیئے کہ تمہاری غلط روش کی بنا پر جو تباہی تم پر آنے والی ہے' اُس سے بچنے کے لئے' خدا کے قوانین سے حفاظت طلب کرو۔ ہر طرف سے مُنہ موڑ کر' اس کی طرف رجوع کرو اور یوں اُس کی رحمت کے سائے تلے آجاؤ۔ یاد رکھو وہ تم سے دُور نہیں' قریب ہے اور تمہاری ہر پکار کا جواب دیتا ہے (۲/۱۸۶)۔

پیغام کا بنیادی نکتہ وہی ہے کہ محکومیت صرف خدا کی جائز ہے' اور کسی کی نہیں۔

قوم کا جواب:

(۱۱/۶۲) قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝

انہوں نے کہا کہ اے صالحؑ! تم سے تو ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں کہ تم اپنے بزرگوں کے سچے جانشین بنو گے' ہمارے معبودوں کا بول بالا کرو گے۔ اپنی قابلیت

سے اس مذہب کو دُور دُور تک پھیلاؤ گے۔ لیکن تم نے ایسی باتیں شروع کر دی ہیں جن سے ہماری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ تم ذرا سوچو تو سہی کہ تم ہم سے کیا کہہ رہے ہو؟) تم ہم سے یہ کہتے ہو کہ ہم انہیں اپنا معبود ماننا چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آبا و اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔ جس بات کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو، ہمیں تو اس کی صداقت میں بڑا ہی شک ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے دلوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوتا ہے (کیونکہ وہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے)۔

قوم کے جواب سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت صالحؑ اپنی قوم میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ایک حضرت صالحؑ ہی نہیں، تمام حضرات انبیاء کرامؑ کی یہی کیفیت تھی کہ اپنی دعوتِ نبوی سے پہلے قوم میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حضور نبیٔ اکرمؐ نے تو اپنی زمانۂ قبل از نبوت کی زندگی کو اپنے دعوے کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کیا تھا (۱۰/۱۶)۔ یہ وجہ ہے جو قوم ان کے دعویٰ کی مخالفت کے باوجود اُن پر جلدی سے ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر پاتی تھی۔ اس سے واضح ہے کہ جو شخص بھی کسی تحریک کی قیادت کے لئے اٹھے، تو ضروری ہے کہ اپنے سابقہ کردار کی بنا پر قوم میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہو۔

باقی رہی مخالفت کی وجہ! سو وہ وہی تقلیدِ اسلاف! حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی تباہی کا باعث یہ ذہنیت ہوتی ہے کہ پیشِ نظر معاملہ پر علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رُو سے غور کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنے کے بجائے، اسے اس بنا پر مسترد کر دیا جائے کہ وہ اُن کے اسلاف کی روش کے خلاف ہے (انڈکس میں 'تقلید' کا عنوان دیکھئے)۔

اس کے جواب میں حضرت صالحؑ نے فرمایا؛

(۶۳/۱۱) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ۝

کہ اے میری قوم! کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ خدا نے مجھے وحی جیسی نعمت

کبریٰ سے نوازا ہے اور اس کی بنا پر میں صحیح راستے کی طرف راہ نمائی دینے والی روشن قندیل لئے کھڑا ہوں؛ اگر اس کے باوجود میں اس کے احکام سے سرکشی اختیار کروں، تو مجھے اُس کے قانونِ مکافات کی گرفت سے کون بچائے گا؟ تم جو کچھ مجھ سے چاہتے ہو، اس سے تم میرے بھلے کی بات نہیں کرتے بلکہ سراسر تباہی کی طرف لے جاتے ہو۔

جیسا کہ مطالب الفرقان جلد پنجم میں بتایا جا چکا ہے، اُس قوم میں جاگیردارانہ معاشی نظام رائج تھا اور حضرت صالحؑ اُس کی جگہ نظامِ ربوبیت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس سورۃ میں اس کی طرف صرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت صالحؑ نے قوم سے کہا:

(۱۱/۶۴) وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ○

نَاقَةُ اللّٰهِ

(تم نے اس سامانِ رزق پر، جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے، اور جو تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے، حد بندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ تم غریبوں اور کمزوروں کے جانوروں تک کو نہ کھلی زمین میں چرنے چگنے دیتے ہو، نہ چشموں سے پانی پینے دیتے ہو۔ تم نے انہیں اپنے جانوروں کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ دیکھو!) یہ ایک اونٹنی ہے۔ تم اس کے متعلق یہ نہ دیکھو کہ یہ کس کی اونٹنی ہے۔ کسی سردار کی ہے یا غریب آدمی کی۔ بس یہ سمجھو کہ اسے اللہ نے پیدا کیا ہے اور یہ اُسی کی اونٹنی ہے۔ دوسری طرف یہ زمین ہے جسے اللہ نے پیدا کیا ہے؛ اس لئے وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ میں اس اللہ کی اونٹنی کو اللہ کی زمین میں کھلے چھوڑتا ہوں تاکہ یہ اس میں چرے پھرے (اور اپنی باری پر

پانی پیئے ۱۳/۹۱)۔ اگر تم نے اسے اس طرح چرنے چگنے دیا تو یہ اس امر کی نشانی ہوگی کہ تم اپنی موجودہ روش سے باز آجانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ لیکن اگر تم نے اسے نقصان پہنچایا تو اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ تم اپنی روش کو چھوڑنے والے نہیں۔ اس کے بعد تم پر تباہی کا وہ عذاب آجائے گا جس کے ظہور کا وقت کچھ دور نہیں۔ میری آنکھیں اسے بہت قریب دیکھ رہی ہیں۔

قوم نے عہد کیا کہ وہ اس نظام کے پابند رہیں گے جس میں تمام لوگوں کے مویشیوں کو چراگاہوں سے متمتع ہونے کی یکساں اجازت ہوگی۔ لیکن وہ اس عہد کے پابند نہ رہے۔

(۱۱/۶۵) فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ ۝

انہوں نے اُس اونٹنی کو مار ڈالا۔ اس پر صالحؑ نے کہا کہ تم اپنے گھروں میں تین دن تک اور بس لو۔ اس کے بعد تم پر تباہی آجائے گی۔ یہ ایسا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا ثابت نہیں ہوگا۔ (چونکہ وہ صالحؑ کی کسی بات کو سچا نہیں مانتے تھے، اس لئے انہوں نے اسے محض دھمکی سمجھا)۔

یہ تین دن کا وقفہ، آخری مہلت تھی کہ شاید وہ اپنے کئے پر نادم ہو جائیں اور صحیح راہ اختیار کر لیں لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا اور تباہی کا عذاب ان پر مسلط ہو گیا۔

(۱۱/۶۶-۶۷) فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْیِ یَوْمِىِٕذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ۝ وَ اَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ۙ

چنانچہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو ہم نے صالحؑ کو اور ان کے ساتھیوں کو جو صاحبِ

ایمان تھے، اپنی رحمت سے، اُس رُسواکُن عذاب سے بچالیا. یقیناً تیرے خدا کا قانون بڑا ہی طاقت ور اور غالب رہنے والا ہے (٦٦).

اور اُن سرکش لوگوں کو ایک زور کی کڑک (اور زلزلہ ٧/٧٨) نے آلیا اور وہ اپنے گھروں میں بے حس و حرکت پڑے رہ گئے (٩١/١٣-١٥). (٦٧).

اُن کے گھر اس طرح ویران ہوئے کہ:

(١١/٦٨) كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۟

گویا وہ لوگ کبھی ان میں بسے ہی نہ تھے. یاد رکھو! ثمود نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی. اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ گئے.

قومِ لوط

قومِ لوطؑ کی داستان بھی مطالب الفرقان، جلد پنجم میں آچکی ہے (دیکھئے صفحات ٢٩٠ تا ٣٠٩). یہ داستان جہاں جہاں بھی بیان ہوئی ہے، اس کا آغاز ان "مہمانوں" کے تعارف سے کیا گیا ہے جو پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس آئے تھے. [مثلاً (٥٦-١٥/٥١؛ ٣٤-٢٩/٣١؛ ٣٠-٥١/٢٤)] — مطالب الفرقان، جلد پنجم (ص ٣٠٦) میں بھی ان مہمانوں کا ذکر ہے. یہاں بھی آغازِ سخن انہی کی آمد سے ہوتا ہے.

(١١/٦٩) وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ

حَنِيۡذٍ ۝

(اور اسی طرح قومِ لوط کی تباہی ہوئی۔ ان کا قصہ یوں ہے کہ) خدا نے اپنے فرستادگان ابراہیمؑ کی طرف بھیجے جنہوں نے اسے خوشخبری دی (جس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے)۔ انہوں نے ابراہیمؑ کو سلامتی کی دُعا دی جس کے جواب میں ابراہیمؑ نے بھی ویسی ہی دُعا دی اور اس کے بعد بلا توقف ان کے لئے ایک بُھنا ہوا بچھڑا لے کر آیا کہ مہمانوں کی تواضع کی جائے۔

لیکن انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔

(۱۱/۷۰) فَلَمَّا رَاٰۤ اَيۡدِيَهُمۡ لَا تَصِلُ اِلَيۡهِ نَكِرَهُمۡ وَاَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِيۡفَةً ؕ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰى قَوۡمِ لُوۡطٍ ۝

لیکن اس نے دیکھا کہ وہ مہمان کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ اس سے وہ اُن کی طرف سے بدگمان سا ہوا اور دل میں خطرہ محسوس کیا۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس ملک کا دستور تھا کہ جو کسی کے ہاں بُرے ارادے سے آتے، وہ اُس کے ہاں کھانا نہیں کھاتا تھا) جب انہوں نے ابراہیمؑ کے ان وسواس کو محسوس کیا تو اُس سے کہا کہ ڈرو نہیں ہم قومِ لُوط کی طرف بھیجے گئے ہیں (تاکہ ان کی تباہی سے پہلے اتمامِ حجت ہو جائے جس طرح ثمود کی تباہی سے پہلے ناقہ صالحؑ کے ذریعے اتمامِ حجت ہوا تھا (۲۷/۵۴)۔ ۰۱)۔

اس کے بعد تین آیات میں حضرت ابراہیمؑ کے ہاں اولاد کی بشارت کا ذکر ہے۔ اس کا داستان لُوط کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ یہی مہمان حضرت لُوطؑ کی طرف بھی گئے تھے۔

(۱۱/۷۱-۷۳) وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۞ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ۞ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۞

ابراہیمؑ کی بیوی بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اسے یہ سُنکر اطمینان ہوا اور وہ جی میں خوش ہوئی کہ خطرہ کی بات کوئی نہیں۔ عین اُس وقت ہم نے اُسے اسحٰقؑ کی پیدائش کی خبر دی اور یہ بھی کہ اسحٰقؑ کے بعد اُن کے ہاں اُن کا پوتا یعقوبؑ پیدا ہوگا۔ اور اِس طرح اُس سرزمین پر (قومِ لوط کی تباہی کے بعد) اُن کی نسل پھیل جائے گی (۷۱)

اِس پر ابراہیمؑ کی بیوی نے کہا کہ یہ تو بڑی تعجب انگیز — اور میرے لئے مجوب کُن — بات ہے کہ میرے ہاں اس عمر میں جبکہ میں اس قدر سن رسیدہ ہو چکی ہوں، اولاد ہوگی اور یہ میرے خاوند بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں اولاد کا ہونا حیرت انگیز سی بات ہے (۲۱/۹۰) — (۷۲)۔

اس پر انہوں نے کہا کہ تم اللہ کے کاموں پر تعجب کیوں کرتی ہو؟ اے اہلِ خانہ! یہ تو تمہارے لئے خدا کی رحمت اور برکت کی خوش خبریاں ہیں۔ اس کی رحمتوں ہی سے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر سزاوارِ حمد و ستائش اور کس قدر فراوانیاں عطا کرنے والا ہے (۵۱/۲۹) — (۷۳)

اولاد کی بشارت

(ضمناً) جہاں تک بڑھاپے میں اولاد پیدا ہونے کا تعلق ہے قرآن کریم نے اس کی وضاحت حضرت زکریاؑ کے قصے میں کر دی ہے۔ انہیں بھی

بڑھاپے میں بیٹے (حضرت یحییٰؑ) کی پیدائش کی بشارت دی گئی تھی تو انہیں تعجب ہوا تھا. قرآن کریم نے یہ کہہ کر بات صاف کردی کہ اُن کے ہاں اولاد نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی بیوی میں کوئی طبیعی نقص تھا جس کی وجہ سے اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی — وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ — (۲۱/۹۰). (علاج معالجہ سے) وہ نقص دُور ہوگیا اور اولاد پیدا کرنے کے قابل ہوگئی. بڑھاپے میں اولاد، کوئی فوق الفطرت سانحہ نہیں.

حضرت ابراہیمؑ نے جب اُن مہمانوں سے سُنا کہ قومِ لوط پر تباہی آنے والی ہے، تو اُنہوں نے اُن سے سوال وجواب شروع کردیے.

(۷۴-۷۵/۱۱) فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِىْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝

جب ابراہیمؑ کے دل سے، ان کی طرف سے پیدا شدہ گھبراہٹ دور ہوگئی اور بیٹے کی خوشخبری سے اور بھی اطمینان حاصل ہوا، تو قومِ لوط کے متعلق ان سے سوال وجواب کرنے لگا کہ انہیں کیوں ہلاک کیا جارہا ہے (۷۴).

اس میں شبہ نہیں کہ ابراہیمؑ بڑا متحمل مزاج تھا اس لئے وہ ذرا ذرا سی بات پر یونہی بھڑک نہیں اٹھتا تھا. لیکن اس کے ساتھ ہی وہ سینے میں بڑا دردمند دل رکھتا تھا جس کی وجہ سے دوسروں کی مصیبت کو بڑی شدت سے محسوس کرتا تھا. یہی وجہ تھی کہ قومِ لُوط کی تباہی کی خبر کو اُس نے اِس طرح محسوس کیا.

لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ہر معاملے کے فیصلے کے لئے ہماری طرف رجوع کرتا تھا. اِس لئے اُس کی رقیق القلبی، اِتّباعِ قوانین پر غالب نہیں آتی تھی (۷۵).

مہمانوں نے انہیں بتایا کہ وہ قوم اپنی غلط روش میں اُس مقام تک پہنچ چکی ہے جہاں قانونِ مکافات

کی رُو سے تباہی لازم ہو جاتی ہے، لہٰذا اُن کے غم میں دلسوزی سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

(۱۱/۷۶) يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝

انہوں نے کہا۔ اے ابراہیمؑ! تو اس بات کا خیال چھوڑ دے (کہ وہ قوم تباہی سے بچ جائے)۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے پروردگار کے قانون کے مطابق اس قوم کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ اب اُن پر وہ تباہی آنے والی ہے جو پلٹ نہیں سکتی۔

اس کے بعد وہ حضرت لُوطؑ کے ہاں پہنچ گئے:

(۱۱/۷۷) وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ۝

قومِ لُوط کی طرف

چنانچہ جب ہمارے فرستادگان، ابراہیمؑ سے رخصت ہو کر لوطؑ کے پاس پہنچے تو وہ اُن کی وجہ سے پریشان ہو گیا اور اپنی بے بسی کے احساس سے دل میں کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے! (اس کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ وہاں کے لوگ، نوواردوں اجنبیوں سے کس قسم کا سلوک کیا کرتے ہیں۔ اور چونکہ یہ نووارد، آکر ٹھہرے بھی لوطؑ کے پاس تھے، اس لئے وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا)۔

اِدھر یہ وارد ہوتے اور اُدھر سے ـــــ

(۱۱/۷۸) وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۭ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ

هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ

اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ○

اُس کی قوم کے لوگ اجنبیوں کے آنے کی خبر سُن کر، بدمستی میں دوڑتے ہوئے آئے ۔ وہ پہلے ہی اِس روشِ بد کے خُوگر تھے ۔ لوطؑ نے انہیں (الگ لے جاکر کہا کہ ذرا سوچو تو سہی کہ تم کیا کر رہے ہو!) یہ تمہاری بیویاں، جو میرے لئے بمنزلہ میری بیٹیوں کے ہیں، تمہارے لئے جائز اور مناسب ہیں۔ ان کی طرف رجوع کرنا، بڑی پاکیزہ روش ہے۔ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور میرے مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوا نہ کرو۔ (یہ بڑی شرم کی بات ہے) کیا تم میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو شرافت سے کام لے اور عقل و ہوش کو ہاتھ سے نہ جانے دے! (۱۵/۷۲؛ ۷/۸۰؛ ۱۵/۷۱؛ ۲۱/۷۴؛ ۲۶/۱۶۵؛ ۲۷/۵۴؛ ۲۸ ـ ۲۹/۲۹؛ ۵۱/۳۵)۔

قرآنِ کریم کی پاکیزگیٔ ذوق اور لطافتِ اسلوب ملاحظہ فرمائیے کہ وہ اس قوم کی فحاشی کا ذکر نام لیکر نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اس قدر نفرت انگیز تھی کہ اس کے ذکر سے حیا کی نگاہیں بھی شرم کے مارے جُھک جائیں۔ وہ اشاروں کنایوں میں بات کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اُس معاشرہ میں بے حیائیاں اور بدکرداریاں کس حد عام ہو چکی تھیں، حضرت لوطؑ کے ایک مختصر سے فقرے نے اس کی مکمل تصویر کشی کر دی جب انہوں نے کہا کہ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ـــ کیا تم میں ایک بھی رجل رشید باقی نہیں رہا؟ ـــ جب کسی معاشرے کی پستیٔ کردار اس قدر عام ہو جائے، تو پھر اُس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہا کرتی۔

حضرت لوطؑ کی اس قدر سخت اور شدید تعریض کا بھی ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس پر نادم ہوتے، انہوں نے نہایت ڈھٹائی سے کہا:

(۱۱/۷۹) قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ

لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ○

انہوں نے کہا کہ تو جانتا ہے کہ ہمیں عورتوں سے جنہیں تو اپنی بیٹیاں کہتا ہے، کچھ
دلچسپی نہیں اور تجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارا ارادہ کیا ہے!
حضرت لوطؑ نے انتہائی تأسف اور قلق کے ساتھ کہا:

(۱۱/۸۰) قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝

حضرت لوطؑ نے کہا کہ اے کاش! میرے پاس تمہارے مقابلہ کی خود طاقت ہوتی یا کوئی
قوی سہارا ہوتا جس کی مدد سے میں تمہیں ان حرکات سے روک سکتا۔
اس پر اُن مہمانوں نے اپنی حقیقت کو دشگاف اور جس مشن کو وہ لے کر آئے تھے اُسے واضح کر دیا۔

(۱۱/۸۱) قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۝

لوطؑ کے مہمانوں نے کہا کہ تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں (اور
اتمامِ حجت کے لئے ان کی طرف آئے ہیں) یہ لوگ تجھ پر قابو نہیں پاسکیں گے۔ تُو
اِن کی دست درازیوں سے محفوظ رہے گا۔ یوں کرو کہ جب رات کا تھوڑا حصہ گزر
جائے تو اپنے رفقاء کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ اور اس سرزمین سے یوں دامن جھاڑ
کر اٹھ کھڑے ہو کہ پھر اس کی طرف مڑ کر نہ دیکھو۔ تمہارے سب رفیق تمہارے ساتھ
چلے جائیں گے، لیکن تمہاری بیوی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ (یہ دوسری پارٹی
سے تعلق رکھتی ہے اس لئے) اسے وہی پیش آنے والا ہے۔ ان کی تباہی کے لئے
صبح کا وقت مقرر ہو چکا ہے اور صبح ہونے میں کچھ دیر نہیں۔
یہاں پھر "اھل" کا مفہوم واضح ہو گیا۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا ایمان نہیں لایا تھا تو وہ ان کے اھل

میں نہیں رہا تھا۔ یہاں حضرت لوطؑ کی بیوی ایمان میں مشترک نہیں تھی، تو وہ بھی اہل میں نہیں رہی۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد پنجم (ص ۳۰۲ - ۲۹۹) ملاحظہ فرمائیے:

(۱۱ / ۸۲-۸۳) فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۝

تباہی چنانچہ جب اُس تباہی کا وقت آگیا تو اُس بستی کی تمام بلند عمارتیں نیچے گرگر پستیوں میں تبدیل ہوگئیں۔ (آتش فشاں پہاڑ کے ایک جھٹکے نے، اسے تہ و بالا کر دیا) اور اس کے بڑے بڑے کھنگران پر بارش کی طرح برسنے لگے (۵۱/۳۴) — پیہم اور مسلسل بارش کی طرح — (۸۲)۔

وہ پتھر خدا کے ہاں سے موت کا پیغام بن کر اُن پر نازل ہونے شروع ہوگئے۔ اس لئے کہ قانونِ مکافات کی رُو سے تباہی کا عذاب، ظالمین سے کچھ دُور نہیں ہوتا کہ اسے وہاں تک پہنچنے میں دیر لگے اور وہ اتنے میں اپنی حفاظت کا سامان کرلیں (۸۳)۔

قومِ مَدیَن (حضرت شعیبؑ)

حضرت شعیبؑ (اور قومِ مدین) کے کوائف، مطالب الفرقان جلد پنجم صفحات ۳۳۱ - ۳۰۹ پر بیان کئے جا چکے ہیں۔ ہم اپنے معمول کے مطابق ان آیات کا متن اور صرف مفہوم درج کرتے جائیں گے جن میں کوئی نیا (وضاحت طلب) نکتہ نہیں آیا۔ تمہیداً اتنی صراحت ضروری ہے کہ قومِ ثمود کی معیشت زرعی تھی، اس لئے وہاں چراگاہوں اور چشموں کی مرتبانہ تقسیم کا سوال درپیش تھا۔ قومِ مدین کی معیشت (بیشتر) کاروباری تھی۔ اس لئے ان کی اصلاح کا تعلق لین دین کے منصفانہ اصولوں سے تھا۔ یہ فرق صرف

نوعیت کا تھا۔ جرم کی اساس و بنیاد ایک ہی تھی ــــ یعنی قوت کے بل پر کمزوروں کی احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھانا۔

(۱۱/۸۴) وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ ○

اسی طرح ہم نے قوم مدین کی طرف، ان کے بھائی بند، شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے بھی ان سے یہی کہا کہ تم صرف خدا کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تو تم بڑے خوشحال ہو، لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں، سخت معاشی ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس حالت کو بدلو اور اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو پورا رکھو۔ ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم پر ایسی تباہی آجائے گی جو تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ (۸۵/۷، ز ۳۔ ۸۳/۱)۔

پیغام کا بنیادی نکتہ وہی ہے کہ اطاعت اور محکومیت صرف قوانین خداوندی کی جائز ہے۔ ان قوانین کا تقاضا ہے کہ کاروبار دیانت اور امانت کے اصولوں پر مبنی ہو۔ اگلی آیت میں اسی اصول کی مزید وضاحت کی گئی ہے ــــ

(۱۱/۸۵) وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ○

اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھو اور کسی

کے حق میں کمی نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو ملک میں سخت ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی اور معاشرہ تہس نہس ہو جائے گا۔

قرآن میں الفاظ تو "ناپ تول" کے آئے ہیں، لیکن اس سے مراد تجارت کا جملہ کاروبار ہے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔ آیت کے آخر میں لفظ "مفسدین" آیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے "فساد" کے ڈانڈے کہاں کہاں جا کر ملتے ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ہو، اگر اس میں اقدارِ واصولِ خداوندی کو ملحوظ نہ رکھا جائے، تو اس سے جو تخریبی نتائج مرتب ہوں گے انہیں فساد کہا جائے گا۔

اقتصادی ناہمواریاں

وہ لوگ کاروبار میں "ڈنڈی مارنے" سے جو ناجائز کمائی کر لیتے تھے، اسے بڑا منفعت بخش سمجھتے تھے۔ کہا گیا کہ حقیقی منفعت، دیانت دارانہ کاروبار ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(۱۱/۸۶) بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ○

یاد رکھو! (جو کچھ تم اس طرح فریب کاری اور سلب ونہب سے جمع کر لیتے ہو، اگرچہ وہ بظاہر بہت کچھ نظر آتا ہے، لیکن وہ تمہارے لئے قطعاً نفع بخش نہیں ہو سکتا) ثبات ودوام صرف ان مفادات کے لئے ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کئے جائیں (۱۸/۴۶) ـــ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ثبات ودوام اُسے حاصل ہو سکتا ہے جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو (۱۳/۱۷) لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں اُس وقت آسکے گی، جب تم خدا کے قانون کی صداقت کو تسلیم کر و گے۔ (اگر تم اس پر یقین نہیں رکھتے تو اسے تم سے جبراً منوایا نہیں جا سکتا) اس لئے کہ میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

اس کے بعد کی آیت میں ایک بڑا اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس سے دین اور مذہب کا فرق نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

(۱۱/۸۷) قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝

صلوٰۃ اور معاشیات

انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! (تم جو کچھ کہتے تھے اُس سے ہم نے سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریق لے کر آئے ہو۔ اس لئے ہم نے اس سے کچھ تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے آبا و اجداد کے طریقے پر پوجا پاٹ کرتے رہیں گے۔ تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پوجا پاٹ کا نہیں۔ تیری صلوٰۃ صرف پرستش نہیں۔ یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں بھی دخیل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں) کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ کہ نہ ہم جس طرح ہمارا جی چاہے دولت حاصل کریں اور نہ ہی جس طرح جی چاہے اسے خرچ کریں؟ چہ خوب! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے آبا و اجداد، جن سے یہ موجودہ نظام منتقل ہو کر چلا آ رہا ہے، سب ظالم اور جاہل تھے اور عقل و فہم تحمل اور بردباری، غریبوں کی ہمدردی اور غمخواری، سب تمہارے حصے میں آ گئی ہے۔

اس آیت کی مفصل تشریح، مطالب الفرقان جلد پنجم، صؔ ۳۱۶ پر آ چکی ہے۔ اُسے ایک نظر بار دیگر دیکھ لیں۔ حضرت شعیبؑ نے جواب دیا:

(۱۱/۸۸) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰي مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا

الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ○

شعیبؑ نے کہا کہ اے میری قوم! ذرا اس پر غور کرو کہ میرے پروردگار نے عقل و بصیرت کے نمایاں راستے میرے سامنے کشادہ کر دیے ہوں اور لوٹ کھسوٹ، بددیانتی اور بے ایمانی سے حاصل کردہ رزق کے بجائے، مجھے نہایت عمدہ، خوشگوار اور حلال و طیب روزی عطا کی ہو (تو میں اس کے بعد بھی تمہیں صحیح راستے کی طرف آنے کی دعوت نہ دوں؟)۔ نہ ہی میں ایسا کر سکتا ہوں کہ جن باتوں سے میں تمہیں روکتا ہوں، انہیں خود اختیار کر لوں۔ میں جو کچھ دوسروں سے کہتا ہوں خود اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ میں تو اس کا تہیہ کر چکا ہوں کہ جہاں تک میرے بس میں ہوگا میں تمہارے غلط معاشرہ کی اصلاح کر دوں گا۔ (میں جانتا ہوں کہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے جن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے، وہ سر دست مجھے میسر نہیں۔ لیکن) مجھے وہ تمام اسباب قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہو جائیں گے۔ اس کے قانون کی محکمیت پر مجھے پورا پورا بھروسا ہے اور سفرِ حیات میں میرا ہر قدم، اُس چشمۂ خیر و خوبی کی طرف اٹھتا ہے۔

اس کے بعد انہیں وارننگ دی۔

(۱۱/ ۸۹-۹۰) وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ○ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ○

اے میری قوم! دیکھنا میری مخالفت میں تم کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھنا جس سے تمہارا

بھی وہی حشر ہو جائے جو نوحؑ، ہودؑ اور صالحؑ کی قوم کا ہوا تھا یا قومِ لوطؑ کا ساحل جس سے تم اچھی طرح باخبر ہو، کیونکہ وہ کچھ زیادہ عرصہ کی بات نہیں۔ نہ ہی ان کی تباہ شدہ بستیاں تم سے کچھ زیادہ دور واقع ہوئی ہیں (۸۹)۔

تم اپنی موجودہ روش کے تباہ کن نتائج سے اس طرح بچ سکتے ہو کہ تم اس راستے کو چھوڑ کر، خدا کے راستے کی طرف آجاؤ اور سلب ونہب کے موجودہ نظام کی جگہ خدا کا نظامِ ربوبیّت قائم کر کے، اس سے اپنی حفاظت کا سامان طلب کرو۔ وہ نظامِ خداوندی نہایت شفقت آمیز انداز سے سامانِ مرحمت عطا کرتا ہے (۹۰)۔

اس کے جواب میں انہوں نے کہا :

(۱۱/۹۱) قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ۝

انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! پہلی بات یہ ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس میں سے بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں! اس لئے انہیں ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ تم کوئی ایسے صاحبِ قوت واقتدار بھی نہیں کہ اس کی وجہ سے ہم تمہاری باتوں کو مجبوراً مان لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں محض تمہاری برادری کا لحاظ ہے۔ اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ نہ ہوتے، تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے اور تم ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکتے (۷/۸۸)۔

غور فرمایئے! حضرت شعیبؑ اُسی قوم کے ایک فرد ہیں۔ اُنہی کی زبان میں اُن سے باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا! مطلب یہ نہیں کہ تمہارے الفاظ کے معنے ہم نہیں سمجھ رہے بلکہ تم جو تعلیم دے رہے ہو، تمہاری تبلیغ و تلقین کا جو مقصد ہے، وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ جب کسی شخص کے قلب و دماغ پر مفاد پرستی کے جذبات غالب آجائیں، تو ان مفادات

کے خلاف کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آیا کرتی۔ لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ عربوں کی زبان عربی ہے پھر وہ قرآن کے پیغام کو کیوں نہیں سمجھتے؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن کی زبان کو تو وہ سمجھتے ہیں، لیکن ان کے مفاد پرستی کے جذبات انہیں اس کی طرف آنے نہیں دیتے۔ اور ایک عربوں ہی پر کیا موقوف، تمام مسلم ممالک میں عربی زبان کے جید عالم موجود ہیں، لیکن مذہب کے معاملہ میں وہ بھی قرآن سے ایسے ہی لابلد ہوتے ہیں جیسے ایک عربی نہ جاننے والا جاہل۔ قرآن فہمی کے لئے عربی زبان کا جاننا بیشک ضروری ہے لیکن صرف عربی زبان جاننے سے قرآن سمجھ میں نہیں آجاتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لَآ اِلٰہَ اِلَّا لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

اور دل اسی صورت میں گواہی دے سکتا ہے، جب اسے (قرآن کے الفاظ میں) تمام غیر قرآنی تصورات، نظریات، عقائد تک سے پاک اور صاف کر لیا جائے (۵۶/۷۹)۔ علامہ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہیے!

یہی ذہنی اور قلبی کیفیت قومِ مدینؔ کی تھی جس کی سمجھ میں (حضرت) شعیبؑ کی بات نہیں آرہی تھی۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا:

(۱۱/۹۲) قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝

شعیبؑ نے کہا کہ اچھا! تمہیں خدا کے قانونِ مکافات کا کوئی ڈر نہیں۔ ڈر ہے تو میری برادری کا ہے۔ میں اب سمجھا کہ تم جو خدا کا نام لیتے رہتے ہو، وہ محض برائے وزنِ بیت ہے۔ تم نے اسے بطور اپنے ساتھ رکھ چھوڑا ہے کہ جب اور کوئی ذریعہ باقی نہ رہے تو اس سے کام لیا جائے، ورنہ مدد اور سہارے کے لئے تمہاری نگاہیں اور ہی طرف اٹھتی ہیں۔ حالانکہ اگر تم آنکھیں رکھتے تو تمہیں نظر آجاتا کہ خدا کا قانونِ مکافات تمہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

اس میں خدا کے لئے جو ظِهْرِيًّا کا لفظ آیا ہے، اس کا مفہوم مطالب الفرقان، جلد پنجم، ص ۳۲۲ پر بیان کیا جا چکا ہے۔

اس تمام نظری مواعظ کے بعد وہی عملی طریق جس سے نظامِ خداوندی کے محسوس انسانیت ساز نتائج رسولؑ کے دعوے کی صداقت کا ثبوت بنتے ہیں. اس کے لئے فرمایا؛

(۱۱/۹۳) وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ○

نتائج بطورِ شہادت

بہرحال، میں نے سمجھ لیا ہے کہ وعظ و نصیحت کا تم پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا. اس لئے اب میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتے جاؤ اور مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو. نتائج بہت جلد بتا دیں گے کہ وہ کون ہے جس پر رُسوا کُن تباہی کا عذاب آتا ہے اور کون سچا اور کون جھوٹا ہے.

تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں.

اس کے بعد تباہی کی گھڑی آپہنچی.

(۱۱/۹۴-۹۵) وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۙ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ○

چنانچہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو ہم نے شعیبؑ اور اس کے رفقاء کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت کے مطابق بچا لیا اور جن لوگوں نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی انہیں زلزلہ کے سخت عذاب نے گھیر لیا. اور جب صبح ہوئی تو دیکھا گیا کہ

وہ اپنے گھروں میں بے حس وحرکت پڑے تھے (۹۴)۔
اور اُن کے گھر اس طرح ویران ہوچکے تھے گویا ان میں کبھی کوئی بسا ہی نہ تھا۔
دیکھو! اہلِ مدین بھی اسی طرح زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ گئے جس طرح
ان سے پہلے قومِ ثمود محروم رہ گئی تھی (۹۵)۔

اس تباہی کی تفصیل مطالب الفرقان جلد پنجم صفحات ۳۲۴ تا ۳۳۱ پر بیان ہوچکی ہے۔
یہاں پر قومِ مدین کی داستان ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد دو ایک آیات میں حضرت موسیٰ اور فرعون کی کشمکش کی طرف محض اشارہ کیا گیا ہے۔

(۱۱/۹۶-۹۷) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ۝

اور اسی طرح ہم نے موسیٰ کو اپنے قوانین اور واضح سند (اتھارٹی) دے کر فرعون
اور اُس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ انہوں نے موسیٰ کی بات نہ مانی اور فرعون کا حکم
مانتے رہے، حالانکہ فرعون کے احکام یکسر استبداد پر مبنی تھے اور انہیں عقل و بصیرت
سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ (آیات ۹۶ اور ۹۷)۔

یہاں بھی فرعون کا جرم، جور و استبداد بتایا گیا ہے اور اس کی قوم کا جرم یہ کہ وہ اس قسم کے مستبد حکمران کی اطاعت کرتی تھی۔ اطاعت کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ وہ اس کے مظالم کو خاموشی سے برداشت کرتے رہتے تھے، ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ فرعون کے جور و ستم پر مبنی احکام کا عملی نفاذ وابستگانِ حکومت کے ہاتھوں ہوتا تھا۔ اس نہج سے وہ بھی ان جرائم میں برابر کے شریک تھے۔ قرآن کریم کے اس قسم کے مقامات میں سیاستِ مُدن کے بڑے عمیق اصول پوشیدہ ہیں۔ مستبد حکمران اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والی حکومت کی مشینری کے ارکان و داعیان، پوری کی پوری حاکم قوم۔ دوسری طرف وہ محکوم قوم جو خاموشی سے ان مظالم کو برداشت

کئے چلی جائے. قرآن کریم بڑے بصیرت افروز انداز میں ان سب کے جرم کا تجزیہ کرتا ہے.

(۱۱ / ۹۸-۹۹) يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ○ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ○

(ہم نے موسٰیؑ سے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں) جب بنی اسرائیل تمہارے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں گے، تو یہ (فرعون) ان کی مخالفت میں اپنی قوم کو لے کر نکلے گا اور خود ان کی قیادت کرے گا اور اس طرح انہیں تباہی اور بربادی کے گھاٹ پر لے جائے گا اور وہ بہت ہی بُرا گھاٹ ہوگا جس پر یہ لوگ پہنچیں گے (۱۴/۲۸). یہی حالت ان کی آخرت کی زندگی میں ہوگی جہاں یہ (فرعون) اپنی قوم کو جہنّم تک پہنچا دے گا (۹۸).

چنانچہ یہی ہوا. وہ قوم اس دنیا میں بھی زندگی کی خوشگواریوں سے محروم ہوگئی اور مستقبل کی زندگی کی شادابیوں سے بھی. یہ کیسا ناخوشگوار صلہ ہے جو کسی کو اس کی جدّ و جہد کا ملے. (لیکن جب جدّ و جہد ہی غلط ہو تو اس کا صلہ کس طرح خوشگوار مل جائے؟) (۹۹).

اس سورۃ میں بہت سی اقوامِ سابقہ کا تذکرہ آگیا ہے.

(۱۱ / ۱۰۰) ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ○

یہ اقوامِ گذشتہ میں سے چند ایک کی سرگزشت ہے جسے ہم تم سے بیان کر رہے ہیں. ان میں سے بعض آبادیوں کے پسماندگان ابھی تک موجود ہیں اور باقی اُجڑ چکی ہیں.

ان کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا؛

(۱۱/۱۰۱) وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ۝

(تم نے ان کے حالات سے دیکھ لیا ہوگا کہ) ہم نے ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی۔ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر زیادتی کی (جو قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر غیر خداوندی قوتوں کی اطاعت اختیار کر لی)۔ سو جب ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آگیا تو وہ جن غیر خداوندی قوتوں کے احکام کی اطاعت کیا کرتے تھے اور انہیں اپنا خدا سمجھ بیٹھے تھے وہ اُن کے کسی کام بھی نہ آسکیں۔ اُن کی اطاعت اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی کہ اُلٹا ان کی تباہی کا موجب بن جائے۔

یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوا:

(۱۱/۱۰۲) وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰی وَهِیَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِیْمٌ شَدِیْدٌ ۝

(لہٰذا، تاریخ کے ان نوشتوں سے تم اس محکم اصول کو یاد رکھو کہ) جب بھی کوئی قوم ظلم و سرکشی پر اُتر آئے، تو خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت اُسے پکڑ لیتی ہے اور یہ گرفت بڑی سخت اور الم انگیز ہوتی ہے۔

اگلی آیت کے پہلے حصہ میں کہا گیا ہے کہ ان داستانوں کو محض تاریخی سوانح سمجھ کر آگے نہ بڑھ جاؤ۔ ان میں عبرت و موعظت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں۔

(۱۱/۱۰۳) اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ

اقوامِ گذشتہ کی اِن داستانوں اور قانونِ مکافات کے اِس غیر متبدل اصول

ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اُس قوم کے لئے واضح دلائل ہیں جو مستقبل کی تباہ کاریوں اور بربادیوں کے احساس سے خائف رہتی ہے اور اُن سے بچنا چاہتی ہے۔

ان تاریخی شواہد میں جہاں ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ جن اقوام نے قوانینِ خداوندی کے خلاف اپنا نظام اور معاشرہ قائم کیا' ان کا انجام کیا ہوا۔ دوسری طرف یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ حق وصداقت کی طرف دعوت دینے والوں کو کس قسم کے جانگسل مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مخالفتوں کے ہجوم میں انہیں کس قدر صبر آزما صعوبات برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ دیگر سورتوں میں ان حضرات (انبیاء کرامؑ) میں سے ایک ایک دو دو کے کوائف سامنے لائے گئے تھے۔ سورۃ ہود میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ تک کے جملہ انبیاء اولوالعزم کے احوال وظروف یکجا بیان کئے گئے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا"۔ ان انبیاء کرامؑ کو جن جانگداز مراحل میں سے گزرنا پڑا تھا' انہیں دیکھ کر اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے بوڑھا ہو جانا فطری تھا!

عین اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اُن صعوبات کی ایک جھلک بھی دکھا دی جن سے حضورؐ (اور جماعت مومنین) کو دوچار ہونا تھا۔ آیت (۱۱/۱۰۳) کا اگلا حصہ اور اگلی آیت یوں ہے:

(۱۱ / ۱۰۳-۱۰۴) ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ○ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ○

محاذ آرائی کا نتیجہ

(اسی محکم قانون کے مطابق اُس قوم کا بھی حشر ہوگا جو اے رسول! تیری دعوت کی اس طرح مخالفت کر رہی ہے)۔ ان کی اس روش کے نتائج اُس دن سامنے آئیں گے جب دونوں فریق ایک میدان میں ایک دوسرے کے مقابل جمع ہوں گے۔ یہ وہ دن ہوگا جب اعمال کے نتائج مشہود طور پر سامنے آجائیں گے (یعنی اس انداز سے جسے سب محسوس طور پر دیکھ لیں)(۱۰۳)

ہم' اپنے قانونِ مہلت کے مطابق' اُس دن کو ایک مدتِ معینہ کے لئے ملتوی کر رہے ہیں۔ (لیکن' آخر یہ آکر ضرور رہے گا) (۱۰۴)۔

اس کشمکش کی باقی تفاصیل آئندہ آیات میں سامنے آئیں گی' لیکن انہیں سامنے لانے سے

پہلے ایک اہم نکتہ پر غور ضروری ہے۔ اس ضمن میں دو تین امور بالخصوص قابلِ توجہ ہیں:

عذاب اور جرائم کی تشریح

(۱) ان اقوام پر عذاب یونہی "آسمان سے" نازل نہیں کر دیا گیا تھا۔ یہ تباہی ان کے جرائم کا فطری نتیجہ تھی۔ بالفاظِ دیگر، یہ تباہی خود ان جرائم کے اندر پوشیدہ تھی۔ پہلے وہ مضمر تھی، پھر بارز ہو کر سامنے آگئی۔

(۲) یہ جرائم کیا تھے؟ ان کے غلط سیاسی، معاشرتی، معاشی نظام، جن کی عمارت استبداد اور استحصال کی بنیادوں پر استوار تھی۔ (نماز، روزے کی اہمیت اپنی جگہ پر، لیکن) ان میں سے کسی قوم کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اس لئے تباہ ہوگئی کہ وہ نماز نہیں پڑھتی تھی، روزے نہیں رکھتی تھی۔ کہا یہی گیا ہے کہ ان کا غلط نظام ان کی تباہی کا موجب بنا، یا یوں کہیئے کہ ان کی تباہی ان کے غلط نظام کا نتیجہ تھی۔ حضرات انبیاء کرامؑ ان کے غلط نظام کی جگہ صحیح نظام استوار کرنے کی تلقین و تبلیغ کرتے تھے۔ (انڈکس میں قوموں کے عروج و زوال" یا ان کی تباہی کے عنوانات دیکھئے)۔

(۳) تیسرے یہ کہ ان کی تباہی، حوادثِ فطری (طبیعی اسباب و ذرائع) سے عمل میں آئی — سیلاب، آندھیاں، جھکڑ، زلزلے، آتش فشاں پہاڑوں کی شعلہ باریاں وغیرہ۔ اُن کے جرائم اور اُن کی تباہی کے ان اسباب میں ربط اور تعلق کیا تھا، اس کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول صـ۱۸۹ پر تفصیلی ذکر آچکا ہے۔ اس ایک بار پھر دیکھ لیجئے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے مذہب پرست حضرات اپنے وعظوں میں ہمیشہ اسے دہراتے ہیں کہ یہ قومیں "فسق و فجور" میں مبتلا تھیں، اس لئے خدا نے انہیں (کسی فوق الفطرت، خارقِ عادات طریق سے) ہلاک کر دیا۔ اس سے ہمارا نوجوان طبقہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ (آپ کے کہنے کے مطابق) کسی قوم میں فحاشی عام ہو جاتی ہے تو اُن کے اس گناہ کی پاداش میں اللہ تعالیٰ ان پر زلزلہ بھیج کر اُن کی بستیوں کو زمین دوز کر دیتا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ فحاشی اور زلزلہ میں بالآخر تعلق کیا ہے؟ اور آج ہمارے سامنے ایسی قومیں موجود ہیں جن میں فحاشی سیلاب کی طرح پھیل رہی ہے، لیکن نہ سیلاب آتا ہے، نہ زلزلہ! مطالب الفرقان جلد اوّل (صـ۱۸۹) میں انہی پریشان کن سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔

اس کے بعد پھر اُس کشمکش کی طرف آیئے جس کی سرداستان، آیت (۱۱/۱۰۳) میں آئی تھی، یعنی

رسول اللہ کے زمانے میں حق و باطل کی قوتوں کا ٹکراؤ. جیسا کہ ہم شروع سے واضح کرتے چلے آرہے ہیں، افراد یا اقوام کے صحیح اور غلط اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آتے ہیں اور اخروی زندگی میں بھی. جو نتائج اس زندگی میں سامنے آتے ہیں وہ چونکہ محسوس اور مرئی شکلوں میں ہوتے ہیں، اس لئے انہیں ہم دیکھ بھی سکتے ہیں، سمجھ بھی سکتے اور سمجھا بھی سکتے ہیں. لیکن اُخروی زندگی میں ان کا راز کیا ہوگا، اس کی کُنہ و حقیقت سے ہم واقف نہیں ہو سکتے. اس لئے انہیں بلا تشریح بیان کر دینے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے. اس زندگی میں یہ نتائج، اجتماعی طور پر قوموں کے ٹکراؤ کی شکل میں سامنے آتے ہیں. عہدِ رسالت مآبؐ میں (جب قرآن نازل ہو رہا تھا) یہ ٹکراؤ مخالفین کے ساتھ جنگوں کی صورت میں سامنے آیا. اس لئے قرآن مجید میں جہاں (عہدِ رسالت مآبؐ میں) اس قسم کے ٹکراؤ کا ذکر آیا ہے، اسے جنگ کی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے. ہم بھی اپنی تشریح کو وہیں تک محدود رکھتے ہیں. اس وضاحت کے بعد سورۃ ہود کی اگلی آیت دیکھئے

(۱۱/۱۰۵) يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيدٌ ۝

محاذ اُس وقت سب فیصلے قانونِ خداوندی کے مطابق ہوں گے اور کوئی شخص اس کے خلاف بات تک نہیں کر سکے گا. (آج کی طرح نہیں کہ جس نے کچھ قوت فراہم کر لی، اس کی بات قانون بن گئی).

اُس وقت دونوں گروہ نکھر کر الگ الگ ہو جائیں گے (۳۶/۵۹) ایک وہ جو زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے محروم رہ جائیں گے. یہ بڑے بدقسمت ہوں گے. دوسرے وہ جو ان خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہوں گے. یہ بڑے خوش بخت ہوں گے.

اس کے بعد ان دونوں گروہوں کا ذکر آتا ہے. بدنصیب گروہ:

(۱۱/۱۰۶-۱۰۷) فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَّشَهِيقٌ ۝ خٰلِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ

وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝

زندگی کی شادابیوں سے محروم رہ جانے والوں کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی (کہ وہ عمل تھے ہی ایسے نتائج پیدا کرنے والے) اور ان کے لئے عمر بھر کا چیخنا چلّانا اور واویلا کرنا ہوگا (۱۰۰/۲۱ '۱۰۶)۔

یہ قومیں ہیں جن میں دوبارہ زندہ ہونے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، اس لئے ان پر ہمیشہ کے لئے تباہی مسلّط ہو جاتی ہے۔ یہ قوانین تیرے پروردگار نے کائنات کے کلّی پروگرام کو سامنے رکھ کر، اپنے اختیار و ارادہ سے بنائے ہیں، اس لئے نہ ان میں کوئی دخل دے سکتا ہے، نہ ان پر معترض ہو سکتا (۱۰۷)۔

خوش بخت گروہ:

(۱۱/۱۰۸) وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِى الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝

اِن کے برعکس، خوش بخت قوم زندگی کی خوشگواریوں سے شادکام ہوگی، اور اُن خوشگواریوں کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا (۹۵/۶) — یہی تقسیم اس زندگی کے بعد بھی قائم رہے گی۔ بدبخت جہنم میں ہوں گے اور خوش بخت جنت میں۔

ابدیت سے مُراد

ان آیات میں جہنم اور جنت کی زندگی کو "ابدی" بھی کہا گیا ہے — اور اس کے ساتھ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (جب تک یہ کائنات باقی ہے) اور اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ بھی۔ جنت اور جہنم کے متعلق سابقہ جلدوں میں بڑی تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ اگرچہ ان میں ابدی خلود کہا گیا ہے، لیکن (ظاہر ہے کہ) یہ ابدیت ذاتِ خداوندی جیسی ابدیت

نہیں ہو سکتی۔ وہ ازلیت جس کی کوئی ابتدا نہیں، اور وہ ابدیت جس کی کوئی انتہا نہیں، ذاتِ خداوندی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کا تعلق ہے نظر آتا ہے کہ یہ الفاظ بطور محاورہ استعمال کئے گئے ہیں جن کے مجازی معنی "ہمیشگی" کے ہیں۔ جیسے " خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا کے الفاظ، ہمیشگی کے مفہوم میں مزید تیقن پیدا کرنے کے لئے آتے ہیں۔" اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ " کے متعلق مطالب الفرقان، جلد پنجم صفحہ ۱۲۴ پر بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ایسا ضرور ہو کر رہے گا۔ جنت اور جہنم کے خلود اور ابدیت کے متعلق میں نے اپنی کتاب "جہانِ فردا" میں تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن سب کچھ کہہ سُن لینے کے بعد بھی یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ اُخروی زندگی کے کوائف کے متعلق ہم نہ حتمی طور پر کچھ سمجھ سکتے ہیں، نہ کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں زمان و مکان کا تصور ہمارے موجودہ تصورات سے یکسر مختلف ہوگا جسے ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اس کے مبنی بر حقیقت ہونے پر ہمارا ایمان ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو الفاظ اس نے استعمال کئے ہیں ان کے مجازی معنی ہی سے ہم اس حقیقت کا اپنے شعور کی محدود سطح کے مطابق کچھ تصور کر سکتے ہیں۔ یہ حقیقت، بہرحال، واضح ہے کہ (قرآن میں کہیں نہیں کہا گیا کہ) اُخروی جہنم سے نکل کر کوئی فرد جنت میں چلا جائے گا اور (جنت کے ارتقائی منازل تو ہوں گے لیکن) وہاں سے بھی کسی کو نکالا نہیں جائے گا۔ جہاں تک جنتِ ارضی کا تعلق ہے، جب تک کوئی قوم اس نظامِ خداوندی کو قائم رکھے گی جس کے نتیجے میں اسے وہ جنتی خوشگواریاں نصیب ہوتی ہیں، وہ خوشگواریاں باقی رہیں گی۔ جب وہ اس نظام کو بدل دے گی، وہ سعادات اس سے چھن جائیں گی۔ جہاں تک جہنم کا تعلق ہے، اگر کوئی قوم اس طرح تباہ ہوئی ہے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی تو اس کی یہ تباہی ابدی ہوگی۔ اگر اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت تو تھی، لیکن وہ عارضی طور پر دب گئی تھی، تو اس کے دوبارہ زندگی حاصل کر لینے کے امکانات رہتے ہیں۔ اگر وہ اپنی روشِ کہن کو چھوڑ کر زندگی بخش اسالیب اختیار کر لے گی تو حیاتِ تازہ سے نوازی جائے گی۔ اسی حقیقت کو اگلی آیت میں یوں بیان کیا گیا ہے:

(۱۱/۱۰۹) فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ

اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۠

سو یہ لوگ، جو خدا کو چھوڑ کر، دوسری قوتوں کے سامنے جھکتے ہیں، ان کے انجام کے متعلق تم اپنے دل میں ذرا سا شبہ بھی پیدا نہ ہونے دو۔ یہ انہی قوتوں کی اطاعت کرتے ہیں جن کی اطاعت ان کے آبا و اجداد کیا کرتے تھے (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ سو جس قسم کا انجام ان کا ہوگا) ہمارا قانونِ مکافات ہر عمل کا بدلہ، بلا کم و کاست، پورا پورا، دے دیا کرتا ہے۔

اس کی زندہ مثال قوم بنی اسرائیل تھی۔ اس کی وضاحت کے لئے فرمایا:

(۱۱ / ۱۱۰ — ۱۱۱) وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

اس سے پہلے کتابِ موسیٰؑ میں بھی، ہم نے یہی کچھ کہا تھا۔ لیکن اس میں اختلاف پیدا کر دیا گیا (یہی وہ اُن کا خود پیدا کردہ اختلاف ہے جس کی بنا پر یہ یہود تمہاری مخالفت کر رہے ہیں)۔ اگر تمہارے پروردگار کے قانونِ مکافات میں مہلت اور تدریج کی گنجائش نہ رکھی گئی ہوتی، تو ان کا فیصلہ کب کا ہو چکا ہوتا۔ یہ لوگ (اس مہلت کی وجہ سے) اس قانون کی نتیجہ خیزی کے متعلق شبہ میں پڑ گئے ہیں اور ایک عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے (۱۱۰)۔

حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ تیرے پروردگار کا قانونِ مکافات ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہتا ہے۔ وہ ہر ایک کے عمل سے باخبر ہے (۱۱۱)۔

امم سابقہ اور انبیاءؑ گذشتہ کے ان تصادمات کو بیان کرنے کے بعد حضورؐ سے فرمایا؛

(۱۱/۱۱۲) فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

لہذا، تم ان کے متعلق کوئی تشویش نہ کرو۔ تم اور تمہارے ساتھ وہ لوگ جو، اپنی غلط روش کو چھوڑ کر، سیدھے راستے پر آجاتے ہیں اور یوں تمہاری جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں، سب کے سب اس توازن بدوش انقلاب کی راہ پر ثابت قدم رہو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے ــــ پھر سن لو کہ اس میں اعتدال اور توازن کو ہمیشہ ملحوظ رکھو اور حدود سے تجاوز نہ کرو۔ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے اعمال پر بھی کڑی نگاہ رکھتا ہے۔

اور جیسا کہ (پہلے بھی متعدد مقامات پر کہا جا چکا ہے) ان مخالفین سے کسی قیمت پر بھی مفاہمت نہیں کی جائے گی؛

(۱۱/۱۱۳) وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝

مفاہمت نہیں ہو سکتی

(یہ لوگ تم سے مفاہمت کی بھی کوشش کریں گے اور چاہیں گے کہ کچھ تم پیچھے ہٹو، اور کچھ یہ آگے بڑھیں اور اس طرح مصالحت کر لی جائے ۱۰/۱۵؛ ۱۷/۷۴؛ ۴۸/۹۔ لیکن تم ہرگز ایسا نہ کرنا) اور یہ لوگ جو قانونِ خداوندی سے سرکشی برت رہے ہیں، ان کی طرف بالکل نہ جھکنا۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم بھی تباہی کی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آجاؤ گے۔ اس تباہی سے بچانے والا صرف خدا کا قانون ہے۔ اس کے سوا تمہارا کوئی بھی حامی و ناصر نہیں۔ اگر اس کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا، تو پھر کہیں بھی پناہ نہیں مل سکتی۔

اس کا عملی پروگرام نظامِ صلوٰۃ کا قیام ہے؛

(۱۱/۱۱۴) وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۚ﴿۱۱۴﴾

اجتماعاتِ صلوٰۃ

اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ تم اجتماعاتِ صلوٰۃ کا نہایت پابندی سے اہتمام کرتے رہو — صبح، شام، رات گئے (۷۸/۱۷ ; ۵۸/۲۴)۔ اس سے معاشرہ کی تشکیل صحیح متوازن خطوط پر ہو جائیگی اور وہ ہمواریاں پیدا ہو جائیں گی جو تمام سابقہ ناہمواریوں کو دُور کر دیں گی — یاد رکھو! ناہمواریاں دور کرنے کا طریق ہی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہمواریاں پیدا کر دی جائیں. تخریبی کاروائیوں کے نقصان رساں اثرات مٹتے ہی تعمیری کاموں سے ہیں۔ — یہ ہر اُس قوم کے لئے محکم اصولِ حیات ہے جو قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھنا چاہتی ہے۔

صلوٰۃ کا تفصیلی مفہوم سابقہ جلدوں میں بیان کیا جا چکا ہے اور اوقاتِ صلوٰۃ کے متعلق مطالبُ الفرقان جلد اوّل ص ۱۳۱ پر اور ضمناً جلد چہارم ص ۲۰۲ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے جہاں زیرِ نظر آیت بھی درج ہے. اس مقام پر اس موضوع پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں.

اس آیت میں فرد، معاشرہ اور قوم کی اصلاح کا بنیادی اصول بتایا گیا ہے اور وہ یہ کہ اصلاح کا ارادہ ہو تو پہلے سابقہ غلط کاری سے رُکا جائے (اسے توبہ کہتے ہیں)۔ اس کے بعد زیادہ سے زیادہ صحیح

حسنات سے سیّات کا ازالہ

(تعمیری) کام کئے جائیں (انہیں حسنات کہتے ہیں)۔ ان تعمیری کاموں کے نتائج ان نقصانات (سیّات) کا ازالہ کر دیں گے جو سابقہ غلط کاری کی وجہ سے ہوئے تھے. تفصیل ان امور کی مطالبُ الفرقان جلد دوم ص ۲۸۸ پر آ چکی ہے اور ضمنی اشارہ جلد اوّل ص ۲۷ پر۔ انہی مقامات سے توبہ اور مغفرت کا مفہوم بھی سمجھ میں آ جائے گا. قرآنِ مجید نے جو ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُ اور خَفَّتْ مَوَازِيْنُ کا اصول بیان کیا ہے[1] یعنی نیکیوں (تعمیری

---

[1] (۸/۷ ; ۶/۱۰۱)

کاموں) کا پلڑا بھاری ہو تو کامیابی ہو جاتی ہے، تو اس سے بھی یہی مقصود ہے (یہ آیت بھی جلد دوم صـ۲۸۸ پر آچکی ہے). اصلاحِ احوال کے لئے یہ اصول اس قدر بنیادی اور اہم ہے کہ اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کی تاکید کی گئی ہے ــــ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ــــ اور اس پر جم کر کھڑے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔

(۱۱/۱۱۵) وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس پروگرام پر نہایت استقامت سے کاربند رہا جائے (کیونکہ اس کے نتائج ایک وقت کے بعد جا کر برآمد ہوں گے). یہ استقامت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ تمہارا اس حقیقت پر ایمان محکم ہو کہ جو قوم خدا کے تجویز کردہ پروگرام پر حسن کارانہ انداز سے عمل پیرا ہو، اس کی محنت کبھی ضائع نہیں جاتی۔ اس کے نتائج مرتب ہونے میں وقت تو لگتا ہے، لیکن اس کی محنت رائیگاں نہیں جا سکتی ــــ یہ اس حقیقت پر یقین ہی ہے جو اس صبر آزما مرحلہ میں کسی کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتا۔

اصلاحِ احوال کا پروگرام

لہٰذا، قرآن کریم کی رُو سے، اصلاحِ احوال کا طریق یہ ہے؛

(۱) نظامِ صلوٰۃ کا قیام۔

(۲) اس قدر تعمیری کام کئے جائیں کہ وہ سابقہ تخریبی امور سے پیدا شدہ نقصانات کا ازالہ کر دیں، اور

(۳) اس پروگرام پر جم کر کھڑا رہا جائے۔

اسی کا نام توبہ ہے۔ یہی مغفرت ہے۔

اس تاکید اور توثیق کے بعد پھر اقوامِ سابقہ کی تاریخ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی۔ فرمایا؛

(۱۱/۱۱۶) فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ

أَنجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ○

(ان تمام تفاصیل کے بعد جو اوپر دی گئی ہیں، تم دیکھو کہ اقوامِ گذشتہ کے کوائف سے تم کس نتیجے پر پہنچتے ہو؟ اسی نتیجہ پر کہ) جن لوگوں کو ہم تباہی سے بچا لیتے تھے، ان میں سے بھی (البعد ہیں) صرف معدودے چند ایسے رہ جاتے تھے جو اپنے مفاد کو قانونِ خداوندی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے تاکہ وہ غیر متغیر رہیں اور انہیں ثبات و دوام حاصل رہے (۱۳/۳۵ ؛ ۱۱/۸۶) اور لوگوں کو، ملک میں ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے۔ ورنہ باقیوں کا تو یہ حال تھا کہ وہ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برت کر اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے تاکہ انکی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے (خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گزرے)۔ یہ تھے ان کے جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آتی تھی۔

ان کی تباہی اسی کا نتیجہ تھی۔ اس کا اٹل قانون یہ ہے کہ:

(۱۱/۱۱۷) وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ○

یاد رکھو! خدا نے کبھی ایسا نہیں کیا (اور نہ ہی وہ ایسا کرتا ہے) کہ کسی بستی کو یونہی (اندھا دھند) ظلم و زیادتی سے تباہ کر دے، درآنحالیکہ اس کے رہنے والے اپنے اور دوسرے لوگوں کے حالات کو سنوارنے والے ہوں۔

نہ تو دھاندلی سے کسی قوم کو تباہ کیا جاتا ہے اور نہ کسی کو مجبور کر کے راہِ راست پر چلایا جاتا ہے۔ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ جس طرح اپنے اختیار کو استعمال کرے گا، اس کے مطابق اس کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔

(۱۱/۱۱۸-۱۱۹) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۙ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○

لٰ اس سے شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ خدا نے ایسا سلسلہ کیوں رکھا ہے کہ لوگ حق و صداقت کی مخالفت کرتے ہیں اور اس طرح باہمی کشمکش پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کر دیا کہ سب انسان ایک ہی راستے پر چلتے۔ سو جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے (۵/۴۸) ۔ خدا کے لئے یہ قطعاً مشکل نہیں تھا کہ وہ انسانوں کو بھی' کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح' بلا اختیار و ارادہ پیدا کر دیتا اور اس طرح وہ سب مجبوراً' ایک راہ پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسانوں کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے وہ باہمدگر اختلاف کرتے ہیں۔

ان اختلافات سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ لوگ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں (۳۸ – ۲/۳۶)۔ ایک صاحبِ اقتدار ہستی کے قانون کا اتباع کرنے سے اختلافات خود بخود مٹ جاتے ہیں۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے ایسا قانون بھی عطا کر دیا ہے۔ انسان

اختلافات ختم کرنے کا طریق

کو اس انداز سے پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ تھا (۵۱/۵۶) کہ وہ' اپنے اختیار و ارادہ سے' قانونِ خداوندی کے اتباع سے اپنے اختلافات مٹا کر ایک امت بن کر رہے۔ ایسا بالآخر ہو کر رہے گا (۲/۲۱۳؛ ۴۳/۳۳)۔ لیکن (اس دوران میں' جو لوگ علم و بصیرت سے کام لینے کے بجائے' اپنے جذبات کے پیچھے لگے رہیں گے (۷/۱۷۹)' وہ تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں جا پڑیں گے (۱۹/۵۹)' خواہ وہ شہروں کی مہذب

آبادی سے متعلق ہوں یا بدوی یا صحرائی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ یہ ہمارا اٹل قانون ہے (اور تاریخ کے نوشتے اس کی شہادت دیتے ہیں کہ کس طرح صحیح ثابت ہوتا چلا آ رہا ہے)۔

تمام انسانوں کو بہ جبر امّتِ واحدہ بنانے کے متعلق مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۵۲۲-۵۲۳ اور جلد سوم صفحہ ۳-۴ پر گفتگو کی جا چکی ہے۔

تفرقہ اور اختلافات خدا کا عذاب ہیں۔ اس کے متعلق انڈکس دیکھئے، نیز وہ حوالے جو مندرجہ بالا مفہوم میں دیے گئے ہیں۔ انسانی اختیار و ارادہ کی بحث کے لئے بھی انڈکس دیکھئے۔

یہ جو کہا گیا کہ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا نے پہلے سے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ "تمام جن و انس سے جہنم بھر دیا جائے گا"۔ یہ مفہوم یکسر غلط ہے۔ خدا نے قانونِ مکافات نافذ کر رکھا ہے جس کے مطابق جنت اور جہنم میں جانے کے فیصلے افراد اور اقوام کے اعمال کی رُو سے ہوتے ہیں۔ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ کے معنی یہ ہیں کہ یہ سب کچھ اس کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوگا جسے خدا نے پہلے سے مقرر کر رکھا ہے۔

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ کے بھی یہ معنی نہیں کہ انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ اختلاف کرتے رہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ چاہیں تو باہمدگر متفق رہیں اور چاہیں تو ایک دوسرے سے اختلاف کریں۔ باہمی اتّفاق اور مودّت سے رہنے والوں پر خدا کی مرحمت کا سایہ ہوتا ہے اور اختلاف کرنے والے جہنم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

جن و انس کے جہنم میں جانے کے متعلق قانون کی وضاحت آیت (۷/۱۷۹) میں کی گئی ہے۔

اس کے بعد بتایا کہ انبیاءؑ سابقہ کی یہ داستانیں کیوں بیان کی جاتی ہیں؛

(۱۱/۱۲۰) وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اے رسولؐ! ہم تمہیں (اقوامِ سابقہ اور) انبیائے گذشتہ کی یہ داستانیں اس لئے

سناتے رہتے ہیں کہ اس سے تمہارا دل مضبوط ہو (۱۱۲ — ۱۱۵/۱۱)۔ اس قرآن میں ہم نے تمام حقائق (واضح انداز میں) بیان کر دیے ہیں۔ یہ حقائق اور اس کی اخلاقی قدریں جماعتِ مومنین کو اس حقیقت کی یاد دلاتی ہیں (کہ ان کی زندگی کا نصب العین کیا ہے اور وہ کس طرح سے حاصل ہوگا)۔

ان تاریخی شواہد کا ملخص یہ ہے کہ کشمکش کتنی ہی شدید اور تصادمات کتنے ہی جرأت آزما کیوں نہ ہوں، کامیابی بالآخر حق کی ہوتی ہے۔ اس حقیقت پر یقین، حق کی علمبردار جماعتوں کے دل میں حُزن اور پاؤں میں لغزش پیدا ہونے نہیں دیتا۔

اور اس کے بعد اس کشمکش کی فیصلہ کن کڑی مخالفین کے سامنے پیش کر دی گئی:

(۱۱/ ۱۲۱-۱۲۲) وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝

(اے رسولؐ! ان دلائل و براہین اور تاریخی شواہد کی روشنی میں، تم بھی اپنے مخالفین سے کہہ دو، جس طرح انبیائے سابقہ نے کہا تھا۔ ۹۳/۱۱) کہ تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہو۔ ہم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہیں (۱۲۱)۔

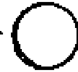
اس کے بعد، تم بھی نتائج کا انتظار کرو۔ ہم بھی انتظار کرتے ہیں (۱۲۲)۔

اس قسم کا چیلنج وہی دے سکتا ہے جسے یقین ہو کہ اُس کے پروگرام کے تعمیری نتائج اُس کے دعویٰ کی صداقت کا ناقابلِ تردید ثبوت بن کر سامنے آئیں گے (جیسا کہ پہلے دیکھا جا چکا ہے)۔ اس قسم کا چیلنج ہر رسول کی طرف سے پیش کیا جاتا تھا۔ اس یقین کی بنا یہ تھی کہ:

(۱۱/ ۱۲۳) وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

(تمہارا یہ چیلنج اُس خدا کے اٹل قانون پر مبنی ہے) جس کے تجویز کردہ پروگرام کی تکمیل

کے لئے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی ہر شے مصروفِ عمل ہے اور تمام معاملات کا فیصلہ اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے (اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس کے جس پروگرام کی تکمیل کے لئے تم اٹھے ہو، وہ کامیاب نہ ہو)۔ بس تم اس کے قانون کی کامل اطاعت کرتے رہو اور ان کی نتیجہ خیزی پر پورا پورا بھروسا کرو۔ یاد رکھو! تمہارا پروردگار کسی کے عمل سے بے خبر نہیں ہوتا کہ اس کا نتیجہ مرتب ہونے سے رہ جائے۔ ایمان اس قسم کی خود اعتمادی پیدا کر دیتا ہے۔



سورۃ ھود ختم شد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انڈکس

مطالب الفرقان جلد ششم

مطالب الفرقان کی پہلی تین جلدوں کا مشترکہ انڈکس، جلد سوم کے آخر میں دیا گیا تھا۔ چوتھی اور پانچویں جلد کا انڈکس ہر جلد کے آخر میں الگ الگ دیا گیا تھا۔ اسی طرح زیرِ نظر جلد ششم کا انڈکس یہاں دیا جا رہا ہے۔ جس موضوع کو بھی آپ نے دیکھنا ہو تو یہ بہتر ہو گا کہ آپ تمام جلدوں کے انڈکس ایک نظر دیکھ لیں تاکہ موضوع زیرِ نظر کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم ہو سکیں۔ انڈکس میں بائیں جانب سورۃ کا نمبر ہے اور دائیں جانب آیت کا نمبر، مثلاً (۱۰:۹۵) سے مراد ہے دسویں سورۃ کی آیت نمبر ۹۵ وقس علیٰ ہذا

انڈکس کے حوالوں میں اگر کہیں غلطی نظر آئے تو براہِ کرم ہمیں بھی مطلع فرمائیں ——— ہم آپ کے شکرگزار ہوں گے۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است